محمد رسول اللہ ﷺ

شائع کردہ

شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

جامعہ پنجاب لاہور

حضرت محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

marfat.com
Marfat.com

⊗ حضرت مُحَمَّد، صلّی اللہ علیه و آلہٖ وسلّم: پیغمبر اسلام ، سرور کائنات ، محمد بن عبداللہ بن عبدالمُطّلب بن هاشم (پورا سلسلۂ نسب آگے آتا ھے).

[یه مقاله بڑے ادب و احترام ، بڑی احتیاط اور بڑے خوف سے مرتب ہوا ہے ؛ مبادا کوئی ایسا لفظ زبان قلم پر نه آ جائے ، جو شان اقدس سے مناسبت نه رکھتا ہو۔ یه مقاله عام مقالات سے مختلف ھے ۔ یه تو مرکزی نقطۂ ایمان ھے جس کے ارد گرد کونین کے سب حقایق لپٹے ہوے ھیں ۔ هم نے هر طرح قابل اعتماد مصادر کی بنیاد پر حالات مرتب کیے ھیں اور کوشش کی ہے که منصب نبوت کی تقدیس کو کوئی گزند نه پہنچنے پائے ۔ یه مقاله دو مقالات سیرة اور علم سیرة نگاری کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے جن میں سیرة کی کتابوں کی درجه بندی کی گئی ھے].

نسب : ابو القاسم ، محمّد (رسول اللہ صلّی اللہ علیه و آلہٖ وسلّم) بن عبداللہ بن عبدالمطّلب (شیبة الحَمد) بن هاشم (عمرو) بن عبد مَناف (=اُلمغیرة) بن قُصَیّ (زید) بن کلاب بن مُرّة بن کعب بن لُؤَیّ بن غالب بن فِہر (قریش) بن مالک بن النَّضْر (قیس) بن کنانة، بن خُزیمة بن مدرَکة (عامر) بن اِلْیاس بن مُضَر بن نزار بن معدّ بن عَدنان ۔ [مُدرکة کے نام کے بارے میں اختلاف ھے؛ ابن حزم (جمهرة انساب العرب، ص ۱۰) نے عامر لکھا ھے، مگر ابن سعد (طبقات، ۱ : ۵۵) اور البلاذری (انساب الاشراف، ۱ : ۳۵)، ابن کثیر : (السیرة النبویة ، قاهره ۱۹۶۴ء، ۱ : ۱۸۸) وغیره نے عمرو نقل کیا ھے ؛ مدرکه کے باپ کے نام کے تلفظ میں بھی اختلاف ھے ۔ بعض نے اسے اِلْیاس پڑھا ھے (دیکھیے لسان العرب، بذیل ماده الس و یوس ؛ الزرکلی : الاعلام، بذیل ماده اِلیاس) اور بعض نے اَلْیَاس بن مُضَر، یعنی ال کو غیر لازم قرار دیا ھے (دیکھیے تاج العروس، مطبوعۂ کویت، بذیل مادۂ یئس، ائس ؛ البلاذری : انساب الاشراف، ۱: ۳۱، ۳۳؛ ابن حزم : جوامع السیرة، ص ۲ و ۳).]

اس حد تک تو نسب خود رسول اکرم صلّی اللہ علیه و آلہٖ وسلّم سے مروی ھے اور اس سے اوپر کے متعلق آپؐ نے ارشاد فرمایا ھے : کَذَبَ النَسّابُون، یعنی نسب بتانے والے جھوٹے ھیں (السهیلی: الروض الانف، ۱ : ۱۱ ؛ طبقات، ۱ : ۵۶).

[آنحضرت صلّی اللہ علیه و آلہٖ وسلّم کے نسب کے سلسلے میں عدنان تک تو سب متفق ھیں، لیکن اس سے اوپر حضرت اسمٰعیل علیه السّلام تک ماهرین انساب میں اختلاف ھے که کتنی پشتیں ھیں ۔ اس اختلاف کا سبب یه ھے که بعض نسّاب نسبت کے وقت اوپر کے صرف نامور اور مشهور آبا و اجداد کا ذکر کر دیتے ھیں اور کم مشهور افراد کو درمیان سے حذف کر دیتے ھیں ۔ اس کی مثالیں کتب اسماء الرجال میں بھی موجود ھیں ؛ چنانچه جن لوگوں نے آنحضرت صلّی اللہ

marfat.com
Marfat.com

علیہ و آلہٖ وسلم کے اجداد کا استقصا کیا ان کے ہاں تعداد زیادہ ہے اور جن حضرات نے صرف نامور اور چیدہ آبا و اجداد شمار کیے، ان کے نزدیک تعداد کم ہوگئی۔ ماہرین انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ عدنان کا نسب حضرت اسمعیل علیہ السّلام تک صحیح ہے، البتہ درمیان کے آبا و اجداد کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت اسمعیل علیہ السّلام کا زمانہ بہت بعید ہے اور اتنے دور تک کے سلسلۂ نسب میں اسما کی تعداد میں اختلاف رونما ہو جانا کوئی بعید نہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے سلسلۂ نسب کی ایک ایک کڑی، جس سے آپؐ کا سلسلۂ پیدائش مربوط ہے، نجابت و شرافت اور عزت و نیک نامی کا پیکر تھی۔ آپؐ کے سب آبا و اجداد اور امہات، یعنی والدہ ماجدہ، نانیاں اور دادیاں نہایت پاکباز، نیک اور باوقار خواتین تھیں۔ آپؐ کے تمام بزرگ شرعی نکاح سے پیدا ہوے تھے۔ آپؐ کے سارے خاندان میں کبھی کوئی شخص زنا اور بدکاری کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ آپؐ کا سارا سلسلۂ نسب محترم اور نامور بزرگوں پر مشتمل ہے۔ وہ سب کے سب سردار اور قائد تھے اور معاشرے میں بڑی معزز اور موقر حیثیت رکھتے تھے۔ شرافت نسبی آپ کی امتیازی خصوصیت ہے]۔

یہ اکیس آبا و اجداد ہیں۔ ہر ایک میں اوسطاً ۳۳ سال کا فرق سمجھیں تو ۶۹۳ سال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آگے صراحت ہوگی، آپؐ کی ولادت سنہ ۵۶۹ء [مشہور ۵۷۰ء] میں ہوئی۔ اس لیے عدنان کی ولادت ۱۲۴ قبل مسیح قرار دی جا سکتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت (السہیلی، ۱: ۱۱) ہے کہ عدنان اور اسمعیل علیہ السّلام کے مابین تیس پشتیں ہیں۔ اس میں ۹۹۰ سال کا اضافہ کریں تو ۱۶۸۳ سال ہوں گے یعنی ۱۲۱۴ ق م ان کا سال ولادت ہوگا۔ تورات (تکوین، ۱۱: ۲۶) کے مطابق تارح [=آزر] کی عمر ۷۰ سال تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ولادت ہوئی اور تکوین (۱۶:۱۶) کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی عمر ۸۶ سال کی تھی جب حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام پیدا ہوے اور حضرت اسحٰق علیہ السّلام کی ولادت کے وقت تو ان کی عمر (تکوین، ۲۱: ۵) ایک سو سال کی تھی۔ اس زمانے کے جن لوگوں کی عمریں تورات میں دی گئی ہیں وہ بکثرت صد سالہ ہیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے مذکورہ بالا اجداد میں سب ہی پہلوٹی بیٹے نہ ہوں گے۔ اس لیے آپؐ کے اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے مابین صحیح مدت بیان نہیں کی جا سکتی۔ موجودہ مغربی تحقیق میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا زمانہ ۱۸۵۰ ق م، یعنی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے ۲۴۱۹ سال قبل سمجھنا چاہیے [نیز دیکھیے: رحمۃ للعالمین، ج ۲، باب ہشتم]۔

[آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے اپنے اور اپنے خاندان کے مقام و مرتبے کی وضاحت کرتے ہوے فرمایا: اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدم یومَ القیامۃِ و لا فَخْرَ، یعنی میں قیامت کے دن اولادِ آدم کا سردار ہوں اور اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔ ایک مقام پر آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم علیہ السّلام میں سے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو منتخب فرمایا اور بنو اسمعیلؑ میں سے بنو کنانہ کو اور بنو کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کرتے ہوے فرمایا کہ میں بنی نوع انسان میں خاندان اور ذات کے اعتبار سے سب سے بہتر ہوں۔ آپؐ کے حسب و نسب اور خاندان کی شرافت و عظمت کی شہادت ابو سفیان جیسے مخالف نے بھی سر عام ہرقل کے دربار شاہی میں دی تھی۔ (دیکھیے البخاری:

marfat.com
Marfat.com

الصحیح، ۱ : ۷ تا ۸، مطبوعہ لائیڈن)].

آبا و اجداد کے کچھ حالات : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے بیٹے، حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی اولاد میں سے ہیں۔ قرآنی بیانات کے باعث ان دونوں اجداد کے متعلق بعض گتھیاں قابل ذکر ہیں؛ [اس لیے مجبوراً ہمیں اجداد کے سلسلے میں بعض اسرائیلی روایات اور تورات و انجیل کے حوالے دینے پڑے ہیں؛ ورنہ در حقیقت آپؐ کی سیرۃ اقدس آپؐ کے حالاتِ زندگی سے شروع ہوتی ہے اور اسی سے اس کا آغاز ہونا چاہیے۔ بہر حال مختصراً بعض عقدوں کا ذکر ناگزیر ہے، کیونکہ نسب کے سلسلے میں یہودی اور عیسائی مستشرقین نے بہت سی موشگافیاں کی ہیں۔]

حضرت ابراہیمؑ عراق باشندے تھے؛ ان کے باپ کا نام قرآن مجید (۶ [الانعام] : ۷۴) میں آزر، اور تورات (تکوین، ۱۱: ۲۵) کے مطابق تارح تھا (جو مغربی تحقیق میں بعض اوقات بگڑ کر یونانی میں آتر Athar ہوی ہو گیا ہے اور یہی لفظ عربی میں آزر ہے [رک بہ آزر]۔ قرآن (۱۹ [مریم] : ۴۶) کے مطابق بت پرست باپ نے ابراہیمؑ کو گھر سے نکال دیا۔ تکوین (۱۲:۱، ۵) کے مطابق، خدا کی وحی پر وہ اپنی بیوی سارہ وغیرہ کے ہمراہ کنعان (شمالی فلسطین) میں آ بسے۔ بعض سفروں میں مصر کے فرعون اور جرار Gerar کے حکمران ابیمالک کے سپاہی دونوں کو زبردستی پکڑ کر لے گئے، مگر با عزت طور پر دونوں بادشاہوں نے حضرت سارہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس واپس کرتے ہوئے بہت سے جانور اور نوکر (غلام، باندیاں) تحفے میں دیں، (تکوین، ۱۲ : ۲۰؛ ۲۰ : ۱ تا ۱۴)۔ مصری تحفے میں حضرت ہاجرہؓ بھی شامل تھیں۔ صحیح بخاری (۶۰ : ۱۱) میں اَخْدَمَھَا (بطور خادمہ کے دیا) کا لفظ آیا ہے۔ تکوین (۱۶ : ۱) میں مصری خادمہ ہاجرہ کا ذکر ہے۔ اس کی شرح میں یہودی فاضل سالوموں بن اسحق نے لکھا ہے کہ وہ فرعون کی بیٹی تھیں، اور باپ نے ان سے کہا تھا اس (ابراہیم و سارہ) کے خاندان میں تیرا بطور خادمہ رہنا تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ کسی اور جگہ (میرے محل میں) مالک بن کر رہے۔ حضرت سارہ کے اولاد نہ ہوئی، اس اثنا میں حضرت ہاجرہؓ [سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نکاح کر لیا تھا (تکوین، ۱۶ : ۳)] اور ان کے بطن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام پیدا ہوے (تکوین ۱۶ : ۱۵)۔ سوکنوں کے جھگڑے کے باعث (تکوین ۲۱: ۱۰-۱۵) [مگر فی الحقیقت امتحاناً حکم ربی سے] حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیل علیہ السّلام کو حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے صحرا میں لا چھوڑا۔ وہاں ایک فرشتے نے (تکوین، ۲۱ : ۱۹-۲۱) حضرت ہاجرہؓ کو ایک کنواں بتایا۔ اس سے کنبے کی جان بچی اور وہ صحرائے فاران میں رہنے لگے۔ بائیبل کے نقشوں میں بئر سبع فلسطین میں غزّہ کے جنوب مشرق میں، اور فاران جزیرہ نمائے سینا کے وسط میں بتائے جاتے ہیں، مگر اسلامی روایتوں میں حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ کو وہاں لا چھوڑا گیا جہاں بعد میں زمزم کا کنواں نکلا اور شہر مکہ بسا۔ بظاہر ان دونوں میں تطبیق ممکن نہیں، لیکن امام بخاری (الصحیح : کتاب الانبیاء، باب ۸) نے صراحت کی ہے کہ کعبے کے اندر جو رنگین تصویریں کھینچی گئی تھیں ان میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمعیلؑ کی تصاویر بھی تھیں اور یہ قبل از اسلام کی بات ہے۔ [بعد میں آپؐ کے حکم سے مٹا دی گئیں].

[یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بائیبل کے مرتب کرنے والوں نے حضرت اسمعیلؑ اور ان کی والدۂ محترمہ حضرت ہاجرہؓ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا ان کی نجابت، شرافت اور عظمت سے کماحقہ واقف نہیں ہونے پاتا۔ اسلامی روایات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے اولوالعزم اور برگزیدہ پیغمبر تھے۔ اللہ تعالٰی نے انہیں منصب نبوت سے نوازا اور توحید کا علم بردار

marfat.com

Marfat.com

بنا کر گمراہی اور بت پرستی سے مخلوق خدا کو بچانے کے لیے مبعوث فرمایا؛ چنانچہ انھوں نے تعلیم شریعت اور تبلیغ دین ایسے بلند مقاصد کے سلسلے میں سخت ترین مصائب برداشت کیے؛ بخوشی آتش نمرود میں کود گئے، مگر اللہ تعالیٰ نے بال بال بچا لیا۔ انھوں نے عبادت اور تبلیغ احکام الٰہی کی خاطر ترک وطن کیا۔ ان کی تین بیویاں تھیں: حضرت سارہؓ، حضرت ہاجرہؓ اور حضرت قطورہؓ۔

حضرت ہاجرہؓ کو بائیبل (کتاب تکوین) میں حضرت سارہؓ کی لونڈی بتایا گیا ہے، جو قطعاً درست نہیں اور حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد کے خلاف تعصب کی بنا پر یہ بات لکھی گئی ہے۔ اسلامی روایات کے مطابق حضرت ہاجرہؓ مصر کے شاہی خاندان سے تھیں۔ بقول القسطلانی (شرح صحیح بخاری، ۵: ۲۳۳، مطبوعہ قاہرہ) کان ابوھاجر من ملوک القبط، یعنی حضرت ہاجرہؓ کے والد قبطی بادشاہوں میں سے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ہاجرہؓ شاہان قبط کے خاندان سے تھیں (نیز دیکھیے عنایت رسول چڑیا کوٹی: النصوص الباھرۃ، در خطبات احمدیہ، ۱۶۳ تا ۱۷۷)۔ امام بخاریؒ کے ہاں یہ الفاظ ہیں: اَخْدَمَھَا ھَاجَر، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ شاہ مصر نے حضرت سارہؓ کی بزرگی اور ان پر خدائی اکرام و انعام دیکھ کر حضرت ہاجرہ کو ان کی خدمت میں دے دیا۔ یہ جملہ از راہ تواضع مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے؛ اگر معاذ اللہ حضرت ہاجرہ لونڈی تھیں تو کتاب تکوین (باب ۱۶: ۳) میں انھیں حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ کیوں لکھا ہے؟ انگریزی میں wife، عربی ترجمہ میں زوجہ اور اردو ترجمہ میں جورو (بیوی) مرقوم ہے۔ اس کے صاف اور واضح معنی یہ ہیں کہ وہ لونڈی ہرگز نہ تھیں، بلکہ وہ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی بیوی تھیں، جس طرح حضرت سارہؓ تھیں اور حضرت اسمٰعیلؑ اسی طرح بیٹے تھے جس طرح حضرت اسحٰقؑ تھے۔ حضرت ہاجرہؓ اور ان کے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کو، جن کی اولاد سے ہمارے نبی کریم حضرت محمّد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم ہیں، اللہ تعالیٰ نے بڑے انعامات سے نوازا۔ تورات میں بھی حضرت ہاجرہؓ کی اولاد کی کثرت اور حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت کی بشارت موجود ہے (دیکھیے تکوین، ۱۶: ۱ تا ۶)۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس بتائی گئی ہے (تکوین، ۱۶: ۱۶)]۔

اس پرانی تاریخ کا ایک اور واقعہ بھی بنواسمٰعیل اور بنو اسرائیل میں اختلاف کا باعث ہے اور وہ بیٹے کی قربانی کا مسئلہ ہے۔ تکوین (۲۲: ۱ تا ۲) کے الفاظ ہیں: ان باتوں کے بعد خدا نے ابراہیمؑ کو آزمانا چاہا اور کہا، تیرے بیٹے، تیرے اکلوتے، اسحٰقؑ کو جس سے تو محبت کرتا ہے، لے اور موریہ کے ملک کو جا اور اسے وہاں ایک پہاڑ پر، جو میں تجھے بتاؤں گا قربان کر۔ اسلامی روایتوں میں یہ حضرت اسمٰعیلؑ سے متعلق ہے اور قرآن مجید (۳۷ [الصّٰفّٰت]: ۱۰۱ تا ۱۱۲) کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سخت امتحان میں کامیاب ہونے کی وجہ سے بطور انعام ایک مزید بیٹے، حضرت اسحٰق کی ولادت کی بشارت دی گئی۔

تورات کی داخلی شہادت بھی قرآن مجید کی تائید کرتی ہے۔ اس کے مذکورۂ بالا اقتباس میں اکلوتے بیٹے کا لفظ ہے اور حضرت اسحٰقؑ پہلوٹھی بیٹے نہیں، دوسرے بیٹے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کی وفات تک (تکوین، ۲۵: ۹) دونوں بھائی زندہ تھے۔ اس لیے کسی وقت بھی اسحٰق اکلوتے بیٹے نہ بنے۔ خروج (۱۳: ۲، ۱۲ اور ۲۲: ۲۹)، نیز اعداد (۳: ۱۳؛ ۸: ۱۷) وغیرہ کے مطابق پہلوٹھی بیٹا قربانی میں دینا چاہیے۔ تورات کو بھی انکار نہیں کہ اسمٰعیلؑ پہلوٹھی بیٹے تھے۔

[حاصل کلام یہ ہے کہ بائیبل کے مطابق

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

قربانی کے لیے اکلوتا بیٹا پیش کیا جاتا تھا اور اکلوتا بیٹا حضرت اسمٰعیلؑ ہیں نہ کہ حضرت اسحٰقؑ۔ کتاب تکوین کی تصریحات ملاحظہ ہوں : (۱) اور جب ابرام (ابراہیمؑ) کے لیے ہاجرہ سے اسمٰعیلؑ پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا (تکوین ۱۶ : ۱۶)؛ (۲) اور جب اس کا بیٹا اسحٰقؑ پیدا ہوا تو ابراہیمؑ سو برس کا تھا (تکوین ۲۱ : ۵ ؛ نیز دیکھیے کتاب تکوین، ۱۷ : ۲۴ و ۲۵ ؛ ۲۱ : ۴ و ۵)۔ ان سب حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت اسحٰقؑ سے تیرہ چودہ برس بڑے تھے اور اکلوتے بیٹے صرف حضرت اسمٰعیلؑ تھے اور یہی مفہوم و مقصود ہے اسلامی روایات کا (دیکھیے ابن القیم : زاد المعاد، ۱ : ۱۶؛ ابن کثیر : البدایة والنہایة، ۱ : ۱۹۱؛ شبلی : سیرة النبی، جلد اول)]۔

حضرت ابراہیمؑ کے کنعان آنے پر خدا نے (تکوین ۱۲ : ۷) ان سے وعدہ کیا کہ ان کی پناہ گاہ، سارا کنعان ہمیشہ کے لیے ان کے اور ان کی اولاد کے قبضے میں دے دے گا۔ پھر اسمٰعیلؑ کی ولادت پر اس کی تجدید بھی کی (تکوین، ۱۷ : ۸)۔ اس وعدے کو بنی اسرائیل سے مختص کر دینا بعد کی تحریف معلوم ہوتی ہے۔

[حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو مکّۂ مکرمہ میں آباد کیا اور وہ انھیں ملنے کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم پا کر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ مل کر بیت اللہ تعمیر کیا۔ کعبہ شریف کی تعمیر در اصل حضرت آدمؑ نے کی تھی۔ طوفان نوحؑ کے وقت یہ عمارت منہدم ہوگئی تھی۔ حضرت جبریلؑ کی نشان دہی پر حضرت ابراہیمؑ نے از سر نو عمارت بنائی۔ تعمیر کعبہ کے دوران میں باپ بیٹا یہ دعا کرتے تھے : رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۲ [البقرة] : ۱۲۷)، یعنی اے ہمارے رب ! ہمارا یہ عمل قبول فرما، تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ آج بھی مقام ابراہیمؑ اور منیٰ کی قربان گاہ اس زمانے کی یادگاریں ہیں]۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی خاطر جب خدا نے چاہ زمزم پیدا کیا تو قبائل جُرہم اور اِیاد کے خانہ بدوش عرب حضرت ہاجرہؓ کی اجازت سے وہاں آ بسے۔ [کعبے کی تولیت حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد کے ہاتھ میں رہی۔ ایک عرصے کے بعد] بنو جرہم اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں تولیت کعبہ پر جھگڑا ہوا [تو کعبے کی خدمت اور تولیت اولاد اسمٰعیلؑ اور بنو جرہم میں تقسیم ہوگئی]۔ جب بنو خزاعہ نے لڑ کر مکے پر قبضہ کیا تو ایک مدت تک کعبے کی تولیت بھی ان کے پاس رہی ؛ لیکن بنو اسمٰعیلؑ بہرحال مکے ہی میں مقیم رہے۔ ان کے ایک فرد کلاب نے شمالی عرب میں اپنے ایک سفر کے دوران میں قبیلہ قضاعہ میں شادی کی۔ اس سے قُصَیّ [رَکْ بآن] پیدا ہوے۔ [قُصَیّ جوان ہوکر اپنے قبیلے میں واپس آ گئے۔ اس زمانے میں حُلَیْل بن حُبْشِیَّة بن سَلول بیت اللہ کا متولّی و حاجب تھا۔ اس نے اپنی بیٹی حُبّی بنت حُلَیْل کی شادی قصی کے ساتھ کر دی۔ حُلَیْل بوڑھا ہوگیا تو اس نے خانۂ کعبہ کی کنجیاں اپنی بیٹی حُبّی کے سپرد کر دیں]۔ اس طرح بنو اسمٰعیل کو مکرر کعبے کے انتظام میں شرکت ملی۔ خسر کی وفات کے بعد قصی نے اپنے ننھیال (بنو قضاعہ) کی مدد سے بنو خزاعہ کو مجبور کیا کہ وہ شہر چھوڑ کر مضافات میں جا بسیں (البلاذری : انساب الاشراف، ۱ : ۴۹ تا ۵۰)۔ السہیلی (۱ : ۹۷) کے مطابق خزاعی سردار الحارث بن مُضاض الاصغر (قصی کے ہمعصر ؟) نے کعبے کے قیمتی چڑھاووں کو چاہ زمزم میں ڈال کر اسے پاٹ دیا اور کنواں صدیوں غائب رہا۔ [قُصَی کو بڑا اقتدار حاصل ہوا۔ اس کی اولاد بہت پھلی پھولی اور وہ قوم کا بہت بڑا سردار تسلیم کیا گیا]۔

marfat.com
Marfat.com

قصی نے مکے میں ایک شہری مملکت کا آغاز کیا ۔ وہاں دارالندوہ (پارلیمنٹ) اور رفادہ (ٹیکس) کے نئے ادارے قائم کیے ، لیکن اپنی وفات پر حکومت اپنے بچوں میں بانٹ دی ۔ کسی کو کعبے اور اس کی چابی کی رکھوالی دی ، کسی کو فوج کی قیادت ، کسی کو ٹیکس کا آمد و خرچ ۔ بعد کی نسلوں میں انتظامات کی مزید تقسیم در تقسیم ہوئی ۔ آغاز اسلام کے وقت وہاں دس سرداروں کی ایک مجلس کار فرما نظر آتی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے محمد حمید اللہ : "شہری مملکت مکہ"، در ماہنامہ معارف ، اعظم گڑھ ، جنوری فروری ۱۹۴۲ء) ۔ [قصی کے چار بیٹے تھے، جن میں عبد مناف بڑے نامور اور صاحب عزت و شرف گزرے ہیں] ۔ عبد مناف کے بھی چار بیٹے تھے، جن میں ہاشم ناموری اور شہرت میں سب پر سبقت لے گئے۔

ہاشم کا اصلی نام عمرو تھا ۔ وہ بڑے دولت مند رئیس ہونے کے ساتھ جود و سخاوت اور مروت و احسان میں بھی بے مثال تھے ۔ ہاشم کہلانے کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے عہد میں مکۂ مکرمہ میں سخت قحط پڑ گیا۔ وہ فلسطین جا کر آٹے کی بوریاں بڑی تعداد میں اونٹوں پر لاد کر لائے ۔ بہت سے اونٹ ذبح کر کے شوربا تیار کیا اور روٹیاں پکا کر اس شوربے میں بھگو بھگو کر تمام اہل شہر کو کھانا کھلاتے رہے ۔ عرب ایسے کھانے کو ھشیم اور ثرید کہتے ہیں ۔ یہ سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا اور اسی وجہ سے ان کا نام ہاشم پڑ گیا۔ وہ حاجیوں کی خدمت اور مہمان نوازی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے ۔ اس سخاوت اور فیاضی سے ہاشم کا نام چار دانگ عرب میں مشہور ہو گیا۔ ذاتی اثر و رسوخ اور وجاہت کی وجہ سے ان کی دوسرے ممالک کے درباروں میں بھی رسائی تھی ۔ قریش کے تجارتی قافلے بیرونی ممالک میں آتے جاتے تھے ؛ چنانچہ] انھوں نے تقریباً ۴۶۶ء میں فلسطین کا سفر کیا اور مقامی (بوزنطی) افسروں سے اجازت حاصل کی کہ مکی کاروان رومی علاقے میں تجارت کے لیے آیا کریں ۔ اس کے بعد راستے کے عرب قبائل سے بھی عبور و مرور کے لیے معاوضہ دے کر معاہدے کیے ۔ پھر مکے سے ایک بڑا قافلہ فلسطین گیا ۔ راستے میں ہاشم نے مدینے میں [بنو نجّار کی] سلمٰی [بنت عمرو بن زید النجاریة] سے شادی کی، مگر آگے گئے تو غزہ پہنچنے پر اچانک وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے ۔ ہاشم کی وفات پر ان کے بڑے بھائی مطلب نے یمن کا، دوسرے بھائی عبد شمس نے حبشہ کا اور تیسرے بھائی نوفل نے عراق کا سفر کر کے وہاں کے حکمرانوں سے بھی اپنے تجارتی کاروانوں کے آنے جانے کی اجازتیں حاصل کیں اور اس طرح مکۂ مکرمہ بین الممالک تجارت کا مرکز بن گیا (تفصیل کے لیے دیکھیے ارمغان ماسینوں (Massignon) اور اس کا ملخص ترجمہ البلاغ، کراچی، جون ۱۹۶۸ء، بعنوان "ایلاف : جاہلیت میں عربوں کے معاشی و سفارتی تعلقات")؛ [نیز رک بہ ایلاف] ۔ اس سے وہاں کی عبادت گاہ کعبہ کی زیارت و حج عام ہو گئے اور مکی زبان بھی ملک کے چاروں اطراف میں زیادہ سمجھی جانے لگی۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان قریشی کاروانوں اور سالانہ میلوں نے ، جن میں قریش کو سرمایہ دارانہ تجارت، نیز قافلوں کی حفاظت کے لیے بدرقوں (خفارہ) کے انتظام کے سلسلے میں بہت اہم حیثیت حاصل تھی ، جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی وفاق (فیڈریشن) پیدا کر دیا (اور مکہ مکرمہ اس کا مرکز بنا)، جس نے سیاسی مرکزیت کا راستہ کھولا جو کہ اسلام کا کارنامہ بننے والا تھا ۔

ہاشم کی وفات (۴۹۷ء) کے چند ماہ بعد ان کی بیوی سلمٰی کے ہاں مدینۂ منورہ میں شیبہ (عبدالمطلب) پیدا ہوئے ۔ [البلاذری (انساب الاشراف، ۱: ۶۴) وغیرہ ہاشم کی وفات عبدالمطلب کی پیدائش سے پہلے بیان کرتے ہیں، لیکن ابن سعد اور ابن خلدون وغیرہ نے لکھا ہے کہ عبدالمطلب اپنے باپ ہاشم کی وفات سے پہلے

marfat.com
Marfat.com

پیدا ہو چکے تھے (طبقات، ۱: ۷۹؛ بیروت ۱۹۶۰ء؛ ابن خلدون: تاریخ، اردو ترجمہ از شیخ عنایت اللہ، ۱: ۲۷۶)۔ بچے کے سر میں کچھ بال سفید تھے، اس لیے اس کا نام شیبہ (بوڑھا) رکھا گیا۔ تقریباً سات برس کی عمر تک عبدالمطلب اپنی والدہ کے پاس اپنے ننھیال میں رہے۔ پھر ان کے چچا مُطّلب انھیں مکۂ مکرمہ اپنے پاس لے آئے۔ یاد رہے کہ ہاشم کی وفات کے بعد رفادہ و سقایۃ، یعنی حُجّاج کی مہمان نوازی اور پانی پلانے کی خدمت، مطّلب کے سپرد ہوئی تھی۔ مطّلب بھی اپنے بھائی ہاشم کی طرح اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ بقول ابن خلدون، مُطّلب بڑی عزت و فضیلت کے مالک تھے اور ان کی سخاوت کی وجہ سے قریش انھیں الفضل، یعنی پیکر فضیلت کہا کرتے تھے۔

مُطّلب کی وفات کے بعد بنو ہاشم کے معاملات کو عبدالمطلب نے سنبھالا اور رفادہ و سقایۃ کی خدمت بطریقِ احسن انجام دینے لگے۔ انھوں نے یمن اور حبشہ کے درباروں میں اپنی قوم کی نمائندگی بھی کی]۔

ان کی ملکیت میں ایک قدرتی چشمہ بھی تھا (البلاذری: انساب الاشراف، ۱: ۷۰-۷۵)۔ بات یہ ہوئی ایک دن خواب میں اشارہ پایا کہ فلاں جگہ کھود کر صدیوں سے غائب شدہ چاہ زمزم برآمد کریں۔ اس کے اندر سے دفینہ بھی ملا جو کعبے کے پرانے چڑھاووں پر مشتمل تھا (ابن ہشام، ص ۹۱ بعد)۔ چاہ زمزم کی ملکیت سے سقایۃ الحاج کے عہدے کی اہمیت بڑھی اور ان کی وجاہت میں اضافہ بھی ہوا۔ عبدالمطلب اور مکی رؤسا ابرھہ حبشی (اصحاب الفیل) کے مکے پر حملے کے خلاف کچھ نہ کر سکے، لیکن عبدالمطلب کے سر برآوردہ ہونے کا پتا اس سے چلتا ہے کہ جب ابرھہ قدرتی حوادث کا شکار ہو کر اور کثیر جانی نقصان کے ساتھ بھاگا اور پھر جلدی ہی یمن میں مر بھی گیا اور قومی آزادی کی کوشش میں یمن کو فی الجملہ کامیابی حاصل ہوئی، حبشیوں کو نکال باہر کیا گیا اور سیف بن ذی یزن [رکّ بآن] آزاد یمن کا بادشاہ بن گیا تو اس پر مبارکباد دینے کے لیے مکے سے جو وفد گیا اس کی طرف سے اظہار مطلب کا کام جناب عبدالمطلب نے انجام دیا تھا (ابن حبیب: المنمق، ص ۵۴۰؛ ابن عبد ربہ: العقد الفرید، ۱: ۱۷۱؛ الاغانی ۲۱: ۵۷ بعد)۔ عبدالمطلب کو شاہی تحفوں میں خضاب بھی ملا، جس سے اہل مکہ ناواقف تھے (البلاذری: انساب، ۱/۶۵-۶۶)۔

[آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ و سلم کے دادا عبدالمطلب اپنے اسلاف کی طرح بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ جود و سخا اور فیاضی میں سارے عرب میں مشہور تھے۔ بیت اللہ کے زائرین کی خدمت کے لیے ہر وقت سرگرم عمل رہتے، بےکسوں اور مظلوموں کی فریاد رسی اور اعانت میں کبھی سستی نہ کرتے اور انسانوں کے علاوہ جانوروں کے لیے بھی خوراک مہیا کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ اخلاق فاضلہ اور محاسن عالیہ کے پیکر تھے اور اخلاق رذیلہ اور پست خیالات سے خود بھی ہمیشہ بچتے اور اپنی اولاد کو بھی ان سے بچنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ان کی دینداری اور پرہیزگاری بھی قابلِ ذکر ہے۔ آخری عمر میں بت پرستی اور شرک کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ملت ابراہیمی اختیار کرکے پکے موحد بن گئے تھے۔ شراب نوشی، زناکاری، ظلم و سرکشی اور برہنہ ہو کر طواف کعبہ کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مزید برآں وہ مستجاب الدعوات بھی تھے۔ ان اوصاف و کمالات کی بنا پر لوگ انھیں الفیاض اور شیبۃ الحمد کے معزز القاب سے یاد کیا کرتے تھے۔ (محمود شکری الآلوسی: بلوغ الارب، ۱: ۳۵۵)]۔

عبدالمطلب کو زمزم کی ملکیت کے لیے بڑی دشواریاں پیش آئیں، (مگر اہل شہر امن پسند تھے اور اسے قبول کرلیا کہ کسی غیرجانبدار حکم سے فیصلہ

marfat.com
Marfat.com

کرائیں) ۔ اس پریشانی کے زمانے میں منت مانی کہ اگر خدا نے مجھے دس بیٹے دیے اور وہ بلوغ کو پہنچے تو میں ان میں سے ایک کو کعبے میں لے جا کر اللہ کے حضور میں قربان کر دونگا (ابن ہشام، ص ۱ : ۱۶۰ ببعد؛ البلاذری : انساب، ۱ : ۹۷) ۔ جب دسویں بیٹے بھی بلوغ کو پہنچ گئے تو جناب عبدالمطلب نے منت یاد کی اور قرعہ ڈال کر قربانی کے بیٹے کا انتخاب کیا۔ قرعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونے والے باپ جناب عبداللہ کے نام نکلا۔ عبدالمطلب کا عزم دیکھ کر رشتہ داروں اور دوستوں نے مداخلت کی اور انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ کسی کاھنہ یا عرافہ سے حل معلوم کیاجائے؛ چنانچہ (بروایت السہیلی) قطبہ یا سجاح نامی کاھنہ سے ملنے یثرب (مدینہ) گئے۔ اس زمانے میں وہ خیبر میں تھی ۔ وھاں پہنچے تو اس نے قصہ سن کر مشورہ دیا کہ بیٹے اور رواجی خون بہا کے مابین قرعہ ڈالو اور خون بہا کی مقدار میں اضافہ کرتے جاؤ تا آنکہ قرعہ خون بہا پر نکلے۔ آخر دس کی جگہ سو اونٹوں پر قرعہ بیٹے کی بجائے خون بہا پر نکلا ۔ جناب عبدالمطلب نے احتیاطاً تین بار قرعے کی تکرار کرکے اطمینان کر لیا کہ واقعی وہ اللہ کو منظور ہے ۔

[جناب عبدالمطلب کثیر الاولاد تھے۔ ان کی حسب ذیل چھے بیویاں تھیں، جن کے بطون سے بارہ اور بقول ابن سعد تیرہ بیٹے اور چھ بیٹیاں پیدا ہوئیں: (۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دادی فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم ؛ اولاد : عبداللہ ، زبیر ، ابو طالب (عبد مناف) ، عبدالکعبہ، ام حکیم البیضاء ، عاتکہ، برہ، امیمہ، اروی؛ (۲) بنو عامر بن صعصعہ کی صفیہ بنت جنیدب بن حجیر؛ اولاد : الحارث؛ (۳) ھالۃ بنت وھیب بن عبد مناف بن زھرہ بن کلاب؛ اولاد : حضرت حمزہ رض، حضرت صفیہ رض، المقوّم، حَجل؛ (۴) نُتَیلہ بنت جناب بن کلیب؛ اولاد : عباس رض، ضرار، قُثَم؛ (۵) لُبنٰی بنت الھاجر؛ اولاد : ابولھب (جمھرۃ انساب العرب، ص ۱۵) ؛ (۶) مُمَنَّعۃ بنت عمرو بن مالک؛ اولاد : الغَیداق (مصعب) (انساب الاشراف، ۱ : ۱۷ ؛ طبقات، ۱ : ۹۳)۔

عبدالمطلب نے خاصی طویل عمر پائی ۔ ان کا ایک شاندار کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے زمزم کا چشمہ دوبارہ کھود کر جاری کیا ۔ اس میں سے سونے کے دو ھرن اور چند تلواریں نکلیں۔ ھرنوں سے کعبے کی زینت کے لیے سونے کا پترا تیار کیا اور تلواروں سے کعبے کے لیے لوھے کا دروازہ بنایا ۔ کعبے کی زیبائش کے سلسلے میں سونا استعمال کرنے کے شرف کی اولیت جناب عبدالمطلب کو حاصل ھوئی ۔ عبدالمطلب ھی نے زمزم کے ساتھ ایک حوض بنایا تاکہ لوگ اس سے پانی پی سکیں۔

عبدالمطلب کے بیٹے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے والد محترم جناب عبداللہ اور آپ ؑ کی پھوپھی ام حکیم البیضاء جڑواں (توأم) پیدا ھوے تھے ۔ جناب عبداللہ اپنے باپ کے بڑے لاڈلے اور محبوب بیٹے تھے ۔ وہ حسن سیرت اور حسن صورت کا بڑا حسین امتزاج تھے ۔ ان کے اخلاق حمیدہ، اوصاف جمیلہ اور پاکبازی کا شھرہ تھا ۔ اٹھارہ سال (اور بعض نے پچیس سال یا کم و بیش بھی لکھے ھیں) کی عمر میں عبدالمطلب نے بنو زُھرہ کی نیک اور پاکباز خاتون حضرت آمنہ بنت وھب بن عبد مناف بن زھرہ بن کلاب بن مُرّۃ سے جناب عبداللہ کا نکاح کر دیا ۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت آمنہ کے دادا عبد مناف اور عبدالمطلب کے دادا عبد مناف دونوں الگ الگ شخصیتیں ھیں ۔ اول الذکر عبد مناف بن زھرہ ھیں اور ثانی الذکر عبد مناف بن قصی ھیں ۔ قصی اور زھرہ دونوں بھائی اور کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب کے بیٹے ھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ددھیال اور ننھیال دونوں کلاب بن مرّہ پر مل جاتے ھیں ۔

marfat.com
Marfat.com

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی دادی کا نام فاطمہ بنت عمرو بن عائذ اور نانی کا برّہ بنت عبد العزّی بن عثمان تھا ۔ آپ؏ کے نانا وھب بن عبد مناف کی والدہ کا نام ھند بنت ابی قیلہ (وجز بن غالب تھا (انساب الاشراف ، ۱ : ۹۱) ۔ آپ؏ کے نانا وھب بنو زھرہ کے نامور اور معزز سردار تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ طہارت نفس، شرافت نسب، عزت و وجاھت، عفت و عصمت اور پاکبازی میں بے مثال تھیں اور اپنی قوم میں سیدۃ النساء کے لقب سے مشہور تھیں ۔ بقول ابن کثیر (السیرۃ النبویۃ ، ۱ : ۱۷۷)، وَ ھِیَ یومئذٍ سیدۃُ نساءِ قومِھا، یعنی حضرت آمنہ اس وقت اپنی قوم میں سیدۃ النساء تھیں اور بقول الطبری (تاریخ، ۲ : ۱۷۳)، وھی یومئذٍ افضل امراۃ من قریش، یعنی حضرت آمنہ اپنے زمانے میں قریش کی سب سے زیادہ فضیلت مآب اور محترم خاتون تھیں۔ ددھیال اور ننھیال دونوں کے اعتبار سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم عرب کے بہترین قبیلے اور بہترین قوم میں سے تھے ۔

نکاح کے بعد جناب عبداللہ قریش کے دستور کے مطابق چند روز اپنے سسرال میں رہنے کے بعد اپنی زوجہ سیدہ آمنہ کو لے کر اپنے گھر چلے آئے ۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد جناب عبداللہ تجارت کے سلسلے میں قریش کے ایک قافلے کے ساتھ ملک شام میں گئے اور غزہ سے واپس گھر آرھے تھے کہ راستے میں بیمار ھو گئے ۔ راستے میں یثرب (مدینہ منورہ) پڑتا تھا اور وھاں ان کے والد عبدالمطلب کے رشتے دار (اخوال) بنو عدی بن النّجار رھتے تھے ۔ حضرت عبداللہ بحالت بیماری ان کے ھاں ٹھیر گئے ۔ قافلے والوں نے مکۂ مکرمہ پہنچ کر عبدالمطلب کو جناب عبداللہ کی علالت اور مدینے میں رک جانے کے بارے میں اطلاع دی ۔ عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو جناب عبداللہ کے پاس مدینے بھیجا ۔ حارث بڑی تیزی سے منزلیں طے کرتا ھوا مدینے پہنچا تو بنو عدی بن النجار نے اسے جناب عبداللہ کی علالت کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ وفات پا چکے ھیں اور یہ کہ انھیں دارالنابغہ میں دفن کیا جا چکا ھے ۔ حارث نے واپس مکے آکر اپنے باپ کو حالات سے آگاہ کیا ۔ پردیس میں جوان بیٹے کی موت نے عبدالمطلب کو محزون و مغموم کر دیا ۔ جوان عبداللہ کی وفات سے سارا خاندان رنج و ملال اور غم و اندوہ کا شکار ھو گیا ۔ حسن صورت اور حسن سیرت کا مجسمہ، جس سے شادی کرنے کے لیے مکے کی کئی خواتین بے قرار تھیں، دنیا سے اچانک عالم شباب میں رخصت ھوگیا۔ سیدہ آمنہ پر یہ اندوھناک اور دلخراش خبر سن کر کیا گزری ھوگی ، جن کا رفیق زندگی شادی کے چند ماہ بعد ھی انھیں ھمیشہ کے لیے غمزدہ اور افسردہ چھوڑ گیا ؛ مگر سیدہ آمنہ صبر و رضا اور ھمت و استقامت کا پیکر تھیں ۔ اللہ تعالی نے انھیں خاتم النبین سیدالمرسلین، رحمۃ للعٰلمین کی امومت کا شرف بخشنا تھا ۔ راضی برضائے الٰہی ھوکر وہ صبر و شکر کی مثال بن گئیں ۔ جناب عبداللہ کی وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی پیدائش سے تقریباً سات ماہ قبل ھوئی ۔ وفات کے وقت جناب عبداللہ کی عمر اٹھارہ برس تھی، مگر الواقدی نے پچیس سال لکھی ھے (طبقات، ۱ : ۹۹ ؛ ابن الجوزی : الوفاء، ۱ : ۸۹) ۔ کتب سیرت میں ایسی روایات بھی موجود ھیں جو جناب عبداللہ کی وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کے بعد (باختلاف مدت) بیان کرتی ھیں (دیکھیے البلاذری: انساب الاشراف، ۱ : ۹۲؛ الطبری، ۱ : ۹۸) ۔ ابن سعد نے طبقات (۱ : ۱۰۰) میں مختلف روایات ذکر کرنے کے بعد وفات قبل از ولادت ھی کو صحیح قرار دیا ھے ۔

آپ؏ کی ولادت سے پہلے ایک اور اھم واقعہ

marfat.com
Marfat.com

پیش آیا اور وہ تھا اصحاب الفیل [رک بآن] کا مکۂ مکرمہ پر حملہ ۔ یمن کے حبشی حاکم ابرھہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت سے پچاس پچپن دن پہلے ماہ محرم میں ھاتھیوں کے ساتھ بلدالحرام پر حملہ کیا تھا ۔ عربوں کے ھاں اس سال کو عام الفیل کہتے ھیں اور ایک عرصے تک یہی تقویمی سال شمار ھوتا رھا ۔

ولادت نبوی : ھمارے رسول مقبول حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت با سعادت موسم بہار میں دو شنبہ کے دن ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ عام الفیل/۵۷۱ء کو مکہ مکرمہ میں ھوئی ۔ تاریخ انسانیت میں یہ دن سب سے زیادہ با برکت، سعید اور درخشاں و تابندہ تھا ۔ آپؐ کی ولادت کے سلسلے یہ بات قطعی اور یقینی ھے کہ ربیع الاول کا مہینہ اور دو شنبہ کا دن تھا اور وقت بعد از صبح صادق و قبل از طلوع آفتاب۔ دو شنبہ کا دن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مبارک زندگی میں بڑی اھمیت کا حامل ھے ۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم دو شنبہ کو پیدا ھوے؛ دو شنبہ کے دن آپؐ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا؛ دو شنبہ کو مکے سے مدینے کو ھجرت کے لیے نکلے اور دو شنبہ کو آپؐ مدینے میں (شاید قُباء مراد ھے جو مضافات مدینہ میں ھے) تشریف فرما ھوے ؛ دو شنبہ کے دن آپ نے اس دار فانی کو خیر باد کہا اور دو شنبہ کے دن ھی آپؐ نے حجراسود کو (۳۵ برس کی عمر میں) بیت اللہ میں نصب فرمایا تھا (ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۱۹۸) ۔ ایک روایت میں دو شنبہ کے ساتھ ۱۲ ربیع الاول کا بھی ذکر ھے اور ساتھ ھی معراج نبوی کا دن بھی دو شنبہ بتایا گیا ھے ۔ (کتاب مذکور، ۱ : ۱۹۹) ۔ جمہور کے نزدیک ولادت مبارک کی تاریخ قمری حساب سے ۱۲ ربیع الاول ھے، مگر کتب سیرت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کے سلسلے میں اور تاریخیں بھی مذکور ھیں ۔ شبلی نعمانی نے سیرت النبی (۱ : ۱۷۱) میں مصر کے مشہور ھیئت دان محمود پاشا فلکی کی تحقیقات کے پیش نظر ۹ ربیع الاول/۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو ترجیح دی ھے ۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے اپنی کتاب رحمۃ للعلمین (۱ : ۴۰) میں آپؐ کی پیدائش ۹ ربیع الاول عام الفیل / ۲۲ اپریل ۵۷۱ء / یکم جیٹھ ۶۲۸ بکرمی قرار دی ھے ۔ اس وقت شاہ ایران نوشیروان کے جلوس تخت کا چالیسواں سال تھا اور اسکندر ذوالقرنین کی تقویم کی رو سے سنہ ۸۸۲ تھا ۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق عیسوی تاریخ ۱۷ جون ۵۶۹ء (دیکھیے *Muhammad Rasulullah*، ص ۱ ، کراچی ۱۹۷۹ء ؛ وھی مصنف ، در *Journal of Pak. Historical Society*، ۱۹۶۸ء کراچی ، ۱۶ : ۲۱۶ تا ۲۱۹) ، نیز ۵۷۰ء (وھی منصف : *Le Prophete de l'Islam*، ۱ : ۳۷، پیرس ۱۹۵۹ء) قرار پاتی ھے].

تاریخ بڑے لوگوں، خاص کر انبیاء کی ولادت کے وقت عام طور پر عجیب و غریب واقعات کے پیش آنے کا بھی ذکر کرتی ھے ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت مبارک سے پہلے بھی اسی قسم کی روایات ملتی ھیں ۔ [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت مبارک سے پہلے آپؐ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ نے عجیب و غریب خواب دیکھے، جن سے آپؐ کی عظمت و جلالت پر روشنی پڑتی ھے ۔ جب آپؐ شکم مادر میں ٹھہرے تو سیدہ آمنہ نے ایک نور دیکھا جو شام کے محلات کو روشن کر رھا تھا۔ یہی نور آپؐ کی ولادت کے وقت انھوں نے فی الواقع بچشم خود ملاحظہ کیا ۔ علاوہ ازیں جو خواتین آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت با سعادت کے وقت سیدہ آمنہ کے پاس موجود تھیں، مثلاً عثمان بن ابی العاص کی والدہ فاطمہ بنت عبداللہ، وہ بیان کرتی

marfat.com
Marfat.com

ہیں کہ اس مبارک ساعت میں تمام گھر نور سے بھر گیا ۔ اسی طرح حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی والدہ الشّفّاء کہتی ہیں کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت کے وقت بطور دایہ (قابلۃ) خدمات انجام دیں اور کسی کو یہ کہتے سنا کہ آپؐ سے ایسا نور روشن ہوا جس سے روم کے محلات نظر آئے (ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۰۶، ۲۰۷ ؛ ابن الجوزی : الوفاء باحوال المصطفیٰ، ۱ : ۹۴، ۹۵) ۔ حافظ ابن حجر العسقلانی (فتح الباری، ۶ : ۴۲۶) نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ آپؐ کی ولادت کے وقت ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر پڑے، آتش کدے بجھ گئے اور بحیرہ ساوہ (طبریہ) خشک ہو گیا (نیز دیکھیے ابن ہشام : سیرۃ؛ ابن الجوزی : الوفاء، ۱ : ۹۷؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کے بارے میں آیات و نشانات اور یہود یثرب کی پیش گوئیوں، نیز راہبوں اور عیسائی مذہبی راہنماؤں کے اقوال و افکار کے لیے دیکھیے ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۱۱ تا ۲۲۱)] ۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل اہم واقعات رونما ہوئے : (۱) کسریٰ نے ہولناک خواب دیکھا جس میں اس کی حکومت کی بربادی اور اسلامی فتوح کی پیشین گوئی تھی ؛ مزید برآں اسی زمانے میں ایران میں ایک زلزلہ آیا جس میں قصر شاہی کے کنگرے گر گئے ، پارے تخت میں صدیوں سے جلتا ہوا آتشکدہ بجھ گیا ، ایک جھیل سوکھ گئی ، ایک صحرا میں ایک ندی پیدا ہو گئی، وغیرہ (ابن ہشام)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ولادت کے سلسلے میں سب سے زیادہ نمایاں وہ طویل روایت ہے جو الزرقانی نے نقل کی ہے (دیکھیے شرح المواھب، ج ۱)۔

عالم مثال کے ان مظاہر یا مکاشفات میں واقعات کا مطالعہ کرنے والے کے لیے کافی غذائے فکر ہے ۔ دنیا کے دو بڑے ممالک کے سربراہوں، یعنی قیصر روم اور کسریٰ ایران کو خواب میں تنبیہ کی گئی کہ اپنی اصلاح کر لو ۔ ان کے لیے یہ خواب نہ صرف ان کے ظالمانہ طرز حکومت کے اختتام کی دھمکی تھی ، بلکہ ان کے (عیسائی اور مجوسی) دینوں میں اس وقت انسانی عناصر نے جو روز افزوں دخل پا لیا تھا اس پر یہ خدا کی ناراضی کا اعلان بھی تھا ۔ ان "بڑوں" کو تقریباً نصف صدی کی مہلت دی گئی ۔ جب وہ درست نہ ہوے تو چشم زدن میں دونوں سلطنتیں اور دونوں دین گویا ناپید کر دیے گئے ۔

بت اوندھے گرے ۔ یہ سارے ہی بت تھے — خدا کو نہ ماننے والوں کے بھی، خدا کی خدائی میں غیروں کو شریک کرنے والوں کے بھی اور خدائے کائنات کو ایک خانوادے کے افراد سے مختص کرنے والوں کے بھی ۔ عہد نبوی اور خلافت راشدہ ہی میں نہیں، آج بھی سارے ادیان اسلام ہی کو اپنا واحد اور سب سے بڑا حریف سمجھتے ہیں — چاہے شیوعیت ہو یا نصرانیت یا یہودیت ۔

[جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی ولادت کی اطلاع آپؐ کے معمّر دادا جناب عبدالمطلب کو دی گئی تو وہ بہت خوش ہوے ، کیونکہ آپؐ ان کے مرحوم پیارے فرزند جناب عبداللہ کی یادگار تھے۔ اپنے نوجوان بیٹے کی اچانک وفات سے ضعیف العمر باپ کو جو شدید صدمہ ہوا تھا ، آپؐ کی ولادت سے ایک حد تک اس کا ازالہ ہو گیا ۔ جناب عبدالمطلب کے دوسرے بیٹوں کو بھی بڑی خوشی ہوئی۔ آپؐ کے چچا ابولہب [رک باں] کی لونڈی ثُوَیبہ نے جب آپؐ کی ولادت کی خوش خبری اپنے مالک کو سنائی تو ابولہب نے خوش ہوکر اسے آزاد کر دیا ۔ عبدالمطلب خوشی خوشی پوتے کو دیکھنے کے لیے گھر آئے ۔ آپؐ کو گود میں اٹھا کر یُمن و برکت کے لیے خانۂ کعبہ میں لائے اور آپؐ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں ۔ پھر اللہ تعالیٰ کا شکر

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

ادا کرتے ہوئے آپؐ کی والدہ ماجدہ کے پاس واپس لے آئے۔ سیدہ آمنہ نے انہیں ان خوابوں سے بھی آگاہ کیا تھا جو سیدہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش سے پہلے دیکھے تھے (ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۰۸، ۲۲۴؛ ابن الجوزی: الوفاء باحوال المصطفیٰ، ۱: ۹۵، ۹۶)۔

دستور کے مطابق سب سے پہلے آپؐ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ نے آپؐ کو تقریباً سات روز تک دودھ پلایا۔ اس کے بعد چند روز تک ثویبہ (مولاۃ ابی لھب) نے آپؐ کو دودھ پلایا اور یہ واقعہ حلیمہ سعدیہ [رک باں] کی سپردگی سے پہلے کا ہے۔ اس وقت ثویبہ کی گود میں ان کا بیٹا مسروح تھا۔ اس سے قبل وہ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب [رک باں] کو بھی دودھ پلا چکی تھیں۔ پھر ابو سلمہ عبداللہ بن عبدالاسد المخزومی کو بھی دودھ پلایا تھا۔ اس طرح مسروح، حضرت حمزہؓ اور حضرت ابو سلمہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے رضاعی بھائی ٹھیرے۔ قیام مکہ کے دوران میں، جب کبھی وہ آپؐ سے ملنے آتیں تو آپؐ اور حضرت خدیجہؓ دونوں ان کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے (الوفاء باحوال المصطفیٰ، ۱: ۹۷)۔ ہجرت کے بعد بھی آپؐ اپنی اس رضاعی ماں کے بارے میں، جو مکے میں رہائش پذیر تھیں، اکثر دریافت فرماتے رہتے تھے اور تحفے تحائف بھی بھیجتے رہتے تھے، یہاں تک کہ ۷ھ میں خیبر سے واپسی پر آپؐ کو ان کی وفات کی خبر ملی۔ ان کا بیٹا مسروح اپنی والدہ سے پہلے ھی وفات پا چکا تھا (البلاذری: انساب، ۱: ۹۴، ۹۶؛ السیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۲۴؛ الروض الانف، ۱: ۱۰۸)۔ ثویبہ کے اسلام لانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ذہبی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام السیوطی کا میلان ان کے اسلام لانے کی طرف ہے۔

سنت ابراہیمیؑ کے مطابق عربوں، بالخصوص قریش مکہ میں عقیقہ کرنے کا دستور تھا؛ چنانچہ جناب عبدالمطلب نے ساتویں دن اپنے لاڈلے پوتے کا عقیقہ کیا اور ختنہ کرایا (آپؐ کے مختون پیدا ہونے کی روایات بھی منقول ھیں)۔ اس موقع پر جانور ذبح کر کے قریش کو کھانے کی دعوت بھی دی۔ کھانے کے بعد قریش نے پوچھا: اے عبدالمطلب! آپ نے اپنے جس بیٹے کے لیے ہماری ضیافت کی ہے اس کا نام کیا رکھا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ میں نے اس کا نام محمدؐ رکھا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آسمان میں اللہ اور زمین میں اس کی مخلوق آپؐ کی تعریف کرے۔ اہل لغت کہتے ہیں کہ محمدؐ کا مفہوم ہے تمام صفات خیر اور اوصاف حمیدہ کا جامع۔ یہ بھی روایات ہیں کہ آپؐ کا اسم گرامی محمد الہامی ہے، نیز آپؐ کی والدہ ماجدہ نے خالق حقیقی کی طرف سے اشارہ پا کر آپؐ کا نام احمد رکھا (ابن سعد: طبقات، ۱: ۱۰۳؛ ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۰۶، ۲۱۰؛ عیون الاثر، ۱: ۳۰)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اسمائے گرامی محمدؐ اور احمدؐ کا مادہ حمد ہے اور حمد کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کے اخلاق حسنہ، اوصاف حمیدہ، کمالات جمیلہ اور فضائل و محاسن کو محبت، عقیدت اور عظمت کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اسم پاک محمدؐ مصدر تحمید (باب تفعیل) سے مشتق ہے اور اس باب کی خصوصیت مبالغہ اور تکرار ہے۔ لفظ محمد اسی مصدر سے اسم مفعول ہے اور اس سے مقصود وہ ذات بابرکات ہے جس کے حقیقی کمالات، ذاتی صفات اور اصلی محامد کو عقیدت و محبت کے ساتھ بکثرت اور بار بار بیان کیا جائے۔ لفظ محمد میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ وہ ذات ستودہ صفات جس میں خصائل محمودہ اور اوصاف حمیدہ بدرجۂ کمال اور بکثرت موجود ہوں۔ اسی طرح احمد اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک یہ اسم فاعل کے معنی میں ہے اور بعض کے نزدیک اسم مفعول کے معنی

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

میں۔ اسم فاعل کی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کرنے والا اور مفعول کی صورت میں سب سے زیادہ تعریف کیا گیا اور سراہا گیا (الروض الانف، ۱:۱۰۶؛ فتح الباری، ۶:۴۰۳؛ لسان العرب اور تاج العروس، بذیل مادہ)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں صرف چند اشخاص ایسے ملتے ہیں جن کا نام محمد تھا۔ لسان العرب اور تاج العروس میں سات آدمیوں کے نام ضبط کیے گئے ہیں اور بعض نے زیادہ بھی نقل کیے ہیں۔ ان لوگوں کے والدین نے اہل کتاب سے یہ سن کر کہ جزیرۃ العرب میں ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے جس کا نام محمد ہوگا، اس شرف کو حاصل کرنے کے لیے یہ نام رکھ لیا؛ البتہ کسی نے احمد نام نہیں رکھا۔ مشیت الٰہی دیکھیے کہ محمد نام کے ان لوگوں میں سے کسی نے بھی نبوت و رسالت کا دعوی نہیں کیا (فتح الباری، ۷: ۴۰۴، ۴۰۵)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اسم گرامی احمد قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ مذکور ہے اور وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کے طور پر: وَ مُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ (۶۱ [الصف]: ۶)، یعنی میں (عیسیٰ) اس پیغمبر کی بشارت سناتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام احمد ہوگا۔ آپؐ کا اسم گرامی محمدؐ چار مرتبہ قرآن مجید میں آیا ہے اور ہر مرتبہ آپؐ کے منصب رسالت کے سیاق و سباق میں: (۱) وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ (۳ [آل عمران]: ۱۴۴)، یعنی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تو اللہ کے رسول ہیں؛ (۲) مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (۳۳ [الاحزاب]: ۴۰)، یعنی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تمھارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے رسول اور انبیاؑ (کی نبوت) کی مہر یعنی اس کو ختم کر دینے والے ہیں؛ (۳) وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷ [محمد]: ۲)، یعنی اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور جو (کتاب) محمدؐ پر نازل ہوئی اسے مانتے رہے اور وہ ان کے ربّ کی طرف سے برحق ہے ان سے ان کے گناہ معاف کر دیے اور ان کی حالت سنوار دی؛ (۴) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (۴۸ [الفتح]: ۲۹)، یعنی محمد اللہ کے رسول ہیں۔ ان چاروں آیات میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا نام لے کر آپؐ کی رسالت و نبوت کے منصب کو واضح طور پر بیان فرمایا ہے تاکہ کسی قسم کے شک وشبہہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

اسی مناسبت کی بنا پر آپؐ نے اور آپؐ کی امت نے دنیا کی تمام قوموں اور امتوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کی اور قیامت تک کرتی رہے گی؛ ہر کام کے آغاز و اختتام پر اللہ تعالیٰ کی تعریف اور حمد کا حکم دیا گیا اور امت کا ہر فرد یہ فریضہ انجام دے رہا ہے۔ بالکل اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے محامد و محاسن اور خصال محمودہ، اوصاف حمیدہ اور فضائل و کمالات کا بیان اور ذکر جس کثرت سے کیا گیا ہے اور ابد تک کیا جاتا رہے گا اس کی مثال بھی دنیا میں نہیں مل سکتی۔

امام ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ختنے کے بارے میں تین اقوال ہیں: (۱) آپؐ مختون پیدا ہوئے؛ (۲) مائی حلیمہ سعدیہ کی حضانت کے دوران میں جب فرشتوں نے شق صدر کیا تو ختنہ بھی کر دیا؛ (۳) آپؐ کا ختنہ آپؐ کے دادا عبدالمطلب نے کیا اور یہ بات عربوں کے دستور عام کے مطابق تھی (زاد المعاد، مطبوعہ قاہرہ، ۱:۱۹)۔ ابن کثیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مختون و مسرور پیدا ہونے سے متعلق کئی روایات نقل کی ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ مختلف طریقوں

marfat.com
Marfat.com

سے مروی روایات کی بنا پر بعض حضرات نے اسے متواتر کا درجہ دیا ہے؛ علاوہ‌ازیں دوسری دونوں روایتیں بھی نقل کی ہیں (السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۰۸، ۲۰۹؛ نیز دیکھیے ابن سعد: الطبقات، ۱ : ۱۰۳)، البتّہ ابن الجوزی نے بڑے جزم سے لکھا ہے کہ آپ مختون و مسرور پیدا ہوئے (الوفاء، ۱ : ۹۷)]۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی وفات پر کہے ہوئے مرثیے میں حضرت حسّانؓ بن ثابت نے محمدؐ اور احمدؐ دونوں نام بطور مترادف کے استعمال کئے ہیں۔ شاخت Schacht کی علم عروض سے قطعی نا واقفیت تھی کہ اس نے اپنے مقالے [رکّ بہ احمد، در ا ۱، لائیڈن، بار دوم] میں محض قیاساً یہ لکھا ہے کہ حضرت حسّانؓ نے وزن شعر کی ضرورت سے محمد کی جگہ احمد کا لفظ قافیے میں استعمال کیا ہے۔ اول تو شاخت نے اس امر کو نظر انداز کر دیا کہ مذکورہ مرثیے کی ایک بیت میں احمد ہے تو دوسرے میں محمد کا لفظ بھی ہے؛ دوسرے یہ کہ باحمد، لاحمد، واحمد وغیرہ میں، یعنی احمد کے لفظ سے پہلے کوئی متحرک حرف ہو، تو وہ لفظ محمد کا هموزن ہو جاتا ہے۔ [یہ شاخت کی نا واقفیت کی دلیل ہے۔ بہر حال یہ دونوں نام پیارے اور کثیر المعانی ہیں اور اب تو دنیا میں ان سے عظیم تر نام کوئی موجود ہی نہیں]۔

رضاعت: عرب میں ایک رواج تھا جو آج سعودی دور میں بھی باقی ہے کہ نوزائیدہ بچوں کو دودھ پلانے کے لیے کسی بدوی عورت کے سپرد کرکے صحرا میں بھیج دیا جاتا تھا۔ [اسی دستور کے مطابق شرفائے مکہ بھی بچے کی پیدائش کے چند روز بعد اسے کسی بدوی عورت کے سپرد کر دیتے تھے تاکہ بچہ صحرا کی کھلی اور صاف ہوا میں پرورش پائے؛ اس کی زبان فصیح اور جسم مضبوط ہو اور وہ اس قابل ہو جائے کہ مصائب و تکالیف کا صبر و تحمل سے مقابلہ کر سکے اور فصاحت و شجاعت کا پیکر بن کر سادہ زندگی بسر کر سکنے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ چند روز آپؐ کی والدہ سیدہ آمنہ نے بنفس نفیس دودھ پلایا۔ پھر کچھ دن ثوبیہ نے بھی دودھ پلایا]۔ پھر طائف کے مضافات کی چند بدوی عورتیں حسب عادت مکّہ مکرمہ آئیں اور نوزائیدہ بچے تلاش کیے۔ آنحضرتؐ یتیم تھے، اس لیے کسی کو لینے کی رغبت نہ ہوئی۔ حلیمہ سعدیہ سواری کے جانور کی کمزوری کے باعث ذرا دیر سے پہنچیں۔ اتنے میں مالداروں کے سارے بچے اٹھ چکے تھے۔ حلیمہ نے خالی ہاتھ واپس جانے کے بجائے آنحضرتؐ کو لے لینا ہی طے کیا۔ اس سے ان کے گھر میں فوراً بڑی برکت پیدا ہو گئی؛ چنانچہ غذا سے محرومی کے زمانے میں ان کے ریوڑ یوں نظر آتے تھے گویا شاداب چراگاہ میں چرتے رہے ہوں (ابن ہشام، ص ۱۰۴ ببعد)۔ یہ واقعہ بڑا معنی خیز ہے کہ حلیمہ سعدیہ نے جب آپؐ کو دودھ پلانا چاہا تو آپؐ نے صرف ایک طرف سے دودھ پیا اور دوسری طرف رضاعی ماں کے اصرار کے باوجود بھی قبول نہ کی، بلکہ اسے اپنے دودھ بھائی کے لیے چھوڑ دیا (السہیلی، ۱ : ۱۰۸)۔

رضاعت کے زمانے میں حلیمہ وقتاً فوقتاً مکہ آتیں اور بچہ ماں کو دکھاتی رہی ہوں گی اور حسب دستور رضاعت کی اجرت اور تحفہ تحائف پاتی رہی ہوں گی، اگرچہ ماخذ میں اس کے بارے میں سکوت ہے۔ بہرحال اس زمانے کے دو تین واقعات قابل ذکر ہیں۔ حلیمہ نے ایک بار عکاظ کے سالانہ میلے میں شرکت کی تو وہاں ایک یہودی فال گو نے بچے کو دیکھ کر غل مچایا کہ لوگو! آؤ اور اس بچے کو قتل کر دو ورنہ وہ تمہیں قتل کرے گا۔ [اس پر اس کے ساتھیوں نے پوچھا کہ کیا یہ یتیم ہے؟ حلیمہ سعدیہ نے کہا: نہیں! میں اس کی ماں ہوں اور یہ (حارث، ان کے خاوند) اس کے والد ہیں۔ اس پر یہودیوں نے کہا کہ اگر یہ یتیم ہوتا تو ہم اسے قتل کر دیتے]۔

marfat.com
Marfat.com

(ابن سعد، ۱ : ۱۱۳)۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ کسی دن شاید گدگدانے پر مچل کر آپؐ نے اپنی بڑی دودھ شریک بہن شیماء کو اس زور سے کاٹا کہ اس کے شانے پر دانتوں کے نشان پڑ گئے (ابن ہشام، ص۸۵۵)۔ تیسرا واقعہ، جو غالباً تین چار سال بعد کا ہے، یہ ہے کہ ایک دن حلیمہ کا ایک بچہ چراگاہ سے بھاگتا ہوا آیا اور کہا : چند لوگ آئے اور قریشی بھائی کا سینہ چیر ڈالا ۔ حلیمہ چراگاہ میں پہنچیں تو دیکھا کہ آنحضرتؐ ایک چٹان پر بیٹھے اور ٹکٹکی لگائے آسمان کو تک رہے ہیں ۔ پوچھا تو کہا : فرشتے آئے تھے ، سینہ چاک کر کے دل نکالا اور دھو کر برائیوں سے پاک کیا؛ پھر اس کی جگہ پر رکھ کر سینہ بند کر دیا جس کی خنکی میں اب تک محسوس کر رہا ہوں ۔ وہ واپس آسمان پر جا رہے تھے تو میں نظر سے انہیں کا تعاقب کر رہا تھا ۔ (ابن ہشام ، ص ۱۰۵).

[اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت حلیمہ بنو سعد کی معزز اور شریف خاتون تھیں ۔ ان کے والد کا نام ابو ذؤیب عبداللہ بن الحارث بن شِجنہ بن جابر تھا ، جو بنو سعد بن بکر بن ہوازن کے قبیلے سے تھا ۔ مائی حلیمہ کے شوہر الحارث بن عبدالعزّٰی بن رِفاعہ بھی بنو سعد کے قبیلے سے تھے ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے رضاعی بہن بھائیوں کے نام یہ ہیں : عبداللہ بن حارث، اُنیسہ بنت الحارث اور الشّیماء (حَذامہ یا بقول بعض حُذافہ) بنت الحارث، جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کی دیکھ بھال اور پرداخت میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں (ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۲۵ ؛ جمھرۃ انساب العرب، ص ۲۵۶ ؛ طبقات ، ۱ : ۱۱۰، ۱۱۱؛ انساب الاشراف، ۱:۹۳)۔ بقول شیخ عبدالحق محدث دھلوی، حلیمہ سعدیہ اپنے نام اور نسبت کی طرح حلم، وقار اور سعادت سے موصوف تھیں (مدارج النبوۃ، ۲ : ۲۳) ۔ قبیلہ بنو سعد کی فصاحت زبان مسلم تھی ۔ آپؐ نے ابتدائی تربیت بنو سعد میں پائی ۔ پھر آپؐ قبیلہ قریش سے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھے اور اس کا آپؐ نے متعدد بار اظہار بھی فرمایا (الروض الانف ، ۱ : ۱۰۹).

حضرت حلیمہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے ہر چیز میں برکت نظر آنے لگی اور ہر شے وافر ہوگئی ۔ خود آپؐ کی نشو و نما اس تیزی سے ہوئی کہ دوسرے لڑکوں میں اس کی مثال نہیں ملتی ۔ دو سال کے عرصے میں آپؐ بڑے صحت مند اور توانا ہوگئے ۔ میں نے آپؐ کا دودھ چھڑا دیا اور آپؐ کو آپؐ کی والدہ کے پاس لے آئی ۔ ہماری یہ دلی خواہش تھی کہ آپؐ کچھ مدت اور ہمارے پاس رہیں ، کیونکہ آپؐ کی وجہ سے ہمارے ہاں بڑی خیر و برکت رہی ۔ آپؐ کی والدہ ماجدہ آپؐ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں ۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے بیٹے کو کچھ عرصہ اور ہمارے پاس رہنے دیں ، تاکہ آپؐ اور مضبوط و توانا ہو جائیں ؛ علاوہ ازیں شہر مکہ میں وبا پھیلی ہوئی ہے اور مجھے اس کا بھی خدشہ ہے ۔ ہمارے اصرار سے وہ رضامند ہوگئیں اور ہم آپؐ کو ساتھ لے کر خوش و خرم وطن کو لوٹے ۔

بنو سعد میں واپسی کے بعد شق صدر کا واقعہ پیش آیا ۔ کتب سیر و احادیث میں اس کی تفصیلات درج ہیں ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم بنو سعد کے گھروں کے پیچھے اپنے ایک رضاعی بھائی کے ساتھ تھے، جو اپنے مال مویشی چرا رہا تھا ۔ اس اثنا میں دو فرشتے (روایات میں دو پرندے یا دو آدمی بھی مذکور ہیں) آئے ۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس تھے اور ان کے پاس برف سے بھرا ہوا سونے کا ایک طشت تھا ۔ انہوں نے آپؐ کا پیٹ (یا سینہ) چاک کرکے قلب اطہر کو نکالا ۔ پھر قلب کو چاک کرکے اس میں سے جما ہوا خون نکال باہر پھینکا ۔ پھر قلب اور پیٹ کو برف

marfat.com
Marfat.com

اور آب زمزم سے دھویا اور اسے علم و حکمت ، ایمان و ایقان ، رافت و رحمت اور شفقت سے بھر دیا ۔ بعد ازاں قلب کو اپنی جگہ رکھ کر چاک شدہ حصے کو ٹانکے لگا دیے اور دونوں شانوں کے درمیان ایک مہر لگا دی ۔ پھر فرشتوں نے آپؐ کو سینے سے لگایا ، آپؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا: اے حبیبؐ خدا! آپؐ خوف زدہ نہ ہوں۔ اگر آپؐ کو معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کیسی بھلائی کا ارادہ رکھتا ہے تو آپؐ بے حد خوشی اور راحت محسوس کریں ۔ یہ روایت متعدد طرق سے حدیث و سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے ۔ صحیح مسلم میں بھی بصحت سند موجود ہے ۔ حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے سینۂ مبارک میں ٹانکوں کے نشان دیکھا کرتا تھا ۔ اس واقعے کے سلسلے میں پہلی روایت حضرت حلیمہ سعدیہ کی ہے ؛ دوسری روایت رسول اللہ صلّی علیہ و آلہٖ وسلّم کی ہے کہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کے سوال کرنے پر اپنی زندگی کے آغاز کا یہ واقعہ ذکر فرمایا۔ اس واقعے کو بیان کرنے سے پہلے آپؐ نے فرمایا کہ میں دعاے خلیلؑ اور نوید مسیحاؑ ہوں؛ تیسری قسم کی روایات صحابۂ کرامؓ کی ہیں، جنھوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے یہ بات سنی اور پھر آگے بیان کی (دیکھیے الطبقات، ۱ : ۱۱۰ یا ۱۱۲؛ السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۲۷ تا ۲۳۱ ؛ ابن الجوزی : الوفاء با حوال المصطفیٰ ، ۱ : ۱۱۰ ببعد).

بعض سیرت نگاروں نے کہا ہے کہ آپ کی عمر سوا دو برس تھی جب یہ واقعہ پیش آیا (ابن کثیر : کتاب مذکور ، ۱ : ۲۲۸)، لیکن ابن سعد نے اس وقت آپؐ کی عمر چار سال بتائی ہے (الطبقات ، ۱ :۱۱۲) ۔ جب آپؐ حضرت حلیمہ کے ہاں قیام فرما تھے تو ایک دن مائی حلیمہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو دیکھنے باہر نکلیں تو آپؐ اپنی رضاعی بہن کے ساتھ باہر دھوپ میں تھے ۔ یہ دیکھ کر وہ بولیں کہ اتنی گرمی میں آپؐ باہر پھر رہے ہیں ۔ اس پر رضاعی بہن نے جواب دیا : اماں جان! میرے بھائی کو گرمی نہیں لگتی ۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک بادل سایہ کیے رہتا ہے ۔ جب آپؐ چلتے ہیں تو بادل بھی ساتھ چلتا ہے اور جب آپؐ ٹھیر جاتے ہیں تو بادل بھی ٹھیر جاتا ہے (الوفاء باحوال المصطفی ، ۱ : ۱۱۴ ؛ السیرۃ النبویۃ ، ۱ : ۲۲۸)] ۔ اس پر مائی حلیمہ نے طے کیا کہ بچے کو اس کی ماں کے سپرد کر دینا ہی بہتر ہے ۔ اس وقت آپؐ کی عمر چار یا پانچ سال کی بیان کی جاتی ہے ۔ واپسی میں مکّے کے قریب آپؐ کہیں کھوگئے؛ اس کی اطلاع پر دادا نے تلاش کرایا (ابن ھشام ، ص ۱۰۶ ببعد ؛ البلاذری : انساب، ۱: ۹۵)؛ آپؐ ایک درخت کے نیچے کھیلتے ہوے صحیح سالم مل گئے [(الوفاء باحوال المصطفی، ۱: ۱۱۶)۔ عبدالمطلب آپؐ کو گھر لائے اور اس خوشی میں بہت سا سونا اور کئی اونٹ صدقے میں دیے اور دایہ حلیمہ کو بہت سا انعام و اکرام دے کر واپس بھیجا (مدارج النبوۃ، ۲ : ۳۰)].

[مائی حلیمہ سعدیہ کے اسلام لانے کے بارے میں اختلاف ہے ۔ امام السیوطی تو اس بات کے قائل ہیں کہ جس بی بی نے بھی آپؐ کو دودھ پلایا وہ اسلام لے آئی (مسالک الحنفاء، ص ۴۴) ۔ شبلی نعمانی نے بہت سے حوالوں سے اس کی تصریح و توثیق کی ہے کہ مائی حلیمہ اسلام لے آئی تھیں، نیز حافظ مغلطائی کے ایک مستقل رسالے التُّحْفَۃ الجَسِیْمَۃ فی اثبات اسلام حلیمہ کا ذکر بھی کیا ہے (سیرت النبی، بار اول ، ۱ : ۱۲۲)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم حضرت حلیمہ کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے ۔ آپؐ کو ان سے اور ان کی اولاد سے بڑی محبت و موانست تھی۔ آپؐ نے اس رشتۂ رضاعت و حضانت کو ہمیشہ یاد رکھا ۔ آخر آپؐ نے اپنی زندگی مبارک کے پہلے پانچ سال اسی خاندان میں گزارے تھے ، دو برس تک مائی حلیمہ کا

marfat.com
Marfat.com

دودھ پیا ، پھر تین برس تک ان کی نگہداشت میں پرورش اور تربیت پائی - ان کے لڑکے لڑکیاں آپؐ کو اٹھائے کھلاتے رہے - السہیلی رقمطراز ہیں کہ حضرت حلیمہ آپؐ کو آپؐ کی والدہ کے پاس لائیں تو آپؐ کی عمر پانچ سال ایک ماہ تھی - اس کے بعد حضرت حلیمہ نے آپؐ کو صرف دو مرتبہ دیکھا : ایک مرتبہ تو حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد وہ مکہ مکرمہ میں آئیں اور آپؐ سے خشک سالی کی شکایات کی اور بتایا کہ ساری قوم قحط کا شکار ہو رہی ہے - یہ سن کر آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے سفارش کی تو انہوں نے بیس بکریاں اور سواری کے لیے ایک اونٹ دے کر رخصت کیا ؛ دوسری مرتبہ یوم حنین میں ملاقات ہوئی (الروض الانف ، ۱ : ۱۱۱ الطبقات ، ۱ : ۱۱۳) - ابن سعد لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی رضاعی ماں آپؐ کے پاس آئی تو آپؐ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا : اُمّی ، اُمّی ! پھر آپؐ نے اپنی چادر مبارک ان کے لیے بچھا دی اور وہ اس پر بیٹھ گئیں - پھر آپؐ نے ان کی حاجت روائی بھی کی (الطبقات، ۱:۱۱۴)- حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے ان کی مقام جِعرانہ میں بھی ملاقات ہوئی تھی اور ان کے بیٹھنے کے لیے آپؐ نے اپنی چادر مبارک بچھائی تھی - البلاذری کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حضرت حلیمہ کی بہن آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپؐ نے اپنی رضاعی ماں کی بابت دریافت فرمایا - جواب ملا کہ وہ وفات پا چکی ہیں - یہ سن کر آپؐ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے - پھر آپؐ نے اپنی رضاعی خالہ کو لباس ، سواری کا جانور اور دو سو درھم نقد دے کر رخصت کیا (انساب الاشراف ، ۱ : ۹۵).

حضرت حلیمہ کے شوہر اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے رضاعی باپ حارث بن عبدالعزّی کے بارے میں اصحاب سیر مثلاً السہیلی، حافظ الذہبی اور حافظ ابن حجر کی رائے ہے کہ وہ مکّے میں اسلام لے آئے تھے اور ان کا اسلام پختہ اور عمدہ تھا- اسی طرح آپؐ کے رضاعی بھائی عبداللہ اور بہن شیماء بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے - حضرت شیماء کو غزوہ حنین میں گرفتار کر کے جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے سامنے لایا گیا تو آپؐ نے اپنی رضاعی بہن کو اس کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر بچھا دی اور فرمایا کہ اگر چاھو تو عزّت و شفقت سے میرے پاس قیام کرو اور اگر اپنی قوم میں جانا چاھو تو تمھیں بحفاظت پہنچا دوں - وہ اسلام لے آئیں اور ان کی خواھش کے مطابق آنحضرت صلّی اللہ علیہ وَ آلہ وسلّم نے انہیں ان کی قوم میں بھیج دیا اور روانگی کے وقت تین غلام، ایک لونڈی اور کچھ اونٹ اور بکریاں عطا کیں - اسی رشتہ رضاعت و حضانت کا پاس کرتے ہوے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے غزوۂ حنین میں قید ہونے والے قبیلہ بنو سعد کے تقریباً چھے ہزار مردوں ، عورتوں اور بچوں کو آزاد کر دیا اور ان کے مال مویشی بھی انھیں واپس کر دیے - اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وَ آلہ وسلّم کے پانچ سالہ قیام کے بارے میں حضرت حلیمہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوے کہتی ہیں کہ اس عرصے میں آپؐ کی عادات نہایت پاکیزہ اور پسندیدہ تھیں ؛ نہ تو آپ روتے تھے اور نہ بے تمیزی کے مرتکب ہوتے تھے ، نہ عام بچوں کی طرح کپڑوں میں بول و براز کرتے تھے ؛ فضول کاموں اور کھیلوں سے بھی پرھیز کرتے تھے (مدارج النبوۃ ، ۲:۲۶ تا ۲۸).

نوعمری : جب حضرت حلیمہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو لے کر آپؐ کی والدہ محترمہ کے پاس آئیں تو حضرت آمنہ اپنے لخت جگر اور نور نظر

marfat.com
Marfat.com

کو تندرست و توانا دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں اور محبت و شفقت اور لاڈ پیار کے اظہار کے وہ تمام انداز اختیار کیے جو ایک بیوہ ماں اپنی آنکھوں کے تارے اور افسردہ دل کے سہارے کے لیے کر سکتی ہے۔ ماں نے اپنے لال کی تربیت اور پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آپؐ کی دیکھ بھال اور نگہداشت، خبرگیری اور حضانت کے لیے اپنی خادمہ ام ایمن کو متعین فرما دیا۔ ام ایمن کا بیان ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے کبھی بھوک یا پیاس کی شکایت نہیں کی۔ آپؐ صبح آب زمزم نوش فرما لیتے اور پھر سارا دن کوئی چیز طلب نہ فرماتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں نے ناشتہ تیار کر کے سامنے رکھا تو کہ دیا کہ مجھے خواہش نہیں (مدارج النبوۃ، ۲ : ۳۰)۔ ام ایمن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو بچپن ہی سے سیر چشمی، بے نیازی، قناعت اور غنائے نفس سے نواز رکھا تھا۔ آمنہ کے لال نے اپنی عمر عزیز کا چھٹا سال اپنی مادر مہربان اور شفیق دادا کی محبت و شفقت کے سائے میں بسر کیا۔ جب آپ چھے برس کے ہوگئے تو آپؐ کی والدہ ماجدہ نے آپؐ کو آپؐ کے دادا کے ننھیال دکھانے کے لیے سفر یثرب (مدینہ) کی تیاری کی۔ ایک اونٹ پر حضرت آمنہ سوار ہوئیں اور دوسرے پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اور آپؐ کی خادمہ (کھلائی) ام ایمن۔ اس سفر کا ایک مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آمنہ اپنے مرحوم شوہر حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کی قبر کی زیارت خود بھی کریں اور اپنے ہونہار لال کو بھی مرحوم باپ کی قبر کی زیارت کرا سکیں؛ چنانچہ ماں بیٹا مع ام ایمن سفر کی منزلیں طے کرتے ہوئے یثرب پہنچے اور وہاں بنو عدی بن النجار کے ہاں دارالنابغۃ میں قیام فرمایا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے دادا عبدالمطلب کی والدہ سلمٰی بنت عمرو یثرب کے اسی خاندان سے تھیں اور آپؐ کے دادا یہیں پیدا ہوئے اور آٹھ برس تک یہیں اپنے ننھیال میں پرورش پاتے رہے تھے۔ وہاں ایک مہینہ ٹھیرنے کے بعد جب واپس لوٹیں تو راستے میں بیمار ہوکر مکے اور مدینے کے درمیان مقام ابواء پر اپنے معصوم اور پیارے لال کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے دیکھتے ابدی نیند سو گئیں اور وہیں مدفون ہوئیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کو بچپن میں قیام مدینہ کی کئی باتیں یاد رہ گئیں تھیں۔ ہجرت کے بعد آپؐ کا ایک مرتبہ بنو عدی بن النجار کی منازل اور قیام‌گاہوں پر گزر ہوا تو فرمایا کہ میں بچپن میں جب اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ یہاں آیا تھا تو بنو عدی کی اس گڑھی میں اپنے ننھیال کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور منڈیر پر بیٹھنے والے پرندوں کو ہم سب مل کر اڑایا کرتے تھے۔ آپؐ نے دارالنابغہ کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ میری والدہ اور میں یہاں ٹھیرے تھے اور اسی گھر کے اندر میرے والد عبداللہ بن عبدالمطلب کی قبر ہے اور بنو عدی کا یہی وہ تالاب (باؤلی) ہے جس میں میں نے تیراکی اور شناوری کی خوب مشق کی۔ ام ایمن کہتی ہیں کہ یہود کے کچھ لوگ آتے جاتے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو دیکھتے تھے۔ میں نے ایک یہودی کو یہ کہتے سنا کہ یہ شخص اس قوم کا نبی ہے اور یہ شہر اس کا دارالھجرت ہے۔ مجھے اس کے یہ الفاظ خوب یاد ہیں (الطبقات، ۱ : ۱۱۶؛ ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۳۵؛ الوفا، ۱ : ۱۱۷)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی مشفق و مہربان ماں کی وفات کے بعد ام ایمن آپؐ کو لے کر مکہ مکرمہ آئیں اور آپؐ کے دادا عبدالمطلب کے سپرد کیا۔ دادا نے اپنے پوتے کی کفالت و تربیت اور نگہداشت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ عبدالمطلب آپؐ کو اپنی تمام اولاد سے زیادہ لاڈ کرتے، پیار اور عزت و محبت سے پرورش کرتے؛ وہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی

marfat.com
Marfat.com

عدم موجودگی میں کھانا نہ کھاتے تھے ۔ آپؐ جب چاہتے دادا کے پاس بلا روک ٹوک آتے جاتے اور ان کی مسند پر بیٹھ جاتے تھے (مدارج النبوة، ۲ : ۳۱) ۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ عبدالمطلب کے لیے دیوار کعبہ کے پاس مسند بچھائی جاتی تھی ۔ ان کے سب بیٹے اور قریش کے سردار اس مسند کے ارد گرد بیٹھتے تھے ۔ عبدالمطلب آتے تو صرف وہی مسند پر بیٹھتے، البتہ جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم تشریف لاتے تو دادا کی مسند پر بیٹھ جاتے اور اگر کوئی شخص آپؐ کو اس مسند سے اٹھانا چاہتا تو عبدالمطلب اسے روک دیتے اور کہتے کہ میرے بیٹے کو بیٹھا رہنے دو ؛ اس کی شان ہی کچھ اور ہے ؛ اسے اپنے شرف و مرتبے کا احساس ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ اتنا بلند مرتبہ اور اعلیٰ مقام پائے گا کہ کسی عربی کو نہ پہلے ملا اور نہ بعد میں ملے گا ۔ پھر وہ آپؐ کے جسد مبارک پر محبت و شفقت سے ہاتھ پھیرتے اور آپؐ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ۔ دادا اپنے ہونہار پوتے کا بڑا خیال رکھتے تھے ۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ میرا پوتا بڑا ہو کر نبوت و حکومت سے نوازا جائے گا ۔ اسی لیے وہ آپؐ کی خادمہ ام ایمنؓ کو اس بات کی تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ ایک پل کے لیے بھی آپؐ سے غافل نہ ہونے پائے (طبقات، ۱ : ۱۱۸ ؛ السیرة النبویة، ۱ : ۲۳۹ و ۲۴۰؛ الوفاء، ۱ : ۱۱۹ تا ۱۲۰، ۱۳۰)]۔

مشفق و مہربان دادا دو سال بعد فوت ہو گئے اور اس وقت آنحضرتؐ کی عمر آٹھ سال کی تھی ۔ (دادا کی عمر کی روایتیں مختلف ہیں : اسی ، ایک سو دس ، ایک سو بیس اور ایک سو چالیس) ۔ جنازے کے پیچھے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم روتے ہوئے جا رہے تھے [(الطبقات ، ۱ : ۱۱۹)] ۔ سارا شہر سوگوار تھا ۔ شہر میں کئی دن ان کا سوگ منایا گیا (البلاذری : الانساب، ۱ : ۸۷)۔

[ام ایمنؓ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو بچپن میں کھلایا اور نگہداشت و خدمت کا حق خوب ادا کیا ۔ وہ آپؐ سے بڑے لطف و محبت سے پیش آتی اور اچھی طرح دیکھ بھال کرتی تھیں ۔ یہ خادمہ آپؐ کو اپنے والد اور والدہ کی طرف سے ملی تھیں ۔ ان کا اصلی نام برکت تھا اور حبشہ کی رہنے والی تھیں ۔ مدت العمر آپؐ کی خدمت کرتی رہیں ۔ جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے ہوا تو آپؐ نے ام ایمن کو آزاد کر دیا۔

ام ایمن کا نکاح پہلے عُبَید بن الحارث الخزرجی سے ہوا تھا اور ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا ، جس کا نام ایمن تھا اور اسی نسبت سے وہ ام ایمن کہلائیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی اُمّ ایمنؓ کی بڑی عزت کرتے اور میری ماں کہ کر یاد کیا کرتے تھے ۔ آپؐ نے عبید کی موت کے بعد بعثت نبوی کے آغاز میں حضرت ام ایمن کا نکاح حضرت زیدؓ بن حارثہ سے کر دیا اور اس نکاح سے اسامہؓ بن زید پیدا ہوئے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات پر ام ایمنؓ کو روتے دیکھ کر پوچھا گیا تو کہنے لگیں کہ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ آپؐ اس دنیا سے تشریف لے جائیں گے ، مگر میں تو اس بات پر روتی ہوں کہ اب سلسلۂ وحی منقطع ہو گیا ہے ۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے موقع پر ام ایمنؓ نے روتے ہوئے کہا کہ آج اسلام کمزور ہو گیا ہے ۔ بالاخر ام ایمنؓ نے خلافت عثمانی میں وفات پائی (الذہبی: سیر اعلام النبلاء ، ۲: ۱۵۹ تا ۱۶۱)۔

یہ قدرت کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ آپؐ بطن مادر میں تھے کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا ۔ چھے برس کے ہوئے تو مہر مادری سے محروم ہو گئے اور آٹھ برس کے ہوئے تو مشفق و مہربان دادا کا سایۂ عاطفت بھی اٹھ گیا ۔ والد کو تو آپؐ نے دیکھا بھی نہ تھا، اس لیے پدرانہ محبت و شفقت کے لطف سے آشنا بھی نہ ہونے پائے تھے ۔ مہر مادری سے محرومی کا

marfat.com
Marfat.com

احساس و شعور تو تھا ، لیکن دادا کی شفقت اور لطف نے اس زخم پر مرہم کا کام کیا ۔ اب دادا کی وفات کے وقت آپؐ خاصے با شعور ہو چکے تھے اور اس محرومی اور غم کی شدت کا احساس اس امر سے بخوبی ہوتا ہے کہ آپؐ ان کے سرہانے کھڑے روتے رہے تھے (الوفاء ، ۱ : ۱۲۹) اور جب جنازہ اٹھا تو آپؐ جنازے کے پیچھے پیچھے روتے جا رہے تھے تا آنکہ انھیں حجون کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا (الوفاء ، ۱ : ۱۳۰)]۔

کہتے ہیں کہ عبدالمطلب نے وصیت کی کہ ابو طالب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے نگران بنیں ۔ آپؐ کے کئی چچا تھے ۔ ابو طالب اور زبیر کی ماں اور عبداللہ کی ماں ایک ہی تھی۔ زبیر کو عام بہبود کے کاموں سے بڑی دلچسپی تھی (دیکھیے نیچے) ۔ اس کے باوجود ابو طالب کو ، جو مفلس بھی تھے، ترجیح دینے کی وجہ شاید یہ تھی کہ عبداللہ اور ابو طالب میں روابط زیادہ بہتر رہے ہوں ۔

[بکریاں چرانے کے ضمن میں یہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ بنو سعد کے ہاں دوران قیام میں بکریاں چراتے وقت آپؐ اپنے رضاعی بھائی بہنوں کے ساتھ ہوتے تھے ۔ امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق آپؐ اهل مکہ کی بکریں قراریط پر چرایا کرتے تھے (الصحیح ، کتاب الاجارہ ؛ الطبقات ، ۱ : ۱۲۵) ۔ نیز ابن سعد کے مطابق آپؐ اپنے گھر والوں کی بکریاں مقام اجیاد (دامن مکہ) میں چرایا کرتے تھے (اَنَا اَرْعٰی غَنَمَ اَهْلِی بِاَجْیَاد ، الطبقات ، ۱ : ۱۲۶) ۔ آپؐ نے ایک حدیث میں یہ بھی وضاحت فرمائی کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں ۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ پیلو کے درختوں کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اس کے سیاہ پھل کھاؤ ، وہ بہت اچھے ہوتے ہیں ۔ جب میں بکریاں چرایا کرتا تھا تو سیاہ پھل ہی کھایا (توڑا) کرتا تھا (الطبقات ، ۱ : ۱۲۶) ۔ بعض سیرت نگاروں نے قراریط پر بکریاں چرانے والی روایات کی تاویل کی ہے اور زیادہ تر رجحان یہ ہے کہ یہ سکّہ نہیں بلکہ اجیاد کے قریب ایک مقام ہے ۔ اس زمانے میں اشراف اور معززین کے لڑکے اور جوان عام طور پر بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے ۔ اس میں تحقیر یا ذلت کا کوئی پہلو نہیں ، بلکہ یہ قیادت ، جفا کشی ، بلند ہمتی اور مردانگی کی نشانی تھی، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی نے بکریاں چرائی تھیں ۔ اس سے بڑھ کر اور زیادہ شرف کیا ہو سکتا ہے.

ابو طالب کی بیوی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی چچی کا نام فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف تھا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ تھیں ۔ وہ مکے میں ایمان لائیں ، مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں وفات پا کر مدفون ہوئیں ۔ انھوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بڑی محبت و الفت سے پرورش کیا ۔ آپؐ بھی ان کی بڑی عزت و تکریم کرتے اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا کرتے تھے ۔ آپؐ اکثر ان کی زیارت کو جاتے اور دوپہر کے وقت انھیں کے ہاں آرام فرماتے تھے ۔ جب آپؐ کی چچی فوت ہوئیں تو آپؐ نے ان کو کفن کے ساتھ پہنانے کے لیے اپنی قمیص بھی دی تا کہ اس کی وجہ سے انھیں جنت کا لباس پہنایا جائے اور جب انھیں قبر میں اتارا گیا تو آپؐ قبر میں ان کے ساتھ اترے تا کہ ان پر قبر میں آسانی اور آسائش ہو جائے (الذہبی: سیر اعلام النبلاء ، ۲:۸۷ ؛ الاستیعاب ، ۲ : ۷۵۳) .

ابو طالب کو اس بات کا یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا مستقبل بڑا درخشاں اور شاندار ہے ۔ وہ آپؐ کی نگہداشت کا بڑا اہتمام کرتے ۔ آپؐ کی چچی بھی اپنی اولاد سے بڑھ کر آپ کی دیکھ

marfat.com
Marfat.com

بھال کرلیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات پر آپؐ بڑے دل گرفتہ اور مغموم نظر آتے تھے۔

ابو طالب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے بڑی محبت تھی۔ وہ آپؐ کی خوب اچھی طرح دیکھ بھال کرتے اور ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ ابو طالب عیالدار تو بہت تھے، لیکن مالدار نہ تھے۔ ان کے ہاں آپؐ کی موجودگی باعث خیر و برکت ثابت ہوئی؛ جب ابو طالب کے اہل و عیال اکیلے کھانا کھاتے تو سیر نہ ہونے پاتے، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم شریک طعام ہوتے تو سب لوگ خوب سیر ہو جاتے۔ ابو طالب آپؐ کے مبارک ہونے کا اکثر اعتراف کیا کرتے تھے۔ ابو طالب کے بال بچے رات بھر سونے کے بعد صبح اٹھتے تو ان کی آنکھیں کیچ آلود ہوتیں اور بال بکھرے ہوئے اور پریشان ہوتے، لیکن آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے چہرے پر تازگی، رونق اور آب و تاب ہوتی اور آنکھیں صاف اور نکھری ہوئی ہوتیں (الطبقات، ۱ : ۱۱۹ و ۱۲۰؛ الوفا، ۱ : ۱۳۱؛ السیرۃ النبویہ، ۱ : ۲۳۲)۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو رسالت و نبوت سے نوازنا تھا، اس لیے آپؐ کی تربیت اور نشو و نما خاص انداز میں ہوئی۔ اللہ تعالی نے ہر قدم پر اپنے حبیبؐ کی راہنمائی اور حفاظت فرمائی اور جاہلیت کی تمام بری اور مشرکانہ عادات سے ہمیشہ بچائے رکھا۔ آپؐ اپنی قوم کی کسی مشرکانہ تقریب میں کبھی شامل نہ ہوئے۔ آپؐ کا بچپن، لڑکپن اور جوانی نہایت پاکبازی اور راستبازی میں گزری۔ بچپن ہی سے آپؐ شرم و حیا کا پیکر تھے۔ ایک طرف آپؐ امانت داری، راست گفتاری اور دیگر اوصاف حمیدہ سے آراستہ تھے تو دوسری طرف بد گوئی، فحش بیانی، غیر مہذب اور آوارہ عادتوں سے بہت دور تھے۔ آپؐ نے نہ تو کبھی میلے ٹھیلے میں شرکت کی اور نہ لہو و لعب میں شامل ہوئے۔ اگر ایک دو مرتبہ ارادہ بھی کیا تو اللہ تعالی نے اس ارادہ سے باز رکھا اور کسی صورت میں بھی آپ تماشا گاہ تک پہنچ نہ پائے]۔

السہیلی (۱ : ۱۱۲) نے البخاری سے روایت کی ہے کہ اس زمانے میں شہر میں ایک شادی تھی۔ آپؐ کو تماشا دیکھنے کا شوق ہوا۔ ایک رفیق چرواہے سے کہا: میری بکریاں بھی آج تو سنبھال لے؛ کسی اور دن تیری بکریاں میں سنبھال لوں گا۔ چرائی شہر کے باہر ہوتی تھی۔ شہر آئے تو تقریب ابھی شروع نہ ہوئی تھی۔ انتظار میں دھوپ کے باعث ایک جگہ سائے میں ذرا پیٹھ لگائی تو غنودگی طاری ہوگئی اور جب بیدار ہوئے تو جلوس باجا سب ختم ہو چکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور مکرر سو گئے۔ اس دن عہد کیا کہ آئندہ کھیل کود میں وقت ضائع نہ کروں گا۔

[ابو طالب اپنے خاندان سمیت ایک بت کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے اور وہاں نذریں نیازیں چڑھاتے اور قربانی وغیرہ کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی اہل خانہ ہر سال مجبور کرتے، لیکن آپؐ انکار کر دیتے۔ ایک سال کا ذکر ہے کہ گھر کے بزرگوں نے بے حد اصرار کیا تو آپؐ بادل ناخواستہ ساتھ چل دیے۔ واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سخت پریشان اور ہراساں نظر آ رہے تھے۔ پھپیاں آپؐ کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں۔ اس کے بعد پھر آپؐ کبھی ایسی تقریب میں شریک نہ ہوئے۔

عہد شباب: تین چار سال اسی طرح گزر گئے تو ابو طالب نے فلسطین کے تجارتی سفر کا ارادہ کیا کہ کچھ کمائیں (ابن ہشام: سیرۃ، ۱ : ۱۹۱ تا ۱۹۳)۔ [سفر طویل اور راستہ دشوار تھا مگر شفیق چچا نے اپنے یتیم بھتیجے کو اپنے ہمراہ سفر میں لے جانے کا ارادہ ترک نہ کیا (ابن ہشام: سیرۃ، ۱ : ۱۹۲،

marfat.com
Marfat.com

قاہرہ ۱۹۳۶ء)]۔ فلسطین آپؐ کے لیے ایک نیا ملک تھا ۔ یونانی حکومت اور عیسائی دین دونوں آپؐ کے لیے اجنبی تھے ۔ اس وقت بھی عیسائیوں میں اپنے دین کی تبلیغ کا شوق تھا ۔ ان کے راہب مہمان نوازی اور خدمت خلق کا ذوق رکھتے تھے۔ بیت المقدس کے شمال میں دمشق کے قریب ایک مقام بُصْریٰ کی منڈی میں بحیرا راہب نے اپنے صومعے میں اس چھوٹے سے تجارتی کاروان کی ضیافت کی ۔ عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشینگوئیوں کے مطابق اس زمانے میں کسی اہم انقلاب کا انتظار تھا (یوحنا ، ۱۴:۱۶ و ۱۶ : ۷ تا ۱۶)؛ یہودیوں کو بھی آنے والے مسیحا کا انتظار تھا ، جسے بنی اسرائیل کے بھائیوں کے خاندان (بنو اسمعیلؑ) سے ہونا چاہیے تھا (استثنا ، ۱۸: ۱۸) ؛ [نیز دیکھیے سرسید : خطبات احمدیہ]. اس طرح بحیرا کا مقصد سہ گونہ ہو جاتا ہے : مسافر پروری ، تبلیغ نصرانیت اور تسلی دہندہ کی تلاش [رکّ بہ بحیرا].

مکہ مکرمہ میں ابو طالب کی ایک دکان تھی ۔ وہ کپڑے اور عطر کا کاروبار کرتے تھے۔ ننھا اور ذہین بھتیجا بھی اسی ماحول میں پروان چڑھا تھا ؛ لہذا فطری دیانت داری سے رفتہ رفتہ شہرت اور ہر دلعزیزی کا حاصل ہونا ناگزیر تھا ۔ آپؐ کی راست بازی اور راست گفتاری کی وجہ سے "الامین" اور "الصّادق" کا خطاب آپؐ کے لیے زبان زد عوام و خواص ہو گیا ۔ [کتب احادیث و سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قبل از نبوت عہد شباب میں تجارتی کاروبار کیا اور اس میں بڑی نیک نامی اور عزت حاصل کی].

آپؐ نے اپنے مکرم چچا ابو طالب کی رفاقت میں شام و فلسطین کی طرف جو سفر کیے اس سے آپؐ کو تجارتی اصول و ضوابط سیکھنے میں بڑی مدد ملی ؛ چنانچہ بعد ازاں آپؐ نے اپنی آزاد تجارت شروع فرما دی ۔ تزویج حضرت خدیجہؓ سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہی شغل رہا ۔ اس دوران میں آپؐ نے جن لوگوں کے ساتھ لین دین کیا انھوں نے آپؐ کو انتہائی امین، پابند عہد اور دیانت دار پایا ، حتّٰی کہ عبداللہ بن ابی الحمساء کے بیان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پاس عہد میں تین روز تک ایک ہی جگہ تشریف فرما رہے (ابو داؤد : سنن ، ۵ : ۲۶۸ ، عدد ۴۹۹۶ ؛ شبلی : سیرۃ النبی ، ۱ : ۱۸۵ ببعد) ۔ سفر تجارت کے دوران میں ایک بار ایک شخص نے آپؐ کو لات و عُزّیٰ کی قسم دینا چاہی تو آپؐ نے فرمایا : میں نے کبھی ان کے نام کی قسم نہیں کھائی ۔ میں ان کے پاس سے گزرتا ہوں تو ان کی طرف التفات بھی نہیں کرتا (ابن الجوزی : الوفا ، ۱ : ۱۴۳)].

[آپؐ سترہ یا بیس سال کے تھے جب حرب فجار چھڑی (الیعقوبی ، ۲ : ۱۵) ۔ یہ جنگ قیس اور کنانہ کے قبیلوں میں حج کے محترم زمانے میں ہوئی ۔ قریش مکہ نے بھی اپنے دستے الگ قائم کرکے شمولیت اختیار کی ۔ چونکہ قریش اس جنگ میں برحق تھے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی اس جنگ میں اپنے چچاؤں کی مدافعت میں حصہ لیا (ابن ہشام : السیرۃ النبویہ ، ۱: ۱۹۵ تا ۱۹۸؛ المسعودی : مروج الذہب، ۲ : ۲۷۴). تاہم علامہ سہیلی (روض الانف، ۱ : ۱۲۰) کی تشریح کے مطابق آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس میں نہ تو عملی حصہ لیا اور نہ کسی پر ہاتھ اٹھایا ۔ زیادہ سے زیادہ آپؐ نے اپنے چچاؤں کی معاونت کی ، یعنی ان کو تیر پکڑاتے رہے اور بس ۔ [فجار کی لڑائیاں دو ہوئی ہیں ۔ پہلی لڑائی اس وقت ہوئی جب آپؐ کی عمر کم و بیش دس سال تھی ۔ دوسری جنگ اس وقت ہوئی جب آپؐ کی عمر چودہ یا بیس سال بیان کی جاتی ہے ۔ اس جنگ میں آپؐ نے اپنے چچاؤں کی معاونت کے لیے حصہ لیا

marfat.com
Marfat.com

(ابن الجوزی، ۱۰۰۰ : ۱۲۵)]۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر مبارک پچیس سال کے قریب ہوئی تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپؐ کی امانت و دیانت ، حسن معاملگی اور ایفاے عہد کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا ۔ یہ شہرت حضرت خدیجہؓ [رک باں] نے بھی سنی ۔ وہ ایک مالدار تجارت پیشہ خاتون تھیں اور مکہ معظمہ میں اپنی نیک نامی کے باعث "طاہرہ" کے معزز لقب سے یاد کی جاتی تھیں۔ انھیں اشراف قریش نکاح کا پیام دے چکے تھے، مگر انھوں نے ان تمام کو رد کر دیا تھا اور اب آزادانہ پاک زندگی بسر کر رہی تھیں ۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپؐ میرا سامان تجارت لیکر شام جائیں ؛ جو معاوضہ دوسروں کو ملتا ہے اس سے آپؐ کو دوگنا ملے گا ۔ آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے ایما پر یہ پیش کش قبول کرلی (السہیلی : روض الانف، ۱ : ۱۲۱ ببعد)]۔

حضرت خدیجہؓ نے بہت سا سامان آپؐ کے سپرد کیا اور ایک غلام میسرہ بھی رفاقت و خدمت کے لیے ساتھ کر دیا ؛ (ایک روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعض رشتہ دار بھی اس کاروان میں شریک تھے) ۔ اس دفعہ بھی بصریٰ (ملک شام) جانا ہوا (ابن ہشام : سیرۃ ، ۱ :۱۹۹ ببعد) ۔ یہ سفر بہت کامیاب رہا اور معمول سے بہت زیادہ نفع مند ثابت ہوا ؛ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے بھی شکر گزاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو وعدے سے زیادہ معاوضہ دیا ۔ ان سفروں میں آنحضرتؐ کی دیانت و امانت سے حضرت خدیجہؓ بے حد متأثر ہوئیں اور ان کا اعتراف کرتے ہوے کچھ تحائف بھی دیے (السہیلی، ۱ : ۱۲۳) ۔ [ابن الجوزی نے روایت کی ہے کہ السائب بن ابی السائب بھی ایک عرصے تک آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے شریک تجارت رہے (الوفا، ۱ : ۱۴۲)]۔

خانہ داری : اس سفر سے واپسی کے تین ماہ بعد [شبلی ، ۱ : ۱۸۸] اس قدر دانی کا سلسلہ باہم مناکحت کی صورت پر منتج ہوا۔ عام روایتوں کے مطابق اس وقت آپؐ کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہؓ کی چالیس سال بیان کی جاتی ہے ۔ حضرت خدیجہؓ سے چار لڑکیاں اور دو سے لے کر چار تک لڑکے پیدا ہوے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نکاح کی سلسلہ جنبانی حضرت خدیجہؓ کی طرف سے ہوئی ۔ بات طے ہوگئی تو حضرت خدیجہؓ نے تاریخ مقرر کی اور فرمایا : "حسب دستور اپنے خاندان کے بزرگوں کے ساتھ آؤ" ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خاندان کے بزرگوں کے ساتھ تشریف لے گئے [جن میں حضرت حمزہؓ اور ابو طالب نمایاں تھے]۔ رسم نکاح کے بعد جناب ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا ، جس میں رواج کے مطابق خاندان اور نوشہ (آنحضرتؐ) کی ستائش کی اور کہا : "اس کے کردار کا مقابلہ مکے کا کوئی دوسرا نوجوان نہیں کر سکتا۔ اگرچہ وہ مالدار نہیں، لیکن دولت تو آنے جانے والی چیز ہے۔ [اس کے پاس پائدار دولت ہے، یعنی امانت و دیانت" (الوفا، ۱ :۱۴۵ ؛ انساب الاشراف، ۱: ۹۷ ببعد)]. اس موقع پر حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار ورقہ بن نوفل نے اٹھ کر اس کی تائید کی (السہیلی ، ۱ : ۱۲۳) ۔ مہر میں اختلاف ہے : بیس اونٹنیاں (ابن ہشام : سیرۃ ۱ : ۲۰۱) ، یا ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی ، یعنی پانچ سو درہم (البلاذری ، انساب، ۱:۹۷)؛ [نیز دیکھیے السہیلی : روض الانف ، ۱: ۱۲۰ تا ۱۲۴؛ ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۱۹۸ تا ۲۰۳؛ الیعقوبی : تاریخ، ۲ : ۱۲۰ تا ۱۲۲]۔

قریب قریب اسی زمانے میں حِلف الفضول [رک باں] کے مشہور معاہدے کی تجدید ہوئی ۔ اس

marfat.com
Marfat.com

کی تجویز زبیر بن عبدالمطلب نے اور سر پرستی عبداللہ بن جُدعان نے کی ۔ آنحضرتؐ نے بھی جوش و خروش سے اس میں حصہ لیا ۔ معاہدہ یہ تھا کہ اگر مکے میں کسی پر ظلم ہوا تو ہم اس کی مدد کو دوڑیں گے اور ظالم کو مکے میں نہیں رہنے دیا جائے گا ۔ بعثت کے بعد بھی آپؐ فرمایا کرتے تھے : ”میں نے یہ حلف اٹھایا تھا ۔ اگر آج بھی کوئی اس کی دہائی دے تو میں اس کی مدد ضرور کروں گا اور قیمتی سرخ اونٹوں کی ایک قطار کے عوض بھی اس فریضے سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوں گا“ ۔ [اس معاہدے کو حلف الفضول اس لیے کہتے ہیں کہ اول اول اس معاہدے کا جن لوگوں کو خیال آیا تھا ان کے ناموں میں لفظ فضل (فضیلت کا مادہ) مشترک تھا (المسعودی: مروج الذہب، ۲: ۲۷۶ تا ۲۷۸ ؛ ابن الجوزی ، الوفاء ، ۱ : ۱۳۶ تا ۱۳۸)]۔

امام احمد بن حنبل (مسند ، ۴ : ۲۰۶ ، ۲۰۷) نے دو طویل روایتیں قبیلہ عبدالقیس کے اسلام کے متعلق نقل کی ہیں ۔ ان کے وفد سے جب آنحضرتؐ نے مشقّر، صفا اور ھجر نامی شہروں کے حالات پوچھے (جو مشرقی عرب میں موجودہ شہر الھفوف و مضافات سے عبارت ہیں) تو انھوں نے حیرت سے کہا کہ آپؐ تو ہمارے شہروں سے ہم سے بھی زیادہ واقف ہیں ۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے ملک کی طویل سیاحت کی ہے ۔ [اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان مقامات کو آپؐ نے شغل تجارت کے دوران میں دیکھا تھا] ۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا شام ، یمن اور مشرقی عرب کی طرح آنحضرتؐ تجارت کے لئے حبشہ بھی گئے تھے ؟ اس سلسلے میں [وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا ، تاہم] یہ امر قابل ذکر ہے کہ آغاز اسلام پر جب مخالفین کی طرف سے ایذا رسانی شدت اختیار کر گئی تو آپ نے اپنے جانثاروں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ۔ اس موقع پر آنحضرتؐ نے جعفرؓ بن ابی طالب کو نجاشی کے نام جو تعارفی خط دیا اس کے الفاظ یہ ہیں : ”میں نے تمہارے پاس اپنے چچا زاد بھائی جعفرؓ بن ابی طالب کو ، جس کے ساتھ چند مسلمان بھی ہیں ، بھیجا ہے ۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کی مہمانداری کیجیے“ (الوثائق السیاسیة، عدد ۲۱) ۔ انسانیت پروری کی اساس پر پناہ دہی کی درخواست کا ایسا دوستانہ اور ہمدردانہ انداز شاید اس استنباط کی اجازت دیتا ہے کہ نجاشی سے یا اس علاقے سے آپؐ کی پہلے سے واقفیت رہی ہو اور ممکن ہے کہ یہ واقفیت حبشہ کے تجارتی سفر کے باعث ہوئی ہو ، [لیکن کوئی قطعی بات نہیں کی جا سکتی]۔

زیدؓ بن حارثہ : حُباشہ کے میلے میں ایک نو عمر زیدؓ بن حارثہ بکنے آیا تو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حِزام نے خرید کر اپنی پھپی حضرت خدیجہؓ کے نذر کیا اور حضرت خدیجہؓ نے اسے آنحضرتؐ کی خدمت کے لیے مختص کر دیا ۔ کچھ دنوں بعد حضرت زیدؓ کا باپ تلاش کرتے کرتے مکہ مکرمہ آپہنچا تو آنحضرتؐ کی خدمت میں باریاب ہوا اور کہا کہ ایک ہمسایہ قبیلے نے ایک لڑائی میں میرے بیٹے کو گرفتار کر کے بیچ دیا ہے ؛ ورنہ وہ آزاد اور مجھ سردار قبیلہ کا بیٹا ہے ؛ لہذا جو چاہو فدیہ لے لو ، میں اسے آزاد کرا کے گھر لے جانا چاہتا ہوں ۔ آنحضرتؐ اس کی گفتگو سے بہت متأثر ہوے اور فرمایا کہ ایک اس سے بہتر حل ہے ۔ آپؐ نے حضرت زیدؓ کو بلایا اور پوچھا کہ کیا وہ اس شخص کو جانتا ہے ؟ زید نے کہا : یہ میرے والد ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا : یہ تجھے واپس لے جانا چاہتے ہیں ؛ اگر جانا چاہو تو میں تجھے آزاد کرتا ہوں ۔ زیدؓ نے کہا : آپؐ نے اب تک میرے ساتھ ایسا مشفقانہ برتاؤ کیا ہے کہ اس سے بہتر ممکن

marfat.com
Marfat.com

لیں۔ میں باپ کے ہاں مالک کی طرح رہنے کے مقابلے میں آپؐ کے ہاں غلام رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس سے آنحضرتؐ بے حد متأثر ہوے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کو فوراً بیت اللہ میں تشریف لائے اور کمال مہربانی سے اعلان کیا کہ میں زید کو آزاد کرتا ہوں اور اسے اپنا متبنّٰی بناتا ہوں۔ باپ دلگیر تو ہوا، لیکن بچے کے مستقبل کے متعلق مطمئن ہو کر اپنے وطن کو لوٹ گیا [ابن ہشام : السیرۃ النبویہ، ۱ : ۲۶۴ ببعد، قاہرہ ۱۹۳۶ء].

تعمیر خانہ کعبہ : مکے میں کعبے کے بیرونی پردوں کو بخور سے دھونی دی جاتی تھی۔ ایک دن ہوا کی شدت سے چنگاریوں نے پردوں کو آگ لگا دی۔ عمارت کمزور ہو گئی تھی؛ کچھ دنوں بعد موسلا دھار بارش شروع ہوئی تو عمارت بیٹھ گئی۔ تعمیر جدید کے لئے صرف اکل حلال سے چندہ کیا گیا؛ سود خواروں اور قحبہ خانوں کے مالکوں سے رقم قبول نہ کی گئی۔ انھیں دنوں مکے کے قریب شعیبہ (جدہ) میں ایک کشتی، جو مصر سے آرہی تھی، ٹوٹ گئی۔ کچھ لوگ زندہ بچے اور کچھ سامان بھی بچایا جا سکا، جس میں شکستہ کشتی کے تختے بھی تھے۔ اہل مکہ نے ان کا سارا سامان حتّٰی کہ کشتی کے تختے بھی خرید لیے تاکہ کعبے کی چھت میں لگائیں۔ اہل مکہ نے پہلے ملبہ صاف کیا اور پرانی بنیادیں برآمد کرکے نئی دیواریں کھڑی کرنی شروع کیں۔ قبائل شہر نے کام بانٹ لیا اور ہر دیوار معین گھرانوں کے سپرد ہو گئی۔ آنحضرتؐ نے بھی اس موقع پر کام کیا؛ آپؐ پتھر اپنے کندھوں پر اٹھا کر لاتے رہے، جس سے آپؐ کے شانے زخمی بھی ہو گئے۔ چار دیواری کوئی گز بھر بلند ہوئی تو ایک دشواری پیدا ہو گئی۔ کعبے کے دروازے کے مغرب کی دیوار کے زاویے میں حجر اسود [رک بآں] کو نصب کرنا تھا۔ اس اعزاز کو حاصل کرنے کے لئے رقابت شروع ہو گئی اور قریب تھا کہ خون خرابہ ہو جائے کہ ایک بوڑھے ابو امیّہ حذیفہ بن مغیرہ نے جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے مشورہ دیا کہ اس وقت جو شخص سب سے پہلے مسجد کے دروازے سے اندر آئے، اسے حَکم بناؤ۔ سب نے قبول کیا۔ اتفاق سے یہ آنحضرتؐ ہی تھے جو کام کرنے کے لیے تشریف لا رہے تھے۔ آپؐ کو دیکھ کر سب لوگ پکار اٹھے : ھذا الامین رضینا بہ، یعنی یہ تو امین ہیں؛ ہم سب ان کے فیصلے پر راضی ہیں (ابن الجوزی، ص ۱۴۸)۔ قصہ سن کر آپؐ نے ایک چادر بچھائی، پتھر کو اس پر رکھا اور چادر کے کونے قبائل کے نمائندوں نے پکڑ کر اٹھائے اور دیوار کے قریب کیا۔ وہاں سے آنحضرتؐ نے [سب کی اجازت سے اور اس طرح سب کے متفقہ وکیل کی حیثیت سے] پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیا (ابن ہشام، سیرۃ، ۱ : ۲۰۴ تا ۲۰۹؛ [نیز رک بہ کعبہ].

روحانی ریاضت سے شغف : اہل مکہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل تھے اور کہا کرتے تھے کہ بت تو اللہ تعالیٰ کے ہاں تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں اور بس (۳۹ [الزمر] : ۳)؛ چنانچہ بیت اللہ میں سیکڑوں بت جمع کر دیے گئے۔ رفتہ رفتہ بہت سے سلیم الطبع لوگوں کو اس سے تنفر پیدا ہو گیا اور ورقہ بن نوفل الاسدی، ابو سفیان الاموی، زید بن عمرو بن نفیل العدوی، قُس بن ساعدہ، عبیداللہ بن جَحش، عثمان بن الحویرث جیسے متعدد فطرت سلیمہ کے مالک لوگوں نے بت پرستی سے کنارہ کشی اختیار کر لی (ابن ہشام، ۱ : ۲۳۸ تا ۲۴۸)۔

مکہ مکرمہ میں عبادت کے لیے گوشہ نشین (معتکف) ہونے کا رواج عبدالمطلب نے شروع کیا تھا؛ وہ رمضان میں مہینا بھر غار حراء میں گزارا کرتے تھے (البلاذری : انساب، ۱ : ۸۴)، جس کی تقلید زید بن عمرو بن نفیل نے بھی شروع کی (کتاب مذکور،

marfat.com
Marfat.com

مخطوطۂ استانبول ۲ : ۶۵۸) ۔ آنحضرتؐ نے بھی غار حراء میں اعتکاف کیا۔ غار حراء مکہ مکرمہ کے مشرق میں کعبۃ اللہ سے کوئی تین میل کے فاصلے پر جبل النور کی چوٹی پر واقع ہے ۔ جب حاجی منٰی کو جاتے ہیں تو منٰی سے کچھ پہلے یہ پہاڑ ان کے بائیں ہاتھ پر نظر آتا ہے ۔ غار کا رخ قدرۃً کعبے کی سمت ہے اور متعدد چٹانوں کے ایک دوسرے پر پڑنے سے بنا ہے ۔ [عمر مبارک کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مزاج میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ آپؐ خلوت کی تلاش میں رہتے (و کان یحبب الیہ الخلاء ، دیکھیے البخاری) ۔ اسی جستجو میں آپؐ غار حرا میں پہنچے ، جو آپؐ کو دشوار گزار راستے ، کعبہ کے سامنے ہونے ، نیز اس میں کامل تنہائی اور یکسوئی میسر ہونے کی وجہ سے پسند آیا] ۔ جب آنحضرتؐ یہاں پہلی بار گئے تو کچھ توشہ ساتھ لیا ؛ پھر آپ کا یہ معمول بن گیا کہ کچھ دنوں کے بعد گھر تشریف لاتے اور ایک آدھ دن قیام کر کے اور توشہ لے کر پھر اسی غار میں تشریف لے جاتے تھے (البخاری : الصحیح)۔ ادھر سے گزرنے والے مسافروں اور مساکین کو بھی آنحضرتؐ شریک طعام کر لیا کرتے (ابن ھشام ، ۱ : ۲۵۲ ؛ الوفا باحوال المصطفٰی ، ۱:۱۶۵]) ۔ [غار حراء میں آپؐ کی عبادت و ریاضت کو ظاہر کرنے کے لیے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں : و کان یتحنث (البخاری : الصحیح ، ۱۰ : ۵) ۔ تحنث کے معنی تعبّد ، یعنی عبادت کرنے اور گناھوں سے بچنے کے ہیں ، مگر بقول علامہ عینی اس کے معنی غور و فکر اور عبرت پذیری کے ہیں (شرح صحیح البخاری ، باب کیف کان بدؤ الوحی) ۔ ابن الجوزی (الوفا ، ۱ : ۱۶۲) کے مطابق اس کا مفہوم متعدد راتوں کی مسلسل عبادت ہے ۔

اللہ تعالٰی کی طرف سے آپ کو ذہنی اعتبار سے بار نبوت اٹھانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا ۔ اس موقع پر بار دگر شق صدر کا ذکر بھی ملتا ہے (ابن الجوزی: الوفا ، ۱ : ۱۶۶) ۔ اور یہ بھی کہ اس مقصد کے لیے آپؐ کو رویائے صادقہ کے ذریعے بشارات دی جاتیں ، مستقبل کے واقعات سے آگاہ کیا جاتا اور بہت سے مخفی حقائق میں آپؐ کی رہنمائی کی جاتی ۔ یہ سلسلہ کم و بیش چھے ماہ تک جاری رہا ۔ روایات میں ہے کہ آپؐ رات کو جو بھی خواب دیکھتے ، بیدار ہونے کے بعد صبح کی روشنی کی طرح اس کی صاف شفاف تعبیر ظاہر ہو جاتی تھی (البخاری : الصحیح ، باب کیف کان بدؤ الوحی)؛ علاوہ ازیں غیبی آوازیں بکثرت سنی جانے لگیں ، حتّٰی کہ آپؐ نے ایک موقع پر فرمایا : مجھے خطرہ ہے کہ کہیں میری عقل متأثر نہ ہو جائے کیونکہ میں اکثر کوئی آواز سنتا ہوں ، مگر جب دیکھتا ہوں تو وہاں کوئی نہیں ہوتا (ابن الجوزی، ۱: ۱۶۰) ۔ مزید براں درخت اور پتھر آپؐ کو بلند آواز سے اسلام کرنے لگے ۔ اس کے علاوہ بے شمار نشانات دیکھنے میں آتے رہے (الوفا ، ۱:۱۶۱)].

بعثت مبارکہ : جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر قمری اعتبار سے چالیس سال کی ہوئی تو روح الامین آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم غار حراء میں تشریف فرما تھے۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں دیبا کے جزدان میں لپٹی ہوئی ایک کتاب تھی ۔ انھوں نے آپؐ سے کہا : اِقرأ (پڑھ)۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا : مجھے پڑھنا نہیں آتا ۔ اس پر اس نے مجھے زور سے بھینچا؛ پھر مجھے چھوڑ کر کہا : پڑھ۔ میں نے پھر وهی جواب دیا کہ مجھے پڑھنا نہیں آتا ۔ اس نے دوبارہ مجھے بڑے زور سے بھینچا ؛ پھر چھوڑ کر کہا : پڑھ۔ میں نے پھر وهی جواب دہرایا تو اس نے تیسری مرتبہ اس زور سے بھینچا کہ میں تھک کر چور ہو گیا ۔ بعد ازاں اس نے چھوڑ کر کہا : پڑھ۔

marfat.com
Marfat.com

اس پر میں نے کہا : کیا پڑھوں ؟ اس نے کہا :
اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝
اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ
مَالَمْ يَعْلَمْ (۹۶ [العلق] : ۱ تا ۵) ، یعنی پڑھیے اپنے پروردگار کے نام سے، جو خالق ہے، جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا ہے، پڑھیے کہ آپ کا رب نہایت بزرگ ، کرم والا، ہے جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی، اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا ۔ جب تکمیل ہو گئی تو وہ چلے گئے اور یہ عبارت میرے ذہن میں نقش ہو گئی (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۱۹۴ ببعد، بیروت ۱۹۶۰ء؛ ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۲۵۱ تا ۲۵۴، مطبوعہ قاہرہ) ۔ البلاذری (انساب ، ۱ : ۱۱۱) کے مطابق وضو اور نماز کا طریقہ بھی اس کے ساتھ ہی حضرت جبریل ؑ نے آپ ؐ کو سکھایا ۔ آپ ؐ سخت گھبراہٹ کے عالم میں گھر تشریف لائے؛ حضرت خدیجہ رض سے فرمایا : مجھے کمبل اڑھاؤ ۔ جب طبیعت سنبھلی تو حضرت خدیجہ رض کو سارا ماجرا کہہ سنایا ۔

[مختلف روایتوں پر بحث و تمحیص کے بعد علامہ السہیلی (روض الانف، ۱ : ۱۵۲ ببعد) نے خلاصہ یہ نکالا ہے کہ اولاً بشارت نبوت خواب میں بوقت شب ہوئی ، پھر حالت بیداری میں نزول قرآن کا آغاز ہوا ۔ علامہ قسطلانی (المواہب مع شرح الزرقانی ، ۱ : ۲۰۷، قاہرہ ۱۳۲۰ھ) نے علامہ ابن البرّ کے حوالے سے بروز دو شنبہ ربیع الاول اور ابن القیم (زاد المعاد) کے حوالے سے ۱۷ رمضان المبارک کو نزول قرآن کی روایت کی ہے ۔ اس کی شرح میں الزرقانی نے لکھا ہے کہ ربیع الاول سے رمضان المبارک تک صرف خوابوں (رویائے صالحہ) میں بشارات نبوت دی جاتی رہیں ۔ گویا نزول قرآن کے لیے ذہنی طور پر آپ ؐ کو تیار کیا جاتا رہا اور ۱۷ رمضان المبارک کو نزول قرآن کا آغاز ہوا (نیز دیکھیے شرح سفر السعادۃ : سلیمان منصور پوری : رحمۃ للعالمین، ۱ : ۴۷، مطبوعہ لاہور.

حضرت خدیجہ رض نے آپ ؐ کو تسلی دیتے ہوئے کہا: بخدا! اللہ آپ ؐ کو رسوا (یا ضائع) نہیں کرے گا کیونکہ آپ ؐ تو صلہ رحمی کرنے والے، صداقت شعار اور راستباز ، دوسروں کا بار اٹھانے والے، محتاجوں کی مدد کرنے والے، مہمان نواز اور مصائب میں دوسروں کے مددگار ہیں (البخاری : الصحیح ، ۱ : ۵ ، مطبوعہ لائیڈن) ۔ آپ ؐ کی رفیقۂ حیات کی یہ گواہی ، آپ ؐ کے کردار کی عظمت، آپ ؐ کے اخلاق کی بلندی اور آپ ؐ کے محاسن کی بڑائی کی روشن دلیل ہے ۔ انسان دوسروں سے تو چھپا رہ سکتا ہے ، مگر رفیق زندگی سے نہیں ۔ حضرت خدیجہ رض کے ان الفاظ میں ان کے پندرہ سالہ عینی مشاہدات کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے]۔

اس کے بعد حضرت خدیجہ رض آپ ؐ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جو عیسائی عالم تھے ۔ البخاری (الصحیح ، ۱ : ۵) کے مطابق اس نے قصہ سنا تو پکار اٹھا کہ یہ تو وہی ناموس اعظم ہے جو حضرت موسیٰ ؑ پر اللہ کی طرف سے نازل ہوا تھا (ناموس Namos یونانی لفظ ہے ، جس کے معنے قانون کے ہیں اور لفظ تورات کا ترجمہ یونانی میں اسی لفظ سے کیا جاتا ہے) ۔ البلاذری (انساب الاشراف ، ۱ : ۱۰۶) کے مطابق ورقہ نے [ایک دوسرے موقع پر] یہ بھی اضافہ کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ؐ وہی نبی ؐ ہیں جن کی حضرت عیسیٰ ؑ نے بشارت دی تھی ۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں [جب کہ قوم آپ ؐ کو ستائے گی اور آپ ؐ کو اپنے شہر سے نکال دے گی ، تاکہ آپ ؐ کی بھر پور مدد کروں ۔ آپ ؐ نے فرمایا : کیا سچ مچ میری قوم مجھے اپنے شہر سے نکال دے گی ؟ اس پر ورقہ بن نوفل نے کہا : بخدا ! آج تک جو بھی اس دعوت کو لے کر آیا ہے اس کے ساتھ اس کی قوم نے یہی سلوک کیا ہے (البخاری: الصحیح، ۱ : ۵)؛ پھر جلد ہی ان کی وفات ہو گئی]۔

اس کے بعد وحی میں تین سال تک فترت یعنی

marfat.com
Marfat.com

وقفہ پڑ گیا ۔ اس وقفے کے دوران میں بعض اوقات آپؐ اس کے اعادے کی خواہش کے باعث بے چین اور بے قرار ہو جاتے تو افق آسمان پر دوبارہ اسی ناموس اعظم کی جھلک نظر آ جاتی جو آپؐ کو یقین دلاتا کہ آپؐ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور وہ جبریلؑ ہیں۔ (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۱۹۶ ، مطبوعہ بیروت) ۔ تین سال کے اس انقطاع کے بعد وحی مسلسل آنے لگی۔

[اسلام کی دعوت و تبلیغ اور السابقون الاولون: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جب نبوت سے نوازا گیا تو آپؐ نے سب سے پہلے ان لوگوں کو تبلیغ فرمائی جو کہ آپؐ کے ساتھ ذاتی روابط اور تعلقات رکھتے تھے ۔ آپؐ کو اپنے ان قریبی رفقا کی طرف سے مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا ۔ عورتوں میں آپؐ کی زوجۂ مطہرہ حضرت خدیجہؓ ، غلاموں میں آپؐ کے جانثار خادم حضرت زیدؓ بن حارثہ ، مردوں میں آپؐ کے وفادار رفیق حضرت ابوبکرؓ ، چھوٹی عمر کے لڑکوں میں آپؐ کے عم زاد حضرت علیؓ نے پہلے پہل اسلام قبول کیا (الیعقوبی : تاریخ ، ۲ : ۲۲ تا ۲۴ ، بیروت ۱۹۶۰ء) ۔ حضرت عمرو بن عبسہ السلمی اور خالد بن سعید بن العاصی نے بھی اسی ابتدائی عرصے میں اسلام قبول کیا (جوامع السیرۃ، ص ۴۶]۔ خفیہ دعوت و تبلیغ کا یہ سلسلہ تقریباً تین سال تک جاری رہا ۔ اسی عرصے میں حضرت ابوبکرؓ کی تبلیغی کوششوں سے حضرت بلالؓ بن رباح ، حضرت عثمانؓ بن عفان ، زبیرؓ بن العوام ، عبدالرحمنؓ بن عوف ، سعدؓ بن ابی وقاص ، طلحہؓ بن عبیداللہ وغیرہ کئی حضرات نے اسلام قبول کیا (ابن ہشام ، ۱ : ۲۶۷ تا ۲۶۹ ؛ دوسرے حضرات کے ناموں کے لیے دیکھیے حوالۂ مذکور، ۲۶۹ تا ۲۸۰؛ [ابن سید الناس : عیون الاثر ، ۱ : ۹۱ ببعد ؛ ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ ، ۱ : ۴۳۲ ببعد ؛ المقریزی : الامتاع ، ص ۱۵ ؛ تاریخ الخمیس ، ۱ : ۲۸۶ ببعد)]۔

ابتدا میں تبلیغ سینہ بہ سینہ اور محدود حلقۂ احباب میں ہوتی رہی ۔ پھر وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۲۶ [الشعراء] : ۲۱۴) یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے کی آیت نازل ہوئی ، جو سماجی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے ناگزیر تھی تو آنحضرتؐ نے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو کھانے پر مدعو کیا اور سب لوگوں کو اسلام کی دعوت دی ۔ ابو لہب کو آنحضرتؐ سے کد تھی ، اس نے اس موقع پر بد زبانی سے جلسہ درہم برہم کر دیا...صرف حضرت علیؓ نے کھڑے ہو کر اپنی جانثاری کا اعلان فرمایا (الطبری ، ۱ : ۱۱۷۲ ببعد)۔

دعوت عام : جب خفیہ تبلیغ سے کسی قدر اسلام پھیل گیا تو حکم آیا : فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۵ [الحجر] : ۹۴)، یعنی آپؐ کو جو حکم دیا جاتا ہے وہ برملا بیان کر دیجیے اور مشرکوں سے کنارہ کش رہیے ۔ [اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے آواز دے کر تمام اہل مکہ کو کوہ صفا کے نیچے جمع کر لیا ۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو اول آپؐ نے پوچھا کہ اگر میں تمھیں بتلاؤں کہ اس پہاڑی کی دوسری جانب ایک لشکر جرار تم پر یلغار کرنے والا ہے تو کیا تم مان لو گے ؟ سب نے تصدیق کی تو آپؐ نے مکہ مکرمہ میں آباد ایک ایک قبیلے کا نام لے کر فرمایا کہ مجھے اللہ نے تمھاری طرف عذاب شدید سے ڈر سنانے کے لیے مامور کیا ہے ۔ لہٰذا اگر تم دونوں جہانوں کی کامیابی چاہتے ہو تو پڑھو لا الٰہ الا اللہ (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۲۰۰ ، بیروت ۱۹۶۰ء) ۔ اس موقع پر بھی ابو لہب نے بد زبانی کی ، جس کا جواب قرآن مجید (۱۱۱ [ابی لہب]) میں دیا گیا]۔

اس اعلان عام کے بعد آنحضرتؐ کا طریقۂ تبلیغ یہ رہا کہ جہاں بھی کچھ لوگ نظر آتے ، آپؐ ان کو مخاطب کر کے قرآن کی کچھ آیتیں پڑھتے اور طرح

marfat.com
Marfat.com

طرح سے اسلام کی دعوت دیتے - اس ابتدائی زمانے میں، توحید باری، نبوت اور حساب آخرت پر خاص طور پر زور دیا جاتا تھا اور اسی طرح اخلاق صالحه اور نیکوکاری پر بھی- [اسی ابتدائی دور میں نماز کا حکم بھی نازل ہو چکا تھا - بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی (مدارج النبوة، اردو ترجمه، ۱:۸۴، مطبوعهٔ کراچی) اس موقع پر ایمان توحید کے بعد عبادات میں سب سے پہلے دو رکعت نماز فرض ہوئی، جس کی حضرت جبریلؑ نے آپؐ کو تعلیم دی - مقاتل کا قول ہے که اولاً دو رکعت نماز فجر اور دو رکعت نماز عشاء فرض ہوئی- حافظ ابن حجر (فتح الباری، کتاب الصلوٰة) فرماتے ہیں که اس پر تو اتفاق ہے که واقعهٔ معراج سے قبل بھی آپؐ اور صحابهؓ نماز ادا فرمایا کرتے تھے، مگر یه نمازیں کون کونسی تھیں، اس میں کچھ اختلاف ہے - بعض علما کے نزدیک صرف فجر اور عصر کی دو نمازوں کا سب سے پہلے حکم ہوا - امام نوویؒ (شرح مسلم) کے مطابق پہلی نماز جو آپؐ پر فریضه تبلیغ و دعوت کے بعد فرض ہوئی وہ رات کی نماز، یعنی قیام اللیل ہے، جیسا که سورة مزمل اور سورة مدثر کی ابتدائی آیات سے مترشح ہوتا ہے - البلاذری (انساب، ۱ : ۱۱۱) نے بھی دو روایات اس مضمون کی نقل کی ہیں جن میں یه بیان کیا گیا ہے که آپؐ کو ابتدائے وحی کے فوراً بعد وضو اور نماز کی تعلیم دی گئی] - ہر نیا مسلمان اپنی جگه ایک مبلغ بن کر اپنے حلقے میں تبلیغ شروع کر دیتا - مرد اور عورتیں دونوں اس کام میں جوش و خروش سے شریک تھے (ابن سعد، ۱ : ۲۰۰ ببعد).

ایذا رسانی : جب مکه مکرمه میں اسلام کی اشاعت ہونے لگی اور لوگ مسلمان ہونے شروع ہو گئے، جن میں بالخصوص نوجوان زیادہ تھے، تو ان کے بڑوں کو بہت دکھ ہوا که ہماری اجازت اور مرضی کے بغیر یه کیوں پرانے قومی دین سے برگشته ہو گئے ہیں- اپنے ان نو عمر رشته داروں کو ان لوگوں نے طرح طرح سے ایذائیں دیں؛ مارا پیٹا، بیڑیاں لگا کر قید کیا، بے چھت کے کمروں میں بند کیا، تپتی ہوئی ریت پر برہنه بدن گھسیٹا، مگر یه اذیتیں بے اثر رہیں - ان لوگوں میں آزاد مرد اور عورتیں ہی نہیں بلکه لونڈی غلام بھی تھے جنہیں ان کے مالکوں نے شدید تکلیفیں دیں - اسی طرح موالی، یعنی غیر قبیلوں کے عرب بھی تھے، جو اہل مکه میں سے کسی ایک کے ساتھ کسی معاہدے کے ذریعے حلیفی (موالی) بن گئے تھے - ان میں سے ایک حضرت عمار بن یاسرؓ کا خاندان بھی تھا، جس نے اپنے گھر میں ایک مسجد بنا لی تھی، جو اسلام میں اولین مسجد کہی جاتی ہے (السہیلی : روض الانف، ۲ : ۱۳؛ [انساب، ۱:۱۶۲]؛ ابن کثیر: البدایة والنہایه، ۷ : ۳۱۱) - [اس خاندان یعنی آل یاسر کو خاص طور پر ظلم و ستم کا نشانه بنایا گیا - حضرت یاسرؓ پر اتنا تشدد کیا گیا که وہ شہید ہو گئے - حضرت سمیهؓ کو ابو جہل نے نیزہ مار کر شہید کر دیا (انساب، ۱ : ۱۶۰)] - باہر سے آنے والے سیاحوں اور مسافروں میں سے بھی کچھ مسلمان ہوئے - ان میں بعض نصرانی بھی تھے (ابن ہشام : سیرة، ص ۲۵۹، ۲۵۲).

تحریر و ضبط قرآن : جب مسلمانوں کی تعداد بیس پچیس ہو گئی تو نازل شده سورتوں کی تحریر و کتابت عمل میں آنے لگی.

کتب سابقه کے برعکس خدا کے آخری نبیؐ نے کتاب اللہ کے تحفظ کے لیے ابتدا ہی سے تحریری اشاعت کا بندوبست کیا - امت میں قرآن مجید کی اشاعت کا جو طریقه تھا اس کے سلسلے میں ابن اسحٰق (مخطوطه فاس؛ نسخه زیر طبع، ص ۱۹۲) کی یه روایت اہم ہے : اذا انزل القرآن علی رسول اللہ صلی اللہ علیه و آله وسلم قرأه علی الرجال ثم علی النساء، یعنی جب بھی آپؐ پر کوئی آیت قرآنی نازل ہوتی تو آپؐ اسے اولاً مردوں

marfat.com
Marfat.com

کو پڑھ کر سناتے، پھر عورتوں کو عام تعلیم قرآن ہی نہیں، خود زنانہ تعلیم قرآن کو آپ جو اہمیت دیتے تھے وہ خاص طور سے مد نظر رہے ؛ مگر صرف سنانا کافی نہ تھا، زبانی یاد کرانا بھی ضروری تھا۔ اس کے لیے آنحضرت اپنے کسی کاتب کو بلا کر خود املا کراتے، پھر اس سے پڑھوا کر سنتے اور ضرورت پر تصحیح کراتے۔ آپ نے حکم دیا تھا کہ اس کے نسخے ہر مسلمان اپنے گھر میں رکھے، اس کو زبانی یاد کر کے نمازوں میں ہر روز پڑھا کرے اور یہ کہ زبانی یاد کرنے سے پہلے قرآن کی صحیح عبارت کی تعلیم خود آنحضرت سے یا اس شخص سے پائے جسے آنحضرت نے تعلیم قرآنی کی اجازت دی ہو۔ لکھنا، مستند استاد سے پڑھنا اور زبانی یاد کرنا، اس سہ گانہ تدبیر کا اہتمام، ابتداے اسلام ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ آنحضرت ہر سال رمضان المبارک میں نازل شدہ قرآن کا حضرت جبریل سے دور فرماتے تھے (فیدارسہ القرآن)۔ بعض روایتوں کے مطابق آپ رمضان المبارک ہی میں قرآن مجمع عام میں پڑھتے اور لوگ اپنے اپنے نسخے لا کر تصحیح کر لیتے اور اس وقت تک نازل شدہ قرآن سے آگاہی حاصل کرتے۔ یہ عمل "عرضۃ" کہلاتا۔ عرضۂ اخیرہ کی بڑی شہرت ہے کہ یہ وفات سے چھے ماہ پہلے ہوا اور اس مرتبہ ایک کی جگہ دو مرتبہ آپ نے پورا قرآن پڑھ کر سنایا (البخاری : الصحیح، کتاب ۱، باب ۱، ص ۶، حدیث ۵ ؛ محمد حمید اللہ : دیباچہ فرانسیسی ترجمۂ قرآن مجید)۔

ایذا رسانی میں شدت : جلد ہی قرآن کریم میں بت پرستی کی مذمت میں شدت آ گئی اور اعلان کیا گیا کہ: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ط اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ (۲۱ [الانبیآء] : ۹۸)، یعنی بے شک تم اور وہ بت جن کی تم اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو سب دوزخ کا ایندھن ہوں گے اور تم سب اس میں داخل ہو کر رہو گے۔ اس پر غیر مسلموں کی طرف سے ایذا رسانی میں بھی شدت آ گئی، آنحضرت کی ذات کے خلاف بھی اور حلقۂ اسلام میں داخل ہونے والوں کے خلاف بھی۔

ابو جہل [رک باں] یوں تو چھپ کر قرآن سنا کرتا، مگر اسے یہ دکھ تھا کہ اس کا اپنا قبیلہ (بنو امیہ)، جو سخاوت وغیرہ میں کبھی آنحضرت کے قبیلہ بنو ہاشم سے پیچھے نہ رہا تھا، اب بنو ہاشم کے فخر نبوت کا مقابلہ نہیں کر سکتا ؛ [اس نے اس کا جواب یوں دیا] کہ میں آنحضرت کی نبوت ہی کو نہیں مانوں گا، اگرچہ وہ جو کچھ تعلیم دیتے ہیں وہ ٹھیک ہی ہے (ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۲۳۷ ببعد)۔ اسی زمانے میں ایک اجنبی کچھ اونٹ بیچنے مکہ مکرمہ آیا۔ ابوجہل نے کم مول پر اس سے وہ اونٹ ہتھیانا لینے چاہے اور دوسروں کو بھی منع کر دیا کہ زائد رقم پیش نہ کریں۔ اس کی بدخلقی سے بچنے کے لیے اور مقامی خریدار تو چپ ہو گئے لیکن جب اجنبی نے آنحضرت کو اپنا دکھ سنایا تو آپ نے معقول قیمت پر ان کو خرید لیا (البلاذری: انساب، ۱ : ۱۰۲)۔ اس پر ابو جہل چھچھورے پن پر اتر آیا۔ ایک دن کسی جگہ اونٹ ذبح ہوا تھا۔ ابو جہل نے عُقبہ بن ابی معیط کو بھیجا کہ جا کر اوجھڑی اٹھا لائے اور جب آنحضرت کعبے کے سامنے سجدے میں جائیں تو وہ آپ کی پیٹھ پر رکھ دے۔ یہ اتنی بوجھل تھی کہ آپ سجدے سے سر نہ اٹھا سکے۔ حضرت فاطمہؓ بچی تھیں۔ اطلاع ملی، تو دوڑی آئیں اور نہ صرف غلیظ بوجھ کو دور کیا [بلکہ ابو جہل کو ملامت بھی کی (انساب، ۱ : ۱۰۵)]۔ ابن الجوزی (المجتبیٰ من المجتنیٰ، مخطوطہ) نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ اس پر ابو جہل نے ننھی بچی کو زور سے طمانچہ مارنے سے بھی دریغ نہ کیا، جس

marfat.com
Marfat.com

حضرت فاطمہؓ رونے لگیں (البلاذری : انساب ۱ : ۱۶۰)۔

ایک دن آنحضرتؐ بیت اللہ شریف کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے کہ عُقبہ بن ابی مُعَیط نے اپنی چادر کو لپیٹ کر حضورؐ کی گردن میں گرہ ڈالی اور اس شدت سے بل دیے کہ حضورؐ کا دم گھٹنے لگا۔ بعض نیک دل حاضرین نے آپ کو اس سے چھٹکارا دلایا (السہیلی ، ۱ : ۱۸۴ ؛ [الوفا ؛ ۱۹ ؛ ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ ، ۱ : ۴۷])۔

(ابو لہب کی بیوی) ام جمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی چچی ہونے کے باوجود درختوں کی ٹہنیاں لاتی اور آنحضرتؐ کے راستے میں ڈال دیتی۔ جب آنحضرتؐ رات کو اندھیرے میں گھر آتے تو آپؐ اس سے تکلیف اٹھاتے (ابن ہشام ، ۱ : ۳۸۱ السہیلی ، ۱ : ۱۸۴)۔ خود ابو لہب آپؐ کے مکان کے دروازے پر اور راستے میں گندگی اور غلاظت پھینک دیتا۔ ایک دن آپ کے دوسرے چچا حضرت امیر حمزہؓ نے دیکھ کر ملامت کی اور اس کے ساتھ اس کی لائی ہوئی غلاظت اس کے سر پر انڈیل دی۔ اب ابو لہب نے دوسروں کو اجرت دے کر اس کام کے جاری رکھنے پر مامور کیا (البلاذری : انساب ، ۱ : ۱۳۱ ، ۱۳۷)۔

بارہا [رؤسائے قریش کی شہ پر قریشی آوارہ مزاج لونڈے] رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو راستے میں پتھر مارتے اور آپ کا مذاق اڑاتے اور طرح طرح سے تنگ کرتے۔ اگر کبھی اتفاق سے یہ اس جگہ پیش آتا جہاں ابو سفیان کا مکان تھا تو آپؐ پناہ لینے کے لئے اس کے گھر میں گھس جاتے اور یہ شریف دشمن لونڈوں کو گھرک کر دفع کرتا ، اور جب وہ جا چکتے تو آنحضرت اپنا راستہ لیتے۔ ہمارا مأخذ (ابن الجوزی) یہ اضافہ کرتا ہے کہ فتح مکہ کے دن کی منادی ''جو ابو سفیان کے گھر میں چلا جائے تو اسے امن ہوگا'' اس کی شکر گزاری میں تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرح صحابہ کرامؓ اور صحابیات صالحاتؓ کو بھی سخت اذیتیں پہنچائی جاتی رہیں۔ حضرت بلال حبشیؓ حضرت صہیبؓ رومی ، حضرت عمّار بن یاسرؓ ، حضرت خباب بن الارتؓ اس کی واضح مثالیں ہیں (البلاذری : انساب ، ۱ : ۱۵۶ تا ۱۹۸)۔ خواتین میں حضرت لُبینہؓ ، حضرت ام عُبیسؓ ، حضرت سُمَیّہؓ (ام عمار) وغیرہ لونڈیاں بھی ہر اذیت کو جھیلتیں لیکن زبان پر کلمہ کفر نہ لاتیں۔ اس سے کہنا پڑتا ہے کہ آزاد مردوں عورتوں کا ہی نہیں غلاموں اور لونڈیوں کا بھی روحانی معیار اور ذہنی حوصلہ بہت بلند تھا اور انہیں اپنی مادی ہی نہیں روحانی زندگی سے بھی بے پناہ دلچسپی تھی ؛ بعض لونڈی غلاموں کو ناقابل برداشت اذیت سے بچانے کے لئے حضرت ابوبکرؓ وغیرہ [نے ان کو خرید خرید کر آزاد کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ، عامر بن فُہیرہؓ، لبینہؓ، زِنّیرہؓ ، نَہدیہؓ ، ام عُبیسؓ کو بھاری داموں پر خریدا اور آزاد کر دیا (شبلی ، ۱ : ۲۳۲)]۔

لیکن جلد ہی یہ ناممکن ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم امن و سکون سے مکے میں کوئی تبلیغی کام کر سکیں۔ اس لئے آپؐ مضافات تشریف لے جانے لگے ، خصوصاً حج کے لیے جو اجنبی یہاں وارد ہوتے آپؐ ان کو اسلام کی تبلیغ فرماتے۔ ابو لہب کو آپؐ سے اتنی کد اور عداوت ہو گئی تھی کہ ہر جگہ آپؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور جب بھی آپ کسی سے مخاطب ہوتے تو شور مچا دیتا اور غلط سلط باتیں کر کے اس اجنبی کو بات سننے سے روک دیتا (ابن ہشام ، سیرۃ ، ۱ : ۳۸۶ ، ۳۸۰)۔ بعثت پر تقریباً پانچ سال گزرے تھے۔ چالیس پچاس آدمی مسلمان بھی ہو گئے تھے ، لیکن ایذا رسانی اتنی شدید

marfat.com
Marfat.com

ہو گئی تھی کہ آنحضرتؐ ایک مخلص مسلمان حضرت ارقمؓ بن ابی ارقم [رک بآن] کے گھر میں ، (جو جبل صفا کے سامنے تھا ، لیکن اب مسجد کعبہ کی توسیع کے باعث وہ حرم کے اندر آ گیا ہے) مجلس لگانے لگے ۔ مسلمانوں کو اس مرکز کی اطلاع تھی ؛ چنانچہ اگر کوئی اجنبی مسلمان ہونے کے لئے آتا تو اہل اسلام اس کو بھی بیت الارقم پہنچا دیا کرتے تھے ۔ بیت الارقم اتنا کشادہ تھا کہ اس میں تیس آدمی آنحضرتؐ کے ساتھ نماز با جماعت پڑھ سکتے تھے ۔

قریش کی معاندانہ تدبیریں : قریش کو جب اس طرح مخالفت کر کے کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے اس مقصد کے لئے بالواسطہ طریقے اختیار کئے ۔ [چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو] روپے پیسے ، خوبصورت لڑکیوں ، حتٰی کہ مکے کی بادشاہت کی لالچ دلائی صرف ایک شرط پر کہ آپؐ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں ۔ آنحضرتؐ نے ان کے جواب میں سورۂ ۴۱ [حٰمٓ السجدہ] کی آیات سجدہ تلاوت فرمائیں۔ پھر فرمایا: اے ابو ولید ! جو کچھ تم نے سنا یہی اس کا جواب ہے (ابن ہشام: سیرۃالنبویہ، ۱:۳۱۳ تا ۳۱۴)۔ پھر ایک مرتبہ یہ کہا کہ ہم سب تمہارے رب پر ایمان لانے کو تیار ہیں ، لیکن تو بھی ہمارے بتوں پر ایمان لا ۔ [اس کے جواب میں سورۂ ۱۰۹ (کافرون) [رک بآن] نازل ہوئی] ۔ جب ہر طرف سے ہار گئے تو [ابو جہل ، عتبہ ، شیبہ وغیرہ سرداران قریش] جناب ابوطالب کے پاس پہنچے اور کہا کہ ہم تمہاری بڑی عزت کرتے ہیں ، لیکن تمہارا بھتیجا [ہمارے بتوں کو برا بھلا کہتا ہے ، ہمارے دین میں کیڑے ڈالتا ہے ، ہمارے داناؤں کو بے وقوف اور بزرگوں کو گمراہ ٹھیراتا ہے ۔ اور] باپ بیٹے ، بہن بھائی ، میاں بیوی میں تفرقہ ڈال کر ناقابل برداشت فساد پھیلا رہا ہے ۔ اسے روکو ؛ تمہاری خاطر ہم نے اب تک اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی ؛ اگر تم نہ روکو گے تو ہم مجبور ہو جائیں گے کہ جبراً اسے چپ کرائیں ۔ [اس موقع پر ابوطالب بھی اپنی قوم کی شدید مخالفت سے گھبرا گئے۔ اور آپؐ کو بلا کر ساری بات بیان کر دی اور اپنی کمزوری اور ضعف کا واسطہ دیا ۔ آپؐ نے فرمایا کہ بخدا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند بھی رکھ دیں اور مجھے اس تبلیغ سے روکیں تو میں ہرگز نہیں رکونگا، تاآنکہ یا تو یہ دین غالب ہو جائے یا میں جان کھو دوں ۔ یہ کہتے ہوئے آپؐ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ۔ ابو طالب بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور دوبارہ اپنی مدد کی آپؐ کو یقین دہانی کرائی (ابن ہشام : سیرۃ ، ۱ : ۲۸۳ تا ۲۸۵)] ۔ اس کے بعد پھر ایک مرتبہ قریش نے یہ تجویز پیش کی کہ محمدؐ کو ہمارے سپرد کر دو ؛ ہم اسے قتل کر کے ملک کو فساد سے نجات دلانا چاہتے ہیں اور اس کے معاوضے میں جس خوبصورت عقلمند مکی نوجوان کو چاہو چن لو ، ہم وہ تمہیں دے دیں گے کہ اسے متبنّٰی بنا لو ۔ ابو طالب نے پر لطف جواب دیا کہ یہ تو انصاف نہیں کہ تم تو میرے بیٹے کو قتل کر دو اور میں تمہارے بیٹے کو ساری عمر کھلاؤں پلاؤں (حوالہ مذکور).

حضرت حمزہؓ کا قبول اسلام : آنحضرتؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شکار کا بہت شوق تھا ۔ ایک دن شکار سے واپسی پر ان کی لونڈی نے ان کو بتایا کہ آج تمہارے بھتیجے محمدؐ کو ابو جہل نے غیر معمولی طور پر سخت تکلیف دی ہے ۔ حمیت میں آکر سیدھے ابو جہل کے پاس پہنچے ۔ اپنی فولادی کمان سے اس پر وار کر کے اسے زخمی کیا اور کہا کہ کیا تو سمجھتا ہے کہ محمدؐ کا کوئی چچا ، کوئی محافظ نہیں ؟ سن لو ، میں بھی مسلمان ہو گیا ہوں (ابن ہشام ، ۱ : ۳۱۱ ببعد)۔ [بعد ازاں

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر کے مسلمانوں میں شامل ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق یہ واقعہ ۶ نبوت کا ہے (السہیلی : روض الانف ، ۱ : ۱۸۵ ؛ [نیز رک بہ حمزہؓ]).

حضرت عمرؓ کا قبول اسلام : حضرت عمرؓ فاروق کو بھی شروع میں اسلام اور اہل اسلام سے بے وجہ عداوت تھی؛ [چنانچہ وہ بھی دوسرے مشرکین کی طرح] اسلام لانے والوں کو ستاتے ، لیکن جب دیکھا کہ ہر طرح کی ایذا رسانی کے باوجود اسلام پھیلتا ہی جا رہا ہے تو ایک دن ایک خطرناک فیصلہ کیا کہ (معاذ اللہ) آنحضرتؐ کو ہی قتل کر دیں - ہتھیاروں سے لیس ہو کر وہ آنحضرتؐ کی تلاش میں نکلے - راستے میں نُعَیمؓ بن عبداللہ (جو ایک مسلمان تھے) ملے - ان کا خطرناک ارادہ سن کر کہا : عمر! پہلے اپنے گھر کی خبر لو ؛ تمھاری بہن اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں - لہذا بنی ہاشم کے طاقتور قبیلے سے جنگ مول لینے سے پہلے اپنے کنبے کو تو درست کرو - فوراً بہن کے گھر گئے - تلاوت قرآن کریم کی آواز سنی تو صحت کا یقین ہو گیا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا - گھر میں ایک معلم قرآن حضرت خبابؓ بن الارت ان کو قرآن کریم پڑھا رہے تھے - ان کی بہن حضرت فاطمہؓ نے قرآن کے اوراق چھپا لیے - بہنوئی نے دروازہ کھولا - حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا پڑھ رہے تھے ؟ مجھے دکھاؤ اور اس کے ساتھ ہی اپنے بہنوئی حضرت سعیدؓ بن زید کو مارنا شروع کر دیا - بہن نے چھڑانے کی کوشش کی تو ایک آدھ گھونسا انھیں بھی لگ گیا اور شاید منہ سے خون بہنے لگا - اب بہن نے جوش میں آ کر فرمایا جو چاہو کر لو ؛ ہم مسلمان ہو گئے ہیں - حضرت عمرؓ نے بہن کو زخمی دیکھا تو شرمندہ ہوے اور نرمی سے کہنے لگے کہ مجھے بتاؤ تم کیا پڑھ رہے تھے؟ حضرت عمرؓ اب بالکل پگھل گئے اور کہا میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں تمھارا دین کیا ہے ؟ حضرت فاطمہؓ نے جوش کے عالم میں تلخ ترش باتیں کیں - پھر فرمایا : جاؤ پہلے غسل کر کے آؤ چنانچہ بعد از غسل حضرت عمرؓ نے اس صحیفہ مقدسہ سے سورۂ طٰہٰ [رک باں] یا سورۂ حدید [رک باں] (عبدالحق محدث دہلوی : مدارج النبوت ، ۵۸ ببعد) کی کچھ آیات پڑھیں تو ان کی کایا پلٹ گئی اور کہا یہ تو بڑی دلآویز چیز ہے - بتاؤ مسلمان کس طرح ہوتے ہیں ؟ اب استاد حضرت خبابؓ بھی باز و کے کمرے سے نکلے اور کہا : اے عمر ! کل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے اللہ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ ! ابو جہل یا عمر سے اسلام کو تقویت دے - خوشخبری ہو کہ یہ سعادت تمھارے حصے میں آئی ہے - پھر وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لے کر بیت الارقم آئے - دروازہ کھٹکھٹانے پر حضرت عمرؓ کو دیکھ کر اندر والوں کو ہچکچاہٹ ہوئی ، مگر آنحضرتؐ نے فرمایا : دروازہ کھول دو - جب حضرت عمرؓ اندر آئے تو آنحضرتؐ نے کپڑے سے پکڑ کر جھنجوڑا اور فرمایا : عمر تم کس ارادے سے آئے ہو ؟ حضرت عمرؓ نے فوراً کلمۂ شہادت پڑھا - یہ اتنا اچانک اور غیر متوقع امر تھا کہ موجود صحابہؓ کے بے ساختہ نعرۂ تکبیر سے پورا علاقہ گونج اٹھا - [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی اچانک غیر متوقع معاملہ پیش آتا تو اس پر تکبیر (اللہ اکبر) فرماتے - آپ کا یہ معمول خالصۃً اللہ کی توحید اور عظمت خداوندی کے اظہار کے لیے تھا - ایسا ہی حضرت عمرؓ کے اسلام لانے پر ہوا] - پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ! کفر تو اپنا مظاہرہ علانیہ کرتا ہے ، مگر ہم دین حق کے باوجود اس کا اخفا کیوں کریں ؟ اس پر وہاں موجود تیس چالیس آدمی قطار باندھ کر نکلے - سب لوگ حرم کعبہ میں

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

پہنچے اور با جماعت نماز ادا کی ۔ کسی کافر کو ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمرؓ کو دعوت مبارزت دے (ابن ہشام ، سیرة ، ۱ : ۳۶۶ تا ۳۷۵) ۔ ایک دوسری روایت (حوالۂ مذکور) میں ہے کہ انھوں نے چھپ کر آنحضرتؐ کو تلاوت قرآن کریم کرتے سنا جس سے ان کے دل پر اثر ہوا اور وہ مسلمان ہوگئے ۔ البخاری (مناقب الانصار، ۶۳ : ۳۵ : ۱۸) میں بھی حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے بارے میں ایک روایت ہے ۔ ان میں پہلی روایت ہی مشہور و مقبول ہے [نیز رک بہ عمرؓ ؛ السہیلی : روض الانف ، ۱ : ۲۷۲ ببعد].

ہجرت حبشہ اولیٰ ۵ نبوی : مکے میں مسلمانوں پر مظالم روز افزوں دیکھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک دن ان سے فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو تم لوگ حبشہ چلے جاؤ ؛ وہاں ایک نیک دل حکمران ہے جس کے ہاں حق کا پاس ہوتا ہے اورکسی پر ظلم نہیں ہوتا ؛ وہاں رہو تا آنکہ خدا تمہارے لیے چھٹکارے کی کوئی صورت پیدا کر دے (ابن ہشام، ۱ : ۳۴۴) ۔ گیارہ [یا بارہ مسلمان مردوں اور چار یا پانچ مسلمان عورتوں] کی پہلی جماعت نے ، جس میں حضرت عثمانؓ اور ان کی بیوی، آنحضرتؐ کی دختر، حضرت رقیہؓ بھی شامل تھے وہاں پہنچ کر خیر و عافیت کی اطلاع دی (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۰۳ ببعد) ۔ اس پر مزید کچھ لوگ روانہ ہوئے؛ [یہ جماعت ایک افواہ کی بنا پر کچھ عرصہ بعد واپس آ گئی، مگر پھر جب اذیت رسانی شدت اختیار کرگئی تو مکرر آپؐ کی اجازت سے ۸۳ مسلمانوں نے ، جن میں ۱۱ قریشی خواتین بھی تھیں، حبشہ کو ہجرت کی (ابن سعد، ۱ : ۲۰۷)] ۔ اس میں حضرت جعفر طیارؓ بن ابی طالب بھی تھے ان کو آنحضرتؐ نے ایک خط بنام نجاشی دیا (دیکھیے الوثائق السیاسیة ، عدد ۲۱)؛ غالباً یہ خط ان کو بطور تعارف و سفارش نامہ دیا گیا تھا ۔

کفار قریش نے مہاجرین حبش کو ، حبشہ سے واپس لانے کے لیے دو افراد عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص پر مشتمل ایک سفارت شاہ حبشہ کے پاس مع تحائف بھیجی ۔ انھوں نے بادشاہ اور اس کے درباریوں کو اپنے گرانقدر تحائف اور اپنی چرب زبانی سے متأثر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور بادشاہ کو کہا کہ یہ ہمارے لونڈی غلام بد دین ہوکر یہاں پناہ گزین ہوگئے ہیں ، مگر نیک دل بادشاہ نے کہا کہ مناسب ہے کہ ان کی بات بھی سن لی جائے؛ چنانچہ ان صحابہ کرامؓ کو بلایا گیا ۔ [اس موقع پر حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر فرمائی اس نے نہ صرف شاہ حبشہ کو متاثر کیا، بلکہ صحابہ کرامؓ کی حق گوئی اور طلاقت لسانی کا ایک اعلی معیار بھی پیش کیا (دیکھیے ابن الجوزی)] ۔ اس پر شاہ حبشہ نے صحابہ کرامؓ کو واپس کرنے سے انکار کر دیا (احمد بن حنبل : مسند، ج ۱، مسند اهل بیت؛ الحاکم : مستدرک ج ۲، کتاب التفسیر) ۔ دوبارہ اگلے روز مشرکین کی سفارت کی طرف سے نجاشی کے دربار میں مکرر یہ الزام تراشی کی گئی کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کے منکر ہیں ۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت جعفرؓ نے جواب دیا کہ ہمارے عقیدے کے مطابق وہ روح اللہ اور کلمة اللہ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے پاکدامن حضرت مریمؑ کو عنایت فرمایا تھا ۔ اس جواب سے نجاشی مطمئن ہوگیا ۔ اس طرح مشرکین کی یہ سفارت مکمل طور پر ناکام ہوگئی ۔

جلد ہی حضرت ابوبکرؓ بھی ترک وطن کرکے حبشہ کی طرف عازم سفر ہوگئے ۔ راستے میں برک الغماد کے مقام پر قبیلۂ قارہ کے سردار ابن الدَّغِنَّة نے ، جو حضرت ابوبکرؓ کا رشتہ دار بھی تھا ، ان کے سفر کا سن کر افسوس ظاہر کیا ۔ وہ قریش کا فوجی حلیف اور با اثر شخص تھا ۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کو مکہ مکرمہ ساتھ لایا اور اعلان کیا : میں ابوبکرؓ کو اپنی پناہ میں

marfat.com
Marfat.com

لیتا ہوں ؛ کوئی انھیں تکلیف نہ دے۔ ابن الدغنہ کی پناہ دہی کے دوران میں انھوں نے اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنا لی ۔ وہ بڑے رقیق القلب تھے۔ بھرائی آواز سے قرآن پڑھتے تو محلے کے غیرمسلم مرد عورتیں ، حتّٰی کہ لونڈی غلام بھی ان کی تلاوت قرآن کریم کو سننے آنے لگے۔ قریش مکہ کی شکایات پر نے ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس سے روکنا چاہا ، مگر حضرت ابوبکرؓ نے ابن الدغنہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے تمھاری حفاظت کی ضرورت نہیں ، اللہ کی حفاظت کافی ہے (البخاری : الصحیح ، باب ھجرۃ المدینہ ؛ ابن ہشام : سیرۃ ، ۲:۱، ۱ تا ۱۳)۔

حیرت نہ ہو کہ حبشہ میں مسلمان پناہ گزین نجاشی کے دل سے شکر گزار تھے ؛ چنانچہ جب ایک بار ملک میں خانہ جنگی ہوئی تو ان مسلمانوں نے نجاشی کی فوج میں رضا کارانہ شرکت کر کے بڑی جانبازی دکھائی تھی (ابن ہشام ، ۱ : ۳۶۵)۔ [ان مہاجرین میں سے کچھ (تقریباً تینتیس مرد اور آٹھ عورتیں) تو اس وقت واپس آئے جب انھیں آپؐ کی ہجرتِ مدینہ کی خبر ملی ۔ ان میں سے دو آدمی مکہ میں وفات پا گئے، سات وہاں محبوس کر لیے گئے اور بقیہ آپ کی خدمت میں پہنچ گئے ؛ ان میں سے چوبیس افراد نے غزوۂ بدر میں بھی شرکت کی ۔ ۷ھ میں باقی ماندہ مہاجرین حبش اس وقت آپؐ کی خدمت میں باریاب ہوئے جب آپؐ خیبر فتح کر چکے تھے (دیکھیے ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۰۷ ؛ نیز رک بہ ہجرت)]۔

مقاطعۂ قریش (۷ نبوی) : مشرکین کو جب حبشہ سے ناکامی ہوئی تو انھوں نے شہر کے بے کس مسلمانوں کی ایذا رسانی میں اور اضافہ کر دیا اور پھر مشورۂ عام کے بعد ایک قرارداد لکھی اور اس پر حلف لیا گیا کہ کوئی شخص بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب سے شادی بیاہ کے تعلقات نہ رکھے ، خرید و فروخت نہ کرے ، بلکہ ان سے بات چیت تک بھی نہ کرے (ابن ہشام ، ۱:۳۷۵ ببعد)۔ اہمیت دینے کے لیے اسے کعبے کے اندر لٹکا دیا گیا تھا ۔ [دیگر قبائل (بنو) کنانہ نے بھی اس معاہدے میں شرکت کر کے اس کو تقویت پہنچائی ۔ جناب ابو طالب اپنے خاندان والوں سمیت شِعب ابی طالب میں محصور ہو گئے] ۔ یہ بڑا سخت معاملہ تھا ۔ بنو ہاشم کے تین سال بڑی مصیبت میں گزرے ؛ صرف حج کے زمانے میں اجنبی تاجروں سے کچھ لین دین کیا جا سکتا تھا اور اسی موسم میں آپؐ وعظ و تبلیغ فرما سکتے تھے ، لیکن مکے میں تجارتی مقاطعے کی باعث اندوختہ جلدی ہی ختم ہو گیا اور سال بسال کی اس خرید و فروخت کے کے امکان سے بھی کوئی فائدہ نہ ہو سکا ۔ حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار کبھی کبھار مخفی طور پر کچھ اشیا بھیج دیتے، مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا؟ ایک دو آدمی نہیں، یہاں دو قبیلوں کے افراد تھے۔ اس دوران میں بھوک مٹانے کے لیے بنو ہاشم نے جڑی بوٹیاں تک کھائیں اور سوکھے اور بدمزہ چمڑے ابال کر تناول کیے۔ اس خاندان کے مسلمان اور غیر مسلم رشتہ دار سبھی اس کا ہدف بنے (بجز ابو لہب کے کہ اس نے قبیلے کا ساتھ چھوڑ کر شہر ہی میں سکونت رکھی (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۰۸ تا ۲۱۰ ؛ السہیلی : روض الانف ، ۱ : ۲۲۰ و بعد ؛ ابن ہشام ، ۱:۳۷۵ تا ۳۷۸)۔

مکہ مکرمہ میں کچھ نیک دل لوگ بھی تھے ، مگر ابوجہل ان کی پیش نہ چلنے دیتا تھا ۔ آخر ہشام بن عمرو بن ربیعہ العامری کی کوششوں سے زہیر بن ابی امیہ ، حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار مطعم بن عدی، نیز زمعہ بن الاسود اور ابوالبختری بن ہاشم، مختلف قبائل کے لوگوں نے رات کو ایک مخفی جلسے میں اس معاہدے کی منسوخی کا طریقۂ کار مرتب کیا ۔ پھر صبح کو کعبۃاللہ کے پاس اپنے اپنے حلقے میں جمع ہوئے ۔ طواف کے بعد اولاً زہیر نے اعلان کیا کہ جب تک اس خلافِ انسانیت مقاطعہ

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

کو ختم نہ کیا جائے گا ، میں چین سے نہیں بیٹھوں گا ۔ ابوجہل نے مخالفت کی تو باقی چار نیک دل اصحاب نے بھی اپنے اپنے قبیلے کی طرف سے یکے بعد دیگرے مقاطعے کی منسوخی کا اعلان کیا ۔ [۱۰ نبوی میں یہ مقاطعہ ختم ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے رفقا شعب ابی طالب سے باہر تشریف لائے] (ابن ہشام : سیرۃ، ۲: ۱۴ تا ۲۱؛ [انساب الاشراف، ۱ : ۲۳۳ تا ۲۳۶ ؛ جوامع السیرۃ ، ص ۶۴ ؛ الوفا ، ۱ : ۱۹۷ تا ۱۹۹]).

عام الحزن (۱۰ نبوی) : آپؐ کو اور آپ کے رفقا کو اس مصیبت سے نجات تو مل گئی ، لیکن قریش کے سہ سالہ مقاطعے نے بہت سے افراد کی صحتیں برباد کر دیں ۔ آنحضرتؐ شہر میں تشریف لائے تو جلد ہی ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ اور چچا ابو طالب وفات پا گئے ۔ یہ واقعہ ۱۰ نبوی کا ہے ۔ آنحضرتؐ نے کوشش تو بہت کی کہ ابو طالب کو کلمۂ شہادت پڑھنے پر آمادہ کریں ، مگر ابو جہل وغیرہ مشرکین مکہ کی طعن و تشنیع کے باعث کہا تو آخر دم صرف یہ کہ میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں (ابن ہشام ، ۲ : ۵۸ تا ۶۰ ؛ السہیلی ، ۱ : ۲۵۸).

سفر طائف : ابو طالب کی وفات پر ابولہب بنو ہاشم کا سردار بنا ۔ شروع میں تو اس نے اعلان کر دیا کہ آنحضرتؐ اپنے اقوال و اعمال کے خود ذمہ دار ہیں، خود وہ اس سے بری ہے ۔ [یہ اعلان گویا آپؐ کو برادری سے خارج کر دینے کے مترادف تھا] کہ جو چاہے آپ کو (معاذ اللہ) قتل کر دے ، قبیلہ آپؐ کی حمایت نہ کرے گا ۔ [اس محاصرے سے نکلنے کے بعد دوسرا انقلاب یہ آیا تھا کہ سرداران قریش نے آپؐ کے خلاف گھیرا تنگ کر دیا ؛ چنانچہ کچھ لوگ ہر وقت آپؐ کا تعاقب جاری رکھتے اور جہاں آپؐ وعظ فرمانا چاہتے آپؐ کو روک دیا جاتا، یا شور و غل مچا دیا جاتا ۔ علاوہ ازیں بیت اللہ شریف میں نماز پڑھنے کے دوران آپؐ پر گندگی اور غلیظ اوجھڑی رکھ دینے کے واقعے سے بھی پتا چلتا ہے کہ آپؐ کے لیے اس علاقے میں رہنا مشکل کر دیا گیا تھا] ۔ بے بسی کے عالم میں آپؐ ۲۰ شوال ۱۰ نبوی کو اپنے خادم حضرت زیدؓ بن حارثہ کے ہمراہ طائف تشریف لے گئے، جہاں آپؐ کی والدہ کے کچھ رشتہ دار تھے۔ یہاں ان دنوں عمرو بن عمیر کے تین بیٹے عبد یالیل، مسعود اور حبیب برسراقتدار تھے۔ آپؐ یہاں دس روز ٹھیرے ؛ ان لوگوں کو سرمایہ داران قریش کی مخالفت کی کہاں ہمت ہوسکتی تھی۔ ان کا [جواب اور رویہ حوصلہ شکن تھا] ۔ تینوں بھائیوں نے آپؐ کی نہ صرف یہ کہ بات نہ سنی بلکہ شہر کے لونڈوں اور اوباشوں کو بھی "شہر بدر" کرنے کے لیے آپؐ کے پیچھے لگا دیا ۔ انھوں نے پتھر مار مار کر آپؐ کو زخمی کیا ۔ [کثرت سے خون نکلنے کی وجہ سے جوتے پاؤں کے ساتھ چپک گئے]۔ پھر ایک باغ کے پاس [جو عتبہ و شیبہ، فرزندان ربیعہ، کی ملکیت تھا آپؐ] پہنچے تو ان کے نیک دل عیسائی [غلام عدّاس نے اپنے آقاؤں کے کہنے کے مطابق] کچھ میووں سے آپؐ کی ضیافت کی ۔ [وہ غلام آپؐ سے اس قدر متاثر ہوا کہ بے ساختہ آپؐ کے سر ، ہاتھ اور قدم چوم لیے]۔ اس بے بسی کے عالم میں آپؐ نے جو دعا کی وہ یہ تھی : اے اللہ! میں تیرے پاس اپنے ضعف ، اپنے وسائل کی کمی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بےقدری کی شکایت کرتا ہوں ۔ اے ارحم الرّاحمین ! کمزوروں اور عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے ۔ تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے ؟ کسی ایسے بیگانے کے جو مجھ سے درشتی سے پیش آئے یا کسی ایسے دشمن کے جسے تو میرے معاملے پر قابو دے دیتا ہے ؟ لیکن اگر تو مجھ سے خفا نہیں تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ، کیونکہ تیری عافیت

marfat.com
Marfat.com

ہی میں میرے لیے بڑی وسعت ہے ۔ میں تیرے بزرگ چہرے کے نور کے واسطے سے ، جس نے تاریکیوں کو روشن کیا ہے اور جس کے سبب ہی سے دنیا و آخرت کے امور ٹھیک حالت میں ہیں ، اس بات سے پناہ طلب کرتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو، یا مجھ پر تیری خفگی اترے ۔ عتاب کا حق تجھی کو ہے یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے ۔ کوئی طاقت اور کوئی قوت نہیں بجز اس کے کہ تیرے ہی ذریعے سے ہو ۔ [طائف سے واپس تشریف لاتے ہوے مزید یہ بھی فرمایا کہ میں ان لوگوں کی تباہی کے لیے کیوں بد دعا کروں ؟ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو امید ہے کہ آئندہ ان کی نسلیں ضرور ایمان لائیں گی (الوفا ، ۱ : ۲۱۱ تا ۲۱۴)].

آزمائش کی گھڑی ختم ہو گئی تھی اور اس دعا کی مقبولیت کے آثار فوراً ظاہر ہونے شروع ہوگئے ۔ رات ہوئی تو آنحضرت ؐ وہاں سے پیدل مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوے ۔ نخلہ پہنچ کر منزل کی اور جب نماز پڑھنے لگے تو کچھ جن جب ادھر سے گزرے تو قرآن کی آواز سن کر آپ ؐ کے دست حق پرست پر مسلمان ہو گئے اور پھر اپنی قوم میں بھی جا کر تبلیغ کرنے لگے (۴۶ [الاحقاف] : ۲۹ تا ۳۲).

چونکہ آپ ؐ کی برادری نے آپ کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے آپ ؐ مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ کر رک گئے اور ایک خزاعی کے ذریعے ایک ممتاز سردار اور حضرت خدیجہ رض کے رشتہ دار مُطعم بن عدی کے پاس بھیجا کہ مجھے اپنی حمایت میں لے لو ۔ اس نے فوراً درخواست قبول کر لی اور اپنے بیٹوں کو لے کر مسلح حالت میں جبل حرا کے پاس پہنچا اور وہاں سے آنحضرت ؐ کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ لایا اور اپنی اور اپنے بیٹوں کی تلواروں کے سائے میں طواف کعبہ کروایا اور اپنی حمایت کا برملا اعلان کیا ۔ پھر آپ ؐ اپنے گھر جا سکے (الطبری : تاریخ ، ۱ : ۱۲۰۳ تا ۱۲۰۴؛ ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۲۱۰ تا ۲۱۳).

[اسراء و معراج : اس امر میں کسی قدر اختلاف ہے کہ واقعۂ معراج کب اور کس تاریخ کو پیش آیا ، نیز یہ کہ یہ واقعہ ایک دفعہ پیش آیا یا متعدد مرتبہ ؟ مستند اور محقق روایات کے مطابق اس واقعے کا وقوع ایک ہی مرتبہ ہوا ۔ تعدد کے قائلین کا استشہاد تعدد و اختلاف روایات سے ہے جب کہ یہ اختلاف جزئیات کے بیان میں ہے نہ کہ اصل واقعہ کے بیان میں ۔ پھر باقاعدہ نظام کتابت نہ ہونے کی وجہ سے ایسے واقعات کے راویوں میں اختلاف کا پایا جانا غیر متوقع بھی نہیں ۔

عام طور پر اس واقعے کے ضمن میں اسراء اور معراج کے دو عنوان قائم کیے جاتے ہیں اور ان میں کسی قدر فرق ہے ۔ اول الذکر سے مراد مسجد حرام سے مسجد اقصٰی تک کا زمینی سفر ہے ، جس کا ذکر قرآن مجید کی ایک مستقل سورۃ (۱۷ [بنی اسرائیل]) میں کیا گیا ہے ۔ ثانی الذکر سے مراد عروج آسمانی ہے ، جس میں رؤیت ملائکہ سے لے کر جنت و دوزخ کی سیر اور مناجات باری تک کے مقاصد شامل ہیں ۔

اس واقعہ کے وقوع میں پانچ اقوال مروی ہیں، مگر ان میں سے مستند اور محقق یہی ہے کہ یہ واقعہ ۲۷ رجب ۱۰ نبوی کو بوقت شب بعد از نماز عشاء و قبل از صلوٰۃ الفجر پیش آیا (دیکھیے الزرقانی : شرح المواہب ، ۱ : ۳۰۶ تا ۳۰۹ ؛ ابن ہشام ۳: سیرۃ، ۲: ۳۷ تا ۴۹؛ ابن سعد : الطبقات، ۱: ۲۱۳ تا ۲۱۵ ؛ سید سلیمان ندوی : سیرۃ النبی ، ۳: ۳۹۳ تا ۴۸۳؛ سلیمان منصور پوری: رحمۃللعالمین ، ۱: ۷۰، مطبوعہ لاہور؛ W. Muir: *Life of Muhammad*، ص ۱۲۱ ، مطبوعہ ۱۹۲۳ء).

واقعۂ معراج کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شب آپ ؐ حطیم یا حجر کعبہ میں استراحت فرما تھے

marfat.com
Marfat.com

(البخاری : الصحیح ، ۳ : ۶۳/۴۲/۱) ؛ بیداری اور نیند کی درمیانی حالت تھی کہ آپؐ نے حضرت جبریلؑ کی معیت میں متعدد فرشتوں کو اپنے پاس آتے ہوے دیکھا۔ انھوں نے آپؐ کے سینۂ اطہر کو چاک کیا اور آب زمزم سے دھو کر علم و حکمت اور حلم و ایقان سے بھر دیا۔ پھر آپؐ کے سامنے سواری کے لیے گھوڑے سے کسی قدر چھوٹا سفید رنگ کا جانور پیش کیا جسے تیز رفتاری کی وجہ سے براق [رک بآن] کا نام دیا گیا ہے۔ حد نگاہ پر اس کا قدم پڑتا تھا۔ اسی پر سوار ہو کر آپؐ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ جب آپؐ دو رکعت نماز نفل سے فارغ ہوے تو آپؐ کو دودھ اور شراب کے دو پیالے پیش کیے گئے کہ آپؐ جسے چاہیں منتخب کر لیں۔ آپؐ نے دودھ کے پیالے کو ترجیح دی۔ اس پر حضرت جبریلؑ نے فرمایا کہ اگر شراب کا پیالہ اٹھاتے تو امت گمراہ ہو جاتی۔ امام بخاری (کتاب مذکور) کی روایت کے مطابق یہ پیالے آپؐ کو عالم بالا میں پیش کیے گئے۔ پھر آپؐ حضرت جبریلؑ کی معیت میں آسمان کے دروازے پر پہنچے تو دربانوں نے پوچھا: کون ہے؟ جواب ملا: جبریلؑ پوچھا گیا: ساتھ کون ہے؟ جواب دیا گیا: محمدؐ۔ پوچھا گیا: کیا ان کو بلایا گیا ہے؟ جواب ملا: ہاں۔ اس پر دروازہ کھلا اور آپؐ کو مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا۔ پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ نے فرزند صالح و نبی صالح کہ کر آپؐ کو خوش آمدید کہا؛ دوسرے اور اس کے بعد کے آسمانوں کے دروازوں پر بھی یہی سوال جواب دہرائے گئے۔ دوسرے آسمان پر فرشتوں کے علاوہ آپؐ کی ملاقات حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ سے، تیسرے آسمان پر حضرت یوسفؑ سے، چوتھے آسمان پر حضرت ادریسؑ سے، پانچویں پر حضرت ہارونؑ سے، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ سے، ساتویں پر حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی اور ہر ایک نے آپؐ کو خوش آمدید و مرحبا کہا۔ آگے بڑھ کر آپؐ عالم بالا کے مقام سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے۔ وہاں آپؐ نے بیت اللہ شریف کی طرز پر بیت المعمور دیکھا، جہاں ہر روز سترہزار فرشتے عبادت کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی سے گفتگو کی، جس کی کیفیت و کمیت کے بیان کرنے سے بحر الفاظ و معانی قاصر ہے۔ واپسی پر تین تحائف ملے: (۱) سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں؛ (۲) یہ بشارت کہ جو شرک کا مرتکب نہ ہوگا عفو و مغفرت کا سزاوار ہوگا؛ (۳) پانچ وقت کی فرض نمازیں۔ واپسی ہی میں آپؐ کو جنت و دوزخ اور ملأ اعلیٰ کے دوسرے مناظر دکھلائے گئے (البخاری: الصحیح، کتاب الصلوۃ، باب ۱؛ کتاب الحج، باب ۷۶ و کتاب مناقب الانصار، باب ۴۲، ۴۳ وغیرہ؛ مسلم: الصحیح، باب المعراج؛ ابن جریر: تفسیر؛ الزمخشری: الکشاف؛ محمود آلوسی: روح المعانی، بذیل ۱۷ [بنی اسرائیل] و ۵۳ [النجم]؛ احمد بن حنبل: مسند، ۱: ۲۵۷؛ ۲: ۳۵۲؛ ۳: ۱۸۲، ۲۲۴، ۲۳۱، ۲۳۹؛ ۴: ۶۶، ۱۴۳، ۲۰۷؛ ۵: ۱۴۳، ۳۸۷؛ الطبری: تاریخ، ۱: ۱۱۵۷ ببعد؛ [نیز رک بہ اسراء؛ معراج؛ بنی اسرائیل].

معراج کی خبر سے مکے میں چہ میگوئیاں ضرور ہوئیں، لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اس خبر سے حلاوت ایمان سے شاد کام ہونے والا کوئی بھی مسلم فرد مرتد ہو گیا ہو۔

پناہ گاہ کی تلاش اور شب مصائب کی طلوع سحر: [معراج سے واپسی پر آپؐ نے تبلیغ و دعوت کی مہم کو مزید تیز کر دیا۔ اب آپؐ مکہ مکرمہ کے پاس آباد دیگر قبائل کے پاس تشریف لے جاتے۔ اس طرح آپؐ] بنو کلب، بنو فزارہ، بنو عامر بن صعصعۃ، بنو حنیفہ، بنو شیبان، بنو حارث، بنو کعب، بنو کندہ، بنو مرہ، وغیرہ [قبائل کے علاوہ اہم مقامات اجتماع، مثلاً ذوالمجاز، مجنّہ اور عکاظ وغیرہ

marfat.com
Marfat.com

(میلوں) اور موسم حج کے اجتماع میں دعوت اسلام دیتے رہے] (المقریزی، امتاع، ۱: ۳۰ تا ۳۱، جہاں چودہ قبیلوں بشمول غسان کا ذکر ہے)؛ السہیلی (روض الانف) اور ابن ہشام (سیرة) وغیرہ نے چند مزید نسلوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ آپؐ کی دعوت کے جواب میں کسی نے اخلاق و نرمی سے، کسی نے اجڈ پن اور سختی سے انکار کیا، مگر کوئی بھی اس سعادت دارین کے حصول کا خواہشمند نہ ہوا۔

عَقَبۂ اُولیٰ: بالآخر ایک روز آپؐ نے میدان مِنٰی کے باہر، عقبہ کے موڑ پر چھے آدمیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت دیکھی، جو رسوم حج ادا کرنے مدینۂ منورہ [رک بآں] سے مکہ معظمہ آئی ہوئی تھی۔ یہ سب خزرجی تھے۔ [ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں: اسعد بن زرارہ، عوف بن حارث، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر، عقبہ بن عامر، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم]. آنحضرتؐ کی تبلیغ پر انہوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا اور وعدہ کیا کہ گھر جا کر مزید کوشش کریں گے۔ یہ بیعت عقبۂ اولیٰ کہلاتی ہے (المقریزی: امتاع، ۱: ۳۰)۔ [اہل یثرب میں اسلام کی فوری اشاعت کے مختلف اسباب ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان پیشینگوئیوں سے واقف تھے جو سابقہ کتب مقدسہ میں نبی آخرالزمان کی آمد سے متعلق تھیں اور دوسرا یہ کہ] یثرب کے دو بڑے قبائل اوس اور خزرج، ایک عرصۂ دراز سے باہمی قتل و خونریزی سے اکتا گئے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی غیر جانبدار اور انصاف پسند ثالث کے گرد باہم متحد ہو جائیں۔ یہ اولیں مسلمان قبیلۂ خزرج کی شاخ بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے، جس سے خود آنحضرتؐ کی ننھیالی رشتہ داری تھی۔ [یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ارباب سیر نے عقبات کی تعداد اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے لکھی ہے۔ جس نے پہلی بیعت کو خارج کر کے بقیہ عقبات کو عقبات تصور کیا اس نے تعداد دو بیان کی اور جس نے اول کو بھی شمار کیا اس نے اس کی تعداد تین بیان کی۔ فرق واقعات کا نہیں، طرز بیان کا ہے۔ ہم نے مؤخرالذکر طریقے کو اس بنا پر پسند کیا ہے کہ اس سے منطقی طور پر واقعات کے فہم میں آسانی ہو جاتی ہے]۔

عقبۂ ثانیہ: عقبۂ اولیٰ میں شریک افراد نے وعدہ پورا کیا اور پورے سال اسلام کی اشاعت میں لگے رہے اور [اسلام کی تبلیغ اس تندہی سے کی کہ اوس و خزرج کے ہر گھر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے چرچے ہونے لگے]۔ دوسرے سال ۱۱ نبوی میں حج کے زمانے ہی میں پانچ پرانے اور سات نئے افراد آنحضرتؐ سے ملنے کے لیے آئے اور آپؐ کے ہاتھ پر مکرر بیعت کی (ابن ہشام، ۲: ۷۳ تا ۷۶)۔ [بعض نے] اسی کو عقبۂ اولیٰ بھی کہا ہے۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ ایک قابل شخص کو ان کا معلم اور مبلغ بنا کر مدینہ منورہ بھیجا جائے۔ اس کے لیے حضرت مُصعبؓ بن عُمیر [رک بآں] کو منتخب کیا گیا۔ اس سے پہلے نماز کی امامت کے سلسلے میں بنو اوس و خزرج کے مابین جو جھگڑے تھے وہ اس اقدام کی وجہ سے ختم ہو گئے (کتاب مذکور، ص ۷۶ تا ۷۸)۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر نے اس خوش اسلوبی سے تبلیغی کام انجام دیا کہ مدینہ منورہ میں بہت سرعت سے اسلام کی اشاعت ہونے لگی اور بعض اوقات تو پورے کا پورا خاندان یک وقت اسلام قبول کر لیتا تھا (ابن ہشام، ۲: ۷۶ تا ۷۸) معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مصعبؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے اس اثنا میں رابطہ قائم رکھا کیونکہ جب آنحضرتؐ کو مدینہ منورہ میں اسلام کی اشاعت کی خوشخبری ملی تو آپؐ نے حضرت مصعبؓ کو ایک خط ارسال فرمایا تھا (الوثائق السیاسیة و بحوالۂ السہیلی: روض الانف، ۱: ۲۷۰ تا ۲۷۲)، جس میں درج تھا کہ دن ڈھلے جمعے کی نماز پڑھا کرو۔ اس حکم کی تعمیل میں جب

marfat.com
Marfat.com

جمعے کی نماز کا مدینہ منورہ میں اہتمام کیا گیا تو بیان کیا گیا ہے کہ پہلی نماز جمعہ میں بارہ آدمی جمع ہوئے۔ (ابن سعد ، ۳/۱ : ۱۱۸)۔

عقبۂ ثالثہ : [اسی کو بعض نے عقبۂ ثانیہ لکھا ہے] ۔ تیسرے سال، یعنی ۱۲ نبوی کے موسم حج میں یثرب سے آنے والے پانچ سو حاجیوں میں سے تہتر مسلمان مرد اور دو خواتین تھیں ۔ یہ لوگ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے پہاڑ کی گھاٹی (عقبہ) میں رات کے وقت ملے ۔ ان لوگوں نے بیعت کےموقع پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپؐ اور دیگر مسلمان مکے سے مدینہ منورہ آ جائیں تو ہم آپؐ کی ویسی ہی حفاظت کریں گے جیسے کوئی اپنے اہل خاندان کی کرتا ہے ۔ انھوں نے یقین دلایا کہ اگر اس کے لیے ساری دنیا سے بھی جنگ کرنا پڑے تو وہ اس کے لیے بھی تیار ہوں گے اور ہر امر میں آنحضرتؐ ہی کی اطاعت کریں گے ۔ آنحضرتؐ نے ان کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے فرمایا : آج سے تمہاری خون طلبی ہی میری خون طلبی ہوگی ، اور تمہاری معافی میری معافی ہو گی ؛ میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے ۔ تعداد کی کثرت کے باعث آنحضرتؐ نے ان کے لیے بارہ نقیب نامزد فرمائے، جو بارہ خاندانوں کے لیے تھے اور ان میں سے اسعدؓ بن زرارہ کو، جو بنی النجار سے تعلق رکھتے تھے ، نقیب النقباء بنایا (البلاذری : انساب الاشراف، ۱:۲۴۳)۔ اس تنظیم کو تاسیس مملکت اور معاہدۂ اجتماعی کی ایک شکل قرار دیا جا سکتا ہے (ابن سعد: طبقات ، ۱ : ۲۲۱ تا ۲۲۳)۔

ہجرتِ مدینہ : بیعت عقبۂ ثالثہ کے بعد ، جو ذوالحجہ ۱۲ نبوی کا واقعہ ہے ، آنحضرتؐ کی ہدایت پر مکہ مکرمہ کے مسلمان چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ جانے لگے ۔ ان میں سے متعدد کو جسمانی اور مالی تکالیف سے سابقہ پڑا ۔ ان کی جائدادیں ، خاص طور پر مکان ضبط کر لیے گئے ۔ تھوڑے ہی دنوں میں مکہ مکرمہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا ۔ اور وہاں آنحضرتؐ اور حضرت ابو بکرؓ کا خاندان یا کچھ کمزور لوگ باقی رہ گئے، یا وہ نوجوان جن کو ان کے اہل خاندان نے ایذا دہی کے لیے قید کر رکھا تھا ۔

مسلمانان مکہ کے ترک وطن پر کفار قریش گھبرائے کہ اہل اسلام کسی دوسرے علاقے میں قوت حاصل کر کے کہیں مکے پر نہ ٹوٹ پڑیں۔ دارالندوہ میں اس مسئلے پر عمومی مشورہ ہوا ۔ بڑے غور و بحث کے بعد ایک تجویز قرار پائی کہ مکہ مکرمہ کے ہر قبیلے سے ایک کڑیل جوان کو چنا جائے اور یہ لوگ مشترکہ طور پر (معاذ اللہ) آنحضرتؐ کو قتل کر ڈالیں تاکہ بنو ہاشم اور مسلمانوں کو سارے قبائل سے جنگ کرنے کی ہمت نہ ہو سکے اور اس طرح وہ خون بہا لینے پر آمادہ ہو جائیں۔ ابن سعد [۸ : ۵۱ ، بیروت ۱۹۵۸ء] کے مطابق آنحضرتؐ کی ایک معمر رشتہ دار خاتون [رقیقہ بنت ابی صیفی بن ہاشم نے] جو غالباً اپنے شوہر کے خاندان میں اس تجویز سے واقف ہوئی ہوں گی آ کر آنحضرتؐ کو آگاہ کیا کہ قریش یکبارگی آپؐ پر ٹوٹ پڑنے والے ہیں ۔ آنحضرتؐ فوراً حضرت ابوبکرؓ کے ہاں تشریف لے گئے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا اور طے ہوا کہ رات کو آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے ہاں آ جائیں گے؛ پھر دونوں شہر کے جنوب میں واقع ایک پہاڑ کے غار ، غار ثور میں جا رہیں گے ۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ اطلاع ملتے یہ بندوبست کر لیا کہ روزانہ انہیں مکہ مکرمہ سے کھانا جاتا رہے اور انہیں شہر کے تازہ بتازہ حالات بھی معلوم ہوتے رہیں اور پھر چوتھے روز غار پر دو اونٹ اور ایک ماہر رہنما موجود ہو تاکہ وہ دونوں مدینہ منورہ روانہ ہو سکیں ۔ آنحضرتؐ نے

marfat.com
Marfat.com

مختلف لوگوں کی جو امانتیں پاس تھیں وہ اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ کے سپرد کیں تاکہ وہ مالکوں کو واپس کرنے کے بعد مدینہ منورہ آ جائیں۔ [جان لینے کے درپے دشمنوں کی امانتوں کو ان کے ارادۂ قتل کے بعد بھی واپس کرنا، یہی شان نبوت ہے]۔ مشرکین قریش رات کو حسب پروگرام آئے اور آ کر آپؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور صبح تک انتظار کرتے رہے۔ یہ لوگ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھڑکی سے جھانک کر اپنا اطمینان کر لیتے تھے کہ اندر کوئی شخص سو رہا ہے، لیکن اندر جانے کا حوصلہ کسی کو نہ ہوا۔ [جب رات زیادہ گزر گئی تو خدائے قادر و قیوم نے آپؐ کے دشمنوں کو غافل کر دیا۔ آپؐ ان کو بے خبر چھوڑ کر حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر پہنچے، جہاں سے ''غار ثور'' میں تین روز کے قیام کے لیے روانہ ہو گئے]۔ صبح ہوئی تو دشمنوں کو آنحضرتؐ کی جگہ حضرت علیؓ مکان میں ملے تو انہوں نے برہمی کا اظہار کیا، لیکن ان کا خون نہ بہایا۔ پھر آپؐ کی اور حضرت ابوبکرؓ کی ہر جگہ تلاش شروع ہوئی۔ گرفتاری کے لیے انعام بھی مقرر کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کھوجی تلاش کرتے غار ثور تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ دشمنوں کو اس قدر قریب دیکھ کر گھبرا گئے تو آپؐ نے فرمایا: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (۹ [التوبۃ]: ۴۰)، یعنی غم نہ کرو؛ اللہ ہمارے ساتھ ہے؛ چنانچہ اللہ تعالٰی نے قریب پہنچنے کے باوجود ان کو ناکام اور نامراد لوٹا دیا (البخاری: الصحیح، ۳: کتاب ۶۳، باب الھجرۃ)۔ اس دوران حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ صبح و شام آپؐ کے لیے کھانا اور حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ تازہ بتازہ خبریں پہنچاتے رہے۔ [علاوہ ازیں حضرت ابوبکرؓ کے مولٰی عامر بن فہیرہ بکریاں چرانے ادھر آ نکلتے۔ اس سے ایک تو آنے والوں کے نشان قدم مٹ جاتے، دوسرے وہ دودھ وغیرہ دے جاتے]، چوتھے روز [طے شدہ لائحۂ عمل کے مطابق] عبداللہ بن اُرَیقط (رہنما) دو اونٹنیاں لے کر غار کے باہر آ پہنچا۔ [عبداللہ بن اُرَیقط الدِّیلی بنو بکر بن عبدمنات میں سے تھا اور عاص بن وائل السھمی کا حلیف؛ وہ راستوں کے ایچ پیچ سے بڑا باخبر اور ماہر و تجربہ کار راہبر اور راہ دان تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کی مہارت راہ دانی اور امانت داری پر اعتماد کرتے ہوئے ہجرت کی غرض سے مدینے جانے کے لیے اس کی خدمات حاصل کی تھیں (انساب الاشراف، ۱: ۲۶۰؛ جوامع السیرۃ، ص ۹۱)]۔ اب ساحل کے ساتھ ساتھ نامانوس راستوں سے ہو کر مدینے کا سفر شروع ہوا۔ [ایک اونٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سوار ہوئے اور دوسرے پر حضرت ابوبکرؓ اور ان کے مولٰی عامر بن فہیرہ۔ بنو مُدلج کے سردار سُراقہ بن مالک بن جُعشُم نے آپؐ کو دیکھا تو سو اونٹوں کے لالچ میں آپؐ کا تعاقب شروع کر دیا۔ جب سُراقہ کا گھوڑا اس مقدس کارواں کے پاس پہنچا تو حضرت ابوبکرؓ بڑے پریشان ہوئے اور آنحضرتؐ کے بارے میں خطرہ محسوس کرنے لگے۔ آپؐ نے اپنے یار غار کو تسلی دیتے ہوئے اللہ کے حضور میں دعا کی: اَللّٰھُمَّ اکْفِنَاہُ بِمَا شِئْتَ، یعنی اے اللہ تو جس طرح چاہے اس سے خود نپٹ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے تو اس کا گھوڑا گرتے گرتے بچا؛ پھر جب وہ آگے بڑھنے لگا تو گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ اس پر سراقہ نے معافی مانگتے ہوئے آپؐ سے امان طلب کی؛ چنانچہ آپؐ نے اسے امان دے دی]۔ راستے میں [اُم مَعبد کے خیمے میں معجزانہ طور پر بکریوں کو دوہ کر] دودھ حاصل کرنے کا موقع بھی ملا۔ ادھر انصار مدینہ منورہ کے جنوب میں (قُبا کے پاس) آپؐ کا روزانہ انتظار کرتے تھے۔ جب آپؐ خیر و عافیت سے قبا پہنچ گئے تو مردوں نے ہتیاروں سے مسلح

marfat.com
Marfat.com

ہو کر، بچوں اور بچیوں نے ڈھولک اور دف بجاتے ہوئے ، اور یہ کہتے ہوئے آپؐ کا استقبال کیا :

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَى لِلّٰهِ دَاعِ
أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِيْنَا جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

[یعنی ثنیۃ الوداع کی طرف سے ہم پر چاند نکل آیا ۔ ہم پر شکر اس وقت تک واجب ہے جب تک کہ کوئی پکارنے والا اللہ کو پکارتا رہے گا ۔ اے وہ جو پیغمبرؐ کے طور پر ہم میں بھیجا گیا ہے ، تو وہ چیز لایا ہے جس کی اطاعت کی جائے گی] ۔ اس موقع پر انتہائی جوش و خروش اور خلوص و نیاز مندی کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا ۔ یہ دو شنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱ھ/ ۳۱ مئی ۶۲۲ء کا واقعہ ہے [انساب الاشراف ، ۱ : ۲۶۳ ؛ جوامع السیرۃ ، ص ۹۳ ؛ الوفا باحوال المصطفٰی ، ص ۲۴۹] ۔ ملاقات کے لیے حاضر ہونے والوں کی کثرت کے باعث آپؐ ایک درخت کے سائے میں ایک باغ میں بیٹھ گئے ۔ پھر قباء اور بنی عمرو بن عوف کے رئیس حضرت کلثومؓ بن الہدم الاوسی کے مکان میں قیام پذیر ہوئے ؛ البتہ دن میں سعد بن خیثمہ الاوسی کے مکان میں بیٹھنے لگے ، جو بڑا بھی تھا اور خالی بھی ، کیونکہ سعد غیر شادی شدہ تھے (ابن ہشام : سیرۃ النبویۃ ، ۲ : ۱۲۰ تا ۱۳۸ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۲۲۷ تا ۲۳۷ ؛ البخاری : الصحیح ، مطبوعہ لائیڈن ، کتاب فضائل النبی ، ۲ : ۴۱۷ ببعد و باب ہجرۃ النبی ، ۳ : ۳۴ تا ۴۵)۔

مسجد قباء کی تعمیر : یہاں آپؐ نے اپنے مختصر قیام کے دوران میں ایک مسجد تعمیر کی جس کا قبلہ بھی آنحضرتؐ نے متعین فرمایا ۔ تیرہ چودہ دن قیام کے بعد قباء سے روانگی عمل میں آئی اور وہاں اترے جہاں آپؐ کی اونٹنی ٹھہری تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو ۔ اسی جگہ اب مسجد نبوی ہے ۔ آس پاس آنحضرتؐ کے ننھیالی رشتہ دار بنو خزرج کی شاخ بنو النجار بستے تھے ۔ جس جگہ آپؐ کی اونٹنی خود بخود رک کر بیٹھ گئی تھی وہ ایک کھلا میدان تھا ، مگر وہاں سے قریب ترین مکان حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا تھا ۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے ۔ آنحضرتؐ کا سامان اپنے دو منزلہ مکان میں لے گئے (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۲۳۲ تا ۲۳۴) ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پہلا کام یہ کیا کہ خالی میدان کو ، جو دو یتیم بچوں کی ملکیت تھا ، قیمتاً حاصل کیا اور وہاں مسجد نبوی اور اپنے کنبے کے لیے چند حجروں کی تعمیر کا آغاز فرما دیا ۔ جب کام مکمل ہوگیا تو آنحضرتؐ وہاں منتقل ہوگئے ۔ پھر مکہ مکرمہ سے آپؐ کے اور حضرت ابوبکرؓ کے بیوی بچوں کو لانے کے لیے چھے آدمی روانہ فرمائے ۔ دس سالہ حضرت انسؓ بن مالک الخزرجی کو ان کی عقیدت مند والدہ نے آپؐ کی خدمت میں لا کر پیش کرتے ہوئے عرض کی یا رسول اللہ ! میرے اس بچے کو اپنے خادم کی حیثیت سے قبول فرما کر میری عزت افزائی فرمائیں ؛ وہ کمسنی کے باوجود لکھنا پڑھنا جانتا ہے ۔ حضرت انسؓ دس سال ، یعنی وفات نبوی تک حضورؐ کے مکان میں بطور خادم کے رہے ۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اس دوران میں آپؐ نے کبھی ایک مرتبہ بھی مجھے گھرکا تک نہیں (الترمذی شمائل النبی)۔

اجتماعی اور سیاسی تنظیم : مدینہ منورہ آنے پر آپؐ کو نظر آیا کہ مکے کے برعکس اس شہر میں کوئی شہری نظام نہیں ، بلکہ بکثرت قبیلے الگ الگ مقاموں پر رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل آزاد ۔ ان میں باہمی رشتہ داری کے باوجود آپس میں خون خرابہ بھی ہوتا رہتا ہے ۔ ان کی اکثریت میں اسلام پھیل گیا تھا ، البتہ بعض خاندان ، مثلاً خطمہ ، واقف ، وائل اور امیہ ابھی تک شرک پر ہی مصر تھے ۔ شہر میں یہودی بھی تھے جن میں سے بنو النضیر خزرج کے

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

حلیف تھے جبکہ بنو قینقاع اور بنو قریظہ قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کی مجموعی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ قینقاع میں سات سو جنگجو اور قریظہ میں چھے سو جنگجو سپاہیوں کا ہونا مقریزی (امتاع، ۱ : ۱۰۵، ۲۲۹) نے صراحت سے بیان کیا ہے اور یہ کہ جب بنو النضیر مدینہ منورہ سے نکالے گئے تو چھے سو اونٹوں پر عورتوں بچوں اور سامان کو لاد کر لے گئے تھے (کتاب مذکور، ص ۱۸۱)۔ اس مخلوط آبادی میں مکے سے آئے ہوئے کئی سو بیروزگار اور بے وسائل مہاجرین بھی تھے، جن میں سے چھے حضرت بلال رض وغیرہ کی طرح کے غیر عرب بھی تھے۔ ان میں سے بہت سے نئی آب و ہوا کے باعث بیمار بھی ہو گئے۔ ان کی آباد کاری کا کٹھن کام بھی انجام دینا تھا۔ اسی [زمانے میں مکہ مکرمہ سے ابوسفیان اور ابی بن خلف نے] عبداللہ بن ابی بن ابی سلول اور اھل مدینہ کے نام ایک دھمکی آمیز خط (الٹی میٹم) لکھ بھیجا کہ آنحضرتؐ کو ان کے سپرد کر دیا جائے، ورنہ مجبوراً جنگ کرنی ہوگی (کتاب المحبر، ص ۱۷۳؛ الوثائق السیاسیۃ).

مؤاخات: آپؐ نے سب سے پہلے مہاجرین پر توجہ فرمائی؛ کیونکہ ان کی خود داری کی حفاظت کے لیے کسی مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ اسی لیے آپؐ نے انصار کو جمع کرکے فرمایا: ہر شخص ایک مہاجر خاندان کو لے لے، دونوں مل کر کام کریں اور کمائی مل کر کھائیں۔ انصار نے ایثار کیا۔ قرآن مجید (۵۹ [الحشر]: ۹) میں ان کی تعریف یونہیں بے وجہ نہیں آئی۔ انھوں نے کہا: یا رسولؐ اللہ! ہماری آدھی زمینیں مہاجرین کو مستقل طور پر دے دیجیے! لیکن خود دار مہاجرین نے اسے قبول نہ کیا اور کہا: غیر مزروعہ زمینیں انھیں تقاوی پر دے دیں اور پیداوار کا ایک حصہ بطور اجرت لے لیا کریں (بخاری: الصحیح، ۲ : ۶۸، کتاب الحرث والمزارعۃ وکتاب الھبۃ وغیرہ).

انھوں نے ایک مہاجر کو ایک انصاری کے بھائی بنائے جانے (مؤاخات) کے فرمان نبوی کو انتہائی خوشدلی سے قبول کیا اور اس طرح سیکڑوں بے روزگاروں کا مسئلہ ایک ہی دن میں حل ہو گیا۔ اس مواخات میں کافی عرصے تک باہمی وراثت بھی چلتی رہی۔ پھر اس کو وحی (۸ [الانفال] : ۷۵) سے منسوخ کر دیا گیا [تفصیل کے لیے دیکھیے البخاری: الصحیح، ۳ : ۱ تا ۶ ببعد، کتاب مناقب الانصار]۔ فراخ دلی، خود داری اور عمدہ ایثار کی ایک مثال حضرت عبدالرحمن رض بن عوف کی ہے کہ ان کے انصاری بھائی نے ان کو گھر لا کر کہا: "یہ میری جائداد ہے: میں اس کا نصف تمھیں دیتا ہوں۔ یہ میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے جسے چاہو چن لو؛ میں اسے طلاق دیتا ہوں۔ عدت کے بعد اس سے نکاح کر لینا"۔ حضرت عبدالرحمن رض بن عوف نے جواب دیا: "خدا تمھیں تمھارے مال و عیال میں برکت دے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو صرف بازار کا راستہ دکھا دو"۔ انھوں نے بازار میں کام شروع کر دیا اور چند ہی روز میں اللہ تعالی نے ان کو خوشحالی عطا فرما دی (البخاری: الصحیح، ۳ : ۲).

بعض انصار نے اپنے باغوں میں سے ایک ایک درخت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے مختص کر دیا اور موسم میں اس کا پھل آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کرنے لگے [مسلم، ۳ : ۱۳۹۲، عدد ۱۷۷۱، کتاب الجہاد، باب ۲۴]؛ اس طرح کسی ایک پر بار نہ پڑا۔ [ان درختوں کو آپؐ نے بنو قریظہ اور بنو النضیر کے انخلا کے بعد ان کے مالکان کو واپس کر دیا]۔ آنحضرتؐ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کھانا کھاتے تو آٹھ دس حاضرین کو اس میں ضرور شریک فرما لیتے۔ آپؐ نے کچھ بکریاں اور اونٹنیاں خریدیں، جن کا دودھ کنبے میں خرچ ہونے لگا۔

میثاق مدینہ: مہاجرین و انصار کی مؤاخات کے بعد شہر کی بقیہ آبادی کی تنظیم پر توجہ دی گئی۔

marfat.com
Marfat.com

حضرت انس بن مالک رض راوی ہیں کہ ان کے باپ کے مکان میں سارے مسلم و غیر مسلم قبائل کے نمائندوں کا اجتماع ہوا اور آنحضرت ؐ کی تجویز پر سب متفق ہو گئے کہ بیرونی حملوں کے دفاع اور اندرونی بین القبائل جھگڑوں میں تصفیے وغیرہ کے لیے شہر میں ایک تنظیم عمل میں لائی جائے اور ایک شخص کو بطور حاکم اعلی متعین کیا جائے۔ حقوق و فرائض تحریری طور پر مرتب کیے گئے - یہ دستاویز جو کسی مملکت کے لیے تحریری طور پر مدون کیے ہوئے دستور کی بظاہر دنیا میں پہلی مثال ہے اور سنہ ۱ھ سے متعلق ہے، ہم تک ابن ہشام، ابو عبید وغیرہ کی روایت سے کاملاً پہنچی ہے، (تفصیل کے لیے دیکھیے حمید اللہ: *The first written constitution in the world*، لاہور ۱۹۷۵ء؛ [رک بہ میثاق مدینہ])۔ یہ دستاویز آنحضرت ؐ کی تلوار کی میان پر ہمیشہ بندھی رہتی تھی۔

اس میثاق باہمی کے نتیجے کی رو سے آنحضرت ؐ کو، جو مسلمانوں کے لیے تو آقا اور سردار تھے ہی، اب غیرمسلموں نے بھی اس حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ درحقیقت یہ آپ ؐ کی مدینہ منورہ میں پہلی سیاسی فتح تھی، جو عظیم نتائج پر منتج ہوئی - [اس کے علاوہ میثاق مدینہ کی دفعات کامل رواداری، مذہبی آزادی اور حسن تعاون پر مبنی تھیں؛ اس لیے یہودیوں اور دیگر غیر مسلموں کے پاس بے اعتمادی کی کوئی وجہ نہ تھی]۔

البخاری (کتاب ۵٦، باب ۱۸۱، حدیث ۱ [۲ : ۲٦۳]) وغیرہ نے روایت کی ہے کہ ایک دن آنحضرت ؐ نے حکم دیا : میرے لیے سارے کلمہ گویوں [من یلفظ بالاسلام] کے نام لکھو - اس طرح پندرہ سو نام درج ہوئے - چونکہ مؤاخات میں ۱۸٦ مکی خاندانوں کو اتنے ہی مدنی خاندانوں میں ضم کیا گیا تھا اور ہر خاندان میں بیوی بچوں کا اوسط چار ہی رکھا جائے تو پندرہ سو کی تعداد ہو جاتی ہے۔ اس لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ مردم شماری بھی انہیں ابتدائی تنظیمات کے زمانے، یعنی تقریباً ۱ھ میں ہوئی ہوگی۔

بیرونی تعلقات : مسلمانوں کا قریش مکہ کے سوا کسی اور سے کوئی جھگڑا نہ تھا - اس بیرونی دشمن سے نپٹنے کے لیے اندرونی تنظیم اور استحکام لازمی تھا - اس کے لیے ایک طرف تبلیغ دین کا سلسلہ جاری ہوا تو دوسری طرف وقتاً فوقتاً نئے احکام نازل ہو کر اسلامی قانون و شریعت کو بتدریج مکمل کرتے گئے؛ چنانچہ اذان [رک بآن]، تحویل قبلہ، روزہ، حج، زکوٰۃ، قانون وراثت و نکاح و طلاق، حجاب، حرمت خمر، قانون صلح و جنگ و غیر جانبداری، نیز قانون تعزیرات (حدود و ممانعات) اور عام اخلاق و احسان (تصوف) اسی دوران میں نازل ہوئے اور شریعت اسلامیہ کا حصہ بنے۔

اب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو بیرونی تعلقات میں قریش کی دھمکی اور جارحانہ اقدامات کا مقابلہ کرنا تھا - جب شہری مملکت مدینہ کے قیام سے کسی قدر اندرونی استحکام و اطمینان حاصل ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ کے اطراف پر توجہ دی اور وہاں کے قبیلوں کو فوجی طور سے حلیف بنانا شروع کیا؛ چنانچہ بنو جھینہ، بنو ضمرہ وغیرہ کے ساتھ ایسے معاہدے ہونے کا پتا چلتا ہے - بنو جھینہ مدینہ منورہ کے شمال مغرب میں اور بنو ضمرہ وغیرہ جنوب مغرب میں آباد تھے اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں سے قریش کے تجارتی کاروان عراق، شام اور مصر جانے کے لیے گزرا کرتے تھے۔

غزوات : ہجرت کے وقت آنحضرت ؐ کے قتل کی سازش قریش کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف گویا اعلان جنگ تھا؛ [اس پر کچھ نہ کچھ کارروائی لازمی تھی]۔ آنحضرت ؐ کی اور دیگر سیکڑوں مہاجرین کی جائدادیں بھی قریش نے ضبط کر لی تھیں - اس کے باوجود قریش مکہ کا غصہ فرو نہ ہوا تھا

marfat.com
Marfat.com

اور وہ موقع کی تاک میں تھے۔ [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے نہ صرف مدینہ منورہ میں اندرونی استحکام پیدا کیا، بلکہ باہر کے حملہ آوروں کا پتا لگانے، نیز دشمنوں کی سرگرمیاں معلوم کرنے کے لیے مختلف دستے آس پاس کے علاقوں میں بھیجے - یہ دستے مدینہ منورہ کے ارد گرد آپؐ کے حکم کے مطابق دشمنوں کی سرگرمیوں کا پتا چلاتے - اس سلسلے کا پہلا دستہ، جو تیس افراد پر مشتمل تھا]، حضرت حمزہؓ کی قیادت میں رمضان ۱ھ میں بھیجا گیا۔ [یہ دستہ جب ساحل سمندر پر پہنچا تو اتفاقاً مشرکین کے ایک کاروان سے، جس میں ابوجہل بھی تھا ، سامنا ہوگیا]، مگر مجدی بن عمرو الجہنی، جو دونوں فریقوں کا حلیف تھا ، بیچ میں پڑا ؛ اس طرح تصادم رک گیا [الواقدی : المغازی، ۱ : ۹ اوکسفرڈ ۱۹۶۶ء]- اسی زمانے میں ساٹھ [اور بقول بعض اسی] افراد پر مشتمل ایک دوسرا دستہ مدینہ منورہ کے جنوب مغرب میں حضرت عبیدہؓ بن الحارث [بن عبدالمطلب] کے ماتحت بھیجا گیا [حوالۂ مذکور، ص ۱۰]- تیسرا دستہ حضرت سعد بن ابی وقاص کی زیر کمان بھیجا گیا - ان میں سے کسی میں کوئی خونریزی نہ ہوئی [(جوامع السیرة، ص ۱۰۰ تا ۱۰۱؛ ابن کثیر : السیرة، ۲ : ۳۳۸ تا ۳۳۹)؛ کیونکہ یہ سب امن پسندی کے جذبے کے امین تھے]، مگر قریشی رئیس کُرز بن جابر الفہری نے ربیع الاول ۲ھ میں مدینہ منورہ کے مضافات کی چراگاہ پر حملہ کیا اور مسلمانوں کے ریوڑ لوٹ لیے- اس کا تعاقب کیا گیا، مگر کامیابی نہ ہوئی - جمادی الاولی ۲ھ میں آپؐ خود صحابہ کرامؓ کی معیت میں العُشَیرہ تک گئے [دیکھیے غزوات] - رجب ۲ھ میں بارہ افراد پر مشتمل ایک دستہ نخلہ بھیجا گیا - آپؐ نے اس کی کمان حضرت عبداللہؓ بن جحش کے سپرد کی اور فرمایا: دو دن تک مدینہ منورہ کے مشرقی سمت میں جاؤ، پھر بند لفافہ کھول کر اس کے احکام کی تعمیل کرو- جب یہ دستہ بطن نخلہ پہنچا تو وہاں پہنچ کر آپؐ کا نامۂ مبارک کھولا تو اس میں لکھا تھا: بطن نخلہ [مکہ مکرمہ کے مشرق جانب اور طائف اور مکہ کے درمیان ایک مقام] پہنچ کر قریش مکہ کے قافلوں پر نگاہ رکھو اور ہمیں ان کے حالات سے مطلع کرو؛ چنانچہ حسب حکم یہ دستہ وہاں پہنچ گیا۔ انھیں دشمنوں کا ایک قافلہ ملا تو انھوں نے آپؐ کے حکم کے بغیر اس پر حملہ کر دیا - جس کے نتیجے میں ایک کافر عمرو بن [عبداللہ] الحضرمی مارا گیا اور کچھ اسیر کیے گئے جنھیں رہا کرانے کے لیے قریش کو فدیہ دینا پڑا۔ اس طرح باہمی تعلقات پہلے سے زیادہ کشیدہ ہوگئے - یہ لڑائی غلطی سے رجب کی یکم کو ہوئی تھی اس پر مشرکین کی طرف سے اشہر حرم کی حرمت کو پامال کرنے کا الزام لگایا گیا ، [جس کا تفصیلی جواب قرآن مجید (۲ [البقرة] : ۲۱۷) میں دیا گیا] - اس دستے کو آنحضرتؐ نے لڑنے کا نہیں بلکہ خبریں حاصل کرنے کا کام سپرد کیا تھا ، اس لیے لڑائی کی اطلاع ملنے پر آنحضرتؐ ناراض ہوے ، لیکن جلدی ہی صورت حال کو قبول فرما لیا، کیونکہ قریش مکہ کی معاندانہ سرگرمیاں پہلے سے بڑھتی جا رہی تھیں .

جمادی الآخرة ۲ھ میں قریشی کاروان خاص جنگی نقطۂ نظر سے تجارت کے لیے شام گیا - تین ماہ بعد جب یہ قافلہ واپس آ رہا تھا [تو ایک مقام پر ابو سفیان کو مسلمانوں کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا - اس کو مزید تقویت اس سے بھی ہو گئی کہ آنحضرتؐ نے اس علاقے میں جو دو افراد حالات معلوم کرنے کے لیے متعین فرمائے ہوے تھے، ابو سفیان کو ان کا نشان مل گیا ؛ چنانچہ ابو سفیان نے نہ صرف راستہ تبدیل کر لیا بلکہ اس نے مکہ مکرمہ سے مدد حاصل کرنے کے لیے بھی ایک آدمی دوڑا دیا] - اس طرح اس کی کمک کے لیے مکے سے ابو جہل [رک بآں] کی قیادت میں جو فوج نکلی اس سے ۱۷ رمضان ۲ھ کو بدر [رک بآں] میں مقابلہ ہوگیا - مسلمان صرف ۳۱۳ اور دشمن ۹۵۰،

marfat.com
Marfat.com

یعنی تگنے سے بھی زائد تھے، مگر انہیں بری طرح ہزیمت اٹھانا پڑی ۔ قیدیوں کو قتل کی جگہ چار چار ہزار درہم کا فدیہ لے کر رہا کیا گیا ، لیکن جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کا فدیہ صرف یہ مقرر کیا گیا کہ ہر قیدی دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے (ابن سعد : طبقات، ۲ : ۱۱ تا ۲۶ ؛ السہیلی : روض الانف، ۲ : ۶۱ تا ۸۷ ؛ ابن حنبل : مسند، ۱ : ۲۴۷، عدد ۲۲۱۶).

غزوۂ اُحُد : قریش نے اگلے سال بڑی تیاریوں کے بعد تین ہزار کی فوج لے کر شوال ۳ھ میں مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا اور احد [رک باں] میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا ۔ [مسلمانوں کو آنحضرتؐ کے جنگی احکام کی خلاف ورزی کی وجہ سے وقتی طور پر کچھ نقصان اٹھانا پڑا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جلد ہی انہیں دوبارہ صف آرا کر کے دشمنوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ۔ جاتے ہوے قریش مکہ نے یہ اعلان کیا کہ] ایک سال بعد بدر ہی میں دوبارہ مقابلہ ہوگا ۔ شوال ۴ھ میں آنحضرتؐ اپنے جانثاروں سمیت بدر گئے اور انتظار کرتے رہے، مگر دشمن نہ آئے ۔ ذوالقعدہ میں بدر کے مقام پر سالانہ میلہ لگتا تھا ۔ اس سے تجارتی استفادہ کرنے کے بعد مسلمان مدینہ منورہ واپس ہوگئے ۔

غزوۂ خندق : اس کے کچھ عرصے بعد شوال ۵ھ میں غزوۂ خندق پیش آیا ۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ مدینہ منورہ کے بنو نَضِیر [رک باں] نے غزوۂ احد کے [چھے ماہ] بعد مسلمانوں سے لڑائی مول لی تھی اور شکست کھانے کے بعد [البخاری، ۳ : ۲۷] شہر چھوڑ کر خیبر جا بسے تھے۔ انھوں نے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے قبائل عرب میں اسلام دشمنی کی آگ بھڑکا دی ۔ یہود نے اپنی دولت اور چرب زبانی سے کام لے کر بنو غطفان و فزارہ کو مدینہ منورہ کے مشرق سے ، بنو المصطلق کو جنوب مغرب سے، اہل طائف ، بنو کنانہ اور اہل مکہ کو جنوب سے اس پر آمادہ کیا کہ وہ بیک وقت اپنی متحدہ قوت سے مدینہ منورہ پر ٹوٹ پڑیں ۔ وہ خود خیبر میں امن چین سے بیٹھ کر انتظامات کی کمان کرتے رہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر صحابہؓ کے مشورے سے خندق [رک باں] کھدوانے کا فیصلہ کیا۔ یہود کی تجویز بظاہر یہ تھی کہ مدینے سے بہت دور لے جا کر آنحضرتؐ اور آپؐ کی چھوٹی سی فوج کو خیبر اور دُومۃ الجندل کے درمیاں گھیر کر [معاذ اللہ] قتل کر دیا جائے ، پھر مدینہ منورہ کو لوٹ لیا جائے۔ بنوالمصطلق مدینہ منورہ سے قریب تر تھے۔ ممکن ہے آنحضرتؐ کو ان کے شریک سازش ہونے کی اطلاع مل چکی ہو؛ بہرحال آنحضرتؐ نے ان کے بعض مسلمان رشتہ داروں کو ان کے علاقے میں بھیج کر مزید اطمینان کرلیا ۔ پھر آپؐ نے اچانک ان پر اس وقت حملہ کر دیا جب کہ وہ چشمہ مُرَیسیع پر قیام پذیر تھے ۔ اس موقع پر مرد بھاگ گئے اور عورتیں اور بچے گرفتار کر لیے گئے۔ پھر آنحضرتؐ کے حسن سلوک کے باعث سب مسلمان ہوگئے ۔ بقیہ دشمن فوج نے شوال ۵ھ میں دس ہزار [بقول الیعقوبی بیس ہزار] کے جم غفیر کے ساتھ مدینہ منورہ کا محاصرہ کرلیا ۔ اسلام کے جانثاروں کی تعداد [تین ہزار اور بقول بعض] صرف پندرہ سو [یا آٹھ نو سو] تھی ، لیکن انھوں نے خندق [رک باں] کھود کر دشمن کو تھکانے اور تاخیر پیدا کرنے کا انتظام کر لیا تھا ۔ آخر اندوختہ ختم ہو جانے ، موسم کے سرد اور طوفانی ہو جانے ، حرمت کے مہینے آ جانے اور سب سے بڑھ کر نصرت خداوندی کے باعث ابو سفیان نے محاصرہ اٹھا کر واپس چلے جانے کا فیصلہ کرلیا تا کہ مکہ مکرمہ آنے والے حاجیوں کی سربراہی اور تجارت و سیاحت میں مشغول ہو سکیں۔

جب وہ چلے گئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا : اب ان کو مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی کبھی ہمت نہ ہوگی کیونکہ جب اتنی کثیر فوج کے باوجود وہ کچھ

marfat.com
Marfat.com

نہ کر سکے تو آئندہ مکرر کوشش کی جرأت نہیں کر سکتے۔ [اس کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آبائی شہر پر، جس میں خدا کا گھر بھی تھا، حملہ کرنے سے پہلے مفاہمت اور صلح جوئی میں پہل کو مقدم سمجھا اور کوشش کی کہ قریش مکہ کی مزید دلجوئی کریں کہ شاید اسی طرح ان کے دل نرم ہو جائیں]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس قدر رحیم وشفیق تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ٦ھ میں جب مکے میں سخت قحط پڑا تو آپؐ نے پانچ سو اشرفیاں مکہ مکرمہ کے غربا میں تقسیم کے لیے بھیجیں۔ ابو سفیان بے بسی کے عالم میں جھنجھلا کر کہنے لگا: محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مکے کے نوجوانوں کو بہکانا چاہتے ھیں (السرخسی: شرح السیر الکبیر، ١: ٦٩)۔ کاروانی راستے بند ہونے کی وجہ سے ابو سفیان کے ہاں جانوروں کی کھالیں پڑی پڑی خراب ہو رہی تھیں۔ آنحضرتؐ نے اس کو مدینہ سے کھجوریں بھیجیں اور اس کے ہاں کی کھالیں خرید لینی چاہیں (حوالۂ مذکور، ١: ٧٠)۔ اسی زمانے میں یمامہ (نجد) کے سردار ثُمامہ بن اثال نے بھی مسلمانوں کی اس کوشش میں مدد دی۔ ایک بظاہر تنبیہی مہم میں مسلمانوں کا ایک دستہ اسے گرفتار کر کے مدینہ منورہ لایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے صحابہؓ کو فرمایا: یہ بنی حنیفہ کا سردار ثمامہ ہے۔ اس سے اچھا برتاؤ کرو۔ اسے مسجد میں رکھا گیا اور خوراک بھی اچھی دی گئی۔ آنحضرتؐ جب بھی ادھر سے گزرتے، اسے تبلیغ دین کرتے، لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا: اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کا قتل ہوگا؛ اگر فدیہ چاہتے ہو تو جو چاہو مانگو۔ کچھ دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے رہا کر دیا۔ آپؐ کے حسن سلوک، رحم و کرم اور کچھ ایام کے ذوق صحبت نے حساس بدوی کی کایا پلٹ دی۔ باہر نکلا، غسل کیا، پھر مسجد میں آ کر کلمۂ شہادت پڑھنے کے بعد کہا: اب تک آپؐ کا چہرا میرے لیے سب سے زیادہ قابل نفرت تھا، اب وہ سب سے زیادہ محبوب ہو گیا ہے۔ وطن واپس جاتے ہوئے وہ مکے سے گزرا۔ اسلام کے علی الاعلان اظہار پر قریش نے اسے قتل کر دینا چاہا، پھر کسی نے یاد دلایا کہ اس کے ملک کے غلے کے تم محتاج ہو۔ رہائی پر اس نے کہا: خدا کی قسم! میرے ملک کے غلے کا ایک دانہ بھی اب تمہیں نہ ملے گا جب تک کہ رسول اللہ صلی علیہ و آلہ وسلم اجازت نہ دیں گے۔ قحط کے باعث اہل مکہ ابتر حالت میں تھے۔ ایک خط لکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عاجزانہ التجا کی کہ ثمامہؓ کے غلے کی برآمد کی بندش اٹھا دی جائے۔ آپؐ نے فوراً ثمامہؓ کو خط لکھا کہ غلے کی برآمد کو نہ روکو (ابن ہشام، ۴: ٢٨٧ تا ٢٨٨).

صلح حدیبیہ: ذوالقعدہ ٦ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پندرہ سو صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ کرنے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے، مگر قریش مزاحمت کے لیے مکے سے نکل کر حدیبیہ [رک بآں] آ گئے، جو فوجی نقطۂ نظر سے مکے کا دروازہ ہے۔ انہوں نے اپنے حلیف احابیش [رک بآں] کو بھی بلا لیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یکے بعد دیگرے متعدد سفیر بھیجے [تاکہ قریش مکہ کو یقین دہانی کرائیں کہ آپؐ صرف عمرہ کرنا چاہتے ہیں، مگر قریش نے اصرار کیا اور کہا] کہ واپس چلے جاؤ، تمہیں مکہ آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ آنحضرتؐ نے قریش کے سفیروں کو اپنے قربانی کے جانور دکھائے اور اطمینان دلایا کہ مقصد صرف عمرہ ہے (ابن ہشام، ٢: ٣٢١ تا ٣٢٩)، لیکن ان سفیروں کو معاہدے کا اختیار نہ دیا گیا تھا، اس لیے آنحضرتؐ نے خراش الخزاعی کو سفیر بنا کر بھیجا۔ مکہ مکرمہ میں اس کی اونٹنی مار ڈالی گئی اور خود اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ بڑی مشکل سے وہ جان بچا کر واپس آئے (حوالۂ مذکور)۔ اب آنحضرتؐ نے حضرت عثمانؓ

marfat.com
Marfat.com

کو ، جو ابو سفیان کے قریبی رشتہ دار بھی تھے، مقصد کی وضاحت کے لیے مکہ مکرمہ بھیجا۔ انھیں قید کر لیا گیا۔ ادھر اسلامی لشکر میں افواہ پھیل گئی کہ ان کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر تمام صحابہؓ سے موت کی بیعت لی کہ جان کی پروا کیے بغیر لڑیں گے اور راہ فرار اختیار نہ کریں گے۔ نازک صورت حال کے پیش نظر قریش مکہ نے سہیل بن عمرو جیسے سنجیدہ اور صلح پسند شخص کو بھیجا کہ مصالحت کی کوشش کرے۔ طویل گفت و شنید کے بعد طے ہوا کہ : (۱) مسلمانوں اور قریش مکہ میں دس سال تک باہم صلح رہے گی ؛ طائف جانے کے لیے مسلمان مکے سے اور شام جانے کے لیے اہل مکہ مدینہ منورہ سے گزر سکیں گے ؛ (۲) امسال آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ عمرہ کیے بغیر واپس چلے جائیں گے ؛ (۳) اگلے سال مسلمان عمرہ کرنے کے لیے صرف تین دن کے لیے مکہ مکرمہ آ سکیں گے ؛ (۴) مسلمانوں میں سے اگر کوئی مکہ مکرمہ میں آ کر پناہ گزین ہو تو اسے واپس نہ کیا جائے گا، لیکن اہل مکہ میں سے اگر کوئی آنحضرتؐ کے پاس آئے تو اس کو اس کے سرپرستوں کے مطالبے پر ان کے سپرد کر دیا جائے گا ؛ (۵) ہر فریق خلوص سے شرائط صلح پر عمل کرے گا۔ وہ نہ تو چھپ کر کسی تیسرے شخص کو مدد دے گا ، نہ خود خیانت کرے گا (بلکہ غیر جانبدار رہے گا) ؛ (۶) دیگر قبائل بھی حسب منشا فریقین میں سے کسی کے ساتھ ملحق ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں ان کے بھی وہی حقوق و فرائض ہونگے جو اصل فریقین کے ہیں ؛ (چنانچہ بنو خزاعہ نے مسلمانوں کی طرف سے اور احابیش نے اہل مکہ کی طرف سے معاہدے میں شمولیت اختیار کر لی) ۔

دوسری ، تیسری اور خاص کر چوتھی شرط پر مسلمانوں کو بڑی تشویش ہوئی اور حضرت عمرؓ جیسی شخصیت بھی عمیق مقصد کو فوراً نہ سمجھ سکی اور برملا رسول اللہؐ کے سامنے اظہار ناپسندیدگی کیا ، لیکن مسلمانوں میں انتہا درجے کا نظم و ضبط تھا ؛ آنحضرتؐ کی رضامندی کو دیکھ کر ہر شخص راضی برضا ہوگیا (نیز رک بہ حدیبیہ ؛ غزوات).

قرآن مجید میں اس صلح حدیبیہ کو فتح مبین کہا گیا ہے، جو آگے چل کر واقعی ایسا ہی ثابت ہوئی.

خیبر کے یہودیوں کی شرارتیں بدستور جاری رہیں؛ اس لیے آپؐ نے اس فتنے کی سرکوبی کا عزم مصمم کر لیا؛ چنانچہ ایک مہینے کی تیاری کے بعد محرم ۷ھ میں خیبر [رک بآں] پر قبضہ کر کے اسے اسلامی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا .

[صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرا کام یہ کیا کہ شاہان عالم کے نام تبلیغی خطوط ارسال کیے] .

حسب معاہدہ ایک سال بعد آنحضرتؐ عمرہ کرنے مکہ مکرمہ آئے اور قریش کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا، بلکہ ہر طرح ان کا دل موہ لینے کی کوشش کی۔ اسی سال وہاں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا۔ اسی زمانے میں حضرت خالدؓ بن الولید اور حضرت عمروؓ بن العاص جیسے باصلاحیت لوگ مسلمان ہوے ابو سفیان کی اپنی بیٹی حضرت ام حبیبہؓ، جو مسلمان تھیں ، حبشہ میں بیوہ ہو گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کو اپنے ساتھ عقد کا اعزاز بخشا۔ [ان کے شوہر نے مرتد ہوکر انھیں بھی نصرانی بننے پر مجبور کیا تھا، لیکن وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں تالیف قلب کے لیے آپؐ نے ان سے نکاح فرما لیا]۔ اس ازدواج سے ابو سفیان کا متأثر ہونا ناگزیر تھا۔ اسی زمانے میں حبشہ سے مسلمان مہاجرین اور بعض نو مسلم حبشی بھی عرب آئے۔ ان کی خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ملاقات ہوئی .

marfat.com

Marfat.com

فتح مکہ: شعبان ۸ھ میں بنو خزاعہ اور بنو بکر کے جھگڑے میں کچھ خونریزی ہوئی تو بعض اہل مکہ نے چھپ کر بنو بکر کی فوج میں شرکت کی اور انھیں ہتیار مہیا کیے۔ یہ صلح حدیبیہ کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ بنو خزاعہ نے، جو مسلمانوں کے حلیف تھے، آنحضرت ؐ سے شکایت کی تو آپ ؐ نے مدد کا وعدہ فرمایا؛ [چنانچہ آپ ؐ نے قاصد کے ذریعے قریش مکہ کے سامنے تین شرائط پیش کیں: (۱) مقتولین کی دیت ادا کی جائے؛ (۲) بنو بکر سے قریش معاہدہ توڑ لیں؛ (۳) صلح حدیبیہ کو ختم کر دیا جائے۔ قُرط بن عمر نے قریش کی طرف سے جواب دیا کہ ہم کو تیسری شرط قبول ہے (الزرقانی: شرح المواهب، ۲ : ۳۳۶)]، مگر پھر قریش مکہ کو ندامت ہوئی اور ابو سفیان کو صلح کی تجدید اور اس کی مدت میں اضافے کے لیے مدینہ منورہ بھیجا (المقریزی، ۱ : ۳۵۸)۔ ابو سفیان تجدید معاہدہ میں ناکام ہو کر واپس چلا گیا اور اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ آنحضرت ؐ کیا کرنے والے ہیں۔ دوسری طرف آپ ؐ نے مدینے کے لوگوں کو ایک مہم کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا، [مگر اس کی وضاحت نہیں فرمائی]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک طرف تو یہ انتظام کیا کہ مدینہ منورہ سے کوئی شخص باہر نہ جانے پائے۔ [ایک شخص حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش مکہ کو اطلاع پہنچانی چاہی، مگر اس کا خط پکڑا گیا۔ آپ ؐ نے اس کی سابقہ خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے اسے معاف فرما دیا (ابن ہشام، ۴ : ۴۰)]۔ دوسری طرف ملک کے تمام حلیف قبائل کو مخفی احکام بھیجے کہ ایک بڑی مہم پر جانے کے لیے تیار رہیں، لیکن مدینہ منورہ نہ آئیں، ہم خود تمہارے علاقے میں سے گزرتے وقت تم کو ساتھ لیں گے۔ الواقدی نے المغازی میں صراحت کی ہے کہ آنحضرت ؐ نے بنو سُلیم وغیرہ کو رمضان المبارک میں مدینہ منورہ آنے کا حکم دیا، لیکن الیعقوبی (۲ : ۱۵۸-۵۹) کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان بیرونی قبائل کے صرف سرداروں کو مدینہ منورہ بلایا گیا اور آنے پر ہر ایک کو رازدارانہ طور پر حکم دیا کہ رضاکاروں کے ساتھ تیار رہیں اور اس امر کو راز میں رکھیں۔ آنحضرت ؐ نے ان کے علاقے میں گزرتے وقت انھیں فوج میں شریک کر لیا۔ جب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو آپ ؐ آڑے ترچھے، اور نامانوس راستوں سے روانہ ہوئے۔ اسی زمانے میں آپ ؐ نے ایک مہم بطن اضم بھیجی، جو مدینہ منورہ کے شمال مغرب میں کوئی تین دن کی مسافت پر ہے۔ مؤرخین نے صراحت کی ہے کہ اس کا مقصد محض دشمنوں کی توجہ ہٹانا تھا۔ اس طرف سے آپ ؐ جلد ہی دوسری سمت روانہ ہو گئے حتی کہ مرا لظہران پہنچنے تک (جو مکے سے ایک ہی منزل پر ہے) اکابر صحابہ ؓ بھی نہ جان سکے کہ کدھر کا قصد ہے (المقریزی: امتاع، ۱:۳۶۵؛ الطبری: تاریخ، ۱:۱۶۲۰)۔ بہرحال قبائلی دستوں کو لینے کے بعد دس ہزار کے لشکر جرار سمیت آپ ؐ نے رمضان المبارک ۸ھ میں مکہ کے اطراف میں واقع پہاڑیوں کے دامن میں پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا اور حکم دیا کہ رات کو ہر سپاہی ایک علحدہ آگ روشن کرے۔ ابو سفیان نے مکے کی ایک بلندی پر سے آگ جلنے کا نظارہ کیا تو ایک بہت بڑے میدان میں آگ جلتی دکھائی دی۔ اس نے خیال کیا کہ کم از کم پچاس ہزار کی فوج کے ساتھ کوئی دشمن حملہ آور ہوا ہے۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے اور پتا چلانے کے لیے آگے بڑھا۔ لشکر اسلام کے ایک گشتی دستے نے اسے گرفتار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ آپ ؐ نے حکم دیا کہ اسے حفاظت سے رکھو اور واپس نہ جانے دو۔ صبح کو حکم دیا کہ فوج چار مختلف جہتوں سے مکے میں داخل ہو، لیکن بجز مدافعت کے ہرگز کوئی

marfat.com
Marfat.com

خونریزی اور لوٹ مار نہ کی جائے ۔ تمام دستوں کو ابو سفیان کی آنکھوں کے سامنے سے گزارا گیا ۔ جب ساری فوج روانہ ہوگئی تو ابو سفیان کو رہا کر دیا گیا۔ وہ اس وقت شہر میں پہنچا جب اسلامی فوج شہر میں داخل ہونا شروع ہو چکی تھی اور فوجی نقیب ہر طرف چلا چلا کر کہ رہے تھے : جو کوئی ہتیار ڈال دے گا ، اسے امن ہے ؛ جو اپنے گھر میں بند بیٹھا رہے گا اسے امن ہے ؛ جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا ، اسے امن ہے ۔ خود آنحضرتؐ بڑے راستے سے شہر میں داخل ہوے [اور اس شان سے کہ آپ کا سر مبارک ، بموجب ارشاد خداوندی : وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّداً (ے [الاعراف] : ۶۱)، فرط تواضع سے سواری کے پالان کو چھو رہا تھا] ۔ آپ کا یہ داخلہ فاتحانہ، مگر پیغمبرانہ تھا ۔

حضرت خالدؓ بن الولید کا رسالہ اس راستے سے داخل ہوا جہاں خود ان کا قبیلہ سکونت پذیر تھا ۔ ان کے رشتہ دار عکرمہ بن ابی جہل نے انھیں روکنے کی کوشش کی، جس پر معمولی خونریزی ہوئی ۔ آنحضرتؐ کو اطلاع ہوئی تو فوراً حضرت خالدؓ کو تنبیہ کی کہ ہاتھ کو روک لو (الواقدی : المغازی ، ۲: ۸۲۷ ببعد ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲: ۱۳۴ تا ۱۴۴) .

پر امن داخلے کے بعد آنحضرتؐ نے اعلان فرمایا کہ مسلمانوں کی سابقہ ضبط شدہ جائدادیں واپس نہیں لی جائیں گی ، بلکہ غیر مسلم قابضین کے قبضے ہی میں رہنے دی جائیں گی ، حتّٰی کہ خود اپنے مکان کو بھی آپؐ نے واپس نہ لیا (البلاذری : الانساب ، ۱ : ۳۵۶ ؛ البخاری ، ۳ : ۱۴۰) ، کتاب المغازی ، باب ۴۸ ، یہ ایک اہم قانونی حکم تھا ۔ پھر اعلان ہوا کہ تمام لوگ بیت اللہ شریف میں جمع ہوں ، آپؐ ان کو خطاب کرنا چاہتے ہیں ؛ چنانچہ تمام لوگ جمع ہو گئے ۔ آنحضرتؐ جب بیت اللہ شریف میں تشریف لائے تو کعبے کے اطراف کے تمام بت توڑ دیے گیے ۔ کعبے کے اندر کی رنگین تصویریں بھی دھو کر مٹا دی گئیں ۔ پھر حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ کعبے کی چھت یا جبل ابی قبیس پر چڑھ کر اذان دیں (الازرقی : اخبار مکہ، ص ۱۱۳)۔ اس پر بعض غیر مسلم ناراض بھی ہوے ؛ نماز با جماعت کے بعد آنحضرتؐ نے غیر مسلم اہل مکہ کو مخاطب کرکے ان کی گزشتہ بیس سالہ اسلام دشمنی کی سرگرمیاں یاد دلاتے ہوے پوچھا : اب تم مجھ سے کیا توقع کرتے ہو ؟ وہ شرم سے صرف یہ کہ سکے: تم ایک شریف بھائی اور ایک شریف بھتیجے ہو ۔ اس پر آنحضرتؐ نے یہ تاریخی جواب دیا : [لاتثریب علیکم الیوم انتم الطلقاء، یعنی] آج تم پر کوئی گرفت نہیں ، جاؤ تم سب کو چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ عتاب بن اسید اس غیر متوقع اعلان پر آپے سے باہر ہو گیا ، جھپٹ کر حضورؐ کے سامنے آیا اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا ۔ آپؐ کے حسن سلوک اور عمدہ اخلاق سے متأثر ہو کر تقریباً سارے کا سارا شہر مسلمان ہوگیا اور اس اخلاص کے ساتھ کہ دو سال بعد جب آنحضرتؐ کی وفات ہوئی اور عرب میں ارتداد کی لہر اٹھی تو اہل مکہ خلوص کے ساتھ اسلام پر قائم رہے .

اس عام معافی کے اعلان پر مختلف دلچسپ چیزیں پیش آئیں ، مثلاً اس موقع پر آپؐ کے قدیمی دشمن عکرمہ بن ابی جہل کو اپنی جان کا خوف ہوا اور چاہا کہ بھاگ کر کسی اجنبی ملک میں پناہ گزین ہو جائے ۔ اس کی بیوی ام حکیم آ کر مسلمان ہو گئی اور شوہر کی جان بخشی چاہی تو آنحضرتؐ نے فوراً قبول فرما لیا اور اسے امان دے دی ۔ وہ جا کر شوہر کو واپس لائی اور وہ اس خلوص سے مسلمان ہوے کہ اس کی نظیر کم ملتی ہے ۔ انھوں نے کہا : اسلام کے خلاف میں نے جتنا مال صرف کیا اور جتنی جنگیں کیں ، اب اس کا دگنا بطور کفارہ اسلام کے لیے کروں

marfat.com
Marfat.com

کا ؛ چنانچہ اپنے اس عہد کو پورا کیا - (عکرمہؓ نے جنگ یرموک میں شہادت پائی) .

ایک اور شخص صفوان ابن امیہ آیا جس نے فتح مکہ کے موقع پر عسکر اسلام کی شہر میں داخلہ کے وقت بھرپور مخالفت کی تھی اور کہنے لگا : میں ابھی اسلام قبول نہیں کرنا چاھتا ، مجھے دو مہینے کی مہلت دی جائے - آپ ؐ نے فرمایا : تمھیں چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے (ابن ہشام ، ۴ : ۹۰) - چند روز بعد وہ بھی خلوص دل سے مسلمان ہوگیا .

ابو سفیان کی بیوی ہند، جس نے جنگ احد میں آنحضرت ؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کی لاش کا مُثلہ کیا تھا ، اس نے فتح مکہ کے بعد ایک ہتوڑا لے کر گھر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا اور کہا : تم نے ہم کو بہت دن دھوکے میں رکھا ؛ آج معلوم ہوگیا کہ تمھیں کتنی قدرت ہے ! پھر نقاب ڈال کر چند دیگر عورتوں کے ساتھ چھپ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئی اور اسلام قبول کر لیا (السہیلی ، ۲ : ۲۷۷ ، وغیرہ) .

وحشی بھی جو حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا ، آ کر مسلمان ہوا - آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے معاف فرما دیا اور صرف یہ کہا : بہتر ہے کہ تو آئندہ میرے سامنے نہ آئے تاکہ مجھے حضرت حمزہؓ کی یاد سے دکھ نہ ہو (البلاذری، ۱ : ۳۶۳) .

فتح مکہ کے بعد آپ ؐ نے آس پاس کے تمام بت اور بڑے بتخانے مسمار کروا دیے - حضرت خالدؓ بن ولید کو عزّیٰ کے خلاف نخلہ (طائف اور مکے کے مابین) ، حضرت عمروؓ بن العاص کو سواع کے خلاف رہاط (بلاد ہذیل میں)، حضرت سعدؓ بن زید الاشہلی کو منات کے خلاف مُشَلّل (مدینہ منورہ کے جنوب میں ساحل پر) بھیجا اور اس طرح تطہیر حرم کعبہ کے عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا - پھر حضرت خالدؓ بن یزید کو یَلَمْلَم بھیجا گیا کہ بنو جذیمہ بن عامر میں تبلیغ دین کریں - غلط فہمی کی بنا پر وہاں حضرت خالدؓ نے خونریزی کی، جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت ناراض ہوے اور [حضرت علیؓ کو بھیج کر] اہل خاندان کو خونبہا اور ہرجانہ دیا حتی کہ کتے کے پانی پینے کا برتن بھی اگر ٹوٹا تھا تو اس کا بھی معاوضہ دیا (البلاذری، ۱ : ۳۸۱؛ ابن ہشام، ۴ : ۷۰ تا ۷۸) .

غزوۂ حنین : اسی زمانے میں خبر آئی کہ بنو ہوازن اور اہل طائف مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے آ رہے ہیں - طائف میں لات کا مشہور بت خانہ تھا - تحقیق کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے جملہ جان نثاروں اور کچھ مکی رضاکاروں کے ساتھ یکم شوال المکرم ۸ھ کو دفاع کے لیے نکلے - آپ ؐ ابھی حنین کی گھاٹی میں سے گزر رہے تھے کہ رات کے اندھیرے میں اچانک دشمن نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی - اس حملے سے مسلمان منتشر ہو گئے ، لیکن آنحضرتؐ کی بہادری اور ثابت قدمی سے بھاگتے ہوے مسلمان پلٹ آئے اور دشمن بدحواس ہو کر بھاگ گئے - مسلمانوں نے ان کے پڑاؤ پر قبضہ کرلیا اور بے شمار جانور اور تقریباً چھے ہزار عورتیں بچے قید کیے (المقریزی، ۱ : ۴۲۳) - ان میں آپ ؐ کی رضاعی بہن الشیماء بھی تھیں - جب آپ ؐ کو پتہ چلا تو آپؐ نے ان سے بڑی محبت کا برتاؤ کیا اور انعام و اکرام کے بعد رہا کر دیا اور ان کی سفارش پر بجاد نامی اس کے ایک رشتہ دار کو بھی رہا کر دیا ، جس نے ایک مسلمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگ میں جلایا تھا (المقریزی، ۱ : ۴۱۳) - عام قیدیوں کو ایک محفوظ مقام پر چھوڑ کر آنحضرت ؐ دشمن کے تعاقب میں بڑھے اور جا کر طائف شہر کا محاصرہ کر لیا - وہاں ایرانی ماہرین تعمیرات کی بنائی ہوئی فصیل اور قلعہ تھا اور شہر میں پانی اور غذا کی کافی مقدار موجود تھی - اسی لیے منجنیق اور دبابوں کے استعمال کے باوجود شہر زیر نہ ہو سکا.

marfat.com
Marfat.com

کچھ دن کی کوشش کے بعد رفقا کے مشورے سے آپؐ محاصرہ اٹھا کر واپس ہو گئے - چونکہ طائف کے اطراف میں اسلام پھیل گیا تھا ، اس لیے اس کو مطیع کرنے کے لیے معاشی دباؤ کافی سمجھا گیا ؛ چنانچہ ایک سال کے اندر ان کے وفد نے مدینہ منورہ آ کر اسلام قبول کر لیا (تفصیل آگے آئے گی) .

طائف سے واپسی کے وقت جعرانہ کے مقام پر میں بنو ہوازن کے مال غنیمت اور قیدیوں کو حسب قانون اہل فوج میں بانٹ دیا - یہ آنحضرتؐ کی دودھ پلائی کے خاندان کے لوگ تھے - اس کے چند دن بعد ان کا وفد آیا اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور مال اور عورتوں بچوں کی واپسی کی التجا کی - آنحضرتؐ نے کہا : تم نے بہت تاخیر کی ہے - اب تو ہر چیز تقسیم ہو چکی ہے ؛ تاہم آپؐ نے فرمایا کہ تمھیں ایک ہی چیز واپس مل سکتی ہے، مال یا قیدی۔ انھوں نے قیدیوں کی واپسی کا تقاضا کیا تو آپؐ نے قیدی رہا کر دیے۔ (۱ : ۴۲۹)۔ پھر آپؐ مدینہ منورہ واپس لوٹ گئے ؛ [نیز رک بہ حنین ؛ طائف] .

دو ماہ بعد حج کا موسم آیا تو اس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں لوگ جمع تھے اور ہر کسی نے اپنے اپنے انداز سے حج کیا - ۹ھ میں حج کے موقع پر سورۃ التوبۃ کا نزول ہوا، جس میں آئندہ سال سے مشرکین کے حج بیت اللہ پر پابندی لگائے جانے کا حکم نازل ہوا تو آپؐ کی طرف سے اس کا موسم حج میں اعلان کیا گیا .

طائف کا قبول اسلام : طائف کے ایک سردار عروہؓ ابن مسعود کو اسلام کی ترغیب ہوئی - وہ مدینہ منورہ آ کر مسلمان ہو گئے اور درخواست کی کہ انھیں طائف میں تبلیغ اسلام کی اجازت دے دی جائے - اس کی جان کے خطرے سے آنحضرتؐ کو تردد تھا ، مگر اس کے بار بار کے اصرار پر آنحضرتؐ نے اسے اجازت دے دی، مگر انھیں ان کے ہمسایوں نے شہید کر دیا - اس پر اس کے کچھ رشتہ دار مدینہ منورہ آ کر مسلمان ہوگئے۔ اس سے طائف میں اشاعت اسلام کی تحریک مزید بڑھی اور ان کا ایک وفد مدینہ منورہ آیا اور کہا : ”ہم اسلام لانے کے لیے آمادہ ہیں ، البتہ نماز نہیں پڑھیں گے ، زکٰوۃ نہیں دیں گے ، جہاد نہیں کریں گے ، زنا اور شراب سے باز نہیں رہیں گے۔ علاوہ ازیں ہمارا بت خانہ لات نہ توڑا جائے ؛ سود بھی ہمارے لیے ممنوع نہ رہے اور ہمارے علاقے کو بھی مکے کی طرح حرم قرار دیا جائے ، جہاں کے نہ درخت کاٹے جائیں اور نہ شکار کیا جائے . . . . [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے منظور نہ کیا] - بالآخر کافی مشورے اور غور و خوض کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا - لات کے بت اور بت خانے کو منہدم کرنے کے لیے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اور ابو سفیانؓ کو بھیجا گیا۔ حضرت مغیرہؓ نے طائف کی ساری آبادی کے سامنے دو چار وار کر کے بت اور بت خانے کا خاتمہ کر دیا - اس سے اہل طائف کا ایمان مزید راسخ ہوگیا - اس طرح اہل طائف کی عظیم ذہنی اور انتظامی صلاحیتوں سے عہد نبوی سے ہی استفادہ شروع ہو گیا اور خلافت راشدہ میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا .

مکہ اور طائف [دونوں شہر سیاسی ، اجتماعی اور دینی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتے ہیں] - جب یہ دونوں شہر برضا و رغبت اسلامی نظام سے منسلک ہو گئے تو باقی عرب کے لیے معمولی سی بات بھی کافی تھی ؛ چنانچہ ایک ہی سال کے اندر بمصداق آیۂ کریمہ: يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (۱۱۰ [النصر] : ۱ - ۲) اسلام لانے کے لیے وفد پر وفد مدینہ منورہ آنے لگے اور اس طرح اسلام کی بیرون عرب کامیابیوں کا گویا راستہ کھل گیا ؛ لیکن بیرون عرب کے تعلقات نبوی سے قبل کچھ یہودیوں کا ذکر مناسب ہوگا.

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور یہودی : یہود کے تعلقات عرب (سبا ، یمن) کے ساتھ حضرت

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

سلیمانؑ کے زمانے سے تھے ۔ مختصر تعداد میں یہ لوگ ہر جگہ آباد تھے ۔ شمال میں مقنا ، تیما ، خیبر ، وسط میں مدینہ اور طائف ، جنوب میں یمن اور عمان وغیرہ میں ان کی قابل لحاظ آبادیاں اور بستیاں تھیں ۔ وہ مکہ مکرمہ میں تجارت کے لیے آیا تو کرتے تھے ، لیکن وہاں متوطن نہ تھے ۔

اسلام کا ان سے سابقہ سب سے پہلے مدینہ منورہ میں پڑا ۔ ان کی آبادی وہاں نصف کے قریب تھی ۔ وہ تین بڑے قبیلوں میں منقسم تھے: بنو قینقاع، بنوالنضیر، اور بنو قریظہ ۔ بنو قینقاع زرگر اور تاجر تھے اور مدینے میں سوق بنی قینقاع گویا بین الممالک تجارت کی منڈی تھا ۔ [وہ تمام یہودی قبائل سے زیادہ شجاع اور بہادر تھے ۔ اسلحہ کے اعتبار سے بھی ان کو تفوق حاصل تھا]۔ بنو النضیر بڑی ذات والے اور بنو قریظہ نیچ ذات والے سمجھے جاتے تھے؛ کیونکہ بنو النضیر کے قاتل قریظہ کے مقتولوں کی صرف نصف دیت (خونبہا) دیا کرتے تھے ۔ مقاتل (تفسیر ، بذیل ۵ [المائدۃ] ۴۴) وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ آنے پر جب اس نا انصافی کو منسوخ کر کے بنو قریظہ کو بھی دوسروں کے ساتھ مساویانہ حقوق عطا فرمائے تو بڑی ذات والے یہودی اس سے ناراض ہو گئے ۔ آپؐ نے نرمی اور شفقت سے ان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی ، مگر بے سود ۔ عبداللہ بن سلام وغیرہ گنتی کے چند لوگ تو خلوص سے مسلمان ہوے ، لیکن باقی اکثر آپؐ کی مخالفت پر کمر بستہ رہے ۔ بعد میں کچھ لوگ دنیوی مصلحتوں سے ظاہر داری کے لیے نفاق کے ساتھ اسلام کا اظہار بھی کرنے لگے (ابن ہشام : ص ۳۵۵) .

[یثرب میں آباد عرب قبائل میں ان یہودیوں نے علمی اور معاشی اعتبار سے اپنی جڑیں خاصی مضبوط کی ہوئی تھیں ۔ تجارتی اور خاص کر سودی لین دین کی وجہ سے عرب قبائل کو انھوں نے اپنا دست نگر بنایا ہوا تھا ۔ یہ لوگ نہایت بیدردی اور شقاوت قلبی سے سود در سود کی رقوم وصول کرتے رہتے ، یہاں تک کہ مجبوری اور بیکسی کی صورت میں معصوم بچوں اور عفیفہ عورتوں کو رہن رکھوا لیتے (دیکھیے البخاری ، ۳ : ۷۵، کتاب المغازی ، باب ۱۵) اور دو چار روپے کے زیور کے بدلے معصوم جانیں تلف کر دیتے (البخاری، ۴ : ۳۱۷ تا ۳۱۸، کتاب الدیات ، باب ۷) ۔ دولت کی بہتات سے اور باتوں کے علاوہ ان میں بدکاری عام ہو گئی تھی ، تاہم شرفا کے لیے یہ لوگ رجم کے بجاے صرف منہ کالا کرنے پر اکتفا کر لیتے تھے (مسلم ، الصحیح ، ۳ : ۱۳۲۶، شمارہ ۱۶۹۹ کتاب الحدود)؛ چند کوڑیوں کے بدلے وہ احکام الٰہی میں ترمیم و تنسیخ کر ڈالتے (۲ [البقرۃ] ۷۹) ، ایک دوسرے کا گلا کاٹتے (۲ [البقرۃ] : ۸۵) ، شرک و کفر کی حمایت کرتے اور مشرکین کو مسلمانوں سے بہتر بتاتے (۲ [النساء] : ۲۱ تا ۲۲) ، خدا کی شان میں گستاخی کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے (۳ [آل عمران] : ۱۸۱)؛ اپنے بعض بزرگوں کو خدا کا بیٹا کہتے یا وہ درجہ دیتے (۹ [التوبۃ] : ۳۰ تا ۳۱)؛ خدا کے احکام کو لوگوں سے چھپاتے (۲ [البقرۃ] : ۱۵۹ ، ۱۷۴ ببعد) ؛ حضرت سلیمانؑ کو جادو گر اور حضرت جبریلؑ کو اپنا ازلی دشمن بتاتے (۲ [البقرۃ] : ۹۷ تا ۹۸، ۱۰۲) ؛ اعلانیہ جھوٹ بولتے اور حرام کھاتے (۵ [المائدۃ] : ۴۲) ؛ کوئی امانت سونپتا تو اس میں خیانت کرتے اور کہتے کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر کوئی حق نہیں (۳ [آل عمران] : ۷۵) ۔ مزید برآں وہ اپنے آپ کو خدا کا بیٹا بتلاتے (۵ [المائدۃ] : ۱۸) ، وغیرہ .

اس پر مستزاد یہ کہ ان یہودیوں کو قبائل عرب کا اتحاد ایک آنکھ نہ بھاتا تھا ؛ چنانچہ انھوں نے ان قبائل عرب کے ساتھ اتحاد کے پردے میں ان کو باہم لڑانے کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا ؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ لوگ لڑتے

marfat.com
Marfat.com

رہیں گے تو ہمارا تجارتی اور سودی کاروبار چلتا رہے گا، ورنہ یہ سلسلہ ختم ہوجائے گا۔ اس بنا پر بلا شبہہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ یہودی عرب معاشرے میں ایک ناسور کی حیثیت رکھتے تھے۔

جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینۂ منورہ میں تشریف لائے تو یہودیوں نے یہ محسوس کر لیا کہ اب اس سچے مذہب کی روشنی میں ہمارا کاروبار ختم ہو جائے گا؛ چنانچہ انھوں نے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف قرآن مجید میں ان کے عیوب و نقائص کو ہدف تنقید بنایا گیا اور انھیں دعوت دی گئی کہ دین اسلام کی روشنی میں وہ اپنے عقیدہ و فکر کی اصلاح کر لیں (دیکھیے ۲ [البقرۃ] : ۳۱ تا ۱۲۳ ؛ ۲ [آل عمران] : ۶۴ تا ۹۱ ، ۱۱۰ تا ۱۲۰ وغیرہ)۔ اس کے علاوہ اسلام کی آمد سے یہود یثرب کا سودی کاروبار مکمل طور سے ختم ہوگیا تھا، کیونکہ اسلام نے روز اول ہی سے سود اور سودی کاروبار کی مذمت شروع کر دی تھی۔ پھر چونکہ ان کے عیوب و نقائص بھی بیان کیے جا رہے تھے، اس بنا پر ان کی ناراضگی اور زیادہ بڑھ گئی؛ تاہم آپؐ نے ان کے بارے میں ہمیشہ تحمل اور برد باری سے کام لیا۔ وہ آپؐ کو سلام کی بجائے سام (موت آئے) کہتے تھے (البخاری وغیرہ)۔ ایک یہودی کا آپؐ پر قرض تھا؛ اس نے ایک بھری مجلس میں (جب کہ اس کی ادائیگی کا بھی وقت نہ آیا تھا) آپؐ کے گلے میں چادر ڈالی اور زور سے کھینچ کر کہا: اے محمد! تم میرا قرض کیوں نہیں دیتے؟ بخدا تم بڑے نادھندہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے اس گستاخی کا مزا چکھانے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا: اے عمر! تمھیں چاہیے تھا کہ تم اسے حسن طلب کی تلقین کرتے اور مجھے حسن ادا کی۔ پھر آپؐ نے اس کو کھجوریں دینے کا حکم دیا (ابن الجوزی: الوفا)]

جب مدینہ منورہ میں شہری مملکت قائم ہوئی تو یہودیوں کی اکثریت انصار سے اپنی ماتحتانہ حلیفی کی وجہ سے اس میں خود بخود شریک ہو گئی (ابن ہشام، ۲ : ۱۴۹) [بلکہ الزرقانی (شرح المواہب، ۱ : ۵۵۱) اور ابن سعد (الطبقات، ۲ : ۲۹) کے بیانات میں اس بات کی صراحت ہے کہ ان یہودیوں نے خود آپؐ سے معاہدہ کیا تھا کہ وہ نہ تو آپ کے خلاف لڑیں گے اور نہ کسی دشمن کو مدد دیں گے]، لیکن سماجی تعلقات مسلمانوں کے ساتھ درست نہ رہ سکے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو ان میں حسد پیدا ہوا اور مکہ مکرمہ جا کر قریش مکہ کو مسلمانوں کے خلاف اکسانے لگے (ابن ہشام، ۳ : ۵۰ ببعد)۔ اسی زمانے (شوال ۲ھ) میں ایک مسلمان عورت بنی قینقاع کے ایک زرگر کی دکان پر گئی، جس نے اس مسلم خاتون سے توہین آمیز سلوک کیا۔ ایک انصاری مسلمان، جو وہاں سے گزر رہا تھا، برداشت نہ کر سکا اور زرگر کا سر قلم کر دیا۔ دوسرے یہودی آئے اور اس مسلمان کو جان سے مار ڈالا۔ آپؐ ان کی فہمائش کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا: بدر والوں کے انجام سے عبرت پکڑو۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا: ہم قریش نہیں؛ ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے (ابن ہشام، ۳ : ۵۰)۔ اس طرح جنگ چھڑ گئی۔ پندرہ دن کے محاصرے کے بعد چار سو زرہ پوش اور تین سو دیگر جنگجو مقاتلین کی موجودگی کے باوجود یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ آنحضرتؐ نے ان کی جان بخشی کر دی اور ان کو اسلحہ لے کر شہر سے چلے جانے کی اجازت دے دی۔ یہ آذرعات (فلسطین) چلے گئے۔ اس حادثے کے بعد باقی یہودیوں کی عداوت بڑھ گئی (البلاذری: انساب، ۱ : ۳۰۸ تا ۳۱۰ ؛ [نیز رک بہ قینقاع])۔

غزوۂ بنی نضیر (ربیع الاول ۴ھ): بنو نضیر اور نجد کے بنو عامر میں معاہدۂ حلیفی تھا (ابن ہشام، ۳ : ۱۹۹)۔ بنو عامر نے مسلمانوں کی ایک تبلیغی

marfat.com
Marfat.com

جماعت کو بلا کر غداری سے قتل کر دیا ۔ پوری جماعت میں سے صرف حضرت عمروؓ بن امیہ الضمری کسی طرح جان بچا کر مدینہ واپس پہنچے ۔ انھوں نے راستے میں بنو عامر کے دو آدمیوں کو سوتے پایا اور ان کے مسلمان ہونے سے لاواقفیت کی بنا پر موقع ملنے پر انھیں قتل کر دیا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپؐ نے سخت خفگی اور افسوس کا اظہار کیا اور ان کی دیت ان کے رشتہ داروں کو بھیجی۔ حلیف ہونے کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بنو نضیر کے پاس بھی گئے اور دیت میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی ۔ بنونضیر نے [بظاہرتو] مطالبے کو قبول کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو انتظار کرنے کے لیے کہا، [مگر دوسری طرف ایک یہودی عمرو بن جحاش بن کعب ایک پتھر اوپر سے گرانے کے لیے چڑھ گیا] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کی ناپاک سازش تھی اور اس طریقۂ قتل کی اس زمانے میں کئی اور مثالیں پیش آ چکی تھیں ۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سمجھا دیا ۔ آپؐ چپکے سے واپس چلے آئے ۔ آپؐ نے ان کو تجدید معاہدہ کی دعوت دی ، جو انھوں نے رد کر دی ۔ اس طرح بنو نضیر سے بھی جنگ چھڑ گئی ۔ بجائے عفو طلبی کے وہ مقابلے پر آمادہ ہوگئے ۔ دو ہفتوں کے محاصرے کے بعد صلح پر آمادہ ہوئے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان سے بڑی رعایت کی ۔ انھیں کل مال و متاع سمیت چلے جانے کی اجازت دی ؛ صرف اسلحہ اور اراضی کو ضبط کیا ؛ حتّٰی کہ ان کے جو قرض مسلمانوں پر تھے ان کی بازیابی کا بھی انھیں حق دیا (السرخسی : شرح السیر الکبیر ، ۳ : ۱۸۰ ، ۲۲۹) ۔ انھیں یہ رعایت بھی دی کہ وہ بوقت ضرورت تجارت وغیرہ کے لیے مدینہ منورہ آ سکتے ہیں ۔ ان کے برے برتاؤ کی وجہ سے جنگ کے زمانے میں بنو قریظہ کا کوئی یہودی ان کی مدد کو نہ آیا (المقریزی ، ۱ : ۱۷۹) ۔ ان کا بڑا حصہ خیبر میں جا بسا اور کچھ فلسطین چلے گئے ۔ چند ایک مسلمان بھی ہوگئے ۔ ان میں سے جو خیبر میں آباد ہوئے انھوں نے جنگ خندق ۵ھ برپا کرائی، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ۔

بنو قریظہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بڑی مہربانیاں تھیں ۔ آپؐ نے انھیں بنو نضیر کے چھوت چھات سے نجات دلائی تھی ، مگر انھیں بھی شکر گزاری میسر نہ آئی ۔ غزوہ احزاب (خندق) میں، جب مسلمان سخت کرب کی حالت میں تھے، تو بنو نضیر کے ورغلانے پر بنو قریظہ بھی آمادۂ فساد ہوگئے کہ مسلمانوں کی صفوں پر اندر سے حملہ کریں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سیاسی اور عسکری دونوں محاذوں پر شدید سرگرمی دکھانے پر جب محاصرہ کرنے والے ناکام واپس ہوگئے تو بنو قریظہ کو اپنے اعمال کا ذمہ دار بننا ناگزیر تھا ۔ وینسنک (رسالہ *Der Islam* ، ۲ : ۲۸۹) نے غیر جانبداری سے معقول بات لکھی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بنو نضیر کے ساتھ بڑی نرمی کا برتاؤ کیا تھا، مگر جواباً انھوں نے خندق کا دہشت ناک محاصرہ کرایا ۔ بنی قریظہ کو بھی اس دفعہ معاف کرنے میں ضرورت سے زیادہ خطرات مول لینا تھے ۔ بہرحال [مختلف روایات کے مطابق] پندرہ، پچیس یا تیس دن کے محاصرے کے بعد انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قبول کیا کہ ان کے حلیف انصار [بنو اوس] ان کی تحکیم کریں ۔ بنو اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ نے جو زخمی تھے ، فیصلہ دیا کہ یہود پر یہودی قانون (تورات کا حکم) ہی نافذ کیا جائے (جو کتاب استثنا ، ۲۰ : ۱۰ تا ۲۰ میں ہے) ۔ تورات کا حکم یہ تھا کہ مقاتلین قتل کیے جائیں؛ عورتیں بچے غلام بنائے جائیں ۔ یہ فیصلہ سخت تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مجبور تھے کہ حَکَم کے فیصلے کا احترام

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

کریں ۔ کچھ قریظی یہودی مسلمان ہو گئے تھے ؛ انھیں اس حکم سے مستثنیٰ رکھا گیا ۔ اس طرح یہود سے برتاؤ کی ایک منفرد نظیر قائم ہو گئی ۔ یہودی افراد کی موجودگی مدینہ منورہ میں کم ہوئی ، مگر مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی ۔ بنو عُرَیض وغیرہ کے چند قبائل پھر بھی باقی رہے ۔ ان میں سے بعض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عطیات بھی دیے (الوثائق السیاسیة ، عدد ۲۰) ۔ اس کے علاوہ بعض یہودی تجارت سے مرفّہ الحال ہوتے رہے ۔ آپؐ نے ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رہن رکھوا کر ، وصال سے کچھ روز قبل، کچھ غلہ قرض لیا تھا ۔ آپؐ کے وصال تک وہ زرہ اسی یہودی کے پاس رہی (البخاری، کتاب البیوع (۳۴)، باب ۸۷؛ ابن سعد، ۲/۱ : ۳۱۲).

غزوۂ خیبر : جیسا کہ دیکھا گیا مدینۂ منورہ کے باہر اسلام سے سب سے زیادہ عداوت ، خیبر کے یہودیوں کو تھی ۔ جنگ خندق کے وہ براہ راست ذمہ دار تھے اور بنو قریظہ کی جنگ کے بھی بالواسطہ وہی باعث ہوئے تھے ، لیکن ان کی ساری جانی و مالی قوت ہنوز خیبر میں محفوظ تھی ۔ صلح حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قریش کو اہل خیبر سے الگ کر دیا ؛ پھر چند ہفتے بعد محرم سنہ ۷ھ میں پندرہ سو مسلمانوں نے خیبر کے ، بروایت یعقوبی (۲ : ۵۶) بیس ہزار اور بروایت مقریزی (۱ : ۳۱۰) دس ہزار مقاتلین کو کچھ اس طرح زیر کیا کہ پھر آئندہ انھیں کبھی اسلامی حکومت کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی ۔ اسی مہم خیبر کے دوران میں تیماء اور فدک کے یہودی بھی لڑے بغیر مطیع ہو گئے اور اہل خیبر کی شرائط پر معاہدۂ اطاعت کرنا منظور کیا، یعنی وہاں کی زمینیں سرکاری سمجھی جائیں گی اور وہ زمینوں پر زراعت کر کے سالانہ نصف پیداوار لگان میں دیا کریں ۔ (نصف پیداوار کا دینا خود مدینہ منورہ کے مسلمانوں میں بھی بروایت بخاری رائج تھا ، نہ اس زمانے کا علمدرآمد تھا ؛ کوئی خصوصی سختی نہیں) ۔

غیر مسلم رعایا پر امن اور آئین پسند رہے تو اسلامی حکومت سے زیادہ روادار تاریخ میں کوئی اور قوم نہیں ملتی ۔ [اسلامی تعلیمات کے مطابق یہ بحث اپنی جگہ آئے گی ۔ مختصراً یہی کافی ہے کہ (اسلامی تعلیمات کے مطابق) غیر مسلم اپنے مقدمات اپنی عدالتوں میں لے جا سکتے ہیں اور اپنے ہی قانون کے تحت] ۔

آنحضرتؐ اور عرب قبائل : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مقصد عقائد و اخلاق کی اصلاح تھا؛ حکومت اور فتوحات نہیں ۔ اسی لیے آپؐ کی طرف سے جھگڑے مول لینے کا کوئی سوال ہی نہ تھا ۔ اسی بنا پر قریش اور ہوازن اور ان کے حلیف قبائل کے سوا دیگر اور قبائل عرب سے شاذ ہی کوئی جھگڑا ہوا ۔ خود دین بھی چونکہ جبر و اکراہ کا مخالف تھا ؛ اس لیے امن پسند بت پرستوں سے کوئی تعرض نہ کیا گیا ۔ مدینہ منورہ میں بھی ایسے لوگ آخر تک موجود رہے اور اسلامی ثقافت کے عالمگیر سمندر میں فاسد عقیدے خود بخود ختم ہوتے رہے ۔ ہجرت کے فوراً بعد مدینہ منورہ کے شمال اور جنوب میں بسنے والے قبائل (بنو جُہینہ ، بنو ضمرہ ، بنو غفار ، بنو اسلم وغیرہ) سے حلیفی کے معاہدے کیے گئے اور ان غیر مسلم قبائل کو نہ آپؐ کی طرف سے کبھی بد عہدی کی شکایت ہوئی اور نہ خود ان کی طرف سے غداری ہوئی ۔ وہ آہستہ آہستہ بغیر جبر کے خود بخود مسلمان ہو گئے ، جن میں سے بعض فتح مکہ سے بھی بعد میں مسلمان ہوئے ۔

بنو ہوازن اور بنو سُلَیم، جن سے قریش کے علاوہ مخاصمت ہوئی ، نہ صرف ہم جد قبائل تھے؛ بلکہ ان میں باہمی حلیفی کے معاہدے بھی موجود تھے ۔ بنو سلیم پر تمام عرب پر حکومت کرنے کا خبط سوار تھا اور بنو ہوازن کو اپنے بت خانہ لات کے باعث مکہ مکرمہ

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

اور بیت اللہ شریف سے ہمسری کا دعوٰی تھا۔ توحید کی دعوت سے اہل مکہ کی طرح ان کی مخالفت شرک دوستی کا نتیجہ تھی۔ نجد کے بنو عامر بن صعصعہ انھیں کی ایک شاخ تھے۔ اگر یہ خود اسلام اور اسلامی حکومت کے خلاف جارحانہ کارروائیاں نہ کرتے تو ان سے جو مختصر جھڑپیں ہوئیں، وہ بھی شائد نہ ہوتیں۔ بنو غطفان اور بنو فزارہ عرب کے دو طاقتور قبیلے تھے ان سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا سامنا ہوا۔ یہ اپنے سردار عُیینہ بن الحصن الفزاری کی کج طبعی کے باعث اسلام اور اسلامی حکومت کے مخالف رہے۔ اسی طرح قریش اور اہل خیبر انھیں گمراہ کرتے رہے، مگر بعد ازاں جب حالات سازگار ہو گئے تو یہ بھی مسلمان ہو گئے۔ اور خلافت راشدہ کی فتوحات میں شریک ہو کر اسلامی سلطنت کی توسیع کا سبب بنے۔

جزیرہ نمائے عرب کا زرخیز ترین علاقہ جنوب میں یمن اور مشرق میں بحرین و عمان ایرانی نو آبادی پر مشتمل تھا۔ شمالی سرحد میں رومی اثرات روز افزوں تھے۔ عرب میں شمالی قبائل زیادہ تر عدنانی تھے؛ بجز مدینہ منورہ کے، جہاں کے انصار یمنی الاصل تھے اور جنوب (یمن) میں قحطانی؛ ان میں دشمنی اور مناقشت قدیم زمانے سے ہی موجود تھی۔ بنو عدنان میں اہل مکہ اور اہل طائف وغیرہ مضر شاخ سے تعلق رکھتے تھے تو نجد اور مشرق عرب میں جہاں ایرانی نفوذ تھا، ربیعہ شاخ تھی۔ کسرائے ایران کے عطا کردہ تاج اور ماتحتی پر نجد کے بنو حنیفہ اپنے چھوٹے سے علاقے میں اپنے آپ کو بہت اونچا سمجھتے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو ہوذہ بن علی نے کہا: مجھے اپنے ساتھ سارے عرب کا شریک حکمران بنا لو تو اسلام قبول کرتا ہوں۔ ہوذہ کی وفات پر مسیلمہ کذاب [رک بآں] کو بھی یہی خبط سمایا؛ چنانچہ اس نے جھوٹی نبوت کا دعوٰی کر کے مخالف اسلام قوتوں کو اپنے ماتحت جمع کر کے اسلام کے خلاف محاذ قائم کر لیا، مگر اس کی کوشش پانی کا بلبلہ ثابت ہوئی جو ہلکی سی ضرب سے ختم بھی ہو گئی [رک بہ ابوبکرؓ]۔

عرب کے انتہائی مشرق بحرین اور عمان میں اسلام برضا و رغبت قبول کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں علاقے پہلے ایرانی نو آبادی تھے۔ اسلامی حکومت کی وجہ سے انھوں نے ایرانی استبداد سے نجات پائی تھی۔ ایران کی موجودگی کے باوجود یہاں مجوسیت [رک بہ مجوس] زیادہ پھیلی ہوئی نہ تھی۔ عمان میں تو معمولی بتوں کی جگہ اسبذ یعنی گھوڑے [ابو عبید: کتاب الاموال، ۲۱) کی پوجا کرنے والے بھی کافی با اثر تھے (الوثائق السیاسیة، عدد ۶۶)۔ بہر حال الاحساء کے حکمران المنذر بن ساوٰی نے اور عمان کے مشترک حکام جیفر بن الجلندی اور عبد بن الجلندی نے تبلیغی مکتوبات نبوی پر فوراً اسلام قبول کر لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام سارے مشرق عرب میں حکمرانی کرنے لگا [نیز رک بہ عمان]۔

یمن سے کوئی جھگڑا ہوا ہی نہیں۔ نجران وغیرہ کے بنو حارث جو بت پرست تھے، حضرت خالدؓ بن الولید اور حضرت علیؓ کی پر امن تبلیغی کوششوں سے بہت جلد اور بآسانی مسلمان ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ وہاں جو نصرانی آباد تھے انھوں نے اولاً علمی بحث کے لیے ایک وفد مدینہ منورہ بھیجا تا کہ نصرانی عقائد کا اثبات کرے [رک بہ مباہلہ]۔ عقائد کے معاملات میں ریاضیاتی دلیلیں تو پیش نہیں کی جا سکتیں؛ [چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کے سامنے پہلے تو براہین قاطعہ پیش فرمائے، مگر پھر باذن خداوندی (۳ [آل عمران]: ۶۱) مباہلے کی دعوت پیش کی جس سے اہل نجران گھبرا گئے۔ بالآخر ایک باہمی معاہدہ ترتیب پا گیا]، جس میں آپؐ کی طرف سے مذہبی

marfat.com

Marfat.com

آزادی وغیرہ کا اطمینان دلایا گیا ؛ پھر خود انھوں نے درخواست کی کہ ایک مسلمان کو ان پر حاکم عدالت بنا کر ان کے ہاں بھیجا جائے (ابن ھشام، ۲ : ۲۲۲ تا ۲۳۳؛ نیز [رک بہ نجران]) .

گمان ھوتا ہے کہ قبیلہ عنس اور قبیلہ بلحارث (بنو حارث) میں بھی رقابت تھی ۔ بلحارث مسلمان ھو گئے تو عنس کو اسلام سے کد پیدا ھو گئی ؛ چنانچہ اسود عنسی [رک بان] نے جھوٹی نبوّت کا دعوی کر کے نام نہاد صوبائی عصبیت کا علم بلند کیا ، لیکن مقامی نو مسلموں نے چند ھی ھفتوں میں اس تحریک کو ختم کر دیا تھا .

شمال مشرق میں بنو تمیم اور شمال میں بنو طیّئ اور بنو کلب سے بھی برائے نام جھڑپیں ھوئیں اور ان میں بھی اسلام ، خاص کر فتح مکہ کے بعد، تیزی سے پھیل گیا اور اس طرح سارا عرب اسلام کے زیر نگین ھو گیا ۔ سنہ ۹ھ کو عام الوفود کہا جاتا ہے ۔ بیسیوں قبائل عرب کے وفد مدینہ منورہ خود بخود حاضر ھو کر مشرف باسلام ھوے ۔ (دیکھیے ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۲۹۱ تا ۳۵۹ ، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۰ء) .

بیرون عرب تبلیغ : جیسا کہ اوپر اشارۃً ذکر ھوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حدیبیہ میں قریش سے مصالحت کے بعد مدینہ منورہ پہنچتے ھی روم ، ایران ، مصر اور حبشہ کے حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھیجے ۔ یہ سنہ ۷ھ کا آغاز تھا ۔ حبشہ [رک بان] سے روابط اس تاریخ سے بہت پہلے شروع ھو چکے تھے ۔ اس موقع پر نجاشی [رک بان] کے نام آپؐ نے جو تبلیغی خط ارسال کیا وہ ھرقل کو آپؐ کے لکھے ھوے خط سے مشابہ ہے (الوثائق السیاسیة ، عدد ۲۲) ۔ یہ مکتوب سنہ ۷ھ کا ھونا چاھیے اس کا ایک جواب بھی (حوالۂ مذکور ، عدد ۲۳) ملتا ہے ، جس میں حبشہ کے حکمران نجاشی کی طرف سے اسلام قبول کرنے کا ذکر ہے ۔ اس کے اسلام لانے کی تائید اس سے بھی ھوتی ہے کہ البخاری (۲۳ : ۵۴، ۶۱ [۱ : ۳۳۱ ، ۳۳۳ تا ۳۳۴]) نے روایت کی ہے کہ نجاشی کی وفات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی ۔ امام مسلم کے مطابق نئے نجاشی کو بھی آپؐ نے تبلیغی خط بھیجا ، مگر بظاہر وہ بے سود رہا (دیکھیے الوثائق السیاسیة، عدد ۲۵) ۔ نجاشی کے نام کا ۷ھ والا اصل خط اب دستیاب ھو گیا ہے (الوثائق السیاسیة ، ص ۴۵، مطبوعۂ قاھرہ ۱۹۵۶ء) .

ھرقل شہنشاہ روم کو ۷ھ میں ایک تبلیغی خط بھیجا گیا (الوثائق السیاسیة، عدد ۲۶)۔ ھرقل سے آپؐ کے سفیر کی ملاقات بیت المقدس میں ھوئی جہاں ھرقل ایران کی فتح پر نماز شکرانہ کے لیے گیا ھوا تھا۔ سفیر کا اعزاز تو ھوا، لیکن یونانی عوام کے شدید دینی تعصب کو دیکھ کر ھرقل نے معذرتی جواب بھیجا (عدد ۲۸)۔ ادھر سے مایوس ھو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مختلف بوزنطی افسروں کو جو عربی النسل تھے براہ راست تبلیغی خطوط بھیجے ؛ ان میں سے ایک خط (حوالۂ مذکور ، عدد ۳۷) کے قاصد کو قبیلۂ غسان کے ایک افسر نے دمشق کے قریب قتل کر دیا ۔ یہ قانون بین الممالک کی کھلی خلاف ورزی تھی ۔ اس پر ھرقل کو مکرر خط لکھا گیا (حوالۂ مذکور ، عدد ۲۷) کہ وہ اسلام لائے ، یا جزیہ دے، یا کم از کم اپنی رعایا میں سے مسلمان یا ذمی بننے کے خواھشمندوں کو نہ روکے ۔ ھرقل نے اسے اپنے خلاف دھمکی سمجھ کر ، ایران سے جنگ کے لیے جمع کی ھوئی فوج میں سے ایک لاکھ آدمی سرحد پر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے بھیج دیے۔ مؤتہ (اردن) [رک بان] میں ان کی (تین ھزار) مسلمان فوج سے مڈھ بھیڑ ھوئی (۸ھ) ۔ معان کا گورنر فروہ بن عمرو الجُذامی بھی ، غالباً ایک تبلیغی خط پر مسلمان ھوگیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس کی

marfat.com
Marfat.com

اطلاع بھیجی (حوالۂ مذکور، عدد ۵۳) ۔ ابن ہشام کے مطابق ہرقل نے اسے قتل اور سولی کی سزا دی ۔ سفیر کے قتل کی تلافی سے انکار پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک بڑی فوج لے کر تبوک گئے (۹ھ)۔ اس پر ہرقل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامنا کرنے سے گھبرایا ۔ تبوک کی مہم کے دوران میں آپؐ نے بوزنطینی علاقوں میں سے دومة الجندل، مقنا، ایلہ، جرباء اور اذرح پر قبضہ کر لیا اور ان سے معاہدات فرمائے (حوالۂ مذکور، عدد ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴) ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ایک خط ضغاطر اسقف روم کے نام بھی ملتا ہے (الوثائق السیاسیة، عدد ۹۲) ۔ اسی طرح ایلہ کے اسقف کے نام بھی آپ نے ایک مکتوب ارسال کیا (عدد ۳۰)، جس میں آپ نے ان کو اسلام لانے ورنہ جزیہ دے کر ذمی بننے کی دعوت دی، اور بصورت دیگر فوجی کارروائی کی اطلاع دی تھی ۔ تبوک کی کامیاب مہم کے باوجود سفیر کے قتل کا مسئلہ حل نہ ہوسکا ۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرض الوفات میں حضرت اسامہؓ بن زیدؓ، جن کے والد حضرت زیدؓ بن حارثہ غزوہ مؤتہ میں شہید ہوگئے تھے، کی سرکردگی میں ان کی تادیب کے لیے ایک فوج تیار کی ۔ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ صدیق نے اپنی خلافت کے دوران میں روانہ کیا، مگر سامنا پھر بھی نہ ہوا ۔

مصر پر ایرانیوں نے قبضہ کر لیا تھا، لیکن جب نینوی میں ہرقل نے ان کو شکست فاش دی، تو مصر، شام اور دیگر مفتوحہ علاقے دوبارہ بوزنطی مملکت میں آ گئے ۔ فتح کے بعد قیصر روم کی فوج ابھی مصر آئی نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسکندریہ کے قبطی سربراہ اور صدر پادری مقوقس کو ایک تبلیغی خط بھیجا ۔ جواب میں سفارتی اخلاق تو برتے گئے اور کچھ تحفے تحائف بھی بھیجے گئے، لیکن قبول اسلام کے سلسلے میں اس نے شائستہ طور پر معذرت کر دی (عدد ۵۰) ۔ مکتوب نبوی بنام مقوقس کی اصل بھی دستیاب ہو چکی ہے (دیکھیے الوثائق السیاسیہ، عدد ۴۷) .

ایران نے کئی صدیوں سے مشرقی عرب پر اور تقریباً نصف صدی سے جنوبی عرب (یمن) پر قبضہ کر رکھا تھا ۔ پایۂ تخت ایران کے اخلاقی انحطاط کے باعث اس کے زیر نگین علاقوں میں استبداد اور بے اصولی پیدا ہو گئی تھی ۔ اس سیاسی اور نفسیاتی کشمکش کے ماحول میں سنہ ۷ھ کے آغاز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے "کسری شاہ فارس" کو ایک تبلیغی خط لکھا (حوالۂ مذکور، عدد ۵۳) اور مشرقی عرب کے ایرانی افسروں کے توسط سے مدائن بھجوایا ۔ مضمون سن کر بادشاہ کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے پورا خط سنے بغیر ہی چاک کر دیا اور [تمام سفارتی آداب واخلاق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے] سفیر کو ذلت کے ساتھ اپنے دربار سے نکال دیا گیا ۔ اس کے بعد حسب عادت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایران کے ماتحت افسروں اور حکمرانوں کو براہ راست خطوط لکھے ۔ ایک خط سماوہ کے حکمران کے نام بھی ہے، جو جنوبی عراق میں ہے (حوالۂ مذکور، عدد ۵۵)؛ وہ غالباً عربی النسل تھا، مگر اس کا جواب معلوم نہیں ۔ بحرین اور عمان کے گورنر اور حکمران بھی آپ کی تبلیغ سے مسلمان ہو گئے ۔ عمان میں مدینہ منورہ سے حضرت عمروؓ بن العاص کو بھیجا گیا کہ اسلامی تعلیم و تربیت اور زکوٰۃ وغیرہ کے وہ ذمہ دار رہیں ۔ جبکہ غیر مسلموں کا جزیہ اور دیگر انتظام مقامی حکمرانوں : جیفر بن الجلندی اور عبد [یا: عیاذ] بن الجلندی، سے متعلق رہے ۔ عمان میں دبا کی بندرگاہ بڑی اہم تھی اور وہاں کے سالانہ میلے میں ہندوستان اور چین وغیرہ کے تاجر بھی آتے تھے ۔ وہاں کے لیے [حضرت حذیفہؓ کو بطور] خصوصی والی مدینہ منورہ سے بھیجا گیا [(انساب الاشراف، ۱: ۵۳۹)]۔ ایران سے نفرت بحرین اور عمان سے کہیں زیادہ یمن

marfat.com
Marfat.com

میں تھی ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ باذان (یا : باذام) بن ساسان نامی یمن پر ایرانی گورنر نے خلوص کے ساتھ اسلام قبول کرلیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے اس عہدے پر بحال رکھا اور کچھ عرصہ بعد سنہ ۱۰ھ میں اس کی وفات ہوئی تو اس کے بیٹے شہر بن باذان کو وہی منصب عطا فرمایا اور عامر بن شہر (مؤخرالذکر کے بیٹے) کو علاقے کی گورنری مرحمت فرما دی۔ ایرانی مقبوضات میں اسلام کے روز افزوں پھیلنے سے گھبرا کر چند سال بعد ملکہ پوران دخت نے بروایت ترمذی و طبری ایک سفیر مدینہ منورہ بھیجا اور تحفے تحائف بھیج کر سابقہ غلطی کی تلافی کی کوشش کی، مگر وہ خود زیادہ دن تخت پر نہ رہ سکی ۔

حِجّۃ الوَداع : فتح مکہ کے سوا سال بعد ذوالحجہ ۹ھ میں حج کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے مِنٰی وغیرہ میں اعلان کیا گیا کہ غیر مسلم قبائل کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے کہ نئے انتظامات کر لیں اور یہ کہ آئندہ سے بیت اللہ شریف صرف اہل اسلام کے لیے مختص ہوگا ؛ غیر مسلم اس کے حج کے لیے نہ آئیں ۔ یہ اعلان سیاسی و دینی اہمیت رکھتا تھا ، لیکن اس سے قطعاً کوئی دشواری پیش نہ آئی ؛ کیونکہ رفتہ رفتہ جملہ اہل عرب حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ ۹ھ کے اس اعلان کے بعد سے حاجیوں کی تعداد روز افزوں رہی اور سنہ ۱۰ھ میں جب آپ حجۃ الوداع کے لیے تشریف لائے تو ایک لاکھ چالیس ہزار کا غیر معمولی اور عظیم الشان اجتماع تھا۔ یہ حج آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالتی زندگی کا اکمال اور اسلام کی تعلیمات کا اتمام تھا ۔ فریضۂ نبوت کے حسن تکمیل پر خداوند تعالی نے فرمایا : اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵ [المآئدۃ] : ۳)، یعنی آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے بطور دین کے اسلام پسند کر لیا ۔ اس سے بڑھ کر مسلمانوں کو کس چیز سے خوشی ہو سکتی تھی ۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ہجرت کے بعد پہلا اور آخری حج تھا ۔ آپؐ کے حج کو جانے کی خبر پھیلی تو تمام مسلم علاقوں سے مسلمان حج کو آئے ۔ اس حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حج کے مناسک ادا فرما کر امت کے سامنے عمدہ مثال پیش کی ۔ اس کے علاوہ لوگوں کے سوالوں کا جواب دیا اور وقوف عرفات کے موقع پر جبل الرحمۃ پر چڑھ کر اپنا شہرۂ آفاق خطبہ حجۃ الوداع دیا ۔ آپؐ کے چاروں طرف ایسے افراد مقرر کیے گئے جو آپؐ کے ہر ہر جملے کو مکبّروں کی طرح باآواز بلند دہراتے تھے ۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ لاکھ حاضرین اس کو بخوبی سن رہے تھے ۔ اس میں حمد و صلوٰۃ کے بعد آپ نے فرمایا : لوگو میری باتوں کو غور سے سنو ۔ ممکن ہے کہ اس سال کے بعد میں تم سے اس مقام پر نہ مل سکوں ؛ اے لوگو! حقیقت میں تمہارے خون ، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں تمہارے لیے تمہارے رب سے ملنے تک (ہمیشہ کے لیے) محترم ہیں ، اتنے ہی محترم جتنا کہ آج کا دن اور یہ مہینا اور یہ مقام ہے ۔ ہاں ! کیا میں نے خدائی پیغام پہنچا دیا ؟ اے اللہ ! گواہ رہنا ؛ کسی کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو وہ صاحب امانت کو واپس کر دے ؛ بے شک زمانۂ جاہلیت کا سود (ربٰو) ختم کر دیا گیا ہے ؛ البتہ تمہیں قرض کے اصل سرمائے کی بازیابی کا حق ہے ؛ نہ ظلم کرو ، نہ ظلم سہو ؛ اللہ نے حکم دیا ہے کہ سود نہ رہنے پائے ؛ سب سے پہلا سود جس (کی منسوخی) سے میں آغاز کرتا ہوں، وہ میرے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کا سابقہ واجب الادا سود ہے ؛ بے شک زمانۂ جاہلیت کے خون ختم کر دیے گئے ہیں

marfat.com
Marfat.com

اور سب سے پہلا خون جس (کی منسوخی) سے میں آغاز کرتا ہوں وہ (میرے چچا زاد بھتیجے) ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کے بیٹے کا خون ہے ۔ [ربیعہ بن الحارث کے بیٹے آدم کو شرفائے مکہ کے دستور کے مطابق دودھ پلانے کے لیے قبیلہ ھذیل کے سپرد کیا گیا تھا ۔ ننھا منا آدم بن ربیعہ ایک دن گھر کے سامنے بیٹھا تھا کہ بنو لیث کے ایک آدمی نے پتھر مارا جس سے بچہ وہیں جاں بحق ہوگیا ۔ یہی پہلا خون تھا ۔ جس کا قصاص یا بدلہ نبی کریم علیہ و آلہ وسلم نے اس مبارک تقریب میں معاف فرما دیا (ابن حزم : جمہرۃ انساب العرب ، ص ۷۰ ؛ الروض الانف ، ۲ : ۳۵۱ تا ۳۵۲ ؛ انساب الاشراف ، ۱ : ۳۶۳)] ؛ بے شک زمانۂ جاھلیت کے جملہ امتیازات ختم کر دیے گئے ھیں ، بجز کعبے کی رکھوالی اور حاجیوں کو پانی پلانے کے کام کے ؛ قتل عمد میں قصاص لیا جائے گا ؛ قتل خطأ وہ ہے کہ جب کسی کو لاٹھی یا پتھر مارنے سے قتل کیا جائے اور اس میں سو اونٹ (بطور خونبہا) ھیں ۔ جو اس سے زیادہ (مانگے) تو وہ زمانۂ جاھلیت والوں میں سے ہوگا ؛ اے لوگو ! شیطان اس سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ تمھاری اس سر زمین میں اس کی عبادت کی جائے ، لیکن وہ اس پر راضی ہے کہ اس (بت پرستی) کے سوا دوسرے ایسے کاموں میں اس کی بات مانی جائے جن کو تم حقارت سے دیکھتے ہو ۔ اپنے دین کے متعلق شیطان کی چالوں سے بچتے رہو ؛ اے لوگو ! نسیٔ (قمری سال کو شمسی سال کے برابر کرنے کے لیے اس میں وقتاً فوقتاً مہینوں کا اضافہ کرنا) کفر میں زیادتی ہے ۔ اس سے جو لوگ کافر ھیں وہ گمراہ ہوتے ھیں ، ایک سال تو وہ (ایک مہینے کو) حلال قرار دیتے ھیں اور دوسرے سال اسے حرام مہینہ ، تا کہ (مہینوں کی) اس تعداد کو (ظاہری طور پر) برابر رکھیں جو اللہ نے حرام قرار دیا ہے ، اس طرح اس مہینے کو حلال کر دیں جو اللہ نے حرام کیا ہے اور حرام کر دیں اس کو جو اللہ نے حلال کیا ہے ۔ حقیقت میں (کبیسہ والی اور غیر کبیسہ والی تقویموں میں) زمانہ گھوم کر اب دوبارہ اسی شکل پر آ گیا ہے جیسا اس دن تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا ۔ حقیقت میں اللہ کے نزدیک ، اس کی تقدیر میں سال کے ، اس دن سے بارہ مہینے ہی تھے جب کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا ۔ ان میں چار حرمت کے مہینے ھیں ، تین پے در پے اور ایک منفرد : ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور قبائل مضر کا رجب ، جو جمادی الآخرۃ اور شعبان کے بیچ میں آتا ہے ۔ ھاں ! کیا میں نے (خدائی پیغام) پہنچا دیا ؟ اے اللہ ! گواہ رہنا ؛ اے لوگو ! بے شک تمھاری بیویوں کا تم پر حق ہے اور تمھارا ان پر حق ہے ۔ تمھارا حق ان پر تو یہ ہے کہ وہ تمھارے بستر تمھارے سوا کسی اور کو (بدکاری کے لیے) روندنے نہ دیں ، اور تمھارے گھروں میں کسی ایسے شخص کو داخل نہ ہونے دیں، جس کو تم پسند نہ کرتے ہو ، بجز تمھاری اجازت کے اور یہ کہ بیویاں کوئی فحش کام نہ کریں ، لیکن اگر وہ ایسا کریں تو بے شک اللہ نے تمھیں پورا حق دیا ہے کہ ان کو (اس سے) منع کرو اور ان کو بستروں میں سزا کے طور پر تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو، لیکن ایسی مار جو سخت نہ ہو ۔ اگر وہ (فحش کاری سے) رک جائیں اور تمھاری بات مانیں تو تم پر واجب ہے کہ ان کو رسم و رواج کے مطابق مناسب غذا اور لباس مہیا کرو ۔ اور بیویوں سے اچھے برتاؤ کے متعلق تاکید کو سنو ؛ کیونکہ حقیقت میں وہ تمھارے ماتحت سی ہوتی ھیں ۔ ھاں ! کیا میں نے پہنچا دیا ؟ اے اللہ ! گواہ رہنا ؛ اے لوگو ! تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ھیں اور کسی مومن کے لیے اس کے بھائی کا مال حلال نہیں بجز اس کی رضامندی کے ۔ ھاں ، کیا میں نے پہنچا دیا ؟ اے اللہ ! گواہ رہنا ؛ میرے بعد کافر بن

marfat.com
Marfat.com

کر ایک دوسرے کی گردنیں ہرگز نہ مارنا ؛ میں تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم ان کو تھامے رہوگے تو کبھی بھٹکنے نہ پاؤگے : اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت ۔ ہاں ، کیا میں نے پہنچا دیا ؟ اے اللہ گواہ رہنا ۔ اے لوگو ! بے شک تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے تم آدم سے (نکلے ہو اور آدم مٹی سے بنے) ۔ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو ۔ اور کسی عربی کو کسی عجمی [کسی عجمی کو عربی پر ، کسی سرخ کو کالے پر اور کسی کالے کو سرخ پر (مسند احمد بن حنبل] بجز تقوی کے کوئی فضیلت نہیں ۔ ہاں ، کیا میں نے خدائی پیغام پہنچا دیا ؟ لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا : ہاں ، بے شک ۔ تو آپ نے فرمایا : اے اللہ ! گواہ رہنا ۔ آپ نے کلام جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا : تو پھر حاضر شخص (یہ باتیں) غیر حاضر تک پہنچا دے ۔

اے لوگو ! بے شک اللہ تعالی نے ہر وارث کے لیے (مرنے والے کی) میراث میں اس کا حصہ مقرر کر دیا ہے اور کسی وارث کے لیے کوئی (مزید) وصیت جائز نہیں اور وصیت (ترکے کے) ایک تہائی سے زیادہ کے لیے درست نہیں اور بچہ بستر کے مالک (عورت کے شوہر) کا سمجھا جائے گا ، اور زنا کار کو پتھراؤ کیا جائے گا اور جو اپنے باپ کے سوا کسی اور سے نسب کا ، یا اپنے مولٰی کے سوا کسی اور کے مولی ہونے کا دعوی کرے تو اس پر اللہ ، فرشتوں اور سارے لوگوں کی لعنت ہو ؛ ایسے شخص سے (قیامت کے دن) نہ کوئی معاوضہ قبول ہوگا اور نہ (فعل کے) کوئی مماثل چیز؛ والسلام علیکم ۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے : الوثائق السیاسیة ، عدد ۲۸۷/الف ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۷۲ تا ۱۷۹ ؛ ابن ہشام : سیرة ، ۴ : ۲۴۸ تا ۲۵۳ ؛ الواقدی : المغازی ، ۳ : ۱۰۸۸ تا ۱۱۰۳ ؛ وغیرہ] .

الطبرانی کی روایت میں یہ جملہ بھی ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں ۔ اس لیے اپنے رب کی عبادت کرو ؛ پانچ وقت کی نمازیں پڑھو ؛ رمضان کے روزے رکھو ؛ اپنے انتظامی افسروں کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہوگے .

یہ خطبہ بلاغت نبوی کے اعلی نمونہ کے حامل ہونے کے علاوہ اسلامی قانون و اخلاق کا بھی جامع ہے ۔ [نیز رک بہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت خطیب] .

خطبۂ خم غدیر : حضرت علیؓ کو تبلیغ اور وصولی زکٰوة وغیرہ کے لیے یمن بھیجا گیا تھا ۔ واپسی میں وہ حج کے زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مکے میں ملے ۔ ان کے ہمراہیوں نے ، حق کے معاملے میں ان کی سختی کی ، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے شکایت کی تو آپؐ نے حج سے واپسی پر مقام خم غدیر [رک بآں] (رابغ) میں پڑاؤ ڈالا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت علیؓ کے طرز عمل کی تائید کی اور ان سے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا ۔ اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا اور آپ مدینہ منورہ تشریف لائے .

مرض الوفات : سفر حج سے واپسی پر دو مہینے گزرے تھے کہ ۱۸ یا ۱۹ صفر ۱۱ھ میں ایک روز آدھی رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یکایک بستر سے اٹھے اور ایک خادم ابو رافع یا ابو مُوَیْہِبَہ کو ساتھ لے کر جنة البقیع کے قبرستان میں تشریف لے گئے اور اپنے پرانے رفقا کے لیے دیر تک دعا و استغفار کرتے رہے ؛ پھر خادم سے کہا: خدا نے مجھے اپنے ہاں آجانے اور دنیا میں تاقیامت رہنے کا اختیار دیا تو میں نے اس کے ہاں جانے کو ترجیح دی ہے ۔ واپس لوٹے تو سر درد سے مرض کی ابتدا ہوچکی تھی (ابن سعد : الطبقات، ۲ : ۲۰۳ تا ۲۰۵) ۔ طبیعت مضمحل ہوتی گئی اور ضعف روز بروز

marfat.com
Marfat.com

بڑھتا گیا۔ [مگر اس کے باوجود آپؐ نے ازواج مطہرات کے گھروں میں باری کے مطابق جانے کا سلسلہ جاری رکھا] اور جب چلنا پھرنا دشوار ہو گیا تو ازواج مطہرات سے کہا: ہر رات ایک بیوی کے ہاں جانے کی جگہ تیمار داری ایک ہی جگہ ہو تو اچھا ہے۔ سب نے قبول کیا۔ [یہ بھی آپؐ نے صراحةً نہیں کہا، بلکہ کنایةً ظاہر کیا، وہ یوں کہ یک شنبہ کی شام کو جب ازواج مطہرات جمع تھیں، آپؐ نے پوچھا کل کس کے گھر پر رہوں گا؟ اگلا دن حضرت عائشہؓ کی باری کا تھا۔ ازواج مطہراتؓ نے مرضی اقدس پا کر عرض کیا: جہاں آپؐ کا دل چاہے قیام فرمائیں]؛ چنانچہ آپؐ حضرت عائشہؓ صدیقہ کے حجرے میں تشریف لائے، جس کا دروازہ مسجد کی صف اول سے عین مقابل کھلتا تھا۔ اس حالت میں بھی جب تک طاقت رہی نمازوں کی بدستور امامت فرماتے رہے۔ آخری نماز، جو آپؐ نے پڑھائی، مغرب کی تھی۔ سر میں درد ہونے کی وجہ سے آپؐ نے سر مبارک پر رومال باندھا ہوا تھا (مسلم: الصحیح، ۲ : ۴۱؛ البخاری، کتاب الاذان، باب ۶۸).

وفات سے غالباً پانچ یوم قبل جمعرات کو ایک روز آپؐ نے غسل کی خواہش کا اظہار فرمایا؛ چنانچہ آپؐ کو ایک ٹب میں بٹھا کر سات چھاگلوں سے آپؐ پر پانی ڈالا گیا۔ اس سے کچھ فوری افاقہ ہوا تو سر پر پٹی باندھے ظہر کے وقت مسجد میں تشریف لائے۔ بعد از نماز منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارک کا آخری خطبہ ہے۔ اس میں آپؐ سب سے پہلے غزوۂ احد کے شہیدوں کو یاد کرکے دیر تک دعاے مغفرت فرماتے رہے۔ پھر فرمایا: اللہ نے اپنے ایک بندے کو دنیا میں رہنے یا اس کے پاس آ جانے میں انتخاب کا اختیار دیا تو اس بندے نے خدا کے پاس جانے کو ترجیح دی۔ صحابہؓ آپؐ کے اس اشارے کو نہ سمجھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ سمجھ گئے اور بلا اختیار رو پڑے اور کہا: ہمارے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انھیں تسلی دیتے ہوئے ان کی تعریف کی [اور فرمایا: میں ابوبکرؓ کی رفاقت اور فیاضی کا سب سے زیادہ ممنون ہوں اور یہ کہ] ان سے بہتر رفیق مجھے کوئی نہیں ملا۔ پھر فرمایا: مسجد میں کھلنے والے تمام مکانوں کے دروازے بند کر دیے جائیں، سوائے ابوبکرؓ کے خوخہ (یعنی چھوٹے دروازے) کے۔ [اس میں بھی حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کی طرف اشارہ ہے تاکہ نماز پڑھانے کے لیے آنے جانے میں سہولت رہے؛ نیز فرمایا: تم سے پہلے لوگوں نے انبیا اور صلحا کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا تھا؛ تم ہرگز قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا، میں تمھیں سختی سے منع کرتا ہوں (مسلم، ۲۷ : ۶۸)]۔ پھر ارشاد فرمایا: لا علمی میں مجھ پر کسی کے کوئی واجب الادا حقوق نہ رہ جائیں؛ اگر کسی کا میں نے مال لیا ہو تو یاد دلائے؛ کسی کو میں نے بیجا طور پر جسمانی ایذا پہنچائی ہو تو وہ ابھی مجھ سے بدلہ لے لے، یا معاف کر دے؛ خدا کے ہاں مؤاخذے کے لیے دل میں چھپا کر نہ رکھے۔ رحمت دو عالمؐ پر بھلا کسے دعوٰی ہو سکتا تھا؟ چنانچہ کسی نے اس پر کچھ نہ کہا تو فرمایا: یہ کافی نہ ہوگا اور مکرر اس جملے کو دہرایا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ اسے آپؐ سے تین درہم وصول کرنے ہیں۔ ان کی فوری ادائی کا حکم دیا گیا [ابن کثیر: السیرة النبویه، ۴ : ۴۵۳ تا ۴۵۸]۔ پھر عام خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنی چھوٹی سے چھوٹی ذمہ داری کو بھی حقیر نہ سمجھے، اس لیے آخرت کے مؤاخذے کی جگہ دنیا ہی میں گلو خلاصی کرا لے، چاہے فضیحت ہی کیوں نہ ہو۔ اس خطبے میں انصار [رک بآں] کا آپؐ نے خاص طور پر ذکر کیا اور فرمایا: میرے بعد انصار کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے؛ نیز ارشاد ہوا: مدینہ

marfat.com
Marfat.com

منورہ میں دوسرے گروہوں کے لوگ بڑھتے جائیں گے، لیکن انصار کم ہوتے جائیں گے - یہ میرے پناہ دہندہ ہیں ؛ میں نے انہیں کے ہاں جگہ پائی - [یہ اپنا فرض انجام دے چکے ہیں - اب تمہیں ان کا فرض پورا کرنا ہے، تم میں سے جو بھی نفع و نقصان کا متولی (خلیفہ) ہو، اسے چاہیے کہ] ان میں جو اچھے کام کرنے والے ہیں ان کے ساتھ احسان کرے اور ان میں سے اگر کوئی برائی کرے تو اس سے درگزر کرے - پھر تاکید فرمائی کہ بوزنطی حکومت کے خلاف تیار شدہ لشکر حضرت اسامہ رض ضرور بھیجا جائے - حضرت اسامہ رض کی کم عمری اور نا تجربہ کاری کی بنا پر اعتراض کرنے والوں کا بھی آپ ؐ نے اس موقع پر جواب دیا - اس فوج میں حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر فاروق رض جیسے اکابر بھی رضاکارانہ طور پر اپنے نام لکھوا چکے تھے - [اگر دقت نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ ؐ کا آخری خطبہ در حقیقت آپ ؐ کی طرف سے اپنے نامزد جانشین (حضرت ابوبکر رض) کی جانشینی اور ان کے لیے وصیت نامہ تھا] - آپ ؐ اس سے اس قدر تھک گئے تھے کہ مکان میں آئے تو بیہوش ہو گئے اور دانت بھنچ گئے - اس پر آپ ؐ کی تمام ازواج مطہرات اور بعض دیگر مسلمان خواتین بھی آپ ؐ کے حجرے میں جمع ہو گئیں (ابن حنبل: مسند، ۱ : ۲۰۹، حدیث ۱۷۸۴)- ہوش میں لانے کے لیے دانتوں کی درزوں میں سے دوا ڈالی گئی ہے - منہ کھولنے کی ضرورت نہیں ہوئی - یہ علاج کامیاب تو ہوا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پسند نہ آیا اور محبت آمیز ملامت کرتے ہوئے فرمایا : سب حاضرین کے منہ میں بھی وہی دوا ڈالی جائے، بجز (احتراماً) چچا حضرت عباس رض کے- یہ واقعہ جمعرات کے دن پیش آیا ! [اسی دن جب عشا کی نماز کا وقت ہوا تو آپ ؐ نے تین مرتبہ غسل فرما کر نماز کے لیے اٹھنا چاہا تو ہر بار آپ ؐ پر غشی طاری ہو جاتی رہی- چوتھی مرتبہ ہوش آیا تو فرمایا:

مُرُوا اَبَا بَکرٍ فَلْیُصَلِّ بالنَّاسِ (البخاری، ۱ : ۱۷۵)، یعنی ابوبکر رض سے کہو کہ نماز پڑھائیں - حضرت عائشہ رض نے عرض کی : یا رسول اللہ ابوبکر رض بہت نرم دل ہیں- وہ آپ ؐ کے مقام پر کھڑے نہ ہو سکیں گے - آپ ؐ نے دوبارہ اس سابقہ حکم کا اعادہ فرمایا - حضرت عائشہ رض نے مکرر عرض دہرائی تو آپ ؐ نے سختی سے فرمایا کہ ابوبکر رض ہی سے کہو نماز پڑھائیں؛ چنانچہ حضرت ابوبکر رض نے آپ ؐ کے حیات طیبہ میں آپ ؐ کے حکم سے کل سترہ نمازوں کی امامت فرمائی (از عشاء جمعرات تا فجر پیر)، (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۲۲۳ بعد)- ابن سعد (حوالۂ مذکور) کے مطابق یہ بات پختہ طور پر ثابت ہے کہ آپ ؐ نے ایک دن فجر کی ایک رکعت حضرت ابوبکر رض کی امامت میں ادا فرمائی تھی]- اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مزاج کسی قدر بہتر ہوا تو آپ ؐ مسجد میں تشریف لائے جبکہ ابوبکر رض نماز شروع کرا چکے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے اشارے کے باوجود کہ امامت جاری رکھو، وہ آپ ؐ کو دیکھ کر محراب سے ذرا پیچھے ہٹ گئے- آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بیٹھے ہوئے امامت فرمائی اور حضرت ابوبکر رض مکبر کا فریضہ انجام دیتے رہے [السیرۃ النبویۃ ، ۴ : ۳۶۲ تا ۳۶۶] - [اس موقع پر ابن سعد (الطبقات، ۲ : ۲۱۵) کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نماز کے بعد بھی کچھ دیر تک تشریف فرما رہے ، پھر آپ ؐ نے کسی قدر اونچی آواز سے فرمایا : بخدا میں نے اسی کو حلال ٹھیرایا جسے خدا نے حلال کیا اور اسی کو حرام کیا جسے اللہ نے حرام کیا - پھر فرمایا : اے محمد ؐ کی بیٹی فاطمہ اور اے رسول اللہ کی پھپی صفیہ ! عمل صالح جاری رکھو، کیونکہ میں خدا کی طرف سے کسی چیز میں تمہیں کفایت نہیں کر سکتا].

اس کے بعد پیر کی صبح تک آپ ؐ برآمد نہ

marfat.com
Marfat.com

ہوے۔ پیر کی فجر کے وقت حجرے کا پردہ اٹھا کر دیکھا کہ لوگ خشوع و خضوع سے نماز پڑھ رہے ہیں تو آپؐ نے خوشنودی سے تبسم [کیا اور فرمایا : خدا نے میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی ہے (ابن سعد ، ۲ : ۲۲۰]۔ آپؐ کے چہرۂ انور کو دیکھ کر لوگ وفور مسرت سے بے قرار ہوگئے، مگر آپؐ نے [اشارہ کیا کہ نماز مکمل کر لو۔ پھر آپؐ نے] پردہ گرا دیا اور بستر پرلیٹ گئے۔ اس وقت تک حضرت ابوبکرؓ سترہ نمازیں پڑھا چکے تھے (الطبری ، ۱ : ۱۸۱۲)۔ نماز کے بعد حضرت ابوبکرؓ اندر آئے اور آپؐ کی صحت بہتر دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ کئی روز سے رات دن یہیں ہوں ؛ اجازت ہو تو بیوی بچوں کو دیکھنے کے لیے کچھ دیر کے لیے گھر ہو آؤں (جو عوالی میں جبل احد کے قریب مقام سُنح میں تھا اور کئی میل کے فاصلے پر)، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ محض افاقۃ الموت تھا .

اس سے ایک دن قبل، اتوار کو حضرت اسامہؓ (لشکر کے سپہ سالار) اور ان کے ساتھ پڑاؤ سے کچھ مسلمان آپؐ کو دیکھنے کے لیے آئے۔ حضرت اسامہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ بات نہ کر سکتے تھے۔ مجھے دیکھ کر دست مبارک اٹھائے ؛ پھر مجھ پر رکھ دیے، گویا میرے لیے دعا فرما رہے ہیں (المقریزی ، ۱ : ۵۳۸ ؛ [ابن ہشام : سیرۃ، ۴ : ۳۰۱])۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم اور اس کے سپہ سالار کو آپؐ کتنی اہمیت دے رہے تھے .

دن بلند ہونے کے ساتھ ساتھ آپؐ پر غشی کے دورے شدت اختیار کرتے جا رہے تھے، مگر پھر افاقہ ہو جاتا۔ حضرت فاطمہؓ سے آپؐ کی یہ حالت دیکھی نہ گئی تو فرمانے لگیں : واکرب اباہ (ہائے میرے باپ کی بیچینی)! آپؐ نے فرمایا : آج کے بعد تمھارا باپ کبھی بے چین نہ ہوگا۔ وفات سے کچھ دیر پہلے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ آپؐ کی عیادت کو آئے۔ ان کے ہاتھ میں تازہ مسواک دیکھ کر آپؐ نے اس پر ایسی نظر ڈالی کہ رمز شناس زوجۂ مطہرہ جان گئیں کہ آپؐ مسواک کرنا چاہتے ہیں ؛ چنانچہ انھوں نے اس سے مسواک لیکر دانتوں میں چبائی؛ پھر آپؐ کا سر مبارک اپنے زانو پر رکھ کر آپؐ کے دانت اپنے ہاتھوں سے صاف کیے جس سے چہرۂ اطہر خوشی سے تمتمانے لگا۔ مسواک ہاتھ سے رکھی ہی تھی کہ حضرت عائشہؓ کو [آپؐ کے سینے میں سانس کی گڑگڑاہٹ محسوس ہوئی۔ کان لگایا تو یہ الفاظ سنے : نماز اوز غلام (ابن سعد ، ۲: ۲۵۳)۔ کچھ دیر بعد حضرت عائشہؓ کو آپؐ کے] سر مبارک کا بوجھ سا محسوس ہوا ، فرماتی ہیں جب میں نے چہرے پر نظر ڈالی تو یہ جملہ سنا : الرفیق الاعلی (رفیق اعلی کے پاس) ؛ تین مرتبہ یہ جملہ دہرایا اور پھر روح سچ مچ اپنے رفیق اعلی ذات کبریا کے پاس جا پہنچی، مگر میں نہ سمجھ سکی؛ پھر جب دوسری ازواج رونے لگیں تو پھر مجھے معلوم ہوا کہ کیا پیش آ گیا ہے ؛ چنانچہ میں نے آہستہ سے آپؐ کے سر مبارک کو تکیے پر رکھ دیا اور کھڑے ہوکر میں بھی رونے لگی [ابن ہشام، ۴ : ۳۰۵] (اللھم صل علیہ و علی آلہٖ و صحبہٖ و بارک وسلم) .

وفات اقدس : [جمہور کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہجرت کے دس سال پورے ہونے کے بعد پیر کے دن ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو اس دنیا سے رحلت فرمائی (ابن سعد ، ۲ : ۲۷۲ ، ۲۷۳ ؛ انساب الاشراف، ۱ : ۵۶۸ ؛ ابن حزم: جوامع السیرۃ، ص ۲۶۵ ؛ ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ ، ۴ : ۵۰۷ ؛ ابن الجوزی : الوفا ، ۷۸۹ ؛ اس ضمن میں بعض اور روایات بھی ہیں؛ ان کے لیے دیکھیے محولہ بالا کتب سیرت، الروض الانف، ۲: ۲۷۲ ؛ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے آپؐ کا یوم وفات ۲ ربیع الاول ، ۲۵ مئی ۶۳۲ء قرار دیا ہے (دیکھیے: محمد حمید اللہ : مقالہ نسی، در

marfat.com
Marfat.com

اسلامک ریویو ، ووکنگ ، فروری ۱۹۶۹ء)] ۔

[وصال مبارک ہوتے ہی جسم مبارک سے ایسی خوشبو سے مہکنے لگا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اس جیسی خوشبو آج تک کبھی نہ سونگھی تھی؛ یہ خوشبو میرے ہاتھوں میں کئی دنوں تک برقرار رہی(عبدالحق محدث دھلوی : مدارج النبوۃ، اردو ترجمہ، کراچی ۱۳۸۷ھ، ص ۶۴۲)] ۔ حجرۂ اطہر کے بعد مسجد میں ، پھر جلد ہی سارے شہر میں اس خبر وحشت اثر سے صف ماتم بچھ گئی ۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ واپس تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لے گئے، جہاں آپؐ کو چادر مبارک سے ڈھانپ دیا گیا تھا ۔ حضرت ابوبکرؓ نے چادر اٹھا کر دیکھا اور احترام و ادب سے بوسہ دیا؛ پھر مسجد میں تشریف لائے ۔ [تمام صحابہ کرامؓ اس سانحۂ ھائلہ پرسخت حیران اور ششدر کھڑے تھے ۔ ان میں سے بعض کی فرط غم سے یہ حالت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ہوش و حواس ھی معطل ہو گئے ہیں؛ بعض یوں خاموش تھے گویا قوت گویائی باقی نہیں رہی، جبکہ بعض اس طرح آہ و زاری کر رہے تھے گویا حج کا تلبیہ پڑھ رہے ہوں ؛ ایک صحابی نے فرط غم سے یہ دعا مانگی کہ : الٰہی میری قوت بصارت ختم کر دے تا کہ میں جمال نبوی کے دیکھنے کے بعد کچھ اور نہ دیکھ سکوں ۔ غرض تمام صحابہ پریشان تھے ۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ فرما رہے تھے کہ آپؐ کا وصال نہیں ہوا بلکہ آپؐ اللہ تعالٰی کی ملاقات کو تشریف لے گئے ہیں ۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر یہ مختصر مگر اثر انگیز] خطبہ ارشاد فرمایا : "لوگو ! اگر کوئی حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو معبود سمجھتا تھا تو جان لے کہ حضرت محمدؐ کا وصال ہو گیا ہے ، لیکن جو اللہ کو معبود سمجھتا تھا تو جان لے کہ اللہ تعالٰی زندہ ہے ، کبھی مر نہیں سکتا ۔ ارشاد ربانی ہے : اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (۳۹ [الزمر] : ۳۰)، یعنی آپؐ نے بھی وصال فرمانا ہے دوسرے بھی مرنے والے ہیں ۔ یہ بھی ارشاد الٰہی ہے : وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ط اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ ط وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا ط وَ سَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ (۳ [آل عمران]: ۱۴۴)، [یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اللہ کے رسول ھی ہیں ۔ آپؐ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں ۔ اگر آپؐ وفات پا جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے ؟ جو کوئی ایسا کرے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ۔ عنقریب اللہ تعالٰی شکر گزار بندوں کو بدلہ عطا فرمائیں گے] ۔ ان آیات کو سن کر بعض صحابہؓ فرماتے ہیں کہ یوں معلوم ہوا گویا یہ آیات اسی وقت نازل ہوئی ہیں، حالانکہ یہ تقریباً سات برس قبل غزوۂ احد کے موقع پر نازل ہوئی تھیں ۔ حضرت ابوبکرؓ نے مزید فرمایا] : آپؐ نے امت میں تنظیم پیدا کی ؛ اب اسے شخصی چیز سمجھ کر ختم کر دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس تنظیم کو جاری رکھنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جگہ کسی کو مقرر کرنا ضروری نظر آتا ہے ۔ کفن دفن کے بعد آپؐ کی جانشینی کے لیے عام مشورہ ہوگا ۔ اس سے سب نے اتفاق کیا ، مگر قدرت کو یہ منظور تھا کہ دفن سے پہلے ھی جانشینی کا فیصلہ ہو جائے (دیکھیے نیچے) ۔ تجہیز و تکفین کا کام دوسرے دن سہ شنبہ کو شروع ہوا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو لباس اتارے بغیر اچھی طرح سے غسل دیا گیا ۔ [آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ ، ان کے دو بیٹوں فضل اور قثم اور حضرت علیؓ نے آپؐ کو غسل دیا ۔ حضرت اسامہؓ اور حضرت شُقران (آپؐ کے مولی) پانی ڈالتے رہے ۔ حضرت اوسؓ بن خولہ انصاری بدری کو بھی بطور نمائندۂ انصار شامل غسل کر لیا گیا ۔ سحول (یمن کا ایک گاؤں جہاں سفید سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا) کے بنے

marfat.com
Marfat.com

ہوئے] تین سفید سوتی کپڑوں میں آپؐ کو پورے ستر عورت کے ساتھ کفن دیا گیا۔ اس ارشاد نبوی کے باعث کہ نبی اسی جگہ دفن ہوتے ہیں جہاں ان کا وصال ہوا ہو، حضرت عائشہؓ کے حجرے میں، بستر نبوی ہی کی جگہ، قبر کھودی گئی]۔ حضرت ابو طلحہؓ انصاری نے لحد والی قبر تیار کی۔ جب آپؐ کو کفنا کر چارپائی پر لٹا دیا گیا تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ داخل ہوئے اور ان کے ساتھ انصار و مہاجرین بھی اندر آ گئے۔ صف باندھ کر بغیر کسی امام کے فرداً فرداً نماز پڑھی۔ جب سارے مرد نماز پڑھ چکے تو پھر عورتوں کی باری آئی، پھر بچوں کی]۔ ہزاروں آدمیوں نے فرداً فرداً نماز جنازہ پڑھی۔ مدینہ منورہ کی زمین میں شور زیادہ ہونے کی وجہ سے قبر میں ایک سرخ قطیفہ (چادر) بچھا کر آپؐ کا جسم اطہر اس پر رکھا گیا۔ [حضرت علیؓ، حضرت فضلؓ، حضرت قثمؓ، حضرت شقرانؓ اور حضرت اوسؓ بن خولی انصاری نے جسم اطہر کو قبر میں اتارا] اور مکی رواج کے مطابق قبر کو مسقّف کیا گیا اور یہ کام حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے انجام دیا (انساب الاشراف، ۱ : ۵۷۵ تا ۵۷۸)۔ بہت سے صحابہ کرامؓ نے آپؐ کے دردناک اور پر اثر مرثیے کہے، جن میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ اور حضرت حسان بن ثابتؓ، [حضرت فاطمہؓ، عاتکہؓ بنت عبدالمطلب، عبداللہؓ بن مسلم، ابوسفیانؓ الحارث، ہندؓ بنت الحارث، ام ایمنؓ، کعبؓ بن مالک] وغیرہ کے مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں (البلاذری : انساب الاشراف، ۱ : ۵۹۲ تا ۵۹۳؛ [عبداللہ بن حامد : شعر الدعوة الاسلامیہ، ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء، ص ۳۸۹ تا ۳۹۲])۔

جانشینی: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات پر اہل بیت، انصار اور عام مسلمان تینوں الگ الگ رجحانوں کے حامل نظر آتے ہیں۔ پرانی قبائلی عادت کی بنا پر غیر شعوری طور پر بعض اہل بیت نبوی کی خواہش تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے رشتہ داروں میں سے کسی کو خلیفہ بنایا جائے۔ انصار کے علاقے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکومت کی تاسیس کی اور وہیں مدینہ منورہ دارالحکومت بنا اور وہاں اکثریت انصار ہی کی تھی؛ اس لیے وہ خلیفہ انصار میں دیکھنا چاہتے تھے۔ عام مسلمانانِ مدینۂ منورہ شورائیت کی طرف مائل تھے اور چاہتے تھے کہ سارے مسلمانوں میں جو سب سے زیادہ موزوں ہو اسی کو چنا جائے۔ [اس بحث کے لیے دیکھیے شبلی : الفاروق، مطبوعہ اعظم گڑھ؛ نیز رک بہ خلافت؛ حضرت ابوبکرؓ صدیق]۔

[انھی حالات میں انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں ایک ہنگامی جلسہ منعقد کیا اور اس بات کا فیصلہ کرنا چاہا کہ خلافت انصار کا حق ہے، لہٰذا انھیں کو ملنی چاہیے۔ اس کے لیے حضرت سعدؓ بن عُبادہ رئیس خزرج کا نام پیش کیا جا رہا تھا۔ ان نازک حالات کی خبر جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو ملی، جو مسجد نبوی میں افسردہ و غمگین صحابہ کرامؓ کو حالات کا سامنا کرنے پر آمادہ کر رہے تھے، تو وہ فوراً سقیفۂ بنی ساعدہ میں پہنچے۔ انھوں نے اس فتنے کا سدباب کرنے میں اس لیے تاخیر کرنا گوارا نہ کی کہ اگر وہاں صلاح مشورہ مکمل ہو جاتا تو واضح طور پر انصار اور مہاجرین میں تصادم کی صورت پیدا ہو جاتی]۔ اس وقت امین الامت حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح بھی ان کے ہمراہ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے انصار کا یہ دعوی سنا تو انھیں متوقع نتائج سے، جو اس فیصلے کی صورت میں پیش آ سکتے تھے، آگاہ کیا اور انھیں مشورہ دیا کہ اس موقع پر قومی اور علاقائی تعصب کو دلوں میں جگہ نہ دیں۔ اس پر انصار نے "ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے" کا نظریہ پیش کیا، مگر یہ صورت حال بھی دو متوازی حکومتوں

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

کے قیام کا موجب بن سکتی تھی ؛ اس لیے اس کو بھی رد کردیا گیا]۔ اس موقع پرایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے [البلاذری : انساب، ۱: ۵۸۴] اور دوسری روایت کے مطابق ایک انصاری نے (الواقدی : کتاب الردہ، مخطوطۂ بانکی پور) نے یہ حدیث نبویہ بیان کی کہ الائمة من قریش ، یعنی خلفا قریش میں سے ہوں گے ۔ [فرمان نبوی کے سامنے سب کی گردنیں جھک گئیں ۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کے اسماے گرامی خلافت کے لیے پیش فرمائے ، مگر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ کو پکڑا اور چاہتے تھے کہ بیعت کریں] ۔ اس پر ایک انصاری نے کھڑے ہوکر کہا کہ آپ ذرا ٹھیریں اور سب سے پہلے مجھے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرے دیں (حوالۂ مذکور)؛ [چنانچہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ یا ایک انصاری نے بیعت کی ۔ ان کا بیعت کرنا تھا کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں لوگ ان کی بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے (دیکھیے ابن سعد : الطبقات، ۳ : ۱۸۱ تا ۱۸۸)] ۔

بہر حال حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جانشین (خلیفہ) منتخب ہوگئے ، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنے سقیفہ بنی ساعدہ والے انتخاب کو قطعی نہ سمجھا اور شہر میں تین دن تک مسلسل منادی کرائی کہ لوگوں پر اس بیعت کی پابندی لازم نہیں ؛ وہ خلافت کے لیے کسی اور موزوں شخص کا پوری آزادی سے انتخاب کر سکتے ہیں (البلاذری : انساب ، ۱ : ۵۸۷ ؛ الجاحظ : الرسالة العثمانیه ، ۲۳۵) ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدفین کے بعد مکرر ان کی بیعت عام ہوئی تاکہ جو لوگ سقیفۂ بنی ساعدہ میں موجود نہ تھے وہ بھی بیعت کر سکیں ۔ اس موقع پر یہ بھی یاد دلایا جا سکتا ہے کہ ایک سے زیادہ لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر مجھ سے ملاقات نہ ہو تو حضرت ابوبکرؓ کے ہاں جانا وہ میرے وعدے کا ایفا کریں گے (البخاری ، کتاب فضائل اصحاب النبیؐ ، باب ۵) ۔

[اس کے علاوہ آپؐ نے مرض الوفات میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا منشا ظاہر کیا تھا : (۱) وصال سے پانچ یوم قبل آپؐ نے خطبہ دیا، جس میں بطور خاص حضرت ابوبکرؓ کی تعریف کی اور فرمایا جس کا دروازہ مسجد میں کھلتا ہے وہ اپنا دروازہ بند کرے بجز حضرت ابوبکرؓ کے ؛ یہ بھی در حقیقت اسی بات کا اشارہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ ہی آپؐ کے جانشین ہوں گے، کیونکہ آپؐ کے خلیفہ ہی کو مسجد میں بلا تاخیر اور ہر وقت آنے جانے کی ضرورت پیش آسکتی تھی ؛ (۲) جمعرات کی عشا سے لے کر دو شنبه کی فجر تک کی تقریباً سترہ نمازیں حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ کے حکم سے پڑھائیں اور اس حکم کی تعمیل میں آپؐ نے سختی سے کام لیا ۔ اگرچہ امّ المؤمنین حضرت عائشہؓ نے تین دفعہ اصرار کرکے اس حکم کو بدلانا چاہا، مگر آپؐ نے سختی سے ان کی درخواست کو رد کر دیا؛ البلاذری (انساب، ۱ : ۵۶۰ تا ۵۶۱) کے مطابق حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ میں حضرت ابوبکرؓ کی امامت سے ہم لوگ خلافت صدیقی کا استشہاد کیا کرتے تھے، وہ یوں کہ آپؐ نے جس ہستی کو اپنی مذہبی و دینی مسند پر کھڑا کر دیا تو دنیوی منصب، جو اس کا تابع ہے، از خود ہی ان سے متعلق ہوگیا اور وہ بخدا اس کے اہل بھی تھے ۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا : قدمک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الصلاة فماذا یؤخرک (انساب ، ۱ : ۵۸۷)، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے آپ (حضرت ابوبکرؓ) کو آگے کیا ہے پس تمھیں پیچھے کون کر سکتا ہے ؛ (۳) ابن الجوزی (الوفاء ، ۲ : ۷۶۹) وغیرہ کے مطابق آپؐ

marfat.com
Marfat.com

نے حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کو فرمایا تھا کہ میرے پاس ہڈی کا شانہ یا لکڑی (لوح) لے آؤ تا کہ میں ابوبکرؓ کے حق میں ایک دستاویز لکھ دوں تا کہ کوئی شخص اختلاف کی جرأت نہ کرے؛ مگر جب حضرت عبدالرحمنؓ مطلوبہ چیز لینے کے لیے جانے لگے تو بلا لیا اور فرمایا: خدا اور اس کے اہل ایمان بندے ابوبکرؓ کے سوا کسی پر راضی نہ ہوں گے؛ (۴) آپؐ نے وصال مبارک سے ایک دن یا اس سے قبل ایک نماز اس حال میں پڑھائی کہ آپؐ بیٹھے ہوئے نماز پڑھا رہے تھے، حضرت ابوبکرؓ بالکل آپؐ سے ملحق کھڑے ہوئے تھے اور عام مسلمان ان سے پیچھے صفوں میں اقتدا کر رہے تھے۔ یہ بھی اس بات کا اشارہ تھا کہ آپؐ کی نیابت کا فریضہ حضرت ابوبکرؓ ہی انجام دے سکتے ہیں].

اسوۂ حسنہ: سرور کائنات حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نبی تھے، لیکن نبی کا اسلامی تصور یہ نہیں کہ وہ عقائد، عبادات اور احسان (تصوف) کی تعمیل تک خود کو محدود رکھے، بلکہ اسلامی تصور میں نبی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دین و دنیا دونوں کے حسنات کا عملی راستہ بتائے۔ اسی لیے آپؐ نے دین بھی سکھایا اور ایک مملکت بھی چلا کر دکھائی۔ شادی کر کے گھریلو زندگی کا ایک عمدہ نمونہ امت کے لیے چھوڑا۔ آپؐ کی زندگی کے کثیر پہلوؤں میں سے ہر ایک پر بحث تو یہاں ممکن نہیں، [البتہ آپؐ کی عظیم شخصیت کے چند پہلوؤں کے طرف اشارے کرنا مناسب ہوگا تاکہ آپؐ کی عظمت کا کچھ اندازہ ہو سکے].

دینی تعلیم: دین اسلام کی اساسیات مجملاً قرآن کریم میں موجود ہیں۔ اس کی تشریحات اور عملی صورتیں حدیث میں ہیں۔ ان کا خلاصہ حدیث جبریلؑ میں ملتا ہے [رک بہ اسلام؛ ایمان]، جسے البخاری، مسلم اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے کہ ایک دن مدینہ منورہ میں ایک غیر معروف شخص نے آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پوچھا: ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ، ملائکہ، کتب، انبیا، یوم آخرت کو اور خیر و شر سب ہی کی تقدیر اللہ کی طرف سے ہونے کو ماننا؛ اجنبی نے کہا: ٹھیک ہے اور اسلام کیا ہے؟ فرمایا: ہر روز پنج وقتہ نماز پڑھنا، رمضان میں مہینا بھر روزے رکھنا، زکوٰۃ ادا کرنا اور استطاعت ہو تو عمر میں کم از کم ایک بار بیت اللہ شریف کا حج کرنا؛ اس نے کہا: ٹھیک ہے: احسان کیا ہے؟ فرمایا: خدا کی عبادت اس طرح کرنا گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھتا ہے؛ اس نے کہا: ٹھیک ہے، یہ بتائیے کہ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: مجھے اس کا تم سے زیادہ علم نہیں۔ اس پر وہ اجنبی اٹھ کر چلا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کہا: دیکھو، وہ کہاں گیا؟ مگر وہ بالکل غائب ہو چکا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: وہ جبریلؑ تھے، جو تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے (البخاری: الصحیح، کتاب الایمان، باب ۳۷).

یہ حدیث جبریلؑ فی الواقع دین کا خلاصہ ہے۔ اس میں عقائد و عبادات بھی ہیں اور دین و دنیا کا اجتماع بھی اور ہر چیز کو بہترین طریقے سے انجام دینے کی تدبیر بھی۔ اس پر نظر ڈالیں تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دین گویا ایک خوبصورت عمارت ہے، عقائد اس کی چھت ہیں، جسے عبادات کے چاروں ستون تھامے ہوئے ہیں اور اس عمارت کی آرائش و زیبائش احسان (تصوف) کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ [تفصیلات کے لیے رک بہ اسلام، ایمان، عقائد، اللہ، وغیرہ].

معجزات: ایمان و عقائد سے قریبی تعلقات رکھنے والی ایک چیز معجزہ [رک بآں] بھی ہے، اس لیے حدیث جبریلؑ کے حصہ دوم یعنی عبادات سے

marfat.com

Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

قبل اس کا مختصر ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ خارق عادت چیزیں مختلف افراد سے صادر ہوتی ہیں : پیغمبر ؑ سے ہوں تو اسے معجزہ کہتے ہیں، ولی سے ہوں تو کرامت اور کسی شیطانی تعلیم دینے والے سے ہوں تو اسے استدراج [یعنی آزمائش] کا نام دیتے ہیں ۔ ظاہری شکل میں ان تینوں میں باہم کوئی فرق نہ ہونے سے ان میں امتیاز دشوار ہوتا ہے، [تاہم اگر دینی اور مذہبی تعلیم اور اس پر عمل کو معیار ٹھیرایا جائے تو مسئلہ سہل ہو جاتا ہے] ۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ ہر خارق عادت چیز خدا اور صرف خدا سے ہی صادر ہوتی ہے ؛ پیغمبر تک بذات خود اس پر قادر نہیں ہوتا، بلکہ پیغمبر ؑ کی شدید ضرورت کے وقت خدا اس کی تقویت کے لیے صادر کرتا ہے ۔ [دراصل معجزہ تائید الٰہی کی ایک آخری صورت ہے ۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے قرآن مجید خود ایک معجزہ ہے ۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ معجزہ دیکھنے کے باوجود بری فطرتیں ایمان نہیں لاتیں ۔ معجزہ ایک اتمام حجت ہے، موجب ایمان نہیں]۔ حضرت ابوبکرؓ [اور دوسرے السابقون الاولون] معجزے دیکھے بغیر ایمان لائے ، لیکن پست کردار لوگ ، مثلاً ابوجہل اور ابولہب، معجزات دیکھ کر بھی ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوئے ۔ [غرض معجزہ برحق ہے، لیکن] قرآن مجید ایمان بالغیب کا مطالبہ کرتا ہے (۲ [البقرہ] : ۳)؛ پھر بھی اکثر پیغمبروں کے متعلق قرآن کریم نے معجزوں کا ذکر کیا ہے ۔ نوح ؑ کا طوفان ، ابراہیم ؑ کے لیے آگ کا ٹھنڈا ہو جانا ، موسیٰ ؑ کا ید بیضا اور سانپ بننے والا عصا ، عیسیٰ ؑ کے ہاتوں بیماروں کا تندرست ہونا ، مٹی کے پرند نما کھلونوں کا واقعی زندہ پرندہ بن جانا اور مردے کا زندہ ہونا اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معجزات اتنے ہیں کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں (دیکھیے سلیمان ندوی : سیرت النبیؐ، جلد سوم)، مثلاً : دوبار مردوں کا زندہ ہونا؛ کھجور کے تنے کا باآواز رونا ؛ گونگے کا بات کرنے لگنا ؛ شق صدر ؛ شق قمر ؛ درخت کا ایک جگہ سے چل کو دوسری جگہ تک چلا آنا ؛ قلیل پانی اور قلیل غذا کا کثیر جماعت کے لیے کافی ہو جانا ؛ ہاتھ کی انگلیوں سے کثیر مقدار میں نوشیدنی پانی نکلنا ؛ آپ سے چرندوں کا باتیں کرنا ، گھر کا محاصرہ کیے ہوئے لوگوں کے بیچ میں سے صاف بچ نکلنا اور ان کا خبردار نہ ہونا؛ غیب کی خبریں دینا کہ تم نے فلاں کام کیا ہے ؛ فرشتوں کا آپؐ کی مدد کے لیے آنا ؛ معراج [رکّ بآں] میں آسمانوں سے بھی پرے حظیرۃ القدس اور قاب قوسین تک جانا ؛ ایسا قرآن مجید پیش کرنا کہ اس جیسا تو کیا اس کی ایک تین آیتی سورۃ کی مثال لانا بھی جن و انس کی متحدہ زور و کوشش کے باوجود ممکن نہیں، وغیرہ ۔ ہر قسم کے بکثرت معجزات آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے صادر ہوئے ، لیکن قرآن مجید میں بار بار وارد ہے کہ فکر و تدبر سے کام لو ؛ عقل سے اور ٹھنڈے دل سے غور کرو تو اسلام کی حقانیت خود ہی تم کو قائل کر دے گی ۔ [معجزے کا انکار ناجائز ہے، لیکن ایمان لانے کے لیے معجزات پر انحصار درست نہیں ۔ اسلام نے معجزات سے زیادہ عقل و فکر اور غور و تدبر پر پر زور دیا اور ان سے کام لے کر دینی مسائل کو سمجھنے کی تلقین کی ہے]۔

عبادات : عقائد کے بعد نماز ، روزہ ، حج ، اور زکوٰۃ کی چار بنیادی عبادتیں فرض کی گئی ہیں کہ عبد کا فریضہ عبادت ہے ۔ عبادت ہر مخلوق کے فطری حالات کے مطابق ہونی چاہیے ۔

نماز کی حد تک یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، اس لیے اس کی عبادت اور نماز بھی سب کی عبادتوں سے فائق ہونی چاہیے ۔ کائنات میں جمادات ، حیوانات اور نباتات سبھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق عبادات کرتے ہیں (۱۷

marfat.com
Marfat.com

[بنی اسرآئیل]: ۴۴)؛ جمادات بے حرکت ادب سے کھڑے ہیں (نماز کا پہلا رکن قیام ہے)؛ حیوانات دائمی طور پر رکوع کی حالت میں رہتے ہیں (نماز کا دوسرا رکن رکوع ہے)؛ نباتات کا منہ ان کی جڑیں ہیں اور دائمی طور پر وہ سر بسجود سے ہیں (نماز کا تیسرا رکن سجدہ ہے)؛ چاند سورج اور ستارے اپنی گردش کو سدا جاری رکھنے پر مأمور ہیں (نماز کی رکعتوں میں بھی ایک ہی مجموعۂ اعمال کی تکرار ہوتی رہتی ہے)؛ پانی، رعد، سایہ وغیرہ ہر مخلوق کا ایک طرز عبادت ہے جو نماز میں سمو دیا گیا ہے۔ غرض مسلمان کی نماز کائنات کی نمازوں کا متوازن خلاصہ اور مجموعہ ہے [رک بہ صلوٰۃ]؛

(۲) روزہ: روزہ انسان کی طاقت کے مطابق خدا کی بعض صفات سے متصف ہونے [صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (۲ [البقرۃ]: ۱۳۸)] اور روحانی قوت کی نشو و نما کی کوشش کا نام ہے کہ کھانا پینا وغیرہ چھوڑ دیا جائے۔ اسلامی روزہ صرف خانقاہ نشینوں کے لیے ہی نہیں، بلکہ ہر مرد عورت اور ہر بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ یہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک رکھا جاتا ہے [نیز رک بہ صوم؛ رمضان وغیرہ]؛

(۳) حج بیت اللہ: خدا ہر جگہ ہے اور انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب تر۔ اس لیے اسے کسی جگہ محدود نہیں کیا جا سکتا ہے، [لیکن انسان چونکہ جہت کا تصور کیے بغیر خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کر سکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ایک گھر (بیت اللہ شریف زادھا اللہ شرفاً و کرامۃً) [رک بہ کعبہ] کو اپنی ذات کے لیے مخصوص کر لیا، تاکہ اللہ کے بندے اس کی جہت میں خدا تعالیٰ کی عبادت بجا لا سکیں؛ چنانچہ اس مقام معظم کی طرف منہ کرکے نماز بھی ادا کی جاتی ہے اور صاحب توفیق افراد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس کا حج [رک بآں] ادا کریں]؛

(۴) زکوٰۃ: اسلام کی چوتھی عبادت زکوٰۃ [رک بآں] ہے۔ نماز، روزہ اور حج بدنی عبادات ہیں، مگر زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ زکوٰۃ اندوختے (سونے، چاندی اور پیسوں)، زراعت، معدنیات، تجارت، مویشیوں کے ریوڑوں وغیرہ میں سالانہ طور پر واجب الادا ہوتی ہے۔ اسلام میں حسنات دارین کو جمع کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اس کا بہترین مظاہرہ زکوٰۃ سے ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کو عبادت قرار دیا گیا ہے اور قرآن میں بار بار ایک ہی جملے میں نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کا یکجا ذکر ہوا ہے۔ اس لیے اگر نماز کے انکاری کو کافر قرار دیا جا سکتا ہے، تو زکوٰۃ کے انکاری کو اس سے کم گناہ کا مرتکب نہیں سمجھا جاتا۔ اس تصور میں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر حکومت کی نگرانی اور جبر کے بغیر کوئی نماز، روزہ اور حج کے فریضے خود ہی کامل طور پر انجام دیتا ہے تو زکوٰۃ بھی اپنی خوشی سے ادا کرنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ زکوٰۃ دین سے باہر سیاسی اور دنیوی چیز سمجھی جائے۔ حکومت جبر کرے تو دیں، ورنہ بے پروائی سے کام لیں [تفصیل کے لیے رک بہ زکوٰۃ].

(۵) احسان: حدیث جبریل[۴] کا تیسرا حصہ احسان کے متعلق ہے جسے تصوف، طریقت، سلوک جیسے مختلف ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ روحانی تزکیہ، اخلاق حسنہ کو طبیعت ثانیہ بنا لینا، اور ہر وقت اور ہر مشغولیت میں خدا سے لو لگائے رکھنا ہے۔ احسان کا اجمالی اور جامع و مانع خلاصہ وہ ہے جو حدیث جبریل[۴] میں اوپر بیان ہوا۔ اس سلسلے میں مسجد نبوی کے صُفّہ [رک بہ اہل صفّہ] کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جو مدرسہ اور اقامتی خانقاہ دونوں پر مشتمل تھا اور وہاں دین و دنیا دونوں کی تربیت ملتی تھی۔ اس کے بڑے اصول اکل حلال اور صدق مقال ہیں۔ فرض تو ہر شخص کے لیے ہے، احسان میں ان کے حسن ادا اور نوافل اور ان پر مواظبت کی

marfat.com
Marfat.com

تاکید ہوتی ہے۔ [نیز رک بہ تصوف ؛ زہد ؛ تقوٰی]۔

(۶) وقوعِ قیامت : حدیث جبریل[ؑ] کا آخری حصہ قیامت کی تاریخ سے متعلق ہے۔ عقائد کے علاوہ قیامت کا یہ مستقل ذکر اس کی اہمیت کے متعلق ہے کہ قیامت اور حساب و کتاب کا عقیدہ ہمیں برائی سے ہر وقت بچاتا ہے۔ غرض حدیث جبریل[ؑ] میں وہ ناگزیر اقل بتایا گیا ہے جو ہر مسلمان کو کرنا چاہیے۔

تعمیل و تنظیم : پیغمبر علیہ السّلام کا کام صرف تبلیغ احکام ہی نہیں تھا ؛ بلکہ حتی الوسع اس کا عملی نفاذ اور باقاعدہ اجرا بھی آپ[ؐ] کے فرائض میں داخل تھا ؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب اپنے ماحول کو اللہ اور یوم آخرت کے ماننے کی دعوت دی تو اس میں نہ آپ[ؐ] کی کوئی ذاتی منفعت تھی اور نہ کوئی جاہ طلبی۔ آپ[ؐ] بار بار فرماتے تھے: قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (۴۲ [الشورٰی]: ۲۳)، یعنی میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ اس کے باوجود آپ[ؐ] کی مخالفت ہوئی اور مخالفوں کی ایذا رسانی سے آپ[ؐ] کی جان کو خطرہ پیدا ہوگیا۔ ان حالات میں دو امکان ہی تھے : یا تو آپ[ؐ] اصلاح کی کوشش سے دستبردار ہو جائیں اور اس طرح اپنے مشن کو ادھورا چھوڑ جائیں ؛ یا پھر اللہ کی وسیع و عریض زمین میں ہجرت کرکے اس کے عملی نفاذ کی کوششیں جاری رکھیں۔ تبلیغ سے دستبردار ہونا نہ صرف خدا کے عائد کردہ فرض کے خلاف ورزی ہوتا، بلکہ برائی کے عام ہو جانے کو روا رکھنا ہوتا۔ بالآخر ناگزیر طور پر ہجرت کا فیصلہ کیا۔ کام آسان نہ تھا، کیونکہ تبلیغ کے مخالفوں کا مقابلہ کرنے کے لیے موافقوں اور حامیوں کی ضرورت تھی اور ان کے حصول کے لیے بھی تبلیغ ہی مؤثر ہو سکتی تھی۔

تبلیغ پہلے دوستوں کے حلقوں میں محدود اور مخفی رہی۔ جو شخص مسلمان ہوتا وہ تبلیغ کا ایک نیا مرکز بن جاتا ؛ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق دعوت و ارشاد میں دن رات کوشاں رہتا۔ ان مخلصوں کو نہ صرف صبر و تحمل رکھنا ہوتا تھا، بلکہ بتدریج اسلام کی تعلیم کو ہر شعبۂ حیات کی ضرورتوں کے لیے مکمل کرنا اور اس کو مسلمانوں تک پہنچانا اور اس پر عمل کرنا اور عمل کرانا بھی شامل تھا۔ مسلمانوں کی تعداد صفر سے شروع ہوئی اور آغاز میں رفتار لازماً سست رہی۔ ابتدائی بارہ سال میں بمشکل دو چار سو آدمی مسلمان ہوے۔ غیر محسوس طور پر ان میں تنظیم پیدا ہو گئی۔ ایک سردار، ایک قانون، ایک برادری یا امت۔ ہر مسلمان ہر ضرورت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے رجوع کرتا اور مسلمانوں میں باہم تعاون رہتا۔ اس مملکت کے لیے شروع میں مرکز نہ تھا ؛ تو اس کی پرواہ بھی نہ کی گئی، کیونکہ اصل مقصد تبلیغ دین تھا اور اس کے لیے صورت حال کے مطابق کام کرنا تھا۔ ہجرت کرکے مدینہ منورہ آنے پر ایک اسلامی ریاست قائم کرنی ممکن ہوئی، لیکن آبادی کی اکثریت ہنوز غیر مسلم تھی اور ایک عنصر یہود سے بھی سابقہ تھا۔ اس لیے حکومت کا ہر شعبہ اور ہر ادارہ بتدریج قائم کرنا اور تجربے سے اس کی کارکردگی کو سدھارنا تھا۔ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ آپ[ؐ] نے شہری مملکت کس طرح قائم فرمائی اور اس کے لیے ایک تحریری دستور کس طرح تدوین کیا۔ اب اس تنظیم کے ارتقا، تعلیم عامہ، عدلیہ، قانون سازی، دفاع، مالیہ وغیرہ کے وجود میں لائے جانے کی ضرورت تھی، جو کہ آپ[ؐ] نے باحسن طریقے پر پوری فرمائی۔

تعلیم عوام : عہد نبوی[ؐ] میں تعلیم کو بڑی اہمیت دی گئی۔ جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ نبی امّی پر نازل ہونے والی اولین وحی کا اولین لفظ اِقْرَأْ، یعنی پڑھ تھا اور اس کے ساتھ ہی قلم کی تعریف میں یہ حقیقت یاد دلائی گئی کہ سارا انسانی علم یعنی تہذیب و تمدن قلم ہی کا رہین منت ہے اور اگلوں کے

marfat.com
Marfat.com

تجربوں سے پہلووں کا استفادہ اس کے بغیر ممکن نہیں ۔
قرآن کریم نے نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصب نبوت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وَ یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَ یُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۲ [البقرۃ]: ۱۵۱)، یعنی آپ تمہیں کتاب و حکمت اور اس چیز کی تعلیم دیتے ہیں، جو تمہیں معلوم نہ تھی۔ علاوہ ازیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صراحت فرمائی: بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (ابن ماجہ، فضل العلماء)؛ اس سے بھی بڑھ کر ارشاد ہے، العلماء ورثۃ الانبیاء (البخاری، ۳/۱۰، ۱ : ۲۸)، یعنی علما نبیوں کے وارث ہوتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان جو تاریخ میں پہلی دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نوعمری میں (ابو سفیان کے باپ) حرب کی سرداری کے زمانے میں مکہ مکرمہ میں لکھی جانے لگی تھی اور قرآن اولین کتاب تھی، جو عربی زبان میں نازل ہوئی۔ اسلام کی تعلیمی روح کے باعث دو سو سال ہی بعد تحریری ادب میں دنیا کی سب سے زیادہ با ثروت علمی زبان بن گئی، جس میں دنیا کے سارے ہی علوم کی اعلٰی ترین کتابیں دستیاب ہونے لگیں۔ لکھائی کے آغاز کے وقت خود اس کے خط کا یہ حال تھا کہ ۲۸ ابجد کے لیے صرف پندرہ [چودہ؟] شکلیں تھیں (ب، ت، ث، ن، ی)؛ (ج، ح، خ)؛ (د، ذ)؛ (ر، ز)؛ (س، ش) جس سے جملے کبھی صحیح اور کبھی غلط پڑھے جاتے تھے۔ رقش یعنی حروف کے نقطے نیز اعراب میں کم از کم تنوین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ باقی اعراب بعد میں وضع کیے گئے (دیکھیے مقالہ صنعۃ الکتابۃ فی عہد الرسول والعمارۃ، در مجلہ فکر و فن، ہامبورگ، دسمبر ۱۹۶۴ء) اور اعراب لگا ہوا عربی خط دنیا کا سب سے زیادہ بے التباس اور خوبصورت خط بن گیا؛ چنانچہ لاطینی میں Rahim کو رحم، رحیم اور راحیم تین طرح پڑھا جاسکتا ہے، لیکن عربی میں یہ التباس ناممکن ہے۔ خط کے استقرار کی طرح زبان کا استقرار بھی قابل ذکر ہے۔ دنیا کی زبانیں چار پانچ سو سال بعد عام طور پر ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔ چوسر Chaucer (م ۱۴۰۰ء) کی انگریزی کو آج کتنے لوگ سمجھ سکتے ہیں، مگر عربی زبان چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود نہ صرف و نحو میں بدلی، نہ لغت میں اور نہ املا و تلفظ میں۔

عہد نبوی میں درس کے لیے صرف ایک جامع کتاب رکھی گئی، یعنی قرآن جس میں سارے ہی علوم کی اساسی چیزیں ہیں۔ عقائد و عبادات بھی، قانون بھی، خدا کی حمد و ثنا بھی، تاریخ عالم بھی، اخلاق و طریقۂ معاشرت بھی۔ تورات بشمول زبور ایک قبیلے کی تاریخ ہیں۔ موجودہ انجیل ایک فرد کی محض سوانح عمری ہے، جبکہ قرآن انسانیت کی تاریخ اور انسان کے لیے ہر شعبۂ حیات میں راستہ بتانے والی کتاب ہے۔

ہجرت سے قبل ہی مکے میں قرآن کریم کو لکھ کر محفوظ کیا جانا شروع کیا گیا۔ مردوں کے علاوہ عورتوں کو بھی اس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کا پڑھنا سمجھنا کسی کنبے اور کسی ایک ذات کے لوگوں سے مخصوص نہیں کیا گیا۔ ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ ہی سے ایک عالم حضرت مُصعب رض بن عمیر کو مدینہ منورہ بھیجا گیا۔ ان کی کوشش سے سال ڈیڑھ سال میں کوئی سو کے قریب خاندان مسلمان ہوگئے۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسجد نبوی بنی تو اس میں صُفّہ کے نام سے ایک اقامتی تعلیم گاہ بھی قائم کی گئی۔ اس میں لکھنے پڑھنے جیسی سادہ تعلیم سے لے کر، دین، قانون سلوک اور اخلاق کی اعلٰی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ عہد نبوی میں مدینہ منورہ ہی میں مسجد نبوی کے علاوہ نو مسجدیں تھیں جن میں سے ہر ایک میں مدرسہ بھی تھا اور اہل محلہ وہیں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ابن حزم (جوامع السیرہ، ص ۳۲۳) کے مطابق صحابیات میں سے بیس کے قریب صاحب فتوٰی فقیہ تھیں۔

marfat.com
Marfat.com

شفاءؓ بنت عبداللہ جو ، جو حضرت عمرؓ کی رشتہ دار تھیں ، کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کو لکھنا پڑھنا سکھایا تھا (ابو داؤد سنن ؛ ابن حنبل : مسند ، ۶/۳۷۲ ؛ الحاکم : المستدرک ، ۴ : ۵۶ تا ۵۷) - ایک روایت (ابن حجر : الاصابہ ، نساء/ص ۶۱۸) میں ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے انھیں شہر کی منڈی میں بعض خرید و فروخت کے معاملات (امر السوق) پر مامور فرمایا تھا - بیرون سے مسلمان مدینہ منورہ آتے اور تعلیم و تربیت حاصل کر کے اپنے علاقوں کو واپس جا کر معلم بنتے تھے - مدینہ منورہ سے بھی مدرس ہر جگہ بھیجے جاتے تھے - الطبری نے سنہ ۱۱ھ کے حالات میں (۱ : ۱۸۵۲ ، ۱۹۸۳) یہ اثر انگیز واقعہ لکھا ہے کہ حضرت معاذؓ بن جبل کو جب یمن بھیجا گیا تو وہ یمن اور حضر موت کے صوبوں کے ہر ضلع میں تعلیمی دورے کیا کرتے تھے ، گویا وہ صوبۂ یمن میں تعلیم کے ناظر اعلی تھے - یہی حالت دوسرے صوبوں میں بھی ہوگی - سورہ ۲ [البقرۃ]: ۲۸۲ میں حکم دیا گیا کہ کوئی ادھار رقم یا معاملہ تحریر کے بغیر نہ ہو اور یہ کہ ایسی دستاویز پر فریقین کے علاوہ دو گواہوں کے دستخط بھی ہوں .

سرکاری تدبیروں کے ساتھ عوام کو بھی تعلیم پھیلانے کی پر زور ترغیب و تشویق دی جاتی رہی - قرآن کریم کو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدون کرایا ، حدیث کی تدوین متعدد صحابہؓ نے آپؐ کی اجازت سے آپؐ کے جیتے جی شروع کر دی تھی - ان میں آپؐ کے خادم خاص حضرت انسؓ بن مالک خاص طور پر قابل ذکر ہیں ، جو لکھی ہوئی یاد داشتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سنا کر تصحیح کرانے کے عادی تھے (الخطیب : تقیید العلم ، ص ۹۵ تا ۹۶ ؛ الحاکم : المستدرک) - شاید حکومت کے وسائل کی کمی تھی کہ حکومت نے صرف مسلمانوں کی تعلیم پر اکتفا کیا ، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ رواداری کا وفور تھا کہ کوئی طبقۂ رعیت بھی ایسا نہ ہو جسے اپنی ثقافت کی آزادی نہ ہو اور اس رواداری ہی کا نتیجہ ہے کہ کبھی مسلمانوں کی خانہ جنگی کے زمانے میں بھی ذمیوں نے بغاوت نہ کی اور اسلامی حکومت کو وہ اپنے ہم مذہب رومیوں وغیرہ کی حکومت پر کھلم کھلا ترجیح دیتے رہے کہ وہاں فرقہ واریت بہت زیادہ تھی -

عدلیہ و تشریعیہ (مقننہ) : شروع میں یگانہ حاکم عدالت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی تھے - ہجرت کرکے مدینہ منورہ آنے پر آپؐ زیادہ تر عدالت مرافعہ بنے رہے - مقدمے اولاً شیوخ قبائل کے پاس جاتے ، بجز اس کے کہ مقدمے کے فریق دو مختلف قبیلوں کے ہوں - ملک میں توسیع ہوئی تو کبھی عامل ہی حاکم عدالت بھی ہوتے ؛ کبھی ایک علیحدہ با اختیار قاضی مأمور کیا جاتا - صوبوں سے بعض اوقات قاضی پیچیدہ مقدموں میں استصواب کرتے ؛ بعض اوقات صوبوں کے نامناسب فیصلوں کی اطلاع ملتی تو مرکز سے تنسیخ اور تصحیح و اصلاح کی ہدایتیں بھی دی جاتیں - قانون (نص صریح) میں سکوت نظر آئے تو قاضیوں کو اجتہاد اور قیاس سے امثلہ و نظائر پر قیاس کرکے نیا قانون بنانے کی بھی اجازت تھی - نیت کی اصلاح پر زور دیا جاتا تھا - قاضیوں کو حکم تھا کہ اپنی ذاتی معلومات پر عمل نہ کریں بلکہ پیش شدہ شہادت پر ہی فیصلے کی بنیاد رکھیں ؛ نیز یہ کہ فریق ثانی کا جواب سنے بغیر یک طرفہ بیان پر فیصلہ ہرگز نہ کیا جائے - ایک اہم ہدایت قاضیوں کو یہ دی گئی ! "البینة علی المدعی والیمین علی من انکر" (ثبوت پیش کرنا دعوی کرنے والے کا فریضہ ہے اور انکار کنندہ مدعی علیہ کو قسم کھا کر انکار کرنا پڑے گا) - فنی چیزوں کے

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

لیے ماہرین سے تحقیقات کرا کر ان کے مشورے پر عمل کیا جاتا ۔ قاضیوں کو تاکید ہوتی کہ پیچیدہ معاملات میں نیک اور باصلاحیت اہل علم سے مشورہ کیا کریں ۔ اسلام نے کسی شخص حتّی کہ حاکم ملک کو بھی قانون سے بالا قرار نہ دیا اور ہر فرد کو اس کے اعمال کا مسئول اور ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے ۔ خلافت راشدہ کے زمانے سے ہمارے ہمعصر عہد تک مسلمان حکمرانوں کے خلاف اس کے اپنے ملک میں قاضی کے ہاں مقدمہ دائرہ ہوتا رہا ہے ۔ حمکران اپنا مقدمہ آپ سننے اور فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ۔ قانون کی تکمیل کے لیے ہر نظام میں ایک تہدید ہوتی ہے جو پولیس اور فوج کی قوت اور حاکم عدالت کے فیصلوں کا نفاذ ہے ۔ اسلام نے اس ظاہری تہدید کو کاملاً اپناتے ہوئے اس میں ایک مزید اور قوی تر عنصر کا اضافہ کیا جو حساب آخرت اور خدا کے ہاں ظالم کی جوابدہی ہے ۔ ایک حدیث ہے کہ لوگ جھگڑے میرے پاس لاتے ہیں اور ممکن ہے کہ کوئی اپنی دلیل بیان کرنے میں زیادہ چرب زبان ہو اور میں جو سنوں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں ۔ اگر میں کسی کو اس کے بھائی کا حق مار کر کچھ دینے کا حکم دوں تو یقین جانو کہ میں اسے جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا دیتا ہوں (صحاح ستہ) ۔

قرآن نے تعلیم کی طرح عدالتی معاملات میں بھی غیر مسلموں کو کامل خود مختاری دی ہے ۔ فریقین ایک ہی ملّت (مثلاً نصرانیت) کے ہوں تو انھیں کے قانون ، انھیں کے حاکم عدالت اور انھیں کی ابتدائی و آخری عدالت مرافعہ ہوگی ؛ اسلامی عدالت اور قاضی سے ان کو کوئی سروکار نہ ہوگا ۔ حاکم عدالت کا تقرر بھی انھیں کی ملت کرتی ہے ۔ انھیں اجازت ہے ، جبر بالکل نہیں ، کہ فریقین متفقہ طور پر چاہیں تو اسلامی حاکم عدالت کے پاس رجوع کریں ۔ فریقین ایک ہی ملت کے ہوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ انھیں کا قانون منگوا کر اس کے مطابق فیصلہ فرماتے ۔ فریقین اگر دو مختلف ملتوں کے غیر مسلم ہوتے تو وہی آپس میں فیصلہ کرتے کہ کس قانون کی طرف رجوع کیا جائے ۔ اگر وہ اسلامی عدالت میں آنے کا فیصلہ کرتے تو ان کی خواہش کے مطابق ان پر اسلامی قانون نافذ کیا جاتا، (لیکن ایسی کوئی معین مثال عہد نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں نہیں ملتی) ۔

اگر فریقین میں سے ایک مسلمان ہوتا تو مقدمہ لازماً اسلامی عدالت میں آتا اور اسلامی قانون رو رعایت کے بغیر پورا پورا انصاف کرتا ۔ (ایسی مثالیں موجود ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان کے خلاف یہودی کے حق میں فیصلہ کیا) ۔

قانون سازی کا عام اصول یہ ہے کہ انسان اپنے ماحول کے پرانے رسم و رواج اور عرف و عادت پر عمل جاری رکھتا ہے ، بجز ان چیزوں کے جن سے کہ اسے ، اس کا قابل احترام سردار ، منع کرے ۔ نیز ان نئی چیزوں پر عمل کرے جن کا وہ حکم دے ۔ اس طرح شروع ہی سے مسلمانوں میں قانون کے دو مآخذ رہے : کتاب اللہ ؛ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ؛ [البتہ اضافی طور پر مقامی (مثلاً مکی یا مدنی) رواج کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے امت کی سہولت اور آسانی کی خاطر اپنی صوابدید کے مطابق کچھ تغیر و تبدیلی کے ساتھ شامل کرنے کی اجازت دے دی ؛ اس طرح] اس پرانے رسم و رواج کو "تقریر نبوی" ہونے ، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے برقرار رکھے جانے ، کی سند حاصل ہوگئی اور وہ اسلامی قانون کا جزو لاینفک بن گیا اور سنت سے بنے ہوئے قانون ہی کے برابر مقدس ۔ "تقریر نبوی" کا اطلاق مکے کے بعد مدینے کے رواج پر ہوا ۔ یہ صحیح ہے کہ مقامی رواج کی "اصلاح" اور اس کو اسلام کے مطابق بنانا بتدریج ہی ہو سکتا تھا ، یعنی

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

اگر کسی رواج کا آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو علم ہوتا، یا رواجی عمل کی بنا پر پیدا شدہ جھگڑا فیصلے کے لیے آپؐ تک لایا جاتا تو آپؐ کچھ نہ کچھ ضرور کر دیتے ، چاہے رواج کو برقرار رکھتے یا اسے تبدیل کر دیتے ، لیکن اگر کوئی رواج آپؐ کے علم میں نہ لایا جاتا تو اس کی اصلاح کی واحد صورت یہ تھی کہ قرآن یا حدیث کے عام احکام سے استنباط کرکے اس رواج کو بعد کے فقہا برقرار رکھیں یا بدلنے کا حکم دیں اور فقہا کا یہ عمل لا متناہی ہے ۔ اس کا تعلق ساری دنیا سے ہے، سارے زمانوں سے کہ قرآن و سنت معلوم و معین ہو چکے ہیں، لیکن دنیا میں اسلام کا پھیلنا ابھی مکمل نہیں ہوا ہے ۔ قرآن و سنت اسلامی قانون کے اہم اور بنیادی مآخذ بھی ہیں اور مقامی پرانے رواجوں کے اصلاح کنندہ بھی؛ البتہ ان کا سمجھنا اور ان سے نئے احکام کا استنباط کرنا انتھک اور مسلسل محنت چاہتا ہے ۔ فہم میں قصور ہو سکتا ہے ، مثلاً وضو کی ضرورت ہو اور پانی نہ ہو تو منہ اور ہاتھوں پر مٹی سے تیمم کرنا چاہیے، لیکن اگر ضرورت غسل کی ہو تو قرآن مجید (۴ [النساء] : ۴۳؛ ۵ [المائدۃ] : ۶) میں کافی صراحت کے باوجود بعض صحابہؓ نے قیاس کیا کہ غسل کے وقت مٹی پر لوٹ کر سارے جسم پر تیمم کرنا چاہیے ۔ ایسے عمل کی اطلاع جب آپؐ کو ملی تو آپؐ نے فرمایا کہ دونوں صورتوں میں منہ اور ہاتھوں کا مسح کافی ہے ۔ اسی بنا پر جب حضرت عمروؓ بن العاص کو آپؐ نے قاضی بنایا تو انھیں بتایا کہ قانون کے معلوم نہ ہونے کی صورت میں حاکم عدالت کو دیانتداری سے اجتہاد (کوشش) کرکے قیاس سے حکم شریعت معلوم کرنا چاہیے اور اس میں اگر حاکم عدالت ناکام رہے، یعنی غلط حکم دے تو بھی اسے اللہ کے ہاں ایک اجر ملے گا (نیت کی درستگی کا) ، اور اگر صحیح حکم تلاش کر لے تو اسے دو اجر ملیں گے ۔ اسلام میں اہل علم میں مساوات ہے ؛ اس لیے ان میں اختلاف رائے قابل برداشت ہے اور امت کا یہ اختلاف اس معنی میں بھی خدا کی رحمت ہے کہ مختلف آرا اور دلیلوں کو دیکھ کر بہتر رائے کا معلوم کر سکنا ممکن ہے ۔ حدیث حضرت معاذؓ بن جبل کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ یمن بھیجے گئے تو رخصتی ملاقات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: کس طرح فیصلہ کیا کرو گے؟ انھوں نے کہا : کتاب اللہ کے مطابق ۔ فرمایا : اگر اس میں نہ پاؤ تو؟ انھوں نے کہا : تب سنت رسولؐ کے مطابق ۔ آپؐ نے فرمایا : اگر اس میں بھی نہ ملے تو؟ کہا : تب میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں گا ۔ اس پر آپؐ نے انتہائی خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا : اللہ کے لیے حمد ہے کہ اس نے اپنے رسولؐ کے سفیر کو اس بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول پوری طرح راضی ہے ۔ غرض قرآن مجید ، سنت نبوی اور تقریر نبوی نیز اجتہاد و استنباط عہد نبوی میں قانون سازی کے عام ذریعے تھے ۔ کچھ خاص وقتی اور محدود ذریعے بھی تھے ، مثلاً قدیم پیغمبروں کی شریعتیں، کیونکہ وہ بھی خدا ہی کا حکم لائے تھے؛ اس لیے ان کی شریعتیں مسلمانوں پر بھی برقرار اور نافذ رہتی ہیں، بشرطیکہ اس کا قرآن کریم میں ذکر ہو اور اس کو قرآن یا سنت نبوی نے منسوخ نہ کیا ہو ۔ چنانچہ اٹھارہ پیغمبروں کا نام لینے کے بعد قرآن (۶ [الانعام] : ۹۰] نے صراحت کی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی تھی اس لیے (اے محمدؐ) ان کی ہدایت کی اقتدا کرو ۔ [قانون سازی کے سلسلے میں قانون بین الممالک کے کئی احکام قرآن مجید میں بھی ہیں ، یعنی جنگ اور امن کے زمانے میں دوسری حکومتوں سے کیسا برتاؤ اور سلوک کیا جائے ۔ اس ضمن میں قانون زیادہ تر سنت نبوی پر مبنی ہے ، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے غزوات اور جنگوں میں جو برتاؤ دشمن سے

marfat.com
Marfat.com

روا رکھا اور یہ قانونِ جنگ دنیا کے تمام قوانین جنگ سے بدرجہا بہتر اور زیادہ انسانیت پرور ہے۔ [نیز رک بہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت مقنن؛ محمد (سورہ)]۔

دفاعی اور عسکری ادارہ: عہد نبویؑ کی روحانی فتوحات کہ کئی لاکھ آدمی مسلمان ہوئے، (حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان شریک ہوئے) اپنی جگہ ہیں، لیکن مادی فتوحات بھی کچھ کم نہیں [رک بہ غزوات]۔ آپؐ کی جنگوں میں آپؐ کے دشمنوں کی تعداد کئی گنا زیادہ ہوتی تھی۔ بعض اوقات دس گنا سے بھی زیادہ، اس کے باوجود دشمن مقابلہ نہ کر سکا۔ ہجرت مدینہ کے فوراً بعد قرآن مجید نے جہاد یعنی فوجی خدمت ہر مسلمان کا فریضہ قرار دے دیا؛ [کیونکہ دشمن اہل اسلام کو مٹانے کے لیے پوری طرح تیاریوں میں مصروف تھے؛ اس لیے اندیشہ تھا کہ اگر ان کے مقابلے کے لیے تیاری نہ کی گئی تو اہل اسلام کو مٹانے میں کوئی دریغ نہ کریں گے (دیکھیے ۲۲ [الحج]: ۳۹)۔

ملک جنگجو اور ہر شخص مسلح تو پہلے سے تھا؛ اب ان کی جنگی تربیت کی تدبیریں روز افزوں اختیار کی گئیں۔ تیر اندازی، گھڑ دوڑ اور کُشتی وغیرہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم شخصی سرپرستی فرماتے رہے [رک بہ علم فروسیۃ؛ فرس]؛ گھڑ دوڑ میں شرکت کر کے جیتنے والوں کو خود انعام دیتے؛ جنگ کے لیے تربیت کے دوران میں جیتنے والے گھوڑوں کا انتخاب جس ٹیلے پر کھڑے ہو کر فرماتے وہاں مدینہ منورہ میں آج بھی مسجد السبق (گھڑ دوڑ کی مسجد) باقی ہے۔ عبادت کے قواعد ایسے بنے کہ ان سے فوجی تربیت میں مدد ملتی ہے۔ ہر سال مہینا بھر روزے رکھنا سپاہیوں کو بھوکے پیاسے رہ کر لڑنے کی تربیت دلاتا ہے۔ نماز سے صبح خیزی، صف بندی اور امام کی آواز پر حرکات و سکنات بھی فوجی تربیت میں معاون ہیں۔ حج کے ذریعے سے ساری مملکت سے مسلمانوں کا اجتماع عام گھر کی چھت کے بجائے آسمان تلے زندگی گزارنا وغیرہ سکھاتا ہے۔ قمری مہینوں کے اختیار کرنے کی وجہ سے ہر موسم کے روزوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بچوں، معذوروں، اپاہجوں کو چھوڑ کر ساری مسلم آبادی مستقل فوج تھی، جب چاہا اور جتنوں کی ضرورت ہوئی اتنوں کو بلا لیا جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مسجد میں نماز کے وقت رضاکاروں کی ضرورت کا اعلان کرتے اور بتاتے کہ کس کے پاس اپنے نام لکھوائیں اور کب اور کہاں جمع ہوں۔ اور اگر خود قیادت نہ فرماتے تو سالار جیش نامزد فرماتے۔ حسب ضرورت ذیلی افسر بھی مامور کیے جاتے؛ چونکہ لڑائی کا مقصد دنیوی منفعت بالکل نہ تھا، اس لیے جنگ کے عین اثنا میں بھی نمازِ خوف کا حکم نازل ہوا (۴ [النساء]: ۱۰۲)۔ اس کی تعمیل کی جاتی تھی خواہ نتائج کچھ ہی نکلیں، اس سے اسلامی افواج کی اہلیت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس سوال پر کہ کوئی مال غنیمت کے لالچ میں، کوئی اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ہے، کوئی حمیت سے، ان میں سے راہ خدا میں لڑنے والا کسے سمجھا جائے گا؟ آپؐ نے جواب دیا: صرف وہ جو اللہ کے نام کی سربلندی کے لیے جنگ کرے۔ اسے نہ مال غنیمت کی چاہت ہو، نہ کوئی اور مادی طلب [رک بہ جہاد]۔ تنظیم کی بہر حال ضرورت تھی۔ جس طرح عوام کی عسکری تربیت میں حکومت دلچسپی لیتی تھی، اسی طرح حکومت سے مستقل فوج کے فائدے نظر سے پوشیدہ نہ رہے۔ فوری ضرورت کے لیے صفّہ کی "خانقاہ" سے دن ہو کہ رات، ہر وقت رضاکار تیار ملتے۔ جب رفتہ رفتہ حکومت کے مالی وسائل بڑھے، بڑی تعداد میں نیم مستقل فوج کے تیار رکھنے کے لیے وظیفہ دینے کا نظام شروع کیا گیا۔ السرخسی (شرح السیر الکبیر، ۲: ۲۷۶، باب ۱۰۵، حیدرآباد)

marfat.com
Marfat.com

نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں سے جو صدقات وصول ہوتے ان کو دشمنوں سے حاصل شدہ مال (فیٔ) سے الگ رکھا جاتا ؛ ہر ایک کے مصارف و مستفیدین جدا جدا تھے ۔ صدقات یتیموں، بوڑھوں اور غریبوں کے لیے تھے ؛ پھر جب کوئی یتیم بالغ ہو کر جہاد (فوجی خدمت) کا مستوجب ہو جاتا تو اسے صدقات کے مستفیدین سے نکال کر فیٔ کے مستفیدین میں منتقل کر دیا جاتا ، لیکن اگر وہ جہاد میں حصہ لینا نہ چاہتا تو اسے حکومت کے مال میں سے کچھ نہ دیا جاتا، (نہ صدقات سے ، نہ فیٔ سے) ، بلکہ اسے کہا جاتا کہ اپنا کسب معیشت خود تلاش کرے ۔ ان وظائف کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ مرد کے فوجی خدمت پر جانے کی صورت میں اس کا کنبہ وسائل حیات سے محروم نہ رہے اور ھتھیار وغیرہ بھی خرید کر تیار رکھے جا سکیں ۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کا دیوان (دفتر) اسی کی تکمیلی اور ترقی یافتہ شکل معلوم ہوتا ہے) ۔ مدینہ منورہ سے باہر مسلمان مجاہدین کی طلبی کے لیے ان کے قبائلی سردار (شیوخ) ذمہ دار قرار دیے گئے اور وہی مطاوبہ تعداد منتخب کر کے روانہ کرتے ۔ اس کے علاوہ سرکاری خزانے میں بھی ہتھیار ، گھوڑے ، اونٹ ، غلہ اور دیگر جنگی ضرورت کی چیزیں رکھی جاتیں ۔ خبر رسانی کے نظام کو بہت ہی عمدہ بنایا گیا ۔ دشمن کے علاقوں میں افراد مقرر کیے جاتے تھے تاکہ ہر نئی اور خطرے والی خبر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو باخبر رکھیں ۔ خصوصی جاسوس بھی عام طور پر خطرے کے دنوں میں کثرت سے بھیجے جاتے ۔ دوسری طرف اپنی خبروں کو دشمن سے چھپانے کی ممکنہ تدبیریں اختیار کی جاتی تھیں ۔ خود آپؐ کا طریقۂ جنگ بھی دلچسپ معلومات کا حامل ہے ۔ خندق [رک باں] سے اھل عرب واقف نہ تھے، اسے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے پر اختیار کر کے عظیم فائدہ اٹھایا گیا ۔ جنگ خیبر میں دشمن نے منجنیق سے سنگباری کی تھی ۔ ایک ہی سال بعد طائف کے محاصرے میں آپؐ نے منجنیق اور دبابے (زرہ پوش گاڑیاں) استعمال کیں ۔ علم الجو سے ہمیشہ استفادہ کیا جاتا ۔ حملے کے وقت کے لحاظ سے حملے کے لیے دشمن بستی یا پڑاؤ کی ایسی جہت انتخاب کی جاتی کہ ابھرتا ہوا یا ڈھلتا ہوا سورج مسلمان سپاھیوں کی آنکھوں کے سامنے نہ رہے ؛ چلنے والی ہوا مسلمانوں کے پیچھے سے چلے ، سامنے سے نہیں ؛ رات کے سفر میں اونٹوں کے گلے کی گھنٹیاں نکلوا دی جاتیں تاکہ آواز سے دشمن متنبہ نہ ہوجائے ۔ عہد نبوی ہی سے فوج میں طبی امداد کا انتظام نظر آتا ہے ۔ جنگ کے دوران میں مردوں کی قلت کی وجہ سے کھانا پکانے اور تیمار داری کے لیے عورتیں منتخب کی جاتیں ۔ مال غنیمت قبل از اسلام دستِ خود دھان خود کا مصداق تھا ۔ قرآن کریم نے حکم دیا کہ جملہ مال غنیمت کو مرکزی ملکیت سمجھا جائے اور فوج کے تمام لوگ برابر کا حصہ پائیں ۔ چاہے مال جمع کرنے میں انھوں نے حصہ لیا ہو یا کسی فوجی کام میں مشغول رہنے کے باعث انھیں اس کا موقع نہ ملا ہو ۔ اس مال کا پانچواں حصہ (خُمس) مرکزی حکومت کے خزانے میں جمع ہو جو عام رعایا کی بہبود پر خرچ کیا جائے اور باقی غانم فوج میں تقسیم کر دیا جائے [رک بہ انفال]۔ نیز سپہ سالار سے لے کر ادنٰی سپاہی تک سب کا حصہ یکساں ہو ؛ فرق ہو تو صرف اس کا کہ سپاہی کے پاس اس کا اپنا گھوڑا تھا یا یہ کہ وہ پیدل تھا (۸ [انفال] : ۱ تا ۴).

مال غنیمت کے سلسلے میں اسیرانِ جنگ کا ذکر ناگزیر ہے ۔ دشمن کی جان اور مال کو نقصان پہنچا سکنا ہر فریق جنگ کے حقوق جنگ میں داخل ہے ، لیکن اسیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا ، بجز اس کے کہ اسیر نے عہد سابق میں کسی اور قابل سزا جرم کا ارتکاب کیا ہو ۔ اسیروں کو بلامعاوضہ

marfat.com
Marfat.com

رہا کرنا، فدیہ لے کر رہا کرنا، اپنے کسی اسیر سے جو دشمن کے قبضہ میں ہو، تبادلہ کرنا، نیز غلام بنا سکنا، عہد نبوی میں ان میں سے ہر ایک کی نظیریں ملتی ہیں۔ غلام بنانا آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو قطعی پسند نہ تھا، لیکن اس عالمگیر رواج کو یک طرفہ طور سے منسوخ کرنے میں دشواری یہ تھی کہ مسلمان قیدیوں کو دشمن غلام بنا سکتا تھا۔ اسیروں کو غلام بنانے کی جو دو ایک مثالیں عہد نبوی میں ملتی ہیں (مثلاً بنو المصطلق اور بنو ہوازن) ان میں یہ بھی تحقیق سے ثابت ہے کہ بالآخر غلام آزاد کر دیے گئے تھے (دیکھیے بالا) اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے غلامی کا جزئی انسداد کرتے ہوے فرمایا: لَا رِقَّ عَلٰی عَرَبِیٍّ، یعنی کسی عرب کو غلام نہیں بنایا جاسکتا (السرخسی: المبسوط، ۱۰: ۱۱۸؛ وہی مصنف: شرح السیر الکبیر، ۲: ۲۶۵، ۲۶۹)۔ قرآن و حدیث میں جگہ جگہ قیدیوں سے اچھا سلوک کرنے کی بڑی تاکیدیں ہیں؛ اس کے ساتھ ہی غلاموں کو آزاد کرنے کی بھی بہت سی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، حتٰی کہ اسے بہت بڑی نیکی قرار دیا گیا ہے۔ [مختلف گناہوں کا کفارہ مثلاً کفارۂ قتل خطأً (۴ [النساء]: ۹۲)؛ کفارۂ حِنث (۵ [المائدة]: ۸۹)؛ کفارۂ ظِہار (۵۸ [المجادلة]: ۳) غلام کی آزادی سے ہوتا ہے]۔ زکوٰة [رک بآن] جو حکومت کی آمدنی کا ایک حصہ ہے، اس میں سے ہر سال ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کرنے کا قرآن مجید میں حکم ہے اور یہ بھی کہ اگر کوئی غلام اپنی آزادی (مکاتبت) کے لیے کچھ رقم اپنے آقا کو دینے پر آمادہ ہو تو آقا اس سے انکار نہیں کر سکتا، بلکہ اسے مطلوبہ رقم کمانے کی سہولت مہیا کرنے پر بھی مجبور ہے۔ مسلم قیدیوں کو دشمن کی قید سے رہائی دلانا اسلامی حکومت کے خرچ پر ہوتا ہے اور اس میں مسلمان اور ذمی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ علم حرب اور علم قانون دونوں کے نقطۂ نظر سے عہد نبوی کی جنگوں کے متعلق تفصیلوں کے لیے دیکھیے [(حمید اللہ: عہد نبوی کے میدان جنگ، مطبوعہ لاہور؛ نیز رک بہ غزوات]۔

مالیات: [نیز رک بہ اسلام؛ صدقات؛ زکوٰة وغیرہ)؛ مال کو قرآن کریم (۴ [النسآء]: ۵) میں زندگی اور اس کی بقا کا وسیلہ قرار دے کر اس کی روز مرہ زندگی میں اہمیت کی طرف ایک جامع اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ مال ظاہری اور باطنی احوال پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے آغاز ہی سے آپؐ نے ایسی تدابیر اختیار کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جن کا مقصد اقتصادی و معاشی حالات کو بہتر بنانا تھا؛ چنانچہ ابتدائی مکی دور میں اہل ثروت کو اہل حاجت کی امداد کرنے کا حکم دیا گیا اور اسے مالداروں پر غربا کے حق واجب سے تعبیر کیا گیا (۵۱ [الذاریت]: ۱۹؛ نیز ۷۰ [المعارج]: ۲۴)۔ مدنی دور میں اس میں مزید وسعت پیدا کی گئی اور زر نقد، سونا، چاندی، ریوڑ وغیرہ کی ایک خاص مقدار پر زکوٰة [رک بآن] فرض کر دی گئی [مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: ابو یوسف: کتاب الخراج؛ ابو عبید: کتاب الاموال، مطبوعہ اسلام آباد، نیز رک بہ علم (معاشیات)؛ مالیات وغیرہ]۔ علاوہ ازیں صنعت و تجارت میں ایمانداری، دیانتداری اور فرض شناسی پر خصوصی زور دیا گیا؛ چنانچہ ایک مستقل سورہ المطففین [رک بآن] میں کم تولنے اور کم ماپنے والوں کی خصوصی مذمت کی گئی۔ اس کے علاوہ معاقل [دیت رک بآن]، جسے موجودہ دور کی اصلاح میں بیمہ [کے مشابہ قرار دیا جا سکتا] ہے، کے نظام کو بہتر بنایا گیا۔ اس طرح قتل خطا کی صورت میں نہ صرف مقتول کے وارثوں کو قابل لحاظ خون بہا ملتا تھا، بلکہ قاتل کی امداد کے لیے بھی اس کے قبیلہ، اس کے خاندان اور بعض صورتوں میں قریہ کے لوگوں کو

marfat.com
Marfat.com

شریک تصور کیا جاتا تھا تاکہ اس پر اور اس کے خاندان پر ضرورت سے زیادہ بوجھ نہ پڑے ۔ بعد ازاں یہ سلسلہ ترقی کر گیا اور امداد باہمی کی طرز پر بننے والی یہ انجمنیں مزید فروغ پذیر ہوئیں ؛ اسلام کی سب سے اہم اصلاح جو سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لیے اختیار کی گئی ، وہ سود کا معاشرے سے مکمل اور غیر مشروط انسداد ہے ۔ اس کے بجائے قرضِ حسنہ کے جذبے کو ابھارا گیا تاکہ ضرورت مند افراد کو بغیر کسی استحصالی صورت کے امداد مل سکے؛ البتہ ساجھے کے کاروبار [مضاربت رک بآن] کو اس بنا پر بحال رکھا گیا تاکہ ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر و توسیع میں مشترک کوششیں اہم کردار ادا کرتی رہیں ۔ خلافت راشدہ کے دور میں ، باقاعدہ طور پر بیت المال [رک بآن] سے ضرورتمندوں کو قرض حسنہ کےطور پر امداد دی جاتی تھی جو اس کے وظائف سے ششماہی طور پر وصول کر لی جاتی [نیز رک بہ زکوٰۃ ، ربوٰ ، بیت المال ، دیت].

تقویم : عبادات، یعنی نماز ، روزہ ، زکوٰۃ اور حج میں بھی اور نظم و نسق مملکت میں بھی تقویم اور علم ہیئت کی ہر وقت ضرورت پڑتی ہے ۔ پنجوقتہ نمازوں کے اوقات حرکت شمسی کے تابع ہیں ۔ جمعہ اور عیدین کے لیے ہفتے اور سال کے ایام متعین کرنے کے لیے تقویم کی حاجت ہے ۔ روزوں میں سحری اور افطار کے لیے بھی اس علم کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ حج کا وقت بھی تقویم سے متعین کیا جاتا ہے ۔ زکوٰۃ کا وجوب بھی سال گزرنے پر ہوتا ہے ؛ لہذا اس کے لیے بھی اس علم کی ضرورت ہے ۔

تقویم کے دو جز ہیں : اسلامی تاریخ (سنہ) کا آغاز کب سے ہو اور مہینوں کا آغاز کہاں سے ؟ عرب میں اگرچہ سال کا آغاز عام طور پر محرم سے تسلیم کیا جاتا تھا ، یعنی حج بیت اللہ کے بعد کے مہینے سے ، لیکن عرب میں سنہ [کے لیے کوئی ضابطہ اور کوئی واقعہ مقرر نہ تھا ؛ چنانچہ مختلف قبائل میں مختلف سنہ رائج تھے، بلکہ] ایک ہی جگہ بار ہا کسی اہم تر واقعے کے وقوع پر قدیم تر نقطۂ توقیت کو ترک بھی کر دیا جاتا تھا ۔ خود مکہ مکرمہ میں متعدد سنہ رائج تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے لے کر ہجرت تک عام طور پر ابرہہ کے ہاتھیوں کے حملے کی یاد میں عام الفیل سے وقت شماری ہوتی رہی ۔ مکہ مکرمہ میں یہ سنہ ۸ھ میں اس کے اسلام لانے تک نافذ رہا ۔ لیکن مدینہ منورہ میں آپؐ کے تشریف لانے کے بعد مسلمان ہجرت سے توقیت (وقت شماری) کرنے لگے ، لیکن امام بیہقی (کتاب دلائل النبوۃ) کے مطابق کچھ مہاجرین توقیت کے لیے سنہ کا آغاز اسی سال سے کرتے تھےجس کے آخر میں انہوں نے مدینہ منورہ ہجرت [رک بآن]، شروع کی، [یعنی موجودہ اعتبار سے سنہ ۱ق ـ ھ سے]، کچھ اس سال کے آغاز سے جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ماہ ربیع الاول میں مدینہ منورہ تشریف لائے؛ [اسی صورت کو عہد فاروقی میں صحابہؓ کے مشورہ سے مجموعی طور پر اپنا لیا گیا (رک بہ ہجرت)] اور کچھ اس سال سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آمد مدینہ منورہ کے بعد شروع ہوا (یعنی سنہ ہجری کے ایک سال بعد سے) ۔ آخر حضرت عمرؓ کے زمانے میں یکسانی کا حکم دیا گیا؛ ورنہ اس سے پہلے ایک ہی واقعہ مختلف انداز سے توقیت کےلیے سامنے رکھا جاتا تھا، مثلاً بنوالمصطلق کی جنگ شعبان سنہ ۴ ، ۵ اور ۶ھ تینوں میں بیان کی جاتی ہے ۔ یہ فرق اسی مختلف طریقہ ہائے توقیت کے باعث ہے، ورنہ سب کا مقصد ایک ہی ہے ۔

قدیم زمانے ہی سے اہل عرب سال کے بارہ مہینوں پر متفق تھے، لیکن انہوں نے جب یہ دیکھا کہ مہینوں کا آغاز اگر چاند کی رؤیت (دیکھنے) سے کیا جائے تو مہینا کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی تیس دن کا اور اس طرح سال میں تقریباً ۳۵۴ دن ہونے

marfat.com
Marfat.com

ہیں : اگر موصوف کا تعلق شمسی سال سے ہو تو پھر ۳۶۵ دن ہوتے ہیں اور ان گیارہ دن کے فرق کے باعث بتدریج قمری مہینے کبھی سردی میں اور کبھی گرمی وغیرہ میں ہو جاتے ہیں ۔ زراعت کے لیے عربوں نے انواء (یعنی بارش کے ستاروں) کا ایک الگ سنہ بنا لیا ، لیکن حج کو ہمیشہ ایک ہی موسم میں لانا مطلوب تھا ، تاکہ موسم حج فصل کے کٹنے وغیرہ کے زمانے میں نہ آنے پائے ۔ اس غرض کے لیے خاصے قدیم زمانے سے انہوں نے نسیٔ (یعنی کبیسہ گری) شروع کر دی تھی کہ وقتاً فوقتاً ایک "خالی" یا گمنام مہینے کا سال میں اضافہ کردیتے ۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ یہ ہر سال ہوتا ، بعض کے مطابق ہر دو سال بعد ، بعض کے مطابق ہر تین سال بعد ، اور بعض کے مطابق حسب ضرورت ہوتا ، جس سے کبھی ایک سال کا ، کبھی دو سال کا اور کبھی تین سال کا وقفہ ہو کر سال تیرہ مہینوں کا شمار کیا جاتا ۔ غالباً یہی صحیح ہے کیونکہ اس سے سارے اختلافات رفع ہو جاتے اور سب بیانوں کی تطبیق بھی ہو جاتی ہے (اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے محمد حمید اللہ : مقالہ نسیٔ درجرنل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، جنوری و اکتوبر ۱۹۶۸ء ؛ اسلامک ریویو، ووکنگ ، فروری ۱۹۶۹ء) .

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے وفات سے تین ماہ قبل خطبہ حجۃ الوداع میں قرآن کریم (۹ [التوبۃ] : ۳۷) کے اس حکم کا اعادہ کیا، جس میں اس رسم بد کی منسوخی کا اعلان کیا گیا ہے؛ تب سے خالص قمری سال مسلمانوں میں رائج ہے .

تقویم کی اصلاح اور قمری سنہ کے رائج کرنے میں کئی مصلحتیں ملحوظ نظر آتی ہیں ۔ اولاً دینی احتیاج ہے ۔ سابق شمسی یا کبیسہ والے حساب میں مثلاً رمضان المبارک ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا ۔ فرض کیجیے کہ وہ دسمبر کے مطابق ہے ۔ یہ مہینا خط استوا کے شمال کے علاقوں میں سردی کا موسم ہے اور خط استوا کے جنوب میں وہی زمانہ گرمی کا ہے ۔ منطقہ باردہ والوں کے لیے گرمی کا موسم خوشگوار ہوتا ہے اور سردیاں تکلیف دہ ہوتی ہیں تو منطقہ حارہ میں گرمیاں بار خاطر ہوتی ہیں اور ساری عمر اگر رمضان بعض ملکوں میں خوشگوار اور بعض ملکوں میں ناقابل برداشت موسم میں آتا رہے تو یہ دین حنیف کی طرف سے ان لوگوں پر بہت نا انصافی ہوتی ۔ اس کے برخلاف ساری ہی دنیا میں رمضان بدل بدل کر بہار ، سرما ، خزاں اور گرما میں آتا رہے ، تو فطرت کی غیر تغیر پذیری کے باوجود سب ہی کو کبھی سہولت اور کبھی زحمت تو ہو، لیکن شکایت اور دلشکنی کا موقع کسی کو نہ ہو اور ضمناً فائدہ یہ بھی ہے کہ دین کا دفاع کرنے والی مسلمان فوج کو ہر قسم کے موسموں میں بھوکے پیاسے رہنے کی تربیت ملتی رہے .

ثانیاً اس کے مالی اور اداری فائدے بھی ہیں ۔ ہجری تقویم کے باعث تینتیس شمسی سال میں چونتیس قمری سال ہوتے ہیں ۔ یعنی ۳۳ شمسی سالوں میں محکمہ مالیہ تقریباً ۳۴ مرتبہ محاصل اس طرح وصول کرتا ہے کہ کسی کو شکایت نہیں ہوتی ۔ کوئی ماہر اقتصادیات اس تدبیر کو برا نہیں کہہ سکتا ۔ اس میں شک نہیں ، ملازمین کی ماہانہ تنخواہیں بھی (۳۳×۱۲) ۳۹۶ کی جگہ (۳۴×۱۲=) ۴۰۸ مرتبہ دینی پڑتی ہیں، لیکن حکومت کی ساری آمدنی چونکہ تنخواہوں پر صرف نہیں ہوتی، بلکہ رفاہ عامہ کے لیے بھی خاصی رقم بچ رہتی ہے ، اس لیے اس تقویمی اصلاح سے محکمہ مالیہ کی منفعت بھی مقصود ہے ۔ ضمناً یہ مصلحت بھی ہے کہ عام طور پر مالی سال کے آخر میں حکومت کے خزانے خالی ہو جاتے ہیں اور نئے محاصل کی آمد تک روز مرہ کے اخراجات کے لیے حکومت کو خاصی زحمت اٹھانی پڑتی ہے اور عام طور پر مختصر مدت والے ڈبنچر جاری کر کے مغربی حکومتیں سود پر قرض لیتی

marfat.com
Marfat.com

ہیں ۔ اسلامی نظام میں محصولوں کی وصولی کے دو مختلف اوقات رکھے گئے ہیں ۔ زراعتی مالگزاری شمسی حساب سے ، اور دیگر محاصل قمری حساب سے ؛ اس لیے حکومت کی تھیلیاں کبھی خالی نہیں ہو سکتیں ۔ اگر اتفاق سے کبھی شمسی اور قمری سال دونوں بیک وقت شروع ہوں تو ان کا اتفاق ایک سال سے زیادہ کے لیے نہیں ہوتا ، بلکہ تیس بتیس سال تک دونوں سالوں میں دوری ہی رہتی ہے ۔

ایک عالمگیر اور ابدی دین کے لیے مقامات کے اعتبار سے دنوں کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی گتھی کا حل بتانا ناگزیر تھا ؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک قول کے ضمن میں اس کا حل تجویز فرمایا جو صحیح مسلم وغیرہ میں ہے ۔ آپؐ نے فرمایا : جب دجال آئے گا تو وہ دنیا میں چالیس دن رہے گا، جس میں کا پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا ؛ دوسرا دن ایک ماہ کے برابر؛ تیسرا دن ایک ہفتے کے برابر اور باقی ۳۷ دن تمہارے موجودہ دنوں جیسے ۔ کسی صحابیؓ نے عرض کیا : یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ! اس سال بھر کے لمبے دن میں کیا صرف ایک دن کی نمازیں پڑھنی کافی ہوں گی ؟ فرمایا : نہیں، بلکہ حساب کرو ۔ ایک سال کے برابر لمبا دن ۹۰ درجہ عرض بلد پر ہوتا ہے ۔ ایک مہینے کے برابر لمبا دن سال کے ایک معین مہینے میں تقریباً ۶۷ درجہ پر اور ایک ہفتے کے برابر لمبا دن ۶۵ درجہ پر ہوتا ہے ۔ چنانچہ مسلم فقہا نے اس پر قیاس کرکے یہ استنباط کیا ہے کہ فنلینڈ ، روس اور کینیڈا میں نماز روزے کے اوقات کے لیے اس حدیث دجال پر قیاس کرنا چاہیے ۔ البتہ ایک صورت غیر واضح رہی وہ یہ کہ ۶۶ تا ۹۰ درجے کے طول بلد پر رہنے والے کس طرح نمازیں پڑھیں ؟ مجلس علمائے دکن نے ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ اتفاق رائے سے تجویز کیا کہ ۴۵ درجہ عرض بلد کے اوقات طلوع و غروب ہی قطب تک کے تمام علاقوں میں سال بھر تک زیر عمل رہیں ، اس وقت بھی جب آفتاب مسلسل کئی دن تک نہ ڈوبے اور اس وقت بھی جب مثلاً ساڑھے تیئیس گھنٹے کا دن اور آدھ گھنٹے کی رات ہو ۔ اس نقطۂ زمین، یعنی ۴۵ درجہ کے انتخاب میں اس واقعے کو مد نظر رکھا ہے کہ عہد صحابہؓ میں مسلمان اس مقام تک پہنچ گئے تھے اور حرکت شمسی ہی کو نماز روزے میں ملحوظ رکھتے تھے ۔ آج بھی خط استوا سے ۴۵ درجہ تک کے علاقوں میں جو مسلمان ہیں انہیں اپنی پرانی عادتوں کو بدلنے کی ضرورت نہیں ۔ رعایت شمالی یورپ اور شمالی امریکہ ، نیز جنوبی چلی اور جنوبی ارجنٹائن کے ایسے علاقوں میں ملے گی جہاں اسلام ہنوز نو وارد ہے ۔ مزید برآں ۴۵ درجہ شمالی اور ۴۵ درجہ جنوبی کے معنی اگرچہ نظریہ کی حد تک نصف کرہ ارض کے ہوتے ہیں، لیکن در اصل اس میں تین چوتھائی سے زیادہ معمور حصہ زمین شامل ہے ۔

دین میں یُسر و عُسر کا مسئلہ : قرآن کریم میں ارشاد باری ہے : يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۲ [البقرة] : ۱۸۵)، یعنی خدا تمہارے لیے سہولت چاہتا ہے ، دشواری نہیں چاہتا ۔ یہ اصول ہر اسلامی حکم میں کارفرما ہے ؛ عہد نبوی کے معاشرے کے لیے بھی اور ہمارے عصر حاضر کے حالات کے لیے بھی ۔ [ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسی اصول کی وضاحت کرتے ان دو مبلغوں کو ، جنھیں ایک قبیلے کی طرف دعوت و تبلیغ کے لیے بھیجا جا رہا تھا ، ارشاد فرمایا : يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا یعنی تم لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا ، دشواری پیدا نہ کرنا ۔ اسی بنا پر اسلامی احکام کی تعمیل و تکمیل کو بقدر استطاعت (۲ [البقرة] : ۲۸۶) سے مشروط فرمایا اور ہر اسلامی حکم میں اہل عذر کے لیے استثنائی احکام خود بیان فرمائے ، مثلاً پانی نہ ملنے کی صورت میں مٹی سے تیمم [رک بآں] کرنے کا حکم ؛ سفر میں

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

قصر صلوٰۃ (۴ [النساء] : ۱۰۲) کا حکم؛ حالت سفر و مرض میں روزے قضا کر لینے کی رخصت (۲ [البقرۃ] : ۱۸۳)؛ حائضہ و نفساء کے لیے نماز کی معافی وغیرہ (نیز رک بہ صلوٰۃ ، روزہ ، حج وغیرہ)] .

اسلام اور مسائل نسواں : دور جاہلی میں عورت کو کمتر درجہ حاصل تھا ۔ معاشرے میں اسے کوئی سماجی اور اقتصادی حقوق حاصل نہ تھے ۔ بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج بھی موجود تھا ۔ عام تصور میں مرد کو تمام معاشرتی و سماجی حقوق حاصل تھے ۔ اسلام نے ان تمام بے ضابطگیوں کی اصلاح کی ؛ چنانچہ بعض استثنائی صورتوں کے سوا ان کو یکساں حقوق و مراعات دیے گئے ۔ جہاں مردوں کو عورتوں پر قوامون (اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (۴ [النساء] : ۳۴) ، قرار دیا، وہاں عورتوں کے بھی مردوں پر واضح حقوق و فرائض مقرر فرمائے : وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲ [البقرۃ] : ۲۲۸)؛ اسلامی احکام و فرائض کی تعمیل میں دونوں کو برابر کا ذمہ دار ٹھیرایا اور افضلیت کا دار و مدار تقوی [رک بآں] پر رکھا، نہ کہ جنسی تقسیم پر (۴۹ [الحجرات] : ۱۳)؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کہ کر خواتین کی مزید حوصلہ افزائی فرمائی : الجنۃُ تحتَ اقدامِ الاُمہات (النسائی : سنن)؛ اسلام میں عورت کی عفت و عصمت کی حفاظت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے ؛ اسی مقصد کے پیش نظر عورتوں اور مردوں کو نگاہ نیچی رکھکر چلنے اور ان کے آزادانہ اختلاط کو سختی سے منع کیا گیا ہے (۲۴ [النور] : ۳۰، ۳۱) ۔ عورت کی عزت و حرمت کو بحال رکھنے کے لیے حجاب [رک بآں] کا حکم نازل ہوا (۲۴ [الاحزاب] : ۶۰)۔ کسی پاکدامن عورت پر جھوٹی تہمت (قذف) لگانے والے کو ۸۰ دروں کی سزا کا مستحق قرار دیا گیا (۲۴ [النور] : ۴) ۔ زنا کے انسداد کے لیے ، غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے اور شادی شدہ کے لیے رجم [رک بآں] حد کے طور پر مقرر کیا (۲۴ [النور] : ۲) ۔ عورت کو ایسا لباس پہننے کا حکم دیا گیا جو اس کے جسمانی حسن و جمال کو ظاہر کرنے کے بجائے اسے اجنبی آنکھوں سے مستور کرتا ہو ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی جو اس قسم کا تنگ یا باریک لباس پہنتی ہیں جس سے ان کی جسمانی آرائش و زیبائش کا اظہار ہوتا ہو ۔

اسلام سے قبل عورت کو حق وراثت سے محروم تصور کیا جاتا تھا۔ اسلام نے پہلی دفعہ اسے وراثت میں حصہ دار بنایا (۴ [النسآء] : ۷، ۱۱ تا ۱۲ ؛ نیز کتب تفسیر بذیل آیات مذکورہ [رک بہ وراثت]) اور عورت کی الگ ملکیت کا تصور قائم کیا تاکہ وہ معاشرے میں باوقار مقام حاصل کر سکے ۔ سب سے اہم اصلاح نکاح کے معاملے میں کی گئی اور وہ یہ کہ مرد کی طرح عورت کو بھی اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ، لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ تعلیم بھی دی کہ وہ والدین کی مرضی سے باہر نہ ہو [رک بہ نکاح] ۔ اسلام سے قبل بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ تھی ۔ لوگ لا تعداد بیویاں اپنے گھروں میں رکھ چھوڑتے تھے (دیکھیے Encyclopaedia Britannica، بذیل مادہ)۔ اسلام نے اس کی ایک خاص تعداد یعنی چار مقرر فرما دی (۴ [النساء] : ۳) ، مگر اس میں یہ شرط رکھی کہ ایسا اسی صورت میں کیا جائے جبکہ مرد اپنی ہر بیوی سے معاملے ، سلوک ، مروت ، احسان اور محبت میں مساوات قائم رکھ سکتا ہو؛ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ایک ہی کافی ہے (۴ [النساء] : ۱۲۹) ۔ گویا تعدد ازواج کو مخصوص حالات اور مخصوص شرائط کی موجودگی میں چار کی تعداد تک محدود کرکے ایک طرف تو عورتوں کو بھی ان کے جائز حق سے محروم نہیں کیا اور دوسری طرف مسلم معاشرے کو پاکبازی کی خوش گوار اور پر سکون زندگی اختیار

marfat.com
Marfat.com

کرنے کے ایک عمدہ طریقے کی تعلیم دی ۔

ازواج مطہرات : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم صرف مردوں ھی کے مبلغ اور معلم نہ تھے، بلکہ آپؐ عورتوں کے بھی محسن اور مربی تھے ۔ عورتوں کو ان کے نازک مسائل کی براہ راست تعلیم دینا نہ صرف نامناسب تھا بلکہ پیکر شرم و حیا صنف نازک کو قطعی طور پر ان کی تعلیم سے باز رکھنے کے مترادف بھی ھو سکتا تھا ۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خصوصی اجازت خداوندی سے متعدد نکاح فرمائے (۳۳ [الاحزاب] : ۵۰) تاکہ عورتیں عورتوں سے بہتر طور پر مسائل سیکھ سکیں ۔ اسی بنا پر تنہا حضرت عائشہؓ کے متعلق منقول ھے کہ ان سے ایک تہائی دین نقل ھوا ھے (تفصیل کے لیے دیکھیے سید سلیمان ندوی : سیرت عائشہ)۔ اس کے علاوہ مختلف قبائل عرب کی اس کے ذریعے تالیف قلب بھی مقصود تھی ۔ اس امر کی مزید تائید اس امر سے بھی ھوتی ھے کہ آپؐ نے اپنی جوانی کے بہترین ایام صرف ایک بیوی یعنی حضرت خدیجہؓ کی رفاقت میں گزار دیے ، جبکہ ۵۰ اور ۵۹ برس کی عمر کے درمیان آپؐ نے زیادہ تر نکاح فرمائے ۔ ظاہر ھے کہ اس میں آپؐ کو دنیاوی فائدوں سے زیادہ دینی فائدے مقصود تھے ؛ کیونکہ آپؐ کا یہ بھی ارشاد ھے : مَالی فی النساء مِن حاجۃٍ (الدّارمی) ، یعنی مجھے عورتوں کی کوئی خواھش نہیں ھے ۔

بہر حال آپؐ نے مختلف اوقات میں گیارہ ازواج مطہرات سے نکاح فرمایا، جن میں سوائے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے باقی تمام بیوہ تھیں ۔ آپؐ کے نکاح میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ نو بیویاں رھیں ۔ تفصیل حسب ذیل ھے :

(۱) حضرت خَدیجۃ الکبریٰؓ بنت خُوَیلد؛ آپؐ نے ۲۵ سال کی عمر میں ان سے نکاح فرمایا ، جبکہ حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال تھی (البلاذری الانساب) ۔ ان کی وفات ۱۰ نبوی ۵۰ عمری (۳ ق ھ/ ۶۱۹ء) میں ھوئی (ابن الجوزی: الوفا باحوال المصطفی، ص ۶۴۶ ، مطبوعہ لاھور ۱۹۷۷ء [نیز رک بآں] ؛ (۲) حضرت سَودہؓ بنت زَمْعَہ ؛ رمضان المبارک ۱۰ نبوی (۵۰ عمری) میں نکاح ھوا ۔ ان کے سال وفات میں مختلف روایات ھیں مثلاً ۲۳ھ اور حضرت عمرؓ بن الخطاب نے نماز جنازہ پڑھائی (البلاذری : انساب الاشراف، ۱ : ۴۰۷)؛ ۵۵ھ (الذھبی: سیر اعلام النبلاء، ۲ : ۱۹۱) [نیز رک بآں] ؛ (۳) حضرت عائشہ صدیقہؓ، ۱۰ نبوی (۵۰ عمری) میں نکاح ھوا اور شوال المکرم ۲ھ میں ان کی رخصتی عمل میں آئی ۔ اس وقت ان کی عمر ۹ سال تھی ۔ ۵۸ھ میں بعمر ۶۶ سال انتقال فرمایا ۔ جنت البقیع میں مدفون ھیں (انساب الاشراف، ۲ : ۴۱۱، جوامع السیرۃ، ۳۳) [نیز رک بآں]؛ (۴) حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ : رمضان المبارک ۳ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نکاح ھوا (انساب الاشراف، ۱ : ۴۲۲ ؛ ابن حجر : فتح الباری، ۹ : ۱۶۲ ببعد) ۔ ۴۵ھ میں ان کا وصال ھوا (انساب، ۱ : ۴۲۷؛ جوامع السیرۃ، ۳۳) ؛ [نیز رک بآں] ؛ (۵) حضرت ام سلمہؓ بنت ابی امیہ ، ۴ھ میں آپؐ سے نکاح ھوا ۔ ۸۴ سال کی عمر ۵۹ھ یا ۶۱ھ میں انتقال فرمایا (انساب، ۱ : ۴۳۲ ؛ جوامع السیرۃ ، ۳۳ ؛ الذھبی ، سیر اعلام النبلاء، ۲ : ۱۴۸)، [نیز رک بآں] ؛ (۶) حضرت زینبؓ بنت جحش، ۵ھ میں نکاح ھوا اور ۵۳ سال کی عمر میں ۲۰ھ میں انتقال فرمایا (کتب مذکورہ) [نیز رک بآں] ؛ (۷) حضرت جویریہؓ بنت الحارث بن ابی ضرار؛ غزوہ مریسیع میں گرفتار ھوکر آئیں ۔ آپؐ نے ۵ھ میں ان کو آزاد فرما کر نکاح کر لیا ۔ ۵۶ھ میں انتقال فرمایا جوامع السیرۃ، ص ۳۵)، [نیز رک بآں] ؛ (۸) حضرت زینبؓ ام المساکین بنت خزیمہ ، ۳ھ میں نکاح ھوا ۔ دو ماہ آپؐ کے نکاح میں رھنے کے بعد ۳۰ سال کی عمر میں وفات پا گئیں (کتاب مذکور ، ص ۳۳)

marfat.com
Marfat.com

[نیز رک باں] ؛ (۹) حضرت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان: ۶ یا ۷ھ میں نکاح ہوا ، ۴۴ھ میں وفات پائی (انساب الاشراف، ۱ : ۴۴۰)، [نیز رک باں] ؛ (۱۰) حضرت میمونہؓ بنت الحارث : ۷ھ میں نکاح ہوا اور ۶۱ھ میں اور بقول بعض ۵۱ھ میں وصال ہوا (انساب الاشراف ۱: ۴۴۶؛ سیر اعلام النبلاء ، ۲ : ۱۷۴؛ جوامع السیرۃ، ص ۳۶)، [نیز رک باں]؛ (۱۱) حضرت صفیہؓ بنت حیی بن اخطب : ۷ھ میں نکاح ہوا ؛ ۵۰ھ میں وفات ہوئی (انساب ، ۱ : ۴۴۴)، [نیز رک باں] ؛ اس کے علاوہ مصری باندی حضرت ماریہ قبطیہؓ بھی ۶ھ میں آپؐ کے حرم میں بطور ام ولد کے آئیں اور ان سے آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ تمام ازواج مطہرات نہایت اعلیٰ درجہ کی عابدہ و زاہدہ اور عالمہ خواتین تھیں ۔ ان میں سے ہر ایک سے متعدد روایات منقول ہیں ۔ سب سے زیادہ احادیث حضرت عائشہؓ سے منقول ہیں (۲۲۱۰ احادیث)؛ ان سے کم حضرت ام سلمہؓ سے (۳۷۸ احادیث) ؛ ان سے کم حضرت میمونہؓ سے (۷۶ احادیث) ؛ پھر حضرت ام حبیبہ سے (۶۵ احادیث) منقول ہیں (ابن حزم : جوامع السیرۃ، ۲۷۵ تا ۳۱۵)- ابن حزم نے ہی حضرت عائشہؓ ، حضرت ام حبیبہؓ ، حضرت ام سلمہؓ ، حضرت حفصہؓ کو اصحاب فتوی فقیہ افراد میں شمار کیا ہے (۳۱۹ تا ۳۲۵)؛ (مزید تفصیلات کےلیے دیکھیے: السہیلی : روض الانف ، ۲ : ۳۶۶ ؛ البلاذری : انساب الاشراف، ۱ : ۳۱۶ تا ۴۵۴ ببعد ؛ الزرقانی : شرح المواہب ، ۳ : ۲۱۶ تا ۲۵۵) .

اولاد و احفاد : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زیادہ تر اولاد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے ہوئی ، البتہ ایک بیٹے کی پیدائش حضرت ماریہ قبطیہؓ (ام ولد) سے ہونا ثابت ہے ۔ تفصیل حسب ذیل ہے : (۱) حضرت قاسم : ۱۱ ق از نبوی میں پیدا ہوئے ۔ حضرت مجاہدؒ تابعی کے نزدیک سات دن اور ابن سعد (الطبقات ، ۱ : ۱۳۱) کے مطابق دو سال تک حیات رہے ۔ آپؐ کی کنیت ابوالقاسم انہیں سے منسوب ہے ؛ (۲) حضرت زینبؓ : تقریباً ۲۳ ق ھ/۶۰۰ء-۶۰۱ء میں پیدا ہوئیں ۔ ان کا نکاح ابوالعاص بن ربیع سے ہوا - ۸ھ میں انتقال فرمایا؛ ان سے دو اولادیں ہوئیں ۔ امامہؓ اور علیؓ، مؤخر الذکر بچپن ہی میں فوت ہوگئے، جبکہ حضرت امامہؓ حد بلوغ کو پہنچیں اور حضرت فاطمہؓ کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں ۔ ان کے بعد حضرت مغیرہؓ نے ان سے نکاح کیا (ابن سعد : الطبقات، ۸ : ۳۱ تا ۳۶) ؛ (۳) حضرت رقیہؓ : حضرت زینبؓ کے بعد پیدا ہوئیں ۔ ان کا نکاح عہد نبوت سے قبل عقبہ بن ابی لہب سے ہوا ، مگر اس نے اپنے باپ ابو لہب [رک باں] کے کہنے پر رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی ؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت عثمانؓ بن عفان [رک باں] سے کر دیا۔ ان سے حضرت عبداللہؓ (بن عثمان) پیدا ہوئے جو دو سال کی عمر میں انتقال کر گئے- رمضان المبارک ۲ھ میں ان کا انتقال ہوا (ابن سعد : الطبقات، ۸ : ۳۶ تا ۳۷) ؛ (۴) حضرت ام کلثومؓ : حضرت رقیہؓ سے چھوٹی اور حضرت فاطمہؓ سے بڑی تھیں ۔ ان کا نکاح آپؐ نے عتبہ بن ابی لہب سے کیا تھا ، مگر اس نے بھی اپنے بھائی کی طرح رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی ۔ آپؐ نے حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد شوال ۳ھ میں ان کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا ۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔ وفات شعبان ۹ھ میں ہوئی (حوالۂ مذکور، ۳۷ ببعد)؛ (۵) حضرت فاطمۃ الزہراءؓ : نبوت سے پانچ سال پہلے (۳۵ عمری) میں پیدا ہوئیں۔ تمام اولاد میں چھوٹی ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سب سے زیادہ پیاری تھیں ۔ ۲ھ میں آپؐ نے ان کا نکاح حضرت علیؓ [رک باں]

marfat.com
Marfat.com

سے کر دیا ۔ ان سے حضرت علیؓ کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں کل پانچ بچے پیدا ہوے : حضرت حسنؓ (م ۴۹ھ)؛ حضرت حسینؓ (ش ۶۱ھ)؛ حضرت محسنؓ؛ حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ۔ حضرت زینبؓ کی پہلی شادی حضرت عبداللہؓ بن جعفر سے اور حضرت ام کلثومؓ کی حضرت عمرفاروقؓ سے ہوئی ، مگر حضرت فاطمہؓ کی نسل صرف حضرت حسنؓ [رک بآں] اور حضرت حسینؓ [رک باں] کے ذریعے دنیا میں باقی رہی (البلاذری : انساب الاشراف ، ۱ : ۴۰۲ تا ۴۰۵)؛ ابن سعد : الطبقات، ۸ : ۱۹ تا ۳۰ ؛ ابن العماد الحنبلی : شذرات، ۱ : بمدد اشاریہ)؛ (۶) حضرت ابراہیمؓ : حضرت ابراہیمؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ام ولد حضرت ماریہؓ قبطیہ کے بطن سے ۸ھ میں پیدا ہوے ۔ ابو سیف اور ام سیف ان کے رضاعی والد اور والدہ تھے ڈیڑھ سال کی عمر پا کر ۸ھ میں فوت ہوگئے (شذرات ، ۱ : ۱۲ تا ۱۳) .

ابن سعد نے مزید دو صاحبزادوں یعنی ، حضرت طیبؓ اور حضرت (عبداللہ) طاہرؓ کے نام بھی گنوائے ہیں جو زمانہ اسلام میں پیدا ہوے اور مکہ مکرمہ ہی میں انتقال فرما گئے۔ (الطبقات ، ۱ : ۱۳۳ تا ۱۳۴)] .

مآخذ : (۱) قرآن کریم ، بمواضع کثیرہ؛ کتب تفسیر : (۲) ابن جریر الطبری (م ۶۷۱) : تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن ، بولاق ۱۳۲۲ء تا ۱۳۳۰ھ؛ (۳) ابن کثیر : تفسیر ، مطبوعہ قاہرہ ؛ (۴) البیضاوی : انوار التنزیل و اسرار التاویل ، مطبوعہ قاہرہ ، ۱۳۵۸ء/۱۹۳۰ء؛ (۵) ابن عباس (م ۹۶۸) : تفسیر، مطبوعۂ بولاق ؛ کتب حدیث : (۶) محمد بن اسماعیل البخاری : الجامع الصحیح، مطبوعہ لائیڈن (بدون تاریخ) (۴ جلدیں) ؛ (۷) مسلم النیسابوری : الصحیح ، قاہرہ ۱۳۳۰ھ؛ (۸) ابوعیسی الترمذی (م ۲۷۹) : الجامع السنن، بولاق ۱۲۹۲ھ ، ۲ جلدیں ؛ نیز شمائل ترمذی ؛ (۹) ابو داؤد : السنن ، دہلی ۱۳۸۳ھ ، ۲ جلدیں ؛ (۱۰) ابن ماجہ : السنن ، طبع محمد فؤاد عبدالباق ، قاہرہ، ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء؛ (۱۱) الدار قطنی : السنن، دہلی ۱۳۱۰ھ؛ (۱۲) النسائی : السنن ، دہلی ۱۸۹۱ء، ۲ جلدیں ؛ (۱۳) الدارمی : الجامع الصحیح المعروف بہ مسند دارمی ، کانپور ۱۲۹۳ھ؛ (۱۴) محمد حمید اللہ : الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدہ، بار سوم ، بیروت ۱۹۶۹ء؛ (۱۵) A. J. Wensinck : المعجم المفہرس لالفاظ الاحادیث النبویہ ، مطبوعہ لائیڈن ۱۹۵۵ء ؛ (۱۶) ہمام بن منبہ : صحیفہ ؛ (۱۷) معمر بن راشد : جامع ؛ (۱۸) عبدالرزاق : مصنف ؛ (۱۰) احمد بن حنبل : مسند ، قاہرہ ۱۳۱۳ھ ، ۶ جلدیں ؛ (۲۰) امام مالک : موطأ، دہلی ۱۲۱۶ھ ؛ (۲۱) الطبرانی : المعجم الصغیر ، دہلی ۱۳۱۱ھ؛ (۲۲) ابن ابی شیبہ : مصنف ؛ کتب سیر و مغازی : (۲۳) ابن اسحٰق : المبدا والمغازی (مخطوطہ ، فرانس و دمشق) ؛ (۲۴) الواقدی : کتاب المغازی ، طبع Marsden Jones ، لندن ۱۹۶۶ء ، ۳ جلدیں ؛ (۲۵) ابن سعد : کتاب الطبقات الکبیر، مطبوعہ بیروت ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء ، ۸ جلدیں ؛ (۲۶) ابن الجوزی : الوفا باحوال المصطفٰی ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء؛ (۲۷) علی بن برہان الدین (م ۹۷۰ھ/۱۰۴۴ء) : انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون ، الشہیر، بسیرۃ الحلبیہ ، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء ؛ (۲۸) احمد بن یحیی بن جابر البلاذری: انساب الاشراف ، مطبوعہ بیت المقدس، ۱۹۳۶ء ، جلد اول؛ (۲۹) القسطلانی : المواہب اللدنیہ بمع الزرقانی : شرح المواہب اللدنیہ ، ۸ جلدیں ، قاہرہ ۱۳۲۸ء ؛ (۳۰) ابن ہشام : السیرۃ النبویہ ، طبع مصطفی السقا ، ابراہیم الانباری و عبدالحفیظ شلبی ، قاہرہ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء، ۴ جلدیں ، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۵ھ ؛ (۳۱) احمد ذینی دحلان : السیرۃ المحمدیہ ؛ (۳۲) کرامت علی : السیرۃ المحمدیہ والطریقۃ الاحمدیہ، مطبوعہ بمبئی ۱۲۷۰ھ: (۳۳) المقریزی : امتاع الاسماع ، ۱ جلد ، مطبوعہ (باق مخطوطہ) ؛ (۳۴) ابن حزم : جوامع السیرۃ ، مطبوعہ قاہرہ

marfat.com
Marfat.com

۱۳۲۵ھ؛ (۳۵) محمد بن یوسف الشامی: السیرۃ الشامیہ؛ (۳۶) الازرقی: اخبار مکہ، ۱۸۵۸ء طبع باعتناء Wüstenfeld؛ (۳۷) السمہودی: خلاصۃ الوفا فی اخبار دار المصطفی، مطبوعہ بولاق ۱۲۸۵ھ؛ کتب تاریخ: (۳۸) الطبری: تاریخ الامم والملوک، مطبوعہ لائیڈن ۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۱ء؛ (۳۹) ابن کثیر: البدایہ والنہایہ؛ (۴۰) الیعقوبی: تاریخ، مطبوعہ بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء؛ (۴۱) ابن الاثیر: تاریخ الکامل، لائیڈن ۱۸۵۱ء تا ۱۸۷۱ء؛ (۴۲) الذہبی: دول الاسلام، حیدر آباد ۱۳۳۳ھ، ۲ مجلدات؛ عام کتب معارف: (۴۳) ابن قتیبہ الدینوری: عیون الاخبار، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۰۷ء؛ (۴۴) المسعودی: التنبیہ والاشراف، طبع ڈی خویہ، لائیڈن ۱۸۹۳ء؛ (۴۵) عبدالحی الکتانی: نظام الحکومۃ النبویہ، المسمی بالترتیب الاداریہ والعمالات والصناعات والمتاجر والحالۃ العلمیہ، التی کانت علی عہدالمدینۃ الاسلامیہ فی المدینۃ المنورۃ العلیہ، مطبوعہ فاس، ۲ جلدیں؛ (۴۶) السرخسی: شرح السیرالکبیر، مطبوعہ حیدر آباد دکن، ۴ جلدیں؛ (۴۶) ابن العماد الحنبلی: شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۰ھ، جلد اول؛ کتب اردو: (۴۷) شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبی، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۳۷۱ھ، ۶ جلدیں؛ (۴۸) قاضی سلیمان سلمان منصور پوری: رحمۃ للعالمین، ۳ جلدیں، مطبوعہ لاہور، تاریخ ندارد؛ (۴۹) محمد حمید اللہ: عہد نبوی کا نظام حکمرانی، حیدرآباد دکن؛ (۵۰) وہی مصنف: عہد نبوی کے میدان جنگ، مطبوعہ با تصویر، حیدر آباد دکن؛ (۵۱) محمد ادریس کاندھلوی: سیرۃ المصطفی، مطبوعہ لاہور ۱۳۸۱ھ؛ یورپین زبانوں میں موجودہ صدی کے مجلات میں شائع شدہ مقالوں کے لیے: (۵۲) Pearson: *Index Islāmicus*؛ عام علمی کتابوں کے لیے: (۵۳) Pfanmüller: *Handbuch der Islam-Literatur*؛ (۵۴) Chauvin: *Bibliographie des ouvrages arabes ou relatifs aux Arabes*؛ (۵۵) Sauvaget: *Introduction a l'histoire de l'Orient musulman*، (متعلقہ فصلیں)؛ یورپی مصنفین کی قدیم کتب سیرت میں اس قدر ایجاد و اختراع اور اتنی گالی گلوچ ہے کہ ان پر جدید مؤلفین کو شرم آتی ہے؛ (۵۶) William Muir: *Life of Muhammad*؛ (۵۷) W. Montgomery Watt: *Muhammad at Mecca*؛ (۵۸) وہی مصنف: *Muhammad at Medina*؛ (۵۹) وہی مصنف: *Muhammad Prophet and Statesman*؛ (۶۰) M. Gaudefroy-Demombynes: *Mahomet*، پیرس ۱۹۵۷ء؛ (۶۱) Muhammad Hamidullah: *Muhammad Rasulullah*، حیدرآباد دکن، ۱۹۷۴ء، کراچی ۱۹۷۹ء؛ (۶۲) وہی مصنف: *Le prophete de l'Islam (sa vie et son oeuvre)*، پیرس ۱۹۵۹ء؛ (۶۳) Alois Sprenger: *Das Leben und die Lehre des Mohammad*، ۳ جلدیں، ۱۸۶۱ء؛ (۶۴) G. Weil: *Muhammad der Prophet*، ۱۸۴۳ء؛ (۶۵) Franz Buhl: *Das Leben Muhammeds*، جرمن ترجمہ از Shaeder، ۱۹۳۰ء؛ (۶۶) J. Wellhausen: *Skizzen und vorarbeiten, Ein Gemeinwesen ohne Obrigkeit*؛ (۶۷) L. Caetani: *Annali de l'Islam*، میلان ۱۹۰۵ء تا ۱۹۲۶ء۔

(محمد حمید اللہ [و ادارہ])

تعلیقات: شمائل و اخلاق نبوی:

⊗ (الف) حلیۂ اقدس: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا جسم اطہر متناسب، جوڑ بند مضبوط، بدن پُرگوشت اور کسا ہوا اور رنگ مبارک سرخی مائل سفید تھا (الترمذی: شمائل، عن انسؓ)۔ آپؐ نہ تو بہت طویل القامت (الطویل البائن) تھے اور نہ چھوٹے قد کے (القصیر المتردد)۔ آپؐ کا جسم مبارک میانہ تھا۔ آپؐ کے قدرے بھاری سر (ضخم الراس) پر گھنے بال، جو بعض اوقات کانوں کی لوؤں کو چھو رہے ہوتے (حوالۂ مذکور عن براء بن عازب)، نہ تو بہت گھنگھریالے تھے نہ بہت سیدھے، البتہ ایک خوشنما اور ہلکا سا خم ان میں دکھائی دیتا

marfat.com
Marfat.com

تھا (ابن الجوزی : الوفا ، ص ۳۹۳) - چہرۂ مبارک آفتابی ، پر شکوہ اور درخشاں و تاباں تھا - پیشانی کشادہ اور پر نور تھی ، جس میں سے ایک نور ابھرتا دکھائی دیتا (کتاب مذکور ، ص ۳۹۱ ببعد) - ابرو دراز ، سیاہ اور بیچ میں ذرا سے غیر پیوستہ اور ان کے درمیان ایک رگ کا معمولی سا ابھار تھا ، جو غصے کی حالت میں مزید نمایاں ہو جاتا تھا (شمائل عن ہند بن ہالہ) - آنکھیں سیاہ مگر سرمئی مائل (اکحل و لیس با کحل) ، پتلیاں سیاہ کالی اور آنکھوں کی سفیدی میں ہلکی سی سرخی کی آمیزش تھی (حوالۂ مذکور) ، پلکیں سیاہ اور دراز ، گویا کہ ایک دوسری کو چھو رہی ہوں (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۴۱۰ تا ۴۱۱ ببعد) - ناک ستواں اور بڑی تھی اور رخسار متوازی (سھل الخدین) ، ریش مبارک گھنی اور بہت دیدہ زیب تھی - دہن مبارک کشادہ اور سامنے کے دانتوں میں ذرا سا فاصلہ نمایاں تھا (ابن الجوزی : الوفا ، ص ۳۹۰) - کان حسین و جمیل (تام الاذنین) اور شانے پُرگوشت اور چوڑے تھے - گردن مبارک قدرے لمبی تھی - سینہ کشادہ تھا - کلائیوں ، بازوؤں اور بالائی سینے پر بالوں کی کثرت تھی ، مگر پیٹ اور سینے کا نچلا حصہ بالوں سے خالی تھا ، البتہ سینے سے ناف تک بالوں کی ایک پتلی اور لمبی دھار (اجرد طویل السردہ) تھی - دونوں شانوں کے مابین "مہر نبوت" تھی ، جو بالوں اور گوشت سے بنے ہوئے ابھار (کبوتر کے انڈے کے برابر سرخ غدہ) کی شکل میں تھی (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۴۲۵ ببعد) - ہتھیلیاں چوڑی اور پُرگوشت تھیں - اسی طرح کلائیاں اور انگلیاں بھی دراز اور پر گوشت تھیں کہ مصافحہ کرنے والوں کو اتنی نزاکت اور نفاست کا احساس ہوتا کہ حریر و دیباج کا لمس بھی اس کے سامنے بے معنی تھا - (حوالۂ مذکور ، ۱ : ۴۱۳ عن انس رض) - بطن مبارک کسا ہوا اور سینے کے مساوی تھا ، (گویا کاغذوں کی تہ جما دی گئی ہو : (ابن الجوزی : الوفا ، ص ۳۹۷) - پنڈلیاں لانبی اور پُرگوشت ، پاؤں پُرگوشت اور مضبوط اور تلوے درمیان سے خالی تھے (کہ پانی نیچے سے نکل سکے) - مجموعی طور پر آپ ؐ کی شخصیت میں جلال و جمال کا ایسا حسین امتزاج پایا جاتا تھا کہ دیکھنے والے پر ہیبت طاری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں آپ ؐ کے لیے انتہائی محبت بھی پیدا ہو جاتی (شمائل عن علی رض) - آپ ؐ کے پسینے سے عطر جیسی مہک آتی ؛ جسم مبارک سے ہر وقت سرور انگیز خوشبو محسوس کی جاتی (الوفا ، ص ۳۹۱ ، عن انس رض) - آپ کی ہنسی کبھی مسکراہٹ سے آگے نہیں بڑھی جس میں سامنے کے دانت نمایاں ہو جاتے - چہرۂ مبارک غصے میں تمتما اٹھتا کہ اس پر نگاہ کا ٹھیرنا مشکل ہو جاتا - چہرۂ مبارک پر پسینے کے قطرے موتی کی طرح چمکتے (البخاری ، ۳ : ۱۰۸ ، المغازی ، باب ۳۴ ، واقعۂ افک) - آپ ؐ کن انکھیوں سے کسی کی طرف نہ دیکھتے ؛ ہمیشہ پورا چہرہ گھما کر نظر ڈالتے ؛ کسی سے ناراض ہوتے تو اس سے رخ پھیر لیتے - آپ ؐ ہمیشہ سلام اور مصافحہ کرنے میں پہل کرتے اور ہاتھ کو اس وقت تک دوسرے کے ہاتھ میں رہنے دیتے جب تک دوسرا خود ہاتھ نہ چھڑا لیتا (الترمذی : شمائل) .

گفتگو : آپ ؐ کی زبان نہایت شیریں اور باوقار تھی - ٹھیر ٹھیر کر گفتگو فرماتے کہ مخاطب الفاظ گن سکتا تھا - جس بات پر خصوصی زور دینا ہوتا اسے کئی بار دہراتے - آواز اتنی بلند تھی کہ حضرت ام ہانی رض کے بیان کے مطابق ، ان کے گھر کے صحن میں صاف سنائی دیتی تھی (ابن ماجہ : سنن ، باب ما جاء فی صلوۃ اللیل) - اکثر متفکر رہتے - بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے - گفتگو کے دوران میں اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ اٹھا کر اشارہ فرماتے - تعجب کا اظہار کرنا ہوتا تو ہاتھ پلٹ دیتے

marfat.com
Marfat.com

(الترمذی : شمائل، عن هند بن ابی هاله) - کلام کو بے جا طول دینے سے گریز فرماتے (ابن سعد : الطبقات، ۲ : ۳۷۵).

چال : آپ قدم اٹھا اٹھا کر یوں چلتے گویا بلندی سے اتر رہے ہوں - آپ کی رفتار نہ تو کسی عاجز کی طرح ہوتی اور نہ کسی سست شخص کے مانند بلکہ ایسی تیز رفتاری سے قدم اٹھاتے کہ صحابہؓ بڑے تکلف سے آپ کو مل سکتے تھے (ابن سعد، ۲ : ۳۸۹) - دوران سفر میں آپ ادھر ادھر توجہ نہ فرماتے، خواہ آپ کا کپڑا ہی کسی چیز میں کیوں نہ الجھ جاتا.

لباس : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب کوئی نیا کپڑا زیب تن فرماتے، تو اس کپڑے کا نام لیتے اور پھر فرماتے : اللھم لک الحمد کما کسوتنیه اسألک خیره و خیر ما صنع له و اعوذ بک من شره و شرما صنع له (ابوداود : السنن، ۴ : ۳۰۹، حدیث ۴۰۲۰) - کپڑوں میں عموماً آپ کو سفید رنگ کا کپڑا زیادہ پسند تھا (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۴۴۹) اور آپ فرمایا کرتے تھے : علیکم بالبیاض من الثیاب، فلیلبسها احیاؤکم و کفنوا فیها موتاکم (ابو داود، ۴ : ۳۳۲، حدیث ۴۰۶۱)، یعنی سفید رنگ کے کپڑوں کو لازم پکڑو، اسی لباس کو زندہ پہنیں اور اسی لباس میں مردے کو کفنایا جائے؛ ایک دوسری روایت میں آپ نے اسے خیر اللباس قرار دیا (الطبقات، ۱ : ۴۴۹)، تاہم آپ نے بعض موقعوں پر سرخ رنگ کے (غالباً دھاری دار) (انوار محمدی، شرح شمائل ترمذی، ص ۸۰)، نیز زعفران اور ورس سے رنگے ہوئے زرد رنگ کے کپڑے بھی ملبوس فرمائے ہیں (ابن سعد : الطبقات، ۴۵۰ تا ۴۵۲).

آپ کو عموماً لباس میں کسی قسم کا تکلف پسند نہ تھا۔ اکثر آپ کا لباس چادر، قمیض اور تہبند تھا - آپ کی چادر (حبرة، جو آپ کو بہت پسند تھی) لمبائی میں چار ہاتھ (اذرع) اور چوڑائی میں دو ہاتھ اور ایک بالشت ہوتی تھی- چادروں میں آپ کو یمنی چادر بہت پسند تھی، جو سرخ اور خط دار اور دہ سوت یا کتان کی بنی ہوتی تھی (علی جونپوری : شرح شمائل ترمذی، ص ۱۷۹) - آپ کو قمیض بہت پسند تھی - آپ کی کتان سے بنی ہوئی قمیض کی آستینیں کلائی کے جوڑ تک ہوتی تھیں، تاہم لمبائی زیادہ نہیں ہوتی تھی (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۴۵۸)؛ ایک دوسری روایت کے مطابق آپ کی قمیض ٹخنوں سے اوپر اور آستین ہاتھ کی انگلیوں تک ہوتی تھی (ابن الجوزی : الوفا، ۲ : ۵۶۳) - آپ کا ازار مبارک اگلی جانب سے نیچے اور پچھلی طرف سے کسی قدر اونچا اور نصف پنڈلی تک ہوتا تھا (ابن سعد، ۱ : ۴۵۹؛ الوفا، ۵۶۵).

آپ عموماً سیاہ رنگ کا عمامہ زیب سر فرماتے تھے - فتح مکہ کے دن بھی عمامہ سیاہ رنگ کا تھا (الوفا، ص ۵۶۷) - شملہ بعض اوقات کندھے پر اور بعض اوقات دونوں کندھوں کے درمیان ڈال لیتے تھے- کبھی پگڑی کو ٹھوڑی کے نیچے لا کر باندھ لیتے تھے- عمامہ کے نیچے سفید شامی ٹوپی کا استعمال بھی معمول تھا - فرمایا کرتے تھے : "ہم میں اور مشرکین میں یہی فرق ہے کہ ہم ٹوپی پر عمامہ باندھتے ہیں" (ابو داؤد : السنن، ۴ : ۳۴۱، حدیث ۴۰۷۸) - آپ سفر میں ایسی ٹوپی (قلنسوہ) پہنتے جو کانوں کو بھی ڈھانپ لیتی تھی (الوفا، ص ۵۶۷ و ۵۶۸).

آپ نو موزے استعمال کرنے کی عموماً عادت نہ تھی، مگر نجاشی نے (غالباً چرمی) موزے بھیجے تو استعمال فرمائے (ابن الجوزی : الوفا، ص ۵۷۱)- اسی طرح آپ نے ان موزوں کو بھی پہنا جو حضرت دحیہ الکلبیؓ نے ھدیۃً پیش کیے تھے (الترمذی، ۴ : ۲۴۰، حدیث ۱۷۶۹) - بعض اوقات آپ شامی عبا بھی ملبوس فرماتے تھے، جس کی آستین تنگ ہوتی تو آپ

marfat.com
Marfat.com

نیچے سے بازو نکال کر دھویا کرتے تھے (ابن الجوزی، ص ۵۶۳؛ الترمذی، ۴ : ۲۴۰؛ جہاں جبۃ رومیۃ کا ذکر ہے)۔ اس کے علاوہ نوشیروانی قبا بھی استعمال فرمائی جس کی جیب اور آستینوں پر دیبا کی سنجاف تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سوت اور کتان دونوں سے بنے ہوئے کپڑے استعمال کیے (ابن سعد : الطبقات، ۱/۲ : ۱۴۵۳)۔ آپ کے نعلین چپل سے مشابہ تھے، مگر ان میں دو تسمے لگے ہوئے تھے (ابن الجوزی، ص ۵۸۱)۔ آپ کا بچھونا چمڑے کا بنا ہوا تھا جس میں خشک گھاس بھری ہوئی تھی۔ چارپائی بان کی تھی، جس سے اکثر جسم پر نشانات پڑ جاتے۔ کبھی کبھار کھجور کی چٹائی پر بھی لیٹتے تھے۔ ایک رات حضرت عائشہؓ نے گدے کو نرم کرنے کے لیے اس کی چار تہیں بنا دیں، مگر آپ نے اس کو دوبارہ سابقہ حالت پر لوٹانے کا حکم دیا (الطبقات، ۱ : ۴۶۴، ۴۶۵)۔ ٹیک لگانے کے لیے تکیہ بھی استعمال فرماتے تھے، جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوتے تھے۔ آپ گھر میں نماز چھوٹی چٹائی پر پڑھتے تھے۔

(ب) معمولات نبوی : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معمولات و مشاغل مبارکہ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ آپ کی حیات طیبہ ہر قسم کی بے اعتدالیوں سے مبرا اور پاک تھی۔ معمولات میں ایک توازن اور تسلسل پایا جاتا تھا، البتہ موقع و محل کی مناسبت سے ان میں خفیف سی زمانی و مکانی تبدیلیاں رونما ہو جاتی تھیں۔

۱۔ روزمرہ کے معمولات : آپ عموماً فجر کی نماز پڑھ کر اپنی جائے نماز (مصلّٰی) پر (خاموشی کے ساتھ) آلتی پالتی مارے بیٹھے رہتے۔ یہاں تک کہ سورج نکل آتا۔ اس کے بعد صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہو جاتے اور اپنی پرانی، خاص طور پر عہد جاہلی کی، باتیں یاد کر کر کے ہنستے، مگر آپ صرف تبسم فرماتے (مسلم، ۴ : ۱۸۱۰، حدیث ۲۳۲۲؛ ابو داود، ۵ : ۱۷۸، حدیث ۴۸۵۰؛ النسائی، حدیث ۱۳۵۸)۔ آپ کا ارشاد تھا کہ مجھے اس قوم کے ساتھ جو ذکر الٰہی میں مصروف ہو، نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک اور نماز عصر کے بعد غروب آفتاب تک بیٹھنا اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں اولاد اسمٰعیل میں کے چار غلام آزاد کروں (ابو داود، ۴ : ۷۴، حدیث ۳۶۶۷)۔ ایک دوسری روایت کے مطابق آپ صبح تک صحابہ کو بنی اسرائیل کے حالات بتایا کرتے تھے (حوالۂ مذکور، ص ۷۰، حدیث ۳۶۶۳)۔ اسی مجلس میں اگر کسی نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو بیان کرتا اور آپ خود یا اکابر صحابہؓ میں سے کوئی ایک (مثلاً حضرت ابوبکرؓ) اس کی تعبیر (تاویل) بیان کرتے (مسلم، ۴ : ۱۷۷۷ تا ۱۷۷۹، حدیث ۲۲۶۹)۔ آپ حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ فرماتے : "تم میں سے جس کسی نے کوئی خواب دیکھا ہو وہ مجھے بتائے، میں اس کی تعبیر بیان کروں گا (حوالہ مذکور؛ البخاری، ۴ : ۳۶۳)۔ اسی بنا پر امام البخاری نے کتاب التعبیر میں ایک باب بعنوان "تعبیر الرؤیا بعد صلوٰۃ الصبح" باندھا ہے۔ انھیں مجالس میں آپ اپنے خواب بھی بیان فرماتے (دیکھیے البخاری، ۴ : ۳۶۳ تا ۳۶۵)۔ پھر آپ صلوٰۃ الضحٰی ادا فرماتے، جو عموماً چار تا آٹھ رکعات پر مشتمل ہوتی تھی۔ حضرت عائشہؓ کے بقول اگر سفر سے واپسی ہوتی تو یہ نماز گھر میں ادا فرماتے (مسلم، ۱ : ۴۹۶، حدیث ۷۱۷ تا ۷۲۰)۔ فتح مکہ کے روز آپ نے یہ آٹھ نوافل حضرت ام ھانیؓ کے گھر میں ادا فرمائے (حوالۂ مذکور)۔ ان نوافل سے قبل اور بعد میں تسبیح کا معمول نہ تھا (مسلم، ۱ : ۴۹۸، حدیث ۳۳۶)۔

بعد ازاں آپ گھر تشریف لے آتے اور پوچھتے کہ گھر میں کھانے کو کچھ ہے؟ اگر بتایا

marfat.com
Marfat.com

جاتا کہ گھر میں برکت ہے - تو آپؐ روزے کی نیت فرما لیتے (مسلم ، ۲ : ۸۰۸ ، حدیث ۱۱۵۴) اور اگر کچھ موجود ہوتا تو اسے تناول فرما لیتے (حوالۂ مذکور) - پھر دن بھر اپنے گھر کے کام کاج میں مشغول رہتے اور جب نماز کا وقت ہوتا تو نماز کے لیے متوجہ ہو جاتے (البخاری ، ۴ : ۱۲۲) - دوپہر کے وقت استراحت (قیلولہ) فرماتے - بعض اوقات آپؐ حضرت ام سُلَیم رض کے گھر تشریف لاتے اور قیلولہ فرماتے (مسلم، ۴: ۱۸۱۷؛ حدیث ۲۳۳۶) - حضرت ام سلیم رض آپؐ کے لیے چمڑے کا بستر بچھا دیتیں، جس پر آپؐ کے جسم اطہر کے پسینے کے قطرے جمع ہو جاتے ، پھر ان سے عطر بناتیں جو بہت پسند کیا جاتا تھا (حوالۂ مذکور) - آپؐ کا یہ معمول سفر میں بھی جاری رہتا (مسلم ، ۲ : ۸۵۳).

نماز عصر کے بعد باری باری تمام ازواج سے مختصر ملاقات اور مزاج پرسی کے لیے تشریف لے جاتے - اس موقع پر بعض ازواج کسی مشروب سے آپؐ کی تواضع کرتیں مثلاً حضرت زینب رض بنت جحش اس موقع پر آپؐ کو شہد پیش فرماتی تھیں ، جسے آپؐ بڑے شوق سے نوش فرماتے (البخاری ، ۳ : ۳۵۸) - ان مختصر سی ملاقاتوں کے بعد آپؐ اس زوجۂ مطہرہ کے پاس تشریف لے جاتے ، جس کے ہاں آپؐ کی باری ہوتی تھی - عموماً ہر زوجہ کی نو ایام کے بعد باری آتی تھی (مسلم ، ۲ : ۱۰۸۴ ، حدیث ۱۴۶۲ ، نیز حدیث ۱۴۶۳ ، جہاں یہ مذکور ہے کہ حضرت سَودہ رض بنت زَمعہ نے بعد ازاں اپنی باری حضرت عائشہ صدیقہ رض کو دے دی تھی) - یہاں دیگر ازواج مطہرات بھی جمع ہو جاتی تھیں اور رات گئے تک یہ مجلس جاری رہتی (مسلم ، ۲ : ۱۰۸۴، حدیث ۱۰۶۲) - یہاں کبھی کبھار بعض ازواج کے درمیان معمولی تکرار بھی ہو جاتی تھی ، جو ایک فطری امر تھا (حوالہ مذکور) - بعض اوقات آپؐ کوئی دلچسپ واقعہ بھی سناتے (ابن الجوزی ، ۲ : ۶۲۳) - عشا کی نماز کے بعد (جو اکثر قدرے تاخیر سے پڑھنے کا معمول تھا) دیگر ازواج اپنے اپنے حجروں میں چلی جاتیں اور آپؐ نماز سے فراغت کے بعد واپس تشریف لا کر سو رہتے - عموماً عشا کی نماز سے پہلے سونا (مگر امام بخاری [۱ : ۱۵۲] نے نماز کے انتظار میں سونے کو مستثنٰی کیا ہے) اور نماز کے بعد گفتگو کرنا آپؐ کو ناپسند تھا (البخاری، ۱: ۱۵۲، ۱۵۳).

سوتے وقت آپؐ وضو ضرور فرماتے تھے (ابن الجوزی، ۲ : ۶۲۴) اور حضرت عائشہ رض کے بقول قضاے حاجت کے بعد ہر مرتبہ استنجا اور وضو کرنا بھی آپؐ کا معمول تھا (ابو داوٗد ، ۱ : ۱۵۱، حدیث ۲۲۲) - سونے سے قبل وضو کے لیے پانی اور مسواک (ابو داوٗد ، ۱ : ۴۷، حدیث ۵۶) اور زندگی کے آخری دنوں میں لکڑی کا پیالہ آپؐ کے پلنگ کے پاس (یا نیچے) رکھ دیے جاتے (کتاب مذکور ، ۱ : ۲۸ ، حدیث ۲۴)- سونے سے پہلے آپؐ دونوں آنکھوں میں تین تین سلائی سرمہ بھی ڈالتے تھے (ابن الجوزی ، ۲ : ۶۲۴)- ابن سعد کے مطابق پانچ اشیا سفر و حضر میں ہمیشہ آپؐ کے ہمراہ ہوتیں : کنگھی ، شیشہ ، تیل ، مسواک اور سرمہ (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۴۸۴)- سونے سے قبل مُسبحات [رک باں] تلاوت فرماتے اور دوسروں کی ترغیب کے لیے فرماتے کہ ان میں ایک ایسی آیت ہے جو ہزار آیات سے افضل ہے - (ابو داوٗد ، ۵ : ۳۰۴ ، حدیث ۵۰۵۸ ؛ الترمذی ، ۵ : ۱۸۱ ، حدیث ۲۹۲۱) - ایک دوسری روایت میں سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الزمر کے پڑھنے کی صراحت ہے (الترمذی، ۵: ۱۸۱، عدد ۲۹۲۰) - ان کے علاوہ سورۂ اخلاص اور معوذتین کو پڑھ کر ہاتھوں پر پھونکتے اور پھر تمام بدن پر ہاتھ پھیرتے تھے (الترمذی ، ۵ : ۴۷۳ تا ۴۷۴ ، حدیث ۳۴۰۲ تا ۳۴۰۳ ؛ البخاری ، ۴ : ۱۸۹ وغیرہ) - ایک صحابی

marfat.com
Marfat.com

کو آپؐ نے سونے سے قبل سورۃ الکافرون پڑھنے کی بھی ہدایت فرمائی (ابو داود، ۵ : ۳۰۲، حدیث ۵۰۵۵)۔ پھر آپؐ داہنی کروٹ پر، دائیں رخسار کے نیچے ایک ہاتھ رکھ کر اور قبلہ رو ہو کر بستر پر لیٹ جاتے اور یہ دعا پڑھتے تھے: اللّٰھم باسمک اموت و احیا (البخاری، ۴ : ۱۸۸)۔ بعض اوقات یہ دعا پڑھتے: اللھم انی اسلمت نفسی الیک و وجھت وجھی الیک و فوضت امری الیک، الجأت ظھری الیک رغبة و رھبة الیک لا ملجأ ولا منجأ منک الا الیک؛ اٰمنت بکتابک الذی انزلت و بنیک الذی ارسلت (البخاری، ۴ : ۱۸۸؛ مسلم، ۴ : ۲۰۸۱، حدیث ۲۷۱۰، و بعد؛ ابو داود، ۵ : ۲۹۹، حدیث ۵۰۴۶)۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ سونے سے قبل جو شخص یہ دعا پڑھے اور پھر رات کو مر جائے تو وہ فطرت اسلام پر مرے گا (حوالہ مذکور)۔ حضرت حفصہؓ کے مطابق آپؐ یہ دعا بھی تین مرتبہ پڑھتے تھے: اللّٰھم قنی عذابک یوم تبعث عبادک (ابو داود، ۵ : ۲۹۸، حدیث ۵۰۴۵)۔ حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ بستر پر لیٹ کر آپؐ یہ دعا بھی پڑھتے تھے: اللّٰھم رب السموات و رب کل شیءٍ خالق الحب والنوی منزل التوراة والانجیل والفرقان، اعوذبک من شر کل ذی شر، انت اٰخذ بناصیته انت الاول فلیس قبلک شیءٌ و انت الآخر فلیس بعدک شیء و انت الظاھر فلیس فوقک شیء، و انت الباطن فلیس دونک شیء، اقض عنا الدین و اغننا من الفقر (مسلم، ۴ : ۲۰۸۴، حدیث ۲۷۱۳؛ الترمذی، ۵ : ۴۷۲، حدیث ۳۴۰۰)۔ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ اس موقع پر یہ دعا پڑھتے تھے: اللّٰھم انی اعوذ بوجھک الکریم و کلماتک التامة من شرما انت اٰخذ بناصیته اللّٰھم انت تکشف المغرم والمأثم اللھم لایھزم جندک ولا یخلف وعدک ولا ینفع ذا الجد منک الجد، سبحانک و بحمدک (ابو داود، ۵ : ۳۰۲، حدیث ۵۰۵۲)۔ آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمة الزھراءؓ کو سونے سے پہلے ۳۳، ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ اور الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ یہ گنتی میں تو سو ہیں مگر میزان عمل میں پورے ہزار ہیں (البخاری ۴ : ۱۸۹؛ مسلم، ۴ : ۱۰۹۱، حدیث، ۲۷۲۷؛ ابو داود، ۵ : ۳۰۶ تا ۳۰۷، حدیث ۵۰۶۲ و ۵۰۶۳)۔

جب آپؐ نیند سے بیدار ہوتے تو فرماتے: الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیه النشور (البخاری، ۴ : ۱۸۸) اور حضرت عائشہؓ کے مطابق دس مرتبہ تکبیر، دس مرتبہ تحمید، دس مرتبہ تسبیح، دس مرتبہ تہلیل اور دس مرتبہ استغفار پڑھتے اور پھر فرماتے: اللّٰھم اغفرلی و اھدنی و ارزقنی و عافنی (ابو داود، ۱ : ۳۸۷، حدیث ۷۶۶)؛ اسی موقع پر یہ دعا بھی پڑھتے: لا الٰه الا انت سبحانک اللّٰھم استغفرک لذنبی و اسألک رحمتک، اللھم زدنی علما و لا تزغ قلبی بعد از ھدیتنی و ھب لی من لدنک رحمة انک انت الوھاب (ابوداود، ۵ : ۳۰۶، حدیث ۵۰۶۱)۔ اگر اتفاقاً رات کو آنکھ کھل جائے تو یہ دعا پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے: لا الٰه الا اللہ وحدہٗ لا شریک له له الملک و ھو علی کل شیء قدیر، سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰه الاّ اللہ و اللہ اکبر ولاحول ولا قوة الا باللہ، رب اغفرلی۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ اس کے بعد اگر کوئی دعا مانگی جائے تو ضرور مقبول ہو اور اگر ارادہ کرکے اٹھے اور وضو کرکے نماز پڑھے تو وہ بھی عنداللہ مقبول ہو (الترمذی، ۵ : ۴۸۰، حدیث ۳۴۱۴)۔ نماز تہجد کی تیاری کرتے ہوئے سورۂ اٰل عمرٰن کی آخری دس آیات تلاوت فرماتے (ابن الجوزی، الوفا، ۲ : ۶۲۶)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس موقع کی یہ دعا نقل فرماتے ہیں: اللھم انت نور السمٰوٰت و الارض و من فیھن ولک الحمد، انت قیم السمٰوٰت والارض ومن فیھن ولک الحمد، انت الحق و وعدک حق

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

و قولک حق و لقاؤک حق و الجنۃ حق و النار حق و الساعۃ حق و محمد حق اللّٰھم لک اسلمتُ و علیک توکّلتُ و بک اٰمنتُ و الیک انبتُ و بک خاصمتُ و الیک حاکمتُ فاغفرلی ما قدمتُ و ما اخرتُ و ما اسررتُ و ما اعلنتُ انتَ المقدم و انتَ المؤخر لا الٰہ الا انتَ ولا الٰہ غیرُک (البخاری ۱ : ۲۸۴ و ۴ : ۱۸۹) - پھر آپؐ قضائے حاجت سے فارغ ہو کر اچھی طرح مسواک فرماتے (ابو داؤد ، ۱ : ۴۷ ، حدیث ۵۵) - پھر وضو فرماتے اور بشمولؐ وتر گیارہ رکعات ادا فرماتے (البخاری ، ۱ : ۲۸۸ و ۴ : ۱۸۸) - اس نماز کو آپؐ نے تمام زندگی کامل پابندی وقت کے ساتھ ادا فرمایا اور سوائے ایک یا دو راتوں کے جبکہ آپؐ کی طبیعت ناساز تھی ، آپؐ نے اس نماز کو ترک نہیں فرمایا (البخاری ، ۱ : ۲۸۴ ، ۲۸۵) - اس نماز کے اہتمام کا یہ عالم تھا کہ آپؐ اپنے متعلقین کو بھی اس نماز کے لیے جگاتے تھے (کتاب مذکور ، ۱ : ۲۸۵) اس نماز میں آپؐ اتنا طویل قیام فرماتے کہ آپؐ کے پائے مبارک سوج جاتے (کتاب مذکور، ۱: ۲۸۶)- حضرت حذیفہؓ کے مطابق آپؐ نے ایک مرتبہ ایک رکعت میں سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران اور سورۃ النساء تلاوت فرمائی (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۲، ۵۰۳) - ایک شب آپؐ نے سبع طوال تلاوت فرمائیں (حوالۂ مذکور)- دوران تلاوت ہر تسبیح والی آیت پر آپؐ تسبیح فرماتے ، ہر سوال والی آیت پر اللہ تعالٰی سے سوال فرماتے ، ہر پناہ والی آیت پر خدا تعالٰی سے پناہ مانگتے (حوالہ مذکور)- ایک شب آپؐ نے پوری رات سورۃ المائدہ کی یہ آیت پڑھتے ہوئے گزار دی : اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۸) - رمضان المبارک میں شب بیداری کا یہ اہتمام اور زیادہ بڑھ جاتا اور آپؐ لمبی لمبی نمازیں ادا فرماتے تھے (البخاری ، ۱ : ۲۹۰).

بعض اوقات وتروں سے قبل (البخاری ، ۱ : ۲۹۰) اور بعض اوقات ہر دو رکعتوں کے بعد قلیل سے وقفے کے لیے سو بھی جاتے اور پھر اٹھ کر وضو فرماتے اور بقیہ نماز پوری فرماتے تھے (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۱ تا ۵۰۲) - رات کی یہ نماز عموماً دو دو رکعات پر مشتمل ہوتی تھی (البخاری ، ۱ : ۲۸۷) - اس کے رکوع اور سجدے کا یہ حال ہوتا تھا کہ ناظر یہ فرق محسوس نہیں کرتا تھا کہ قیام طویل تھا یا رکوع و سجدہ (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۲ ، ۵۰۳) - حضرت عائشہؓ کے بقول آپؐ کا سجدہ ۵۰ آیات کی تلاوت کے مساوی ہوتا تھا (البخاری ، ۱ : ۲۸۵) - نماز تہجد میں آپؐ تین دن سے کم میں قرآن حکیم کا ختم کرنا ناپسند فرماتے تھے اور جب قرآن ختم ہوتا تو آپؐ کھڑے کھڑے دعا مانگتے تھے (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۶)- وتروں میں آپؐ علی الترتیب سورۃ الاعلٰی، سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص پڑھتے تھے اور نماز کے اختتام پر فرماتے: سبحانَ الملکِ القدوس (تین مرتبہ اور تیسری مرتبہ ذرا دراز کرتے ہوئے ؛ دیکھیے ابن الجوزی، ۲: ۵۰۷)- نماز وتر کے بعد آپؐ استراحت فرماتے تھے- پھر جب اذان کی آواز بلند ہوتی تو اٹھ کر فجر کی دو رکعتیں ادا فرماتے (البخاری ، ۱ : ۲۸۶) - اس کے بعد آپؐ اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جاتے (کتاب مذکور، ۱ : ۲۹۲، ۲۹۳)، لیکن بقول حضرت عائشہؓ اگر وہ جاگ رہی ہوتیں تو لیٹنے کے بجائے ان سے گفتگو فرماتے (حوالۂ مذکور) اور پھر جب مؤذن بلانے آتا تو آپؐ اٹھ کر باہر نکلتے اور نماز فجر کی امامت فرماتے .

۲- صبح و شام کے معمولات : صبح و شام کے اوقات آپؐ کے نزدیک خاص اہتمام رکھتے تھے ، جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ قرآن کریم میں بے شمار مواقع پر صبح و شام (بکرۃً و اصیلاً / عشیا ، دیکھیے محمد فؤاد عبدالباقی : معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم) کی عبادت اور التسبیح و تہلیل پر زور دیا گیا - اسی بنا پر آپؐ کا یہ فرمان تھا کہ جو

marfat.com
Marfat.com

شخص صبح نماز کے لیے وقت پر نہیں اٹھتا اس پر شیطان غالب آ جاتا ہے اور وہ تمام دن تھکاوٹ اور کسل مندی محسوس کرتا رہتا ہے (البخاری، ۱ : ۲۸۸ تا ۲۸۹)۔ آپؐ ان اوقات کو بہت سی دعاؤں اور اوراد سے معمور رکھتے تھے (جن کے لیے دیکھیے البخاری، ۴ : ۱۸۴ تا ۲۱۰، کتاب الدعوات؛ مسلم، ۴ : ۲۰۶۱ تا ۲۰۹۰، کتاب الذکر و الدعا و التوبۃ و الاستغفار؛ الترمذی، ۴ : ۴۵۵ تا ۵۸۲، کتاب الدعاء؛ و دیگر کتب حدیث).

۳۔ معمولات طہارت: آپؐ کو طہارت کا بہت خیال رہتا تھا۔ دن ہو یا رات آپؐ بدوں طہارت کیے وقت گزارنا ہرگز پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ رفع حاجت کے لیے بہت دور بعض اوقات تقریباً ۲ میل (ابن القیم: زاد المعاد، ۱ : ۱۷۱) نکل جاتے، جہاں سے بمشکل آدمی دکھائی دے سکے (ابو داود، ۱ : ۱۴، حدیث ۱ و ۲)۔ قضائے حاجت سے قبل آپؐ یہ دعا ضرور پڑھتے تھے: اعوذ باللہ من الخبث و الخبائث (مسلم، ۱ : ۲۸۴، حدیث ۳۷۵)، یا اللّٰھم انی اعوذ بک من الخبث و الخبائث (ابن الجوزی، ۲ : ۳۸۷) ابن ماجہ (حدیث ۲۹۹) میں اس کے معاً بعد یہ اضافہ بھی ہے۔ الرّجس النّجس الشیطان الرّجیم (نیز دیکھیے ابن قیم: زاد المعاد، ۱ : ۱۷۰ تا ۱۷۲) اور دوران قضائے حاجت قبلے کی طرف منہ اور کمر کرنے سے پرہیز فرماتے (مسلم، کتاب الطہارۃ؛ ابن ماجہ، حدیث ۳۱۳؛ النسائی، ۱ : ۲۳) اور جب تک بیٹھ نہ جاتے اس وقت کپڑے نہیں اٹھاتے تھے (الترمذی، ۱ : ۲۱، حدیث ۱۴؛ ابو داود، ۱ : ۲۱، حدیث ۱۴) ہمیشہ بیٹھ کر رفع حاجت فرماتے (الترمذی، حدیث ۱۲) اور اس دوران میں ہر قسم کی گفتگو کرنے (بشمول جواب سلام) کو ناپسند فرماتے تھے (ابن ماجہ، حدیث ۳۴۳؛ ابو داود، ۱ : ۲۲ تا ۲۳، حدیث ۱۵ تا ۱۷)۔ آپؐ رفع حاجت کے لیے جانے سے قبل اپنی انگوٹھی (جس پر محمد رسول اللہ کے الفاظ کندہ تھے) اتار کر رکھ جاتے تھے (ابن ماجہ، حدیث ۳۰۳)۔ آپؐ (ابتدائی) استنجا ایسی اشیا سے فرماتے جو مطہر ہوتیں (مثلاً ڈھیلا وغیرہ)؛ ایسی اشیا جو غیر مطہر ہوں (مثلاً کوئلہ، وغیرہ)، ان سے استنجا کرنا آپؐ کو ناپسند تھا (ابو داود، ۱ : ۳۴ تا ۳۷، حدیث ۳۶ تا ۳۹) اور ان کے استعمال میں طاق کا لحاظ رکھتے تھے (ابن ماجہ: سنن، حدیث ۳۴۹۸؛ ابو داود، ۱ : ۳۳ تا ۳۴، حدیث ۳۵)۔ بعد ازاں پانی استعمال فرماتے (البخاری، ۱ : ۵۱) اور پھر زمین پر ہاتھ مار کر اپنے دونوں ہاتھ اچھی طرح رگڑ کر دھوتے تھے (ابو داود، ۱ : ۳۹، حدیث ۴۵)۔ اس سے فارغ ہو کر جب آپؐ باہر نکلتے تو فرماتے: غفرانک (الترمذی، حدیث ۷؛ ابن ماجہ، حدیث ۳۰۰) (ابن الجوزی، ۲ : ۳۸۷)۔

معمولات مسواک و وضو: مسواک آپؐ کی تمام زندگی کا معمول رہی، یہاں تک کہ آخری گھڑیوں میں بھی حضرت عائشہؓ نے آپ کا منشا پا کر آپؐ کو مسواک کرائی، جس سے چہرۂ مبارک فرط مسرت سے تمتمانے لگا تھا (ابن ہشام، البلاذری وغیرہ)۔ آپؐ کو مسواک اس قدر پسند تھی کہ آپؐ فرماتے تھے کہ اگر میری امت پر گراں نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا لازمی حکم دیتا (النسائی، ۱ : ۱۲؛ مسلم، ۱ : ۲۲۰، حدیث ۲۵۲)۔ آپؐ ہر نماز کے لیے تازہ وضو فرماتے (البخاری، ۱ : ۶۶)، ہر وضو میں اچھی طرح مسواک فرماتے اور دوسروں کو بھی آپؐ کی یہی تلقین تھی کہ اگر ہر نماز کے لیے تازہ وضو نہ کیا جا سکے تو مسواک ضرور کر لینی چاہیے (ابو داود، ۱ : ۱۴، حدیث ۴۸)۔ اسی طرح جب بھی آپ سو کر بیدار ہوتے تو ضرور مسواک فرماتے (ابو داود، ۱ : ۴۷، حدیث ۵۷)۔

وضو سے قبل آپؐ بسم اللہ ضرور پڑھتے؛ پھر

marfat.com
Marfat.com

برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہاتھوں پر پانی ڈال کر تین مرتبہ انہیں دھوتے؛ پھر ایک یا دو یا تین چلوؤں سے (ابن قیم، ۱ : ۱۹۲) اچھی طرح کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈال کر اسے صاف فرماتے؛ پھر تین مرتبہ چہرہ دھوتے؛ پھر پہلے اپنا دایاں پھر بایاں ہاتھ کہنی سمیت (دو یا تین مرتبہ) دھوتے؛ پھر اپنے سر کا مسح فرماتے: پھر پہلے دائیں، پھر بائیں پاؤں کو دھوتے (البخاری، ۱ : ۶۰ تا ۶۱؛ مسلم، طہارۃ، ۱ : ۲۰۴ و ۲۰۵، حدیث ۲۲۶؛ ابن ماجہ، حدیث ۲۹۵؛ النسائی، ۱ : ۶۹، ۷۰، وغیرہ)۔ اگر موزے پہنے ہوتے تو انہیں اتارے بغیر ان پر مسح فرماتے (البخاری، ۱ : ۶۱ ببعد؛ مسلم، ۱ : ۲۲۸، حدیث ۲۷۴)۔ دوران وضو داڑھی کا خلال اور پاؤں کی انگلیوں کے خلال کا بھی معمول تھا (ابو داود، ۱ : ۱۰۱، حدیث ۱۴۵)۔ ابن قیم (زاد المعاد، ۱ : ۱۹۵ ببعد) کے مطابق دوران وضو آپ سے بجز ابتدا میں تسمیہ کے اور کوئی دعا منقول نہیں، البتہ وضو کے بعد آپ یہ دعا پڑھتے تھے: اشھد اَن لّا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ و اشھد ان محمدا عبدہٗ و رسولہٗ اللّٰھم اجعلنی من التوابین و اجعلنی من المتطھّرین۔ آپ عموماً دو رطل پانی سے وضو اور ایک صاع (تقریباً چار سیر) پانی سے غسل فرما لیا کرتے تھے (ابن الجوزی، ۲ : ۳۸۸)؛ پانی کی اس سے زیادہ مقدار بھی مروی ہے (ابو داود، ۱ : ۱۶۶ و ۱۶۷، حدیث ۲۳۸)۔ وضو کے بعد بعض روایات کے مطابق کپڑے سے منہ وغیرہ صاف کرتے تھے (الترمذی، ۱ : ۸۴ ببعد، حدیث ۵۳، ۵۴)۔

غسل: آپ کے غسل کا طریقہ یہ تھا کہ آپ پہلے اپنے دونوں ہاتھ دو یا تین مرتبہ دھوتے؛ پھر استنجا فرماتے؛ پھر زمین پر ہاتھ مار کر انہیں اچھی طرح دھوتے، پھر کلی کرتے اور پانی ڈال کر ناک صاف فرماتے، پھر اپنا چہرہ دھوتے، اپنے تمام بدن پر پانی ڈالتے، پھر اس جگہ سے ہٹ کر اپنے پاؤں دھوتے (ابو داود، ۱ : ۱۶۹ تا ۱۷۰، حدیث ۲۴۵؛ مسلم، ۱ : ۲۵۴، حدیث ۳۱۷؛ الترمذی، ۱ : ۱۷۳ تا ۱۷۴، حدیث ۱۰۳)۔ حضرت عائشہؓ کے مطابق آپ غسل میں بھی نماز کی طرح پورا وضو فرماتے، پھر دائیں کندھے پر پانی ڈالتے، پھر بائیں پر، پھر تین مرتبہ تمام بدن پر پانی بہاتے (ابو داود، ۱ : ۱۶۷، حدیث ۲۴۰ و ۲۴۱؛ ابن ماجہ، حدیث ۵۷۴)۔ خصوصی ضرورت کے علاوہ جمعہ اور عیدین کے مواقع پر غسل کا شدید اہتمام ہوتا تھا (البخاری، ۱ : ۲۲۴ تا ۲۳۵ و ببعد، کتاب الجمعہ؛ مسلم، ۱ : ۵۷۹ تا ۵۸۱، حدیث ۸۴۴ تا ۸۴۷؛ الترمذی، حدیث ۴۹۲ تا ۴۹۴) ان تقریبات پر آپ خوشبو کے استعمال کو پسند فرماتے تھے (ابو داود، ۱ : ۲۴۷، حدیث ۳۴۷)۔

۴۔ معمولات نماز: آپ کو تمام زندگی نماز کے اہتمام کا بڑا خیال رہا۔ آپ کے نزدیک سب سے عمدہ عمل نماز کا اول وقت پر ادا کرنا ہے (الترمذی، ۱ : ۳۲۰، حدیث ۱۷۰؛ ابو داود، ۱ : ۲۹۶)۔ آپ کا ارشاد تھا کہ تین چیزوں کو کبھی مؤخر نہیں کرنا چاہیے: نماز جب اس کا وقت ہو جائے، جنازہ جب آ جائے اور جوان عورت، جب اس کا کوئی رشتہ مل جائے (احمد بن حنبل: مسند، ۱ : ۱۰۵، حدیث ۸۲۸؛ الترمذی، ۱ : ۳۲۰، حدیث ۱۷۱)۔ آپ کی زندگی مبارک میں ایک نماز کے سوا (اور وہ بھی سفر کے دوران میں تمام صحابہؓ کو نیند آ جانے کی وجہ سے) کوئی نماز قضا نہ ہوئی (مسلم، ۱ : ۴۷۱، حدیث ۶۸۰؛ ابن ماجہ، حدیث ۶۹۷؛ النسائی، حدیث ۶۲۰؛ ابو داود، ۱ : ۳۰۲ تا ۳۰۵، حدیث ۴۳۵ تا ۴۳۷)۔ فرض نمازیں مسجد میں باجماعت اور نفل نمازیں گھر میں تنہا پڑھنے کا معمول تھا۔

فجر کی نماز آپ اتنی روشنی میں کہ پاس بیٹھنے والا، دوسرے کو پہچان سکتا تھا ادا فرماتے تھے (مسلم ۱ : ۴۴۷، حدیث ۶۴۷)، لیکن خواتین

marfat.com

Marfat.com

کی شمولیت کی وجہ سے آپؐ بعض دنوں (بالخصوص رمضان المبارک) میں اتنے منہ اندھیرے نماز پڑھتے کہ عورتیں چادروں میں لپٹی ہوئی پہچانی نہ جا سکتی تھیں (مسلم، ۱ : ۴۴۶، حدیث ۶۴۶).

فجر کی نماز میں آپؐ عموماً ساٹھ سے سو آیات تک تلاوت فرماتے تھے (مسلم، ۱ : ۴۴۷، حدیث ۶۴۷)، مگر کبھی سورۃ المومنون کی ۴۵ یا ۴۹ آیات، کبھی سورۂ قٓ، کبھی التکویر جیسی چھوٹی سورتیں بھی پڑھنے کا معمول تھا۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ عموماً آپؐ قراءت میں تخفیف فرماتے تھے (مسلم، ۱ : ۳۳۶ تا ۳۳۷، حدیث ۴۵۵ تا ۴۵۸)، تاہم جمعہ کے روز نماز فجر کی پہلی رکعت میں سورۃ الٓمٓ السجدہ اور سورۃ الدّھر تلاوت فرماتے (مسلم، ۲ : ۵۹۹، حدیث ۸۷۹، ۸۸۰؛ نیز دیکھیے ابن القیم: زاد المعاد، ۱ : ۲۰۹ تا ۲۱۰، مطبوعہ کویت)۔ ظہر کی نماز آپؐ گرمیوں میں ذرا تاخیر سے، یعنی سایہ کے تین قدموں سے پانچ قدم ہونے کے درمیان) اور سردیوں میں ذرا جلدی (سایے کے پانچ قدم سے سات قدم کے درمیان) پڑھا کرتے تھے؛ (ابو داؤد، ۱ : ۲۸۳، حدیث ۴۰۱؛ النسائی، کتاب المواقیت، ۱ : ۲۵۰، ۲۵۱) ایک مرتبہ آپؐ نے اس وقت ظہر کی نماز ادا فرمائی جب کہ ٹیلوں کے سایے نمودار ہوگئے (البخاری؛ مسلم، ۱ : ۴۳۱، حدیث ۱۶۱، الترمذی، ۱ : ۲۹۶، حدیث ۱۵۷)۔ آپؐ ظہر کی ابتدائی دو رکعتوں کو آخری دو رکعتوں سے اور پہلی رکعت کو دوسری رکعت سے لمبا فرماتے تھے (مسلم، ۱ : ۳۳۳ تا ۳۳۴، حدیث ۴۵۱ تا ۴۵۲)۔ پہلی دو رکعتوں میں عام اندازے کے مطابق ۳۰، ۳۰ آیات (مثلاً سورہ ۳۲ [الٓمٓ السجدة]، آیات ۳۰) اور آخری دو رکعتوں میں ۱۵، ۱۵ آیات کے بقدر قیام فرماتے تھے (حوالۂ مذکور)؛ مگر یہ تصریح بھی کی گئی ہے کہ ظہر اور عصر کی آخری دو رکعتوں میں سوائے سورۃ الفاتحہ کے کوئی اور سورت نہیں پڑھتے تھے۔ پہلی رکعت کا قیام اتنا طویل ہوتا کہ ایک شخص بآسانی بقیع میں قضائے حاجت سے فارغ ہو کر، گھر میں طہارت اور وضو کر کے پہلی رکعت میں شامل ہو سکتا تھا (کتاب مذکور، ۱ : ۳۳۵، حدیث ۴۵۴)، مگر کبھی کبھار اسی نماز میں سورۃ الّیل کا پڑھنا بھی مروی ہے۔ آپؐ عصر کی نماز اس وقت ادا فرماتے جب کہ سورج کی روشنی حضرت عائشہؓ کے حجرے میں موجود ہوتی (البخاری، ۹/۱۳، ۱ : ۱۳۶) اور ایک شخص مدینہ منورہ کے انتہائی علاقے سے ہو کر سورج کے زرد ہونے سے قبل واپس پہنچ جاتا تھا (کتاب مذکور، ۱ : ۱۴۷)۔ عصر کی پہلی دو رکعتوں میں آپؐ کا قیام ظہر کی آخری دو رکعتوں کے قیام سے قدرے کم ہوتا تھا (یعنی تقریباً ۱۵ آیات کے بقدر: مسلم ۱ : ۳۳۴، حدیث ۴۵۲ تا ۴۵۳)۔ ظہر اور عصر میں قراءت مخفی ہوتی تھی، مگر کبھی کبھار، دوسروں کو بتلانے کے لیے کوئی ایک آدھ آیت آپؐ بلند آواز سے بھی پڑھ دیتے (کتاب مذکور، ۱ : ۳۳۳، حدیث ۴۵۱)۔ نماز مغرب کو جلدی پڑھنے کا معمول تھا، یہاں تک کہ نماز کے بعد تیر گرنے کی جگہ دکھائی دے سکتی تھی۔ نماز مغرب میں سورہ مرسلات یا سورہ طور (یا اس کے مطابق کوئی سورت) پڑھتے تھے۔ (مسلم، ۱ : ۳۳۸، حدیث ۴۶۲ تا ۴۶۳).

عشا کی نماز کو آپؐ تاخیر سے پڑھتے تھے (البخاری ۹/۲۰، ۱ : ۱۵۰)، مگر ایک دوسری روایت کے مطابق اگر لوگ جمع ہو جاتے تو جلدی ورنہ تاخیر سے ادا فرماتے تھے (کتاب مذکور، ۹/۲۱، ۱ : ۱۵۱)۔ عشا کی نماز میں آپؐ سورۃ الاعلی، سورۃ الشمس اور سورۃ التین جیسی سورتیں تلاوت فرماتے تھے (مسلم، ۱ : ۳۳۹ تا ۳۴۰، حدیث ۴۶۴، ۴۶۵).

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

نماز باجماعت میں آپؐ خود بھی تخفیف کے حکم پر عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اسی کی تاکید فرماتے (کتاب مذکور، ص ۲۴۰، حدیث ۴۶۹ ببعد) ۔ جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ دوسری رکعت میں سورۂ منافقون اور کبھی سورۃ الاعلی اور سورۃ الغاشیہ پڑھتے تھے ؛ علامہ ابن القیم (زاد المعاد، ۱ : ۳۷۹) کے مطابق ان سورتوں کا مکمل طور پر پڑھنا سنت ہے نہ کہ بعض حصوں کا ۔ عیدین میں دونوں مؤخر الذکر سورتیں تلاوت فرماتے تھے (البخاری، کتاب العیدین و کتاب الجمعہ ؛ نیز زاد المعاد، ۱ : ۳۷۸ تا ۳۷۹) ۔

۵۔ معمولات صوم : آپؐ رمضان المبارک کے علاوہ بھی بہت سے روزے رکھتے تھے، مگر آپؐ کو صوم وصال (مسلسل روزے رکھنا) پسند نہ تھا، بلکہ آپؐ کو صوم داودؑ (ایک دن روزہ اور ایک دن افطار)، زیادہ محبوب تھا (البخاری، ۳۰/۵۸، ۱ : ۴۹۳؛ مسلم، حدیث ۱۱۵۹، النسائی، ۴ : ۲۰۶؛ ابو داود، ۲ : ۸۰۷، حدیث ۲۴۲۶ تا ۲۴۲۷) ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم رمضان المبارک کے علاوہ پورے شعبان کے (البخاری، ۳۰/۵۲، ۱:۴۹۱؛ ابو داود، ۲ : ۸۱۲، حدیث ۲۴۳۱؛ الترمذی، ۳ : ۱۱۳، حدیث ۷۳۷؛ النسائی، ۴ : ۲۰۰)، ہر ماہ میں تین دن، ذی الحجہ کے نو ابتدائی ایام، یوم عاشورہ (ابو داود، ۲ : ۸۱۵، حدیث ۲۴۳۷؛ النسائی، ۴ : ۲۰۵) ہر ماہ کی تیرھویں چودھویں اور پندرھویں (النسائی، ۴: ۲۲۲ تا ۲۲۳، حدیث ۲۴۴۴؛ ابو داود، حدیث ۲۴۴۹)، ہر ہفتے میں سے دو دن، پیر اور جمعرات (ابو داود، حدیث ۲۴۳۶؛ الترمذی ۳ : ۱۲۱، حدیث ۷۴۵) کے روزے رکھنے کا بھی معمول تھا ۔ اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب آپؐ روزے رکھتے تو اتنے روزے رکھتے تھے کہ محسوس ہوتا تھا اب کبھی آپؐ افطار نہیں کریں گے اور جب افطار کرتے تھے تو لگتا تھا اب آپؐ کبھی روزے نہیں رکھیں گے (البخاری، ۳۰/۵۲، ۱ : ۴۹۱) ۔ آپؐ کا طریقہ خود آپؐ کے اپنے بیان کے مطابق یہ تھا کہ آپؐ روزے بھی رکھتے تھے اور افطار بھی فرماتے تھے، مگر اعتدال کے ساتھ (البخاری) ۔ آپؐ سحری کا ہمیشہ اہتمام فرماتے تھے ؛ آپؐ کے نزدیک بہترین سحری کھجور تھی (ابو داود ۲ : ۸۲۴، حدیث ۲۳۴۵)، لیکن کبھی ایسے بھی ہوتا کہ جب گھر تشریف لاتے اور گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو روزے کی نیت فرما لیتے (مسلم، حدیث ۱۱۵۴؛ النسائی، ۴ : ۱۹۳ تا ۱۹۵ ببعد) ۔ نفلی روزوں میں یہ بتلانے کے لیے کہ بوقت ضرورت انہیں کھولا بھی جا سکتا ہے ؛ آپؐ نے بعض مواقع پر روزے کی نیت کر کے افطار کر لیا (ابو داود، ۲ : ۸۲۶، حدیث ۲۴۵۶ ؛ الترمذی، ۳ : ۶، حدیث ۷۳۲)، مگر ان حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم روزے کی قضا ضروری سمجھتے تھے (ابو داود، ۲ : ۸۲۶، حدیث ۲۴۵۷) ۔ روزے کے دوران میں مسواک کرنے، حجامت کروانے (پچھنے لگوانے)، سرمہ ڈالنے کا بھی معمول تھا (ابو داود، حدیث ۲۳۶۴، ۲۳۷۲، ۲۳۷۸) ۔ افطار میں آپؐ ہمیشہ تعجیل فرماتے (البخاری، ۳۰/۴۵، ۱ : ۴۸۸؛ مسلم، حدیث ۱۰۹۸) آپؐ کا ارشاد تھا کہ جب تک امت روزے کی افطاری میں تعجیل کرتی رہے گی اس وقت تک وہ خیر پر رہے گی ۔ روزہ عموماً کھجور یا پانی سے افطار فرماتے (الترمذی، ۳ : ۷۹، حدیث ۶۹۵ ؛ ابو داود، ۲ : ۷۶۴، حدیث ۲۳۵۵ ببعد) ۔ افطار کے وقت کبھی تو فرماتے : ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ (ابو داود ۲ : ۷۶۵، حدیث ۲۳۵۷) اور کبھی یہ دعا پڑھتے : اَللّٰهُمَّ لَکَ صُمْتُ وَ عَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ (حوالۂ مذکور) ۔

۵۔ معمولات حج و عمرہ : آپؐ نے ہجرت سے قبل جو حج اور عمرے کیے ان کی صحیح

marfat.com
Marfat.com

تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے (ابن حزم : جوامع السیرۃ ، ۱ ، ص ۱۵) ۔ ہجرت کے بعد آپ نے صرف ایک حج اور دو مفرد عمرے (عمرۃ القضا : سنہ ۷ھ/۶۲۹ء ، عمرہ از جعرانہ ، ۸ھ/۶۳۰ء) اور ایک عمرہ قران (حجۃ الوداع کے ساتھ) ادا فرمائے (تفصیل کے لیے دیکھیے ابن سید الناس : تاریخ الخمیس ۲ : ۲۸ ؛ ابن قیم ، زاد المعاد ، ۲ : ۹۷ تا ۱۰۰ ؛ ابن کثیر ، ۵ : ۲۱۵) ۔ ابن سید الناس، ابن کثیر (حوالہ مذکور) اور دوسرے بہت سے سیرت نگاروں نے عمرہ صلح حدیبیہ کو شمار کر کے ان عمروں کی تعداد چار تک بیان کی ہے ۔

جب آپ حج ، عمرے یا جہاد کے سفر کے لیے روانہ ہوتے تو سب سے پہلے اپنی جگہ کسی کو مدینہ منورہ میں قائم مقام امیر مقرر فرماتے ؛ چنانچہ عمرہ صلح حدیبیہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر ابن ام مکتوم کو اور عمرہ قضا کے موقع پر ابو رہم الانصاری کو مدینہ منورہ میں اپنا قائم مقام بنایا (دوسرے مواقع کے لیے دیکھیے ، الواقدی ، ۱ : ۷ تا ۸ ، مطبوعہ آکسفرڈ) ۔ اپنی ازواج میں سے عموماً ایک (بعض اوقات ایک سے زائد) کو اپنے ساتھ لے جاتے ، لیکن اس کا فیصلہ بجائے خود کرنے کے، قرعہ اندازی کے ذریعے فرماتے (البخاری، ۶۴/۳۴، ۳ : ۱۰۴ ، کتاب المغازی) عموماً حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو زیادہ ہم رکابی کا شرف حاصل ہوتا تھا ۔

گھر سے عموماً پیر یا جمعرات کو نکلتے (ابن الجوزی ، ۲ : ۶۵۹ ، صرف یوم الخمیس : ابو داود ۳ : ۷۹ ، حدیث ۲۶۰۵) اور عموماً فجر کے تڑکے نکلنے کا معمول تھا (الترمذی ، ۳ : ۵۱۷ ، حدیث ۱۲۱۲ ؛ ابو داود، ۳ : ۷۹، حدیث ۲۶۰۶) ۔ اکیلے سفر کے بجائے آپ جماعت (دو یا زائد افراد) کی صورت میں اور باقاعدہ ایک امیر کے تحت نکلنے کو پسند فرماتے تھے ۔ اگر آپ کسی قافلے میں شامل ہوتے تو اس کے امیر تو آپ ہی ہوتے ، ورنہ آپ امیر کا تقرر بھی فرماتے ۔ الوداع کے وقت آپ فرماتے : استودع اللہ دینکم و امانتکم و خواتم اعمالکم (ابو داود ، ۳ : ۷۷ ، حدیث ۲۶۰۱ ؛ الترمذی ، ۵ : ۴۹۹ ، حدیث ۳۴۴۲ تا ۳۴۴۳) ۔ جب آپ سواری کے رکاب پر پاؤں رکھتے تو فرماتے : بسم اللہ ؛ پھر جب سواری پر اچھی طرح بیٹھ جاتے تو یہ دعا فرماتے : سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ، الحمد للہ (تین مرتبہ) اللہ اکبر (تین مرتبہ) لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ ظلمت نفسی فاغفرلی فانہ لایغفر الذنوب الا انت ، (ابن قیم : زاد المعاد ، ۳ : ۲۴۵ ؛ ابو داود ، ۳ : ۷۷ ، حدیث ۲۶۰۲) ۔ اسی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ آپ اس دعا کے بعد مسکراتے ، پوچھا جاتا تو فرماتے خدا اپنے اس بندے کو پسند فرماتا ہے جو یہ کہتا ہے (اے رب) میرے گناہوں کی مغفرت فرما، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے سوا کوئی گناہوں کو نہیں بخش سکتا (الترمذی، ۵ : ۵۰۱، حدیث ۳۴۴۶) ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مطابق سواری پر بیٹھ جانے کے بعد یہ دعا پڑھتے : اللہ اکبر (تین مرتبہ) ، سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ؛ اللھم انا نسألک فی سفرنا ھذا البر والتقوی و من العمل ما ترضی ؛ اللھم ھوّن علینا سفرنا ھذا واطوعنّا بعدہ ؛ اللھم انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی الاھل ؛ اللھم انی اعوذ بک من وعثاء السفر و کآبۃ المنظر و سوء المنقلب فی المال والاھل اور جب سفر سے واپسی ہوتی تو یہ اضافہ فرماتے : آیبون ان شاء اللہ ، تائبون عابدون لربنا حامدون (مسلم ، ۲ : ۹۷۸ ، حدیث ۱۳۴۲ ؛ معمولی اختلاف کے ساتھ : الترمذی ، ۵ : ۵۰۲ ، حدیث ۳۴۳۸ تا ۳۴۳۹) ۔ دوران سفر میں ہر بلندی کو چڑھتے اور ہر نشیب کی طرف اترتے ہوئے تکبیر کا ورد جاری

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

رکھتے تھے (الترمذی، ۵ : ۵۰۰، حدیث ۳۴۴۵)۔ جب کسی جگہ پڑاؤ کرتے تو فرماتے: اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق (کتاب مذکور، ص ۴۹۶، حدیث ۳۴۳۷)۔ حج اور عمرے کے سفروں میں آپ ذوالحلیفہ کے مقام [رک بہ میقات] سے احرام باندھتے (مسلم، ۲ : ۸۸۷، حدیث ۱۲۱۸)۔ تمام راستے تکبیر و تہلیل اور تلبیہ کا ورد جاری رکھتے (حوالۂ مذکور)۔ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے قبل آپ ذو طوای میں شب باشی کر کے صبح غسل کرکے پھر مکہ مکرمہ کی طرف بڑھتے (مسلم، ۲ : ۹۱۹، حدیث ۱۲۵۹ب)۔ مکہ مکرمہ میں آپ ثنیۃالعلیا سے داخل ہوتے اور ثنیہالسفلی سے باہر نکلتے (مسلم، ۲ : ۹۱۸، حدیث ۱۲۵۹)۔ بیت اللہ شریف پر نظر پڑتی تو تکبیر و تہلیل پڑھتے (ابو داؤد، ۲ : ۴۳۸، حدیث ۱۸۷۲) اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے: اللھم زد ھذا البیت تشریفاً و تعظیماً و تکریماً و مہابۃً و زد من شرفہ و کرمہ ممن حجہ او اعتمرہ تشریفا و تعظیماً و تکریماً (عبدالحی لکھنوی: حاشیہ ھدایہ، ۱ : ۲۲۱، شمارہ ۱۰، بحوالۂ امام شافعی)۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی آپ سیدھے حجر اسود کے پاس آتے؛ اس کے سامنے کھڑے ہو کر تکبیر و تہلیل فرماتے اور اسے چومتے (ابو داؤد، ۲ : ۴۳۹، حدیث ۱۸۷۳)۔ پھر بیت اللہ شریف کا طواف فرماتے۔ طواف کے ہر چکر میں حجر اسود کے استلام کو دہراتے، نیز رکنین یمانین کو بھی ہاتھ سے چھوتے اور دعائیں پڑھتے (کتاب مذکور، ۲ : ۴۴۰، حدیث ۱۸۷۳ و ۱۸۷۶)۔ طواف اور استلام حجر اسود سے فارغ ہو کر دروازے اور رکن کے مابین کھڑے ہو کر اپنا سینہ، چہرہ اور دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت پھیلا کر بیت اللہ شریف کی دیواروں پر رکھتے اور جہنم کے عذاب سے پناہ مانگتے (ابن ماجہ، حدیث ۲۹۶۲؛ ابو داؤد، ۲ : ۴۵۲، حدیث ۱۸۹۹)۔ پھر مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ادا فرماتے جن میں سورہ الکافرون اور سورہ اخلاص تلاوت فرماتے تھے (مسلم، ۲ : ۸۸۸، حدیث ۱۲۱۷)۔ وہاں سے باب بنی مخزوم، یعنی باب الصفا سے صفا مروہ کی طرف نکل جاتے اور صفا مروہ کے مابین سعی فرماتے۔ ہر چکر میں دعاؤں اور اوراد کا سلسلہ جاری رہتا (حوالۂ مذکور) اور اسی طرح بقیہ مناسک حج ادا فرماتے۔ [حج اور عمرہ کے دیگر مناسک کے لیے رک بہ حج؛ عمرہ؛ احرام؛ تلبیہ؛ قربانی وغیرہ].

مناسک حج سے فراغت کے بعد آپ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی طرف سے متعدد جانور ذبح فرماتے۔ حجۃ الوداع میں آپ نے پنی طرف سے ۱۰۰ اونٹ قربان کیے جن میں سے ۳۰ اونٹ اپنے مبارک ہاتھوں سے ذبح فرمائے (ابو داؤد، ۲ : ۳۶۷، حدیث ۱۷۶۱، ۴۵۵ تا ۴۶۴، باب صفۃ حجۃ النبی، حدیث ۱۹۰۵) باقی حضرت علی نے ذبح کیے۔

مدینہ منورہ کے لیے واپسی کے دوران میں بھی تکبیر و تہلیل کا سلسلہ جاری رہتا۔ جب مدینہ کے پاس ثنیہ یا مقام فدفد پر پہنچتے تو یہ دعا پڑھتے: "اللہ اکبر (تین مرتبہ)، لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک و لہ الحمد و ھو علی کل شیء قدیر آیبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ و نصر عبدہ و ھزم الاحزاب وحدہ (مسلم، ۲ : ۹۸۰، حدیث ۱۳۴۴)۔ دوسری روایت کے مطابق آپ واپسی کے سفر کے دوران میں ہر بلندی و پستی کے موقع پر مذکورہ دعا پڑھتے۔ آپ یہ التزام فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ میں آپ کی واپسی (چاشت) کے وقت ہو۔ آپ سب سے پہلے مسجد میں تشریف لاتے اور دو رکعت نماز ادا کر کے وہیں بیٹھ رہتے؛ لوگ حال احوال اور مسائل پوچھنے آتے رہتے؛ ان سے فارغ ہو کر آپ گھر میں تشریف لے جاتے (ابن الجوزی، ص ۶۶۳ تا ۶۶۴)۔

marfat.com
Marfat.com

۶- معمولات سفر : [نیز رک بہ معمولات حج و عمرہ] آپؐ سفر کے دوران میں (خاص طور پر سفر جہاد میں) رات کے پر سکون لمحات میں سفر کرنا زیادہ پسند فرماتے تھے (ابو داؤد) - سفر کرتے ہوئے سواری کو تیز تیز ہانکتے (ابن الجوزی ، ص ۶۶۱) - دوران سفر میں اپنی سواری پر بیٹھ کر خواہ اس کا کسی طرف بھی رخ ہوتا نوافل ادا فرماتے (حوالہ مذکور) .

۷- معمولات دعا : دعا کو آپؐ عبادت کا مغز (مُخ) قرار دیتے تھے (الترمذی ، ۵ : ۴۵۶ ، حدیث ۳۳۷۱) ؛ نیز فرماتے تھے کہ اللہ کے نزدیک دعا سے زیادہ مکرّم کوئی چیز نہیں (کتاب مذکور ، حدیث ۳۳۷۰) ؛ آپؐ فرماتے تھے جو خدا سے انہیں مانگتا ، خدا اس پر غضب ناک ہوتا ہے (کتاب مذکور، حدیث ۳۳۷۳) - صحابہؓ فرماتے ہیں کہ خود آپؐ کو دعا کا بڑا اہتمام رہتا تھا۔ آپؐ ہاتھ اٹھا کر یوں عاجزی سے دعا مانگتے جس طرح کوئی مسکین کھانا طلب کرتا ہے (ابن الجوزی، ص ۵۴۷) - آپؐ کا فرمان تھا کہ ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو پھیلا کر دعا مانگنی چاہیے ، نہ کہ ہاتھ الٹے کر کے (ابو داؤد ، ۲ : ۱۲۵ ، حدیث ۱۴۸۴)۔ حضرت ابن عباسؓ کے بقول دعا کے وقت ہاتھ کندھوں کے برابر ہونے چاہئیں (حوالۂ مذکور)؛ حضرت عائشہؓ کے مطابق آپؐ صرف جامع دعائیں مانگتے تھے (ابو داؤد ، ۲ : ۱۶۳ ، حدیث ۱۴۸۲) اور آپؐ دوسروں کو بھی یہی تلقین فرماتے، مثلاً آپؐ نے فرمایا: جب تم خدا سے جنت طلب کرو گے تو اس میں جو کچھ بھی ہے تمھیں مل جائے گا؛ اسی طرح جب تم جہنّم سے پناہ مانگو گے تو جو کچھ اس میں ہے اس سے تمھیں پناہ حاصل ہو جائے گی (کتاب مذکور، ۲ : ۱۶۲ ، حدیث ۱۴۸۰)- آپؐ فرماتے تھے کہ اللہ تعالٰی کے اسماے حسنٰی کے ساتھ جس نے دعا مانگی وہ ضرور قبول ہوگی (ابو داؤد، ۲: ۱۶۶ تا ۱۶۸ ، حدیث ۱۴۹۳ تا ۱۴۹۶) - دعا کے بارے میں آپؐ کی تعلیم یہ تھی کہ سب سے پہلے اللہ عزّ و جل کی بزرگی اور اس کی ثنا بیان کی جائے ؛ پھر اس کے نبیؐ پر درود پڑھا جائے ؛ پھر جو چاہے اللہ سے دعا کی جائے (کتاب مذکور ، ۲ : ۱۶۲ ، حدیث ۱۴۸۱) - آپؐ دعا میں اِنْ شِئْتَ (اگر تو چاہے) کے بجاے عزیمت یعنی پختگی کے ساتھ مانگنے پر زور دیتے تھے (مسلم، ۴ : ۲۰۶۳ ، حدیث ۲۶۷۸-۹) - آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جو مسلمان اپنے بھائی کے لیے اس کے پس پشت دعا مانگتا ہے تو ایک فرشتہ مقرر ہوتا ہے جو اس کی دعا پر آمین کہتا ہے اور نیز یہ دعا مانگتا ہے کہ یہ نعمت دعا کرنے والے کو بھی حاصل ہو (مسلم ، ۴ : ۲۰۹۴ ، حدیث ۲۷۳۲ و ۲۷۳۳).

آپؐ صبح و شام کے ہر معمول کو دعا سے شروع فرماتے اور دعا ہی پر ختم فرماتے تھے - آپؐ کی یہ دعائیں کتب احادیث و سیر میں ہر موقع کے لیے الگ الگ اور بڑی تفصیل کے ساتھ ملتی ہیں - صرف نماز میں سات مواقع پر آپؐ کا معمول دعا مانگنے کا تھا : (۱) تکبیر تحریمہ کے بعد ؛ (۲) رکوع سے قبل اور قراءت کے بعد ؛ (۳، ۴) رکوع اور سجدے میں : مثلاً سبحانک اللھم ربنا و بحمدک اللھم اغفرلی؛ (۵) قومہ میں ؛ (۶) دونوں سجدوں کے درمیانی قعدے میں ؛ (۷) سلام سے قبل (مسلم و البخاری ، نیز ابن القیّم) (تفصیل کے لیے دیکھیے کتب حدیث میں، کتب دعا).

۸- معمولات جہاد : مدنی زندگی میں آپؐ کو بار بار دشمنان اسلام کے خلاف صف آرا ہونا پڑا اور فوجی دستوں کی قیادت کرنا پڑی - جنگ ہوش و عقل کے بجاے جوش و جذبے سے لڑی جاتی ہے ، مگر ہمیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی سیرت طیبہ میں ان مواقع پر بھی اعتدال و توازن نظر آتا ہے - جہاد کے لیے آپؐ حسب ذیل باتوں کا اہتمام فرمایا کرتے تھے :

marfat.com
Marfat.com

حسب ارشاد خداوندی : وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (۹-[الانفال] : ۶۰) - جنگ پر روانہ ہونے سے پہلے آپؐ اس جنگ کے لیے تمام ممکنہ وسائل بہم پہنچاتے تھے - موجود افرادی قوت میں سے جتنی ضرورت ہوتی اس کے مطابق رضاکاروں کا انتخاب فرما لیتے - چند جنگوں (مثلاً غزوہ تبوک وغیرہ) میں ہر مسلمان عاقل بالغ کا جنگ کے لیے حاضر ہونا لازمی تھا - ان کے علاوہ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے لیے دشمن کی تعداد (ابتداءً : دس ، مگر بعد ازاں دو ، کے مقابلے میں ایک : ۹ [الانفال] : ۶۵) کی مناسبت سے افرادی قوت کا تعین فرماتے ؛ افرادی قوت کے ساتھ ساتھ تمام ممکنہ عسکری وسائل (اسلحہ ، مویشی اور باربرداری کے جانوروں) کا بھی پورا پورا انتظام فرماتے - ایسے مواقع پر صحابہؓ سے دل کھول کر چندہ دینے کی اپیل کی جاتی ؛ پھر اس تمام جمع شدہ پونجی سے سامان جنگ خرید کر مجاہدین میں تقسیم فرماتے - سپاہیوں کو آپؐ کی تعلیم یہ تھی کہ صرف اور صرف اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے جنگ کریں (البخاری ، ۲ : ۲۰۵ ؛ مسلم ، ۳ : ۱۵۱۲ تا ۱۵۱۳ ؛ حدیث ۱۹۰۴ ؛ الترمذی ، حدیث ۱۶۴۶) ، لیکن جنگ جیتنے کی صورت میں مال غنیمت میں سے حصہ دینے کا بھی وعدہ فرماتے [رک بہ انفال ؛ فیء ؛ غنیمت] - جہاد کی تیاری کے ضمن میں ہتھیاروں کی صفائی (ابو داؤد ، ۳ : ۹۶ ، حدیث ۲۵۸۳) اور گھوڑوں اور جوانوں کی دوڑ کا بندوبست بھی فرماتے (ابو داؤد ۳ : ۵۴ ، حدیث ۲۵۷۵ ، ۲۵۷۸) ؛ جہاں آپؐ کھڑے ہو کر گھوڑوں کی دوڑ کراتے ، وہیں بعد ازاں مسجد سبق الخیل بنی ہے .

اگر آپؐ نے خود قیادت نہ کرنا ہوتی تو آپؐ لشکر پر امیر اور نائب امیر اور بعض اوقات نائب النائب [رک بہ مؤتہ] بھی آپؐ ہی مقرر فرماتے ؛ قیادت سونپنے کا بھی وہی اصول تھا جو نماز کی امامت کے لیے مقرر تھا ، یعنی آپؐ کسی صاحب علم اور پختہ عمر کے آدمی کو اس کا امیر مقرر فرماتے (البخاری ، ۲ : ۲۱۰) ، مگر بعض اوقات بہادری اور علم و فہم اور بعض دیگر خصوصیات کی بنا پر نوجوانوں کو بھی قیادت سونپ دیتے تھے (جیسے کہ حضرت اسامہؓ بن زید کو قیادت سونپی) - لشکر کو رخصت کرتے وقت مدینہ منورہ سے باہر تک تشریف لے جاتے - الوداع کرتے وقت ان کو اور ان کے دین کو اللہ کی امان میں سونپتے (ابو داؤد) - روانہ کرتے وقت یہ نصیحت فرماتے تھے کہ خدا سے ہر حال میں ڈرتے رہنا اور اپنے ساتھی مسلمانوں کی خیر خواہی کرتے رہنا - پھر آپؐ فرماتے : خدا کے نام پر کافروں کے خلاف جہاد کرنا ؛ خیانت اور بد عہدی نہ کرنا ؛ کسی کو مُثلہ نہ بنانا ؛ کسی بچے اور کسی عورت کو قتل نہ کرنا (البخاری ، ۲ : ۲۵۱ ؛ مسلم ، حدیث ۱۷۴۴) - جب تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو اس کے سامنے تین باتیں پیش کرنا : (۱) اسلام قبول کرلو ؛ (۲) اگر اسلام قبول نہیں کرتے تو جزیہ ادا کرنا قبول کرو ؛ (۳) اگر جزیہ دینا بھی منظور نہیں کرتے تو پھر لڑنے کے لیے تیار جاؤ - اگر وہ اسلام یا جزیہ دینا قبول کر لیں تو ان سے جنگ روک دینا ؛ اگر وہ یہ باتیں قبول نہیں کرتے تو پھر اللہ کی مدد سے ان کے خلاف جہاد کرنا اور اگر تم کسی قلعے کا محاصرہ کرو اور قلعے کے لوگ اللہ اور اللہ کے رسول کی ذمہ داری پر اترنا چاہیں ، تو تم ہرگز قبول نہ کرنا ، مگر یہ کہ وہ تمہاری ذمہ داری پر اترنا قبول کریں ؛ کیوں کہ اگر تم اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ذمہ داری کو پورا نہ کر سکو ، تو یہ اللہ اور اللہ کے رسول کی ذمہ داری کو توڑنے سے بہتر ہے اور اسی طرح اگر کسی قلعے والے اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر اترنا قبول کریں تو ہرگز نہ ماننا ، مگر یہ کہ وہ تمہارے حکم پر اترنا منظور کریں ، کیوں کہ

marfat.com
Marfat.com

تم نہیں جانتے کہ تم ان میں حکم خداوندی جاری بھی کر سکتے ہو یا نہیں (مسلم، ۳ : ۱۳۵۷ تا ۱۳۵۸، حدیث ۱۷۳۱)۔ ایسے موقعوں پر آپؐ یہ بھی فرماتے: تم لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا، تنگی نہیں (کتاب مذکور، حدیث ۱۷۳۲)۔ آپؐ جنگ میں جنگی چال (خُدعہ) کے تو قائل تھے، مگر دھوکا اور فریب (الغدر) کے ہرگز قائل نہ تھے۔ آپؐ کا فرمان تھا کہ قیامت کے روز غدر کرنے والوں کا الگ جھنڈا ہوگا (کتاب مذکور، حدیث ۱۷۳۵)۔ امیر کے ساتھ ساتھ عام فوج کو بھی نصیحتیں فرماتے اور انھیں خاص طور پر اطاعت امیر کا حکم دیا جاتا (کتاب مذکور، ص ۱۴۶۵، حدیث ۱۸۳۴)۔ آخر میں دعا کر کے انھیں رخصت فرماتے (ابو داؤد)۔

اگر آپؐ نے خود کسی جنگ کی قیادت کرنا ہوتی تو آپؐ اپنی تمام ذمہ داریاں نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے۔ آپؐ کو جب کسی طرف سے جنگی کارروائی کی اطلاع ملتی تو آپؐ اپنے خاص احباب کی مجلس مشاورت طلب فرماتے اور اس مسئلے کو سب کے سامنے پیش کرتے؛ جو فیصلہ بھی ہوتا، خواہ آپؐ کی مرضی کے خلاف ہو (مثلاً غزوہ احد کے موقع پر باہر نکل کر مدافعت کرنے کا فیصلہ)، اس کی بہرحال پابندی فرماتے۔ دشمنوں کی مدافعت کے لیے جو بھی تدبیر سوچی جاتی آپؐ اس تدبیر کی انجام دہی میں صحابہؓ کے پوری طرح شریک رہتے، مثلاً خندق کھودنے میں (البخاری، ۲ : ۲۱۰)۔ اگر باہر نکل کر مدافعت کرنے کا فیصلہ ہوتا تو آپؐ پوری طرح زاد راہ لے کر نکلتے (البخاری، ۲ : ۲۴۳؛ باب حمل الزاد فی الغزو)۔

جب لشکر مدینہ منورہ سے باہر ڈیرے ڈال دیتا تو اپنے لشکر کا جائزہ لیتے؛ اگر کوئی اس میں نابالغ ہوتا (مسلم، ۳ : ۱۴۹۰، حدیث ۱۸۶۸) یا اگر کوئی ماں باپ کی مرضی کے خلاف شریک جہاد ہونا چاہتا (ابو داؤد، ۳ : ۳۸، حدیث ۲۵۲۹؛ النسائی، حدیث ۳۱۰۵؛ ابن ماجہ، حدیث ۲۷۸۲) تو اسے واپس بھیج دیتے؛ بقیہ لشکر کو لے کر روانہ ہوجاتے۔

روانگی کے دوران میں دشمن کی نقل و حرکت سے باخبر رکھنے کے لیے آدمی مقرر فرماتے (البخاری، ۲ : ۲۱۲؛ ابو داؤد ۳ : ۲۱، حدیث ۲۵۰۱)۔ اگر قریبی علاقے میں دشمن کے کسی جاسوس کی اطلاع ملتی تو اسے ڈھونڈھ نکالتے (البخاری، ۳ : ۱۳۷؛ مسلم، ۳ : ۱۴۴۱، حدیث ۲۴۹۴؛ ابو داؤد، ۳ : ۱۱۰، حدیث ۲۶۵۰)۔

آپؐ جنگی معلومات کو نہایت خفیہ رکھتے یہاں تک کے آپؐ کے انتہائی قریبی ساتھیوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ آپؐ کا ارادہ کدھر کا ہے (غزوہ تبوک اس کلیے سے مستثنٰی ہے)۔ راستے میں آپؐ تیز تیز چلنا پسند فرماتے (البخاری، ۲ : ۲۴۷)۔ رات کے آخری پہر میں سفر کرنا آپؐ کو زیادہ پسند تھا (ابو داؤد، ۳ : ۹۷، حدیث ۲۶۰۴)۔ راستے میں اونٹوں اور دوسرے جانوروں کی گردنوں سے گھنٹیاں (جرس) اتروا دی جاتیں (البخاری، ۲:۴۸ ۲؛ ابو داؤد، ۳ : ۵۳، حدیث ۲۵۵۴)۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ دشمن آپؐ کے اچانک پہنچ جانے سے حواس باختہ ہو جائے اور یوں خونریزی کی نوبت نہ آنے پائے۔

اگر کسی جگہ رات بسر کرنے کا فیصلہ ہوتا تو رات کے پہرے داروں نیز ارد گرد کے علاقے پر دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے نگران افراد کا تقرر فرماتے (البخاری، ۲ : ۲۰۲؛ ابو داؤد، ۳ : ۲۱، حدیث ۲۵۰۱)۔ رات راستے سے ہٹ کر بسر کی جاتی۔ دشمن کے متوقع حملے کی وجہ سے حالت جنگ کے علاوہ پہرے دار دستوں کے (بعض اوقات الگ الگ) شعائر مقرر فرماتے، تا کہ ایک دوسرے اور دوست دشمن کی شناخت میں آسانی رہے (ابو داؤد، ۳ : ۷۳، حدیث ۲۵۹۵ ببعد)۔ حملے کے لیے، رات ہوتی تو

marfat.com
Marfat.com

صبح کا اور صبح ہوتی تو دوپہر ڈھلنے کا انتظار فرماتے (البخاری، ۲ : ۲۳۹ ؛ ابو داود، ۳ : ۱۱۳، حدیث ۲۶۵۵؛ الترمذی، حدیث ۱۶۱۲) ۔ اگر اس بستی میں مسجد کے کوئی آثار دکھائی دیتے یا اذان کی آواز سنائی دیتی تو حملہ موقوف کر دیتے (البخاری، ۲ : ۲۳۵) اور اگر اس بستی میں سے اسلام کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوتی تو مقررہ وقت پر بلند آواز سے اللہ اکبر کے نعرے کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیتے (ابو داود، ۳ : ۱۱۴، حدیث ۲۶۵۶) ۔ حملہ کرنے سے قبل آپؐ یہ دعا پڑھتے : اللّٰھم مُنْزِلَ الکتاب مُجْرِیَ السَّحاب و ھازِمَ الاَحزاب ! اِھزِمھم و انصرنا علیھم (البخاری، ۲ : ۲۳۹) ۔ نیز حملے سے قبل : اللّٰھمّ اَنْتَ عضدی و نصیری، بک اَحُول و بک اصول و بک اُقاتل (ابو داود، ۳ : ۹۹، حدیث ۲۶۳۲) بھی پڑھنے کا معمول تھا۔ ان مختصر دعاؤں کے علاوہ نماز فجر میں قنوت نازلہ (جس سے متعلقہ تمام بحثوں کے لیے دیکھیے : ابن القیم : زاد المعاد، ۱ : ۲۷۳ تا ۲۸۳، مطبوعۂ کویت ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) اور خطبات میں نصرت خداوندی کے حصول اور اسلام کی فتح و نصرت کے لیے لمبی لمبی دعائیں بھی ضرور مانگتے ۔ اس وقت آپؐ پر ایسی رقت طاری ہوتی کہ صحابہؓ آپؐ پر ترس کھاتے (دیکھیے غزوۂ بدر، ابن ہشام)۔ خیبر پر حملے کے وقت: "اللہ اکبر خربت خیبر، و انّا اذا نزلنا بساحۃ قوم فساء صباح المنذرین" (البخاری، ۲ : ۲۳۶) آپؐ کی زبان پر جاری تھا۔ آپؐ صحابہ کرامؓ کو یہ تاکید فرمایا کرتے کہ اگرچہ دشمن تم پر حملہ کر چکا ہو، پھر بھی اگر وہ تمھارے حملے کے وقت کلمہ پڑھ لے تو اس سے تلوار فوراً اٹھا لی جائے (ابو داود، ۳ : ۱۰۴، حدیث ۲۶۴۴؛ مسلم، ۱ : ۹۵، حدیث ۹۵)۔ حملے سے قبل صحابہؓ کو مختلف مقامات پر تعینات فرماتے اور یہ تاکید کرتے کہ فتح ہو یا شکست تم اپنی جگہ ہرگز نہ چھوڑنا (ابو داود، ۳ : ۱۱۸، حدیث ۲۶۶۲) ۔ جنگ کے میدان پر آپؐ کی نظر اس قدر حاوی ہوتی تھی کہ جنگ بہر صورت آپؐ کے مرتب کیے ہوئے نقشے کے مطابق ہی لڑی جاتی ۔

جنگ کے دوران میں آفاق اور قدرتی مظاہر سے بھی مدد لیتے ۔ عام طور پر آپؐ سورج کو اپنے پیچھے اور دشمن کو اپنے آگے رکھتے ؛ ہوا کے رخ سے حملہ کرتے تاکہ گرد و غبار مسلم سپاہیوں کے بجائے دشمن کو پریشان کرے (ابو داود، ۳ : ۱۱۳، حدیث ۲۶۵۵) ۔ آپؐ صحابہؓ کو یہ تاکید فرماتے کہ تاک تاک کر تیر چلاؤ، (زیادہ اسلحہ ضائع نہ کرو) اور تلوار اس وقت نکالو جب دشمن تمھارے سر پر پہنچ جائے (ابو داود، ۳ : ۱۱۸، حدیث ۲۶۶۴) ۔ جنگ کے دوران میں مسلم خواتین کو بھی آپؐ ہمراہ لاتے تاکہ وہ زخمیوں کو پانی پلائیں اور اگر ضرورت پڑے تو انھیں اٹھا کر مدینہ منورہ یا مرکز عسکر تک پہنچا آئیں (مسلم، ۳ : ۱۴۴۲ تا ۱۴۴۴، حدیث ۱۸۰۹ تا ۱۸۱۲؛ الترمذی ۴ : ۱۳۹، حدیث ۱۵۷۵؛ ابو داود، ۳ : ۴۰، حدیث ۲۵۳۱)، دورانِ جنگ میں آپؐ ہمیشہ دشمن سے متصل سب سے اگلی صفوں میں ہوتے اور حضرت علیؓ جیسے شجاع بھی جنگ کی شدت میں آپؐ کے زیر سایہ پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے (ابن الجوزی، الوفا، باب شجاعت النبی) ؛ اسی طرح خطرات کے موقع پر آپؐ سب سے آگے ہوتے (البخاری، ۱۱۶/۵۶، ۲ : ۲۴۰) ۔ آپؐ ہمیشہ بزدلی اور جبن سے پناہ مانگتے (البخاری، ۲ : ۲۰۷) ۔ لڑائی میں اگر اور شدت آ جاتی اور آپؐ کی سواری مضطرب ہونے لگتی تو آپؐ سواری سے کود کر نیچے آ جاتے (البخاری، ۶۴/۵۲، ۳ : ۱۶۸ ؛ ابو داود، ۳ : ۱۱۴، حدیث ۲۶۵۸) ۔ فتح ہوتی یا ہزیمت آپؐ اپنی جگہ سے ایک انچ پیچھے ہٹنا بھی پسند نہ فرماتے ۔ لڑائی کے دوران میں اپنے ساتھیوں کے حوصلے بڑھاتے اور فرماتے : ارموا و

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

ارکبوا (ابو داؤد ، ۳ : ۲۹ ، حدیث ۲۵۱۲) کبھی ارشاد ہوتا : یا خیل اللہ ارکبی (حوالۂ مذکور).

اگر خدا تعالٰی کی مدد سے آپ کو فتح ہو جاتی تو سجدۂ شکر بجا لاتے (الترمذی ، ۴ : ۱۴۱، حدیث ۱۵۷۸؛ ابو داؤد ، ۳ : ۲۱۶ ، حدیث ۲۷۷۴) اور اس جگہ قیام عدل و انصاف کے لیے کم از کم تین ایام تک قیام فرما رہتے (البخاری، کتاب الجهاد؛ الترمذی، ۴: ۱۲۱ حدیث ۱۵۵۱؛ الدارمی ، حدیث ۲۴۶۱؛ ابو داؤد، ۳: ۱۴۴) ۔ علاقے کا مناسب بند و بست کرکے اور علاقے میں کسی امیر کا تقرر فرما کر ، مال غنیمت سمیت آپ بخیر و عافیت واپس تشریف لاتے ، جہاں مدینہ کے لوگ شہر سے باہر نکل کر آپ کا استقبال کرتے (ابو داؤد، ۳ : ۲۱۹ ، حدیث ۲۷۷۹ ؛ البخاری ، الجهاد، باب ۱۹۶ ، ۴ : ۳۱۸، الترمذی؛ حدیث ۱۷۱۸ [مزید تفصیلات کے لیے رک بہ غزوات نبوی]) .

۹۔ معمولات ملاقات [دیکھیے شمائل و اخلاق نبوی : دوستوں سے آپ کا ساوک] .

۱۰۔ معمولات عیادت و تعزیت [دیکھیے شمائل و اخلاق نبوی : بیماروں سے آپ کا سلوک].

۱۱۔ معمولات خطابت [دیکھیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت خطیب] .

۱۲۔ معمولات تبلیغ و رسالت [دیکھیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم بحیثیت مبلغ] .

۱۳۔ معمولات عدل و انصاف [دیکھیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت مقنن ؛ شمائل و اخلاق].

(ج) شمائل و اخلاق نبوی: یوں تو اللہ تعالٰی کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف علاقوں اور خطوں میں جو انبیاے کرام بھی مبعوث ہوئے ، وہ سب کے سب حسن اخلاق اور اعلٰی کردار کا جامع نمونہ تھے ، جن سے بھٹکی ہوئی انسانیت کو ہمیشہ اخلاق اور اعلٰی کردار کی رہنمائی حاصل ہوتی رہی ہے ؛ ارشاد باری ہے : اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (۶ [الانعام] : ۹۰) ، یعنی یہ انبیا وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے ہدایت دی تھی تو تم انھی کی ہدایت کی پیروی کرو ۔ انبیاے کرام کے اعلٰی و ارفع اخلاق کے حامل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ اہل دنیا ان کی پیروی سے اپنے معاشرے کو باہمی بھائی چارے اور الفت و محبت کے جذبوں سے معمور رکھیں : وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴ [النساء] : ۶۴) ، یعنی ہم رسول اس لیے بھیجتے ہیں کہ اللہ کے حکم سے ان کی پیروی کی جائے : مزید فرمایا : قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (۶۰ [الممتحنة]: ۴)، یعنی بےشک تمھارے لیے ابراہیم اور ان کے رفقا عمدہ نمونہ ہیں ۔ ان تمام انبیاے کرام میں ، سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ کی ذات اقدس پر تمام انبیا کے مکارم اخلاق کی عظیم الشان طریقے پر تکمیل ہو گئی ۔ خود آپ کا ارشاد ہے : بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ (کنز العمال ، ۲ : ۵ ، مطبوعہ حیدر آباد دکن) یا حسن الاخلاق (مالک : موطأ ، باب حسن الخلق) یعنی میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ دنیا میں مکارم اخلاق کی تکمیل کر دوں (نیز دیکھیے مشکوٰة المصابیح ، ۳ : ۱۲۹ ، حدیث ۴۷۷۰) ۔ قرآن کریم میں آپ کے حسن کردار کی تعریف میں کہا گیا : وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸ [القلم] : ۴) ، یعنی اور بلاشبہ آپ عظیم اخلاق کے حامل ہیں ۔ "خلق عظیم" کے جملے میں جو ظاہری اور معنوی محاسن جمیلہ پوشیدہ ہیں انھیں کی بنا پر دنیاے انسانیت کو بلا امتیاز رنگ و نسل آپ کی اتباع اور آپ کی پیروی کرنے کی تلقین کی گئی ہے : لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳ [الاحزاب] : ۲۱) ، یعنی البتہ تمھارے لیے آپ کی ذات اقدس میں عمدہ نمونہ موجود ہے ۔ صرف یہی نہیں

marfat.com
Marfat.com

بلکہ آپ ؐ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا : مَنْ یُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (۴ [النساء] : ۸۰) ، یعنی جو شخص آپ ؐ کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی ؛ دوسری جگہ آپ ؐ کی پیروی کرنے والوں کو اللہ کی طرف سے محبت اور بخشش کی نوید سنائی گئی : قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَ یَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ (۳ [اٰل عمرٰن] : ۳۱) ، یعنی اے پیغمبر ! آپ ؐ کہہ دیجیے کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تم سے محبت رکھے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا ۔

آپ ؐ کے مکارم اخلاق اور عادات حسنہ کے اپنے ہی نہیں، بلکہ دشمن بھی مداح تھے ، قرآن کریم میں ہے : قَدْ نَعْلَمُ اِنَّہٗ لَیَحْزُنُکَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ فَاِنَّھُمْ لَا یُکَذِّبُوْنَکَ وَ لٰکِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ (۶ [الانعام] : ۳۳)، یعنی بے شک ہمیں خوب معلوم ہے کہ ان (کافروں) کی باتیں آپ ؐ کو رنج پہنچاتی ہیں ، مگر یہ آپ ؐ کی تکذیب نہیں کرتے ، بلکہ یہ ظالم خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ۔ بعثت مبارکہ سے پہلے آپ ؐ کو مکہ مکرمہ میں اسی بنا پر محمد ؐ کے بجائے "الامین" اور "الصادق" کے نام سے پکارا جاتا تھا؛ یہی وجہ تھی کہ انھیں اپنی امانتیں سونپنے کے لیے آپ ؐ کے سوا کوئی شخص موزوں نظر نہ آتا تھا اور آپ ؐ کا گھر اچھا خاصا "دارالامانت" بنا ہوا تھا ۔ اسی بنا پر آپ ؐ کو ہجرت [رک باں] کے موقع پر حضرت علی ؓ کو یہ امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچانے کے لیے پیچھے چھوڑنا پڑا اور انھوں نے تین دن میں یہ امانتیں ان کے وارثوں کو پہنچائیں ۔ ابو سفیان سے ان کے زمانۂ کفر میں قیصر روم نے آپ ؐ کے بارے میں پوچھا : کیا نبوت سے پہلے آپ ؐ نے کبھی جھوٹ بولا ہے ؟ ابو سفیان ؓ نے کہا: نہیں؛ پھر اس نے پوچھا کہ کیا کبھی آپ ؐ نے کسی سے دھوکا کیا ہے ؟ ابو سفیان نے کہا : نہیں (البخاری ، ۱ : ۷ ، کتاب ۱ ، باب ۶) ۔ حضرت ابو ذر ؓ غفاری کے بھائی اُنیس ؓ نے آپ ؐ کو مکہ میں دعوت و تبلیغ میں مصروف دیکھا تو اپنے بھائی ابو ذر ؓ کو جا کر بتلایا : میں نے دیکھا کہ آپ ؐ لوگوں کو اعلٰی اخلاق اپنانے کا سبق دیتے ہیں (مسلم ، ۴ : ۱۹۲۳، حدیث ۲۴۷۴ ؛ البخاری ، ۴ : ۱۲۱ ، الادب) ۔ بیت اللہ کی تعمیرِ نو کے موقع پر جب اھل مکہ نے ایک دوسرے کے مقابلے میں تلواریں کھینچ لی تویں تو یہ آپ ؐ ہی تھے جنھیں دیکھ کر قریش نے کہا تھا : ھذا الامین قد رضینا بما قضی بیننا (ابن سعد ، ۱ : ۱۴۶) یعنی یہ تو امین ہیں ، ہم ان کے فیصلر پر راضی ہیں ۔

آپ ؐ کے کردار کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جن لوگوں نے آپ ؐ کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے وہ سب آپ ؐ کے حسن کردار کے مدّاح ہیں ۔ حضرت خدیجۃ الکبرٰی ؓ (م ۱۰ نبوی ۳ ق ھ/۶۱۹ء) نے آپ ؐ کے ساتھ تقریباً ۲۵ سال بسر کیے؛ ان کا کہنا ہے کہ آپ ؐ صلہ رحمی کرنے والے ، مقروض کا بوجھ اٹھانے والے ، محتاج کو کما کر دینے والے ، مہمان نوازی کرنے والے اور مصائب میں لوگوں کے مددگار تھے (البخاری ، ۱ : ۵، کتاب بدء الوحی) ۔ حضرت عائشہ ؓ کو تقریباً دس سال تک آپ ؐ کے انتہائی قریب رہ کر اخلاق عالیہ کے مشاھدے کا موقعہ ملا ۔ ان سے کسی نے آپ ؐ کے اخلاق کی بابت پوچھا تو فرمایا : کیا تم قرآن نہیں پڑھتے ، کیونکہ قرآن ہی آپ ؐ کا اخلاق تھا (ابن سعد ، ۱ : ۳۶۴) ، یعنی جو کچھ قرآن نے کہا آپ ؐ نے سب سے پہلے خود اس پر عمل پیرا ہو کر دکھایا ۔ ایک موقع پر انھوں نے آپ ؐ کے اخلاق حسنہ کی یوں تعریف کی : آپ ؐ تمام لوگوں میں سب سے عمدہ اخلاق والے تھے ؛ آپ ؐ نہ تو قصداً اور نہ بلا قصد فحش گوئی کرتے ؛ نہ بازاروں میں

marfat.com
Marfat.com

شور و غوغا کرتے اور نہ ہی برائی کا بدلہ برائی سے دیتے ، بلکہ آپؐ معاف کرنے اور درگزر کرنے والے تھے (الترمذی : شمائل ، ص ۳۷۸ ، بمع شرح انوار محمدی ؛ ابن الجوزی : الوفا ، ۲ : ۴۱۶)۔ ایک دوسری روایت میں انہی سے منقول ہے کہ کوئی شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے زیادہ اچھے اخلاق والا نہ تھا؛ آپؐ کے ساتھیوں میں سے جس کسی نے بھی آپؐ کو بلایا تو آپؐ نے اس کی آواز پر لبیک کہا (الوفا)۔ ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں : آپؐ نے اپنے کسی خادم یا خادمہ کو کبھی نہیں مارا پیٹا (مسلم : الصحیح، الفضائل ، حدیث ۲۳۲۸ ؛ ابن ماجہ : النکاح ، حدیث ۱۹۸۴) اور نہ ہی اپنے پر کسی زیادتی کا بدلہ لیا بجز اس کے کوئی اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو نظر انداز کر دے؛ آپؐ کے سامنے کسی نے دو باتیں پیش نہیں فرمائیں، مگر آپؐ نے انہیں میں سے ، اس کے حق میں ، آسان کو پسند کیا ، بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو (الترمذی : شمائل ، ص ۳۸۹ ؛ ابو داؤد ، ۵ : ۱۴۲ ، حدیث ۴۷۸۵ تا ۴۷۸۷ ؛ مسلم ، ۴ : ۱۸۱۳ ، الفضائل ، حدیث ۲۳۲۷ ؛ الوفا ، ۲ : ۴۲۰)۔ حضرت انسؓ بن مالک نے دس سال تک شب و روز بطور خادم کے آپؐ کی خدمت میں گزارے ، وہ فرماتے ہیں : آپؐ نے کبھی کسی کام کو ، جو میں نے کیا ہو ، یہ نہیں فرمایا کہ یہ تو نے کیوں کیا ہے اور نہ ہی جو کام میں نے نہ کیا ہو ، اس کی بابت یہ فرمایا کہ یہ تو نے کیوں نہیں کیا (الترمذی : شمائل ، ص ۳۸۴ بعد؛ ابن سعد (الطبقات ، ۱ : ۳۸۲) نے حضرت انسؓ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے : میں نے آپؐ کی دس سال تک خدمت کی ہے ، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپؐ (امتیازاً) اپنے ہم مجلس سے دور ہو کر بیٹھے ہوں، یا کسی مصافحہ کرنے والے سے آپؐ نے پہلے ہاتھ کھینچا ہو ، تا آنکہ وہ خود ہی ہاتھ نہ کھینچ لیتا ، اور یا کسی شخص نے آپؐ سے کھڑے ہو کر گفتگو کرنا چاہی ہو اور آپؐ پہلے پھر آئے ہوں ، تا آنکہ وہ خود نہ پھر جاتا . . . . یا کسی شخص نے اپنا سر (سرگوشی کے لیے) آپؐ کے قریب کیا ہو ، اور آپؐ نے اپنا سر ، اس کے اپنے سر کو ہٹانے سے پہلے ہٹا لیا ہو؛ ایک دوسری روایت میں انہیں سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نہ تو برا بھلا کہنے والے تھے؛ نہ فحش گو اور نہ لعن طعن کرنے والے، جب کسی کو عتاب کرنا ہوتا تو فرماتے : اسے کیا ہو گیا اس کی پیشانی خاک آلود ہو (کتاب مذکور ، ۱ : ۳۶۹)۔ حضرت علیؓ ، جنھوں نے نبوت کے ۲۳ برس اور اس سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا تھا ، آپؐ کے خلق عظیم کی بابت فرمایا کرتے تھے : آپؐ خندہ جبین (دائم البشر) نرم خو اور طبعاً مہربان تھے ؛ آپؐ سخت مزاج اور تنگ دل قطعاً نہ تھے؛ کوئی برا اور فحش لفظ زبان سے نہ نکالتے ، کسی کی عیب جوئی اور بدگوئی نہ کرتے ؛ جو آپؐ کو پسند نہ ہوتا اس سے منہ پھیر لیتے ؛ آپؐ نے اپنے نفس کو تین باتوں، یعنی فضول جھگڑا، تکبر اور بے معنی گفتگو سے الگ رکھا تھا ؛ دوسروں کی بابت آپؐ تین باتوں، یعنی کسی کی مذمت کرنے ، عیب گیری اور تجسس کرنے سے اجتناب فرماتے تھے اور وہی بات کہتے ، جو انجام کے اعتبار سے ، فائدہ مند ہوتی ؛ لوگوں کے ساتھ ہنستے اور تعجب کرنے میں شریک رہتے ؛ مسافر اور اجنبی کی گفتگو اور سائل کے سوال کی درشتی کو نظر انداز کر دیتے . . . . آپؐ کو صرف سچی تعریف پسند تھی ؛ کسی کی بات کو درمیان سے کاٹنے سے گریز فرماتے (الترمذی : شمائل ، ص ۳۹۳ تا ۳۹۴)۔ مزید فرمایا: نہایت سخی ، راست گو ، نرم طبیعت اور خوش مزاج تھے۔ کوئی اگر اچانک دیکھتا تو ڈر جاتا ، مکر جب وہ آپؐ سے معاملہ کرتا تو محبت کرنے لگ جاتا

marfat.com
Marfat.com

(حوالۂ مذکور) ۔ ایک اور صحابی حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ عرصۂ دراز تک آپؐ کی زیر کفالت رہے ، فرماتے ہیں : آپؐ نرم طبیعت تھے ؛ سخت گیر نہ تھے۔ کسی کی اہانت آپؐ کو کبھی منظور نہ ہوتی ؛ معمولی معمولی باتوں میں لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ؛ کسی چیز کو برا نہ کہتے ؛ کھانا ، جیسا بھی ہوتا کھا لیتے ، کبھی اسے برا نہ کہتے ؛ کبھی ذاتی معاملے میں غصہ نہ کرتے ، البتہ اگر کوئی امر حق میں مخالفت کرتا تو غضبناک ہو جاتے (قاضی عیاض : الشفا ، ص ۷۰ ؛ ابن سعد ، ۱ : ۴۲۲ تا ۴۲۳).

حضرت عمروؓ بن العاص کو آپؐ کے انتہائی قریب رہ کر تقریباً چار سال تک اخلاق نبوی کے مشاہدے کا موقعہ ملا ۔ وہ فرماتے ہیں کہ آپؐ عام لوگوں سے گفتگو ، توجہ اور عمدہ برتاؤ کے ذریعے ایسا معاملہ فرماتے کہ اسے اپنے متعلق یہ گمان ہونے لگتا کہ اس کا درجہ آپؐ کے ہاں سب سے زیادہ ہے ۔ وہ خود اپنی بابت فرماتے ہیں کہ مجھے بھی اپنے متعلق یہ گمان ہوا تھا ؛ پھر ایک بار موقع ملا تو میں نے پوچھا : یا رسولؐ اللہ ! کیا میں (آپؐ کی نظر میں) بہتر ہوں یا ابو بکرؓ ؟ فرمایا : ابو بکرؓ ؛ پھر عرض کیا : میں بہتر ہوں یا عمرؓ ؟ فرمایا : عمرؓ ؛ پھر پوچھا : کیا میں بہتر ہوں یا حضرت عثمانؓ ؟ فرمایا : عثمانؓ ۔ آپؐ نے حقیقت واضح کر کے میری غلط فہمی دور کر دی ۔ مجھے افسوس ہوا کہ کاش میں نے آپؐ سے یہ سوال نہ پوچھا ہوتا (الترمذی : شمائل ، ص ۳۸۲ تا ۳۸۳) ۔

علماے سیرت نے سیرت طیبہ کے محاسن کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے : (۱) فطری و جبلی اوصاف ؛ (۲) اکتسابی محاسن (دیکھیے قاضی عیاض : الشفا بتعریف حقوق المصطفی ، ۳۸ تا ۳۹ ، مطبوعہ بریلی ، بدون تاریخ) ۔ یہ تقسیم دوسرے انسانوں کی نسبت ہے ، ورنہ آپؐ کے لیے ان میں کوئی تفاوت نہ تھا : آپؐ کے تمام اوصاف ذاتی اور فطری تھے اور وہ آپؐ کی جبلّت و فطرت کا حصہ تھے (حوالۂ مذکور) ۔ ان تمام کی تفصیلات تو یہاں نہیں دی جا سکتیں ، البتہ ذیل میں ان میں سے چند ایک کی طرف مختصر اشارات پیش کیے جاتے ہیں :

(الف) فطری و جبلی اوصاف : (۱) جسمانی حسن و وجاہت : آپؐ کے مختلف دیکھنے والوں (مثلاً حضرت علیؓ ، انسؓ بن مالک ، ابو ہریرہؓ ، براءؓ ابن عازب ، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ ، ہندؓ ابن ابی‌ہالہ ، ابو حذیفہؓ ، جابرؓ بن سمرہ ، ام معبدؓ ، ابن عباسؓ ، معرضؓ بن معیقب ، ابو الطفیلؓ ، العداءؓ بن خالد ، حکیم بن حِزام وغیرہ) کی یہ متفقہ شہادت ہے کہ قدرت نے آپؐ کو مردانہ حسن و وجاہت کا انتہائی حسین اور باوقار پیکر بنایا تھا ۔ حضرت براءؓ بن عازب فرماتے ہیں : میں نے کسی زلف والے کو سرخ (دھاری دار) جوڑے میں آپؐ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا (الترمذی : شمائل ، ص ۵ ، مع شرح انوار محمدی) ۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہا کرتے تھے : میں نے آپؐ سے حسین کسی کو نہیں دیکھا ، لگتا تھا سورج اپنے چہرے کے ساتھ متحرک ہے ؛ جب آپؐ مسکراتے تو دیواریں کھل اٹھتی تھیں (القسطلانی : المواہب، ۴ : ۷۳)۔ حضرت براءؓ بن عازب فرمایا کرتے تھے : آپؐ کا چہرہ تلوار کی طرح ، (پھر فرمایا) نہیں ، بلکہ چاند کی طرح چمکدار اور مدّور تھا (البخاری، ۲ : ۳۹۲، المناقب)۔ حضرت کعبؓ بن مالک فرماتے ہیں : جب آپؐ خوش ہوتے تو سچ مچ چاند کا ٹکڑا دکھائی دیتے (کتاب مذکور ، ۲ : ۳۹۳ ؛ قاضی عیاض : الشفا ، ۳۰) ۔ حضرت جابرؓ بن سمرہ کہتے ہیں : آپؐ کا چہرہ تلوار ، پھر کہا نہیں ، بلکہ سورج اور چاند کی طرح جگمگاتا تھا اور گولائی مائل تھا (القسطلانی ، ۴ : ۷۴) ۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ لگتا تھا

marfat.com
Marfat.com

آپؐ کا بدن چاندی سے بنایا گیا (ابن الجوزی : الوفا ، ۲ : ۳۰۶)۔ اس بارے میں حضرت علیؓ کی روایت بڑی جامع ہے؛ وہ فرماتے ہیں : جس نے آپؐ کو اچانک دیکھا، وہ دہشت زدہ ہوگیا ؛ جس نے کچھ عرصہ آپؐ کے ساتھ گزارا، وہ آپؐ سے محبت کرنے لگا۔ میں نے آپؐ جیسا شخص نہ کبھی پہلے دیکھا اور نہ کبھی بعد میں (الترمذی : شمائل ، ۱ ، ۱۲ ؛ مشکوٰۃ ، ۳ : ۱۳۶ ، حدیث ۵۷۹۱ نیز ص ۱۳۲ تا ۱۳۸ ؛ الزرقانی ، ۴ : ۷۰ تا ۸۰)۔

(۲) نظافت طبع : اس مردانہ حسن و وجاہت کے ساتھ ساتھ ، قدرت نے آپؐ کو اعلٰی درجے کا نظیف الطبع اور نفاست پسند بنایا تھا ، آپؐ فرمایا کرتے تھے : صفائی (تو) نصف ایمان ہے (مسلم ، ۱ : ۲۰۳ ، حدیث ۲۲۳) ؛ نیز فرمایا : دین کی بنیاد ہی صفائی پر ہے (قاضی عیاض : الشفا، ص ۳۰)۔ آپؐ کو فطری طور پر ظاہری و معنوی گندگی سے شدید کراہت تھی ؛ اگرچہ ایک وضو [رک بآں] سے متعدد نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں اور صحابہؓ کرام اکثر پڑھتے بھی تھے، مگر آپؐ اکثر ہر نماز کے لیے الگ وضو فرماتے (البخاری ، ۱ : ۶۵ ، ۶۶ ، کتاب الوضوء)۔ فتح مکہ کے موقع پر ایک ہی وضو سے متعدد نمازیں پڑھیں تو صحابہؓ کرام کو تعجب ہوا؛ چنانچہ حضرت عمرؓ سے نہ رہا گیا اور آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا : یا رسول اللہ ! آپؐ نے آج وہ کام کیا ہے جو آپؐ پہلے نہیں کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا : اے عمرؓ میں نے دانستہ ایسا کیا ہے (تاکہ اس کا جواز ثابت ہوسکے) (مسلم ، ۱ : ۲۳۲ ، حدیث ۲۷۷)۔ ہر جمعے کو غسل کرنے کا معمول تھا۔ آپؐ نے صحابہؓ کرام کو بھی حکم دیا تھا کہ جمعہ کے دن غسل کر کے آیا کرو (البخاری، ۱ : ۲۲۴، کتاب الجمعۃ)۔ ایک روایت میں آپؐ نے اسے واجب قرار دیا (حوالۂ مذکور)۔ اس کے

علاوہ آپؐ ہمیشہ مسواک کرنے ، کلی اور اِستنشاق کرنے کا شدت سے اہتمام فرمایا کرتے تھے (کتاب مذکور، ص ۲۲۴ تا ۲۲۵)۔ جسم مبارک کو اگرچہ فطری طور پر خوشبو کی ضرورت نہ تھی ، مگر اس کے باوجود خوشبو ہمیشہ آپؐ کے استعمال میں رہی؛ عموماً سکہ خوشبو، جو بقول علی جونپوری، بہت سی خوشبوؤں سے بنی ہوتی تھی ، آپؐ کو پسند تھی (انوار محمدی شرح شمائل ، ۲۲۶)۔ اگر کوئی خوشبو تحفہ دیتا تو اسے کبھی واپس نہ کرتے (حوالۂ مذکور)۔ آپؐ کو خوشبوؤں میں مشک ، عنبر اور عود کی خوشبوئیں زیادہ محبوب تھیں (ابن الجوزی : الوفا ، ۲ : ۵۹۲)۔ یوں فطری طور پر آپؐ کا جسم خوشبو کا منبع تھا اور آپؐ کے جسم اطہر سے ہمیشہ خوشبو کی لپٹیں نکلتی رہتی تھیں ؛ حضرت انسؓ کے بقول : آپؐ کے جسم مبارک کی خوشبو مشک و عنبر سے بھی زیادہ فرحت بخش ہوتی تھی (البخاری، ۲ : ۳۹۴، المناقب)۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ جس راستے سے گزرتے تو اس راستے میں دیر تک خوشبو کی مہک بکھری رہتی (قاضی عیاض : الشفا ، ص ۳۱)۔ حضرت علیؓ نے جب آپؐ کے جسم مبارک کو (بعد از وصال) غسل دیا۔ فرماتے ہیں کہ آپؐ کے بدن پر ذرہ برابر بھی میل کچیل نہ تھی ، تو میں نے کہا : آپؐ زندہ رہے تو بھی پاک اور طاہر رہے اور وصال ہوا تو بھی نظافت میں فرق نہ آیا (کتاب مذکور ، ص ۳۲)۔ حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ آپؐ کے پسینے کو ملا کر انتہائی نفیس خوشبو تیار کرتی تھیں (مسلم ، ۴ : ۱۸۱۵ ، حدیث ۲۳۳۱ ؛ مشکوٰۃ ، ۳ : ۱۳۴ تا ۱۳۵ ، حدیث ۵۷۸۸)۔ آپؐ کے کپڑے اگرچہ زیادہ قیمتی نہ ہوتے ، مگر ہمیشہ صاف ستھرے ہوتے تھے۔ آپؐ کا تمام زندگی ، قرآن کریم کے اس حکم : وَ ثِیَابَکَ فَطَہِّرْ (۷۴ [المدثر] : ۴) ، یعنی اور اپنے کپڑوں کو صاف ستھرا رکھیے ، پر عمل رہا۔

marfat.com
Marfat.com

سر مبارک پر تیل لگا کر کنگھی کرنے کا معمول تھا۔ جسم کے زائد بال صاف کرنے کا آپؐ ہمیشہ اہتمام فرماتے رہے اور ان کی صفائی کو آپؐ فطرت سے تعبیر کرتے تھے (مسلم، ۴: ۱۸۱۹، حدیث ۲۳۳؛ ابن الجوزی: الوفا، ۲: ۵۸۵ تا ۵۹۱؛ الترمذی: شمائل، ۴۰ تا ۵۱)۔ اسی نظافت پسندی کا یہ نتیجہ تھا کہ دوسرے افراد کو بھی آپؐ صاف ستھرا دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر کسی کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھتے تو فرماتے: اس سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے دھو لیا کرے (ابو داؤد، ۴: ۳۳۳، حدیث ۴۰۶۲)۔ اگر کسی کے بالوں کو پراگندہ دیکھتے تو فرماتے: کیا یہ اپنے بالوں میں کنگھی نہیں کر سکتا (حوالۂ مذکور)۔ اگر کوئی اپنی وسعت کے مطابق مناسب کپڑے نہ پہنتا تو فرماتے: خدا نے جو نعمت دی ہے اس کا اثر بھی شکل و صورت میں واضح ہونا چاہیے (کتاب مذکور، حدیث ۴۰۶۳)۔

اسی نظافت طبع کا نتیجہ تھا کہ آپؐ کو بدبو دار اشیا، مثلاً کچے پیاز اور لہسن سے نفرت تھی اور فرمایا کرتے تھے: جو کوئی ان اشیا کو کھائے وہ مسجد میں نہ آئے (الترمذی، ۴: ۶۲۱، حدیث ۱۸۰۶، ۱۸۰۷)۔ راستوں اور سایہ دار درختوں کے نیچے بول و براز کا عام رواج تھا؛ آپؐ نے اسے سخت ناپسند کیا اور ایسا کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔ آپؐ مسجد کی صفائی کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے، وہاں ایک خاتون ام محجن جھاڑو دیا کرتی تھیں مسجد میں بچوں اور ہوش و حواس سے عاری لوگوں کے جانے کی ممانعت فرما دی؛ خرید و فروخت کرنا بھی سخت منع تھا۔ گاہے بگاہے مسجد میں خوشبو کی انگیٹھیاں بھی جلائی جاتی تھیں [رک بہ مسجد]۔

(۳) شرافت حسب و نسب: آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے حسب و نسب کے اعتبار سے نجیب الطرفین اور شریف النسب پیدا کیا تھا؛ آپؐ کے ددھیالی اور ننھیالی خاندان کا ہر فرد عزت و حشمت اور عفت و عصمت کا بہترین نمونہ تھا۔ آپؐ کے دونوں طرف کے آبا و اجداد فیاضی، نیک نامی اور سرداری میں مرجع انام رہے۔ آپؐ انبیا میں سے حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی اولاد، اہل عرب میں سے قریش اور قریش میں سے بنو ہاشم سے تعلق رکھتے ہیں [نیز دیکھیے اس سلسلے کا ابتدائی مقالہ]۔ حضرت ابو ہریرہؓ آپؐ سے نقل کرتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد، سب سے بہتر زمانے میں مبعوث کیا ہے (قاضی عیاض: الشفا، ص ۳۷)۔ حضرت عباسؓ سے ایک دوسری روایت یوں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام مخلوق میں سب سے افضل مخلوق (انسانوں) میں پیدا کیا؛ بہترین زمانے میں مبعوث کیا؛ قبیلوں میں سے سب سے بہتر قبیلہ اور گھروں میں سب سے بہتر گھر میرے لیے انتخاب کیا؛ پس میں حسب و نسب کے اعتبار سے سب سے بہتر ہوں (البیہقی)۔

(۴) فہم و فراست: اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو فطری طور پر ذکاوت طبع، نظافت نفس اور جودت عقل و فکر میں بے مثال پیدا کیا تھا؛ گو آپؐ نے کسی سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا، پھر بھی آپؐ تمام علوم و فنون کا سرچشمہ اور حقائق و معارف کا منبع تھے۔ جتنے علوم [رک بہ علم] آپؐ کی ذات بابرکات سے نکلے ہیں، دنیا میں آج تک کسی انسان کو اتنے علوم کی ترویج کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ آپؐ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہر جملہ علمی دنیا میں نئی سے نئی راہ پیدا کرنے کا موجب بنا۔ آپؐ نے اپنی زندگی مبارک میں جو عظیم الشان ورثہ چھوڑا ہے چودہ صدیاں بیت جانے کے باوجود بھی کائنات کے لیے سرچشمہ ہدایت اور بنی نوع انسان کے لیے چراغ راہ ہے۔

سیرت طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ ہر

marfat.com
Marfat.com

معاملے کا بڑی گہرائی اور تفصیل سے جائزہ لیتے تھے اور پھر اس کے متعلق جو فیصلہ صادر فرماتے وہ اتنا درست اور صحیح ہوتا تھا کہ تمام دنیا کے انسان باہم مل کر بھی اس سے بہتر فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مختلف معاملات میں آپ کی اختیار کردہ حکمت عملی دور جدید میں کیے جانے والے سائنسی اکتشافات سے بہت قریب تھی۔

(۵) جودت طبع: خالق کائنات کی طرف سے آپ کو جو لازوال اوصاف عطا ہوئے تھے، ان میں آپ کی طبیعت کی ذکاوت و فطانت بطور خاص قابل ذکر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کے تیز اور رسا ذہن کا ٹھیک ٹھیک بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

آپ نے تقریباً دس سال کے مختصر عرصے میں، جتنا عظیم الشان کام کر دکھایا وہ صدیوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس عرصے (از ۱۲ ربیع الاول ۱ تا ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ) میں آپ کو دشمنوں کے خلاف تقریباً چھوٹی بڑی ۸۲ مہمات سر کرنا پڑیں، ان میں سے ۲۷ (غزوات) میں آپ نے خود بہ نفس نفیس شرکت فرمائی اور بقیہ ۵۴ (سرایا) میں دیگر صحابہ کرام کو قیادت سونپی گئی (الواقدی، ۱: ۷ ببعد طبع Marsden James، آکسفرڈ ۱۹۶۶ء) - ان تمام کی نقشہ سازی اور منصوبہ بندی کا کٹھن کام آپ نے خود ہی انجام دیا۔ سرایا میں گو عملاً آپ شریک نہ ہوتے تھے، مگر ان تمام کی ضروری منصوبہ بندی آپ ہی فرماتے تھے۔ ان میں سے ایک مہم بھی انجام اور مآل کے اعتبار سے ناکام نہیں ہوئی۔ ان جنگی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ جن کی اوسط سالانہ ۸۔۲ نکلتی ہے، صحابہ کرام کی تعلیم و تربیت اور اسلامی حکومت کی تاسیس کا کام بھی جاری رہا۔ ان امور میں سے ہر امر اپنی جگہ اتنا اہم ہے کہ اگر اسے مدت مدید میں بھی حاصل کیا جاتا تو قابل قدر تھا۔

غزوات و سرایا میں اکثر و بیشتر آپ کی ذکاوت طبع کا اظہار ہوتا رہتا تھا [رک بہ غزوات]۔ آپ حیرت انگیز طریقے سے دشمن کی تعداد کا پتا چلا لیتے تھے، مثلاً غزوہ بدر میں دشمن کی تعداد کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ اتفاقاً دشمن کے پانی پلانے والے (سقاء) پکڑے گئے۔ انہیں آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے ان سے پوچھا: دشمن کے لشکر کی تعداد کیا ہے؟ انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا اچھا یہ بتاؤ کہ وہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا ایک دن دس اور دوسرے دن ۹۔ آپ نے فرمایا کہ دشمن نو سو اور ہزار کے درمیان ہے (الواقدی، ص ۵۳)۔ غزوات و سرایا میں آپ نئی سے نئی حکمت عملی اختیار فرماتے، جس سے دشمن اپنی کثرت تعداد کے باوجود مغلوب ہو جاتا: غزوۂ بدر کے موقع پر صف بندی؛ غزوہ احد میں پہاڑ کا پشت پر رکھنا؛ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنا؛ غزوہ خیبر میں صبح سویرے اچانک دشمن کے سر پر پہنچ کر اسے حواس باختہ کر دینا؛ فتح مکہ کے موقع پر ہر قسم کی تدابیر اختیار کرکے آخر دم تک دشمن کو حملے کی خبر تک نہ ہونے دینا اور غزوہ طائف میں دبابہ اور منجنیق کا استعمال اس کی روشن مثالیں ہیں [رک بہ غزوات؛ نیز خطاب: الرسول القائد، مطبوعہ قاہرہ]۔

صحابہ کرام کی عملی تربیت اور ذخیرۂ احادیث کی صورت میں آپ نے دنیا کے لیے جو لافانی ذخیرہ چھوڑا وہ بھی آپ کی فطانت و ذہانت کے عملی ثبوت کے لیے کافی ہے۔ احادیث مبارکہ کا ہر جملہ اور ہر لفظ علم و حکمت، مصالح دینی و دنیوی کا منبع اور مخزن ہے۔ احادیث کی ہر ترکیب بجائے خود اتنی جامع ہے کہ اس سے فصحائے عرب پر حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ اسلام لانے میں تأمل نہیں کرتے تھے۔

(۶) وحی ربانی سے ہمہ وقتی تعلق: ان سب سے

marfat.com
Marfat.com

سرفراز اور آپ کی سب سے بڑی خصوصیت، آپ پر وحی ربانی بالخصوص قرآن کریم کا نزول مبارک ہے ۔ آپ کی یہ خصوصیت آپ کو جملہ انسانوں سے ممتاز کرتی ہے ۔ یہ خصوصیت اکتساب و اجتہاد کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ محض انعام و اکرام خداوندی کے ظہور کا ثمرہ تھی (دیکھیے ۳ [آل عمرٰن]: ۱٦۴؛ ۷۲ [الجن]: ۲٦تا۲۸) ۔ اسی وحی و الہام کے ذریعے آپ اللہ تعالٰی کے ہاں سے اگلی پچھلی اور دور دراز کی خبروں سے آگاہی پاتے تھے (دیکھیے ۳ [آل عمرٰن ۴۴؛ ۳۸ [صٓ]: ٦۹).

(۷) عصمت نبوی : اس کے علاوہ آپ کی عظمتوں اور رفعتوں کا یہ بھی ایک نہایت شاندار پہلو ہے کہ آپ ہر چھوٹی بڑی انسانی و بشری خطا و نسیان اور ہر کبیرہ و صغیرہ لغزش سے مبرا اور منزہ تھے؛ یوں تو قرآن کریم میں متعدد جگہ آپ کی سب اگلی پچھلی خطاؤں کی معافی کا ذکر ہے (مثلاً ۴۸ [الفتح] : ۲)، مگر واقعةً آپ کی سیرت میں ذنب اور گناہ نام کی کوئی بھی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو دوسرے انسانوں میں موجود ملتی ہے.

(ب) خصائل مکتسبہ : یعنی وہ عادات شریفہ جو ہر صاحب عقل و فکر یا ، بقول قاضی عیاض ، جمہور عقلا کے نزدیک مدح و ستائش کی مستحق ہیں اور جن کی بنا پر ان عادات کے حامل کو عزت و عظمت کا مستحق خیال کیا جاتا ہے ۔ یہ عادات عموماً طویل محنت و ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہیں ۔ ان عادات شریفہ کا مفہوم یہ ہے کہ قوای نفس افراط و تفریط کے بجائے اعتدال و اقتصاد کی راہ پر گامزن ہو جائیں اور ان میں میل اور کجی کا شائبہ بھی باقی نہ رہے (قاضی عیاض: الشفا، ص ۴۳)۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس لحاظ سے یہ امتیاز رکھتے ہیں کہ آپ کی ذات بابرکات میں وہ تمام اوصاف اور محاسن خلقی اور فطری طور پر جمع تھے، جن کو سلیم الطبع اور راست فکر لوگ عظمت و رفعت کا معیار سمجھتے ہیں ۔ آپ کو ان عادات کے لیے نہ تو تربیت کی ضرورت پیش آئی اور نہ محنت و ریاضت کی ، بلکہ خالق فطرت نے آپ کو انہیں اوصاف پر تخلیق کیا اور ان محاسن کو آپ کی طبیعت میں راسخ کر دیا (الزرقانی : شرح المواہب ، ۴ : ۲۴۳ تا ۲۵۳ ببعد) ۔ آپ خود فرمایا کرتے تھے : اَدَّبَنِیْ رَبّی فَاَحسَنَ تَأدیبی (الشفا ، ص ۴٦ ، حاشیہ ۲۹) ، یعنی اللہ تعالٰی نے میری تربیت خود فرمائی اور خوب فرمائی ہے ۔ یہ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ زمانۂ قبل از بعثت میں بھی آپ محاسن و کمالات انسانیہ کا پیکر تھے ؛ آپ نے اس وقت بھی کوئی کام ایسا نہیں کیا جسے غلط کہا جا سکتا ہو ، آپ کا ارشاد تھا : لمانشأتُ بُغضتْ اِلیّ الاوثانُ و بغض الیّ الشعراء و لم اُھم بشیء مما کانت الجاھلیة تفعلهٗ (کتاب مذکور ، ص ۴۴) ، یعنی مجھے پیدایشی طور پر بتوں اور ان کی پوجا نیز شعرا سے نفرت تھی اور میں نے اس وقت بھی کسی ایسے کام کا ارادہ نہیں کیا جو زمانۂ جاھلیت میں لوگ کیا کرتے تھے.

شمائل و عادات کے سلسلے میں ایک لفظ سنت [رک باں] کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا ، جس کا لفظی مفہوم تو راستہ اور طریقہ ہے ، مگر اصطلاحی طور پر اس سے سیرت طیّبہ کے وہ افعال حسنہ مراد ہوتے ہیں، جو آپ کی تمام زندگی میں التزاماً پائے جانے کی وجہ سے گویا آپ کی فطرت ثانیہ بن چکے تھے اور یہ عادات و خصوصیات بغیر تکلف اور تصنّع کے آپ کی طبیعت مبارکہ سے صادر ہونے کی بنا پر منہاج نبوی کا مرتبہ حاصل کر چکی تھیں ۔ یہ نہیں کہ کبھی تو ان کا صدور ہوا اور کبھی نہیں ہوا ۔ آپ کو ہمیشہ ایسی عادات ناپسند رہیں جو کبھی تو ہوں اور کبھی نہ ہوں۔ حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں آپ کے نزدیک سب سے اچھا عمل وہ تھا جس پر مداومت ہو (البخاری ،

marfat.com
Marfat.com

۳ : ۲۲۲)؛ آپؐ فرمایا کرتے تھے: خدا کو تمہارا وہ عمل زیادہ پسند ہے جس پر ہمیشگی اختیار کی جائے خواہ وہ عمل تھوڑا ہی کیوں نہ ہو (کتاب مذکور، ص۲۲۳)۔ اسی بنا پر آپؐ نے جو کام بھی کیا، ہمیشہ کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی سیرت طیبہ میں ایک جیسے واقعات کی کثرت ملتی ہے ، حتّٰی کہ ایک ایک وصف پر مستقل کتب لکھی گئی ہیں اور محدّثین نے اپنی کتب کے کئی کئی ابواب قائم کیے ہیں ۔ اس لحاظ سے شمائل نبوی کو امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔

آپؐ کی ایسی عادات مبارکہ کو ابتداءً دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (الف) شخصی اوصاف؛ (ب) معاملاتی اوصاف.

(۱) شخصی اوصاف : اوصاف ذاتیہ کی یوں تو فہرست بہت طویل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی شخص ان کی تعریف و تکریم کا صحیح حق ادا نہیں کر سکتا؛ تاہم مختصرًا چند ایک خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ آپؐ کے کردار کی عظمت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

(۱) عزم و استقلال : آپؐ پیکر عزم و استقلال تھے ؛ اسی بنا پر آپؐ کو اولوالعزم پیغمبروں میں شمار کیا گیا (۴۶ [الاحقاف] : ۳۵)۔ اس امر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ نبوت کے بار عظیم کو جب آپؐ لے کر اٹھے تو ایک متنفس بھی آپؐ کے ہمراہ نہ تھا، مگر آپؐ کو اپنی منزل کی طرف بڑھنے میں قطعاً کوئی تذبذب نہ ہوا ۔ زندگی مبارک مین کئی مواقع ایسے آئے جب آپؐ کے آہنی اور غیر متزلزل عزم و استقلال کا مظاہرہ ہوا ۔ ایک موقع پر ابو طالب نے مشرکین کی مخالفت بڑھ جانے کی وجہ سے آپؐ کو مشورہ دیا کہ بت پرستی کی مذمت چھوڑ دیں ۔ آپؐ نے اشکبار آنکھوں سے فرمایا : بخدا ! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج بھی لا کر رکھ دیں تو بھی میں دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت سے نہیں رکوں گا تا آنکہ یہ فریضۂ تبلیغ و رسالت پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے یا میرا دم نکل جائے (ابن ہشام، سیرۃ، ۱ : ۲۸۴ تا ۲۸۵) ۔ ایک موقع پر بعض صحابہؓ نے دشمنوں کی عداوت اور ایذا رسانی سے تنگ آ کر آپؐ سے دعا کی درخواست کی تو آپؐ نے سختی سے جواب دیا : تم سے پہلے جو لوگ گزر چکے ہیں ان کے جسموں پر آہنی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں اور کھال کو جسم سے الگ کر دیا جاتا تھا، مگر وہ مذہب سے برگشتہ نہ ہوئے۔ بخدا ! دین اسلام اپنے منتہائے کمال کو پہنچ کر رہے گا تا آنکہ صنعاء سے حضرموت تک جانے والا مسافر خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرے گا (البخاری، ۸۹/۱ ۳ : ۳۳۶ ؛ ابو داود ، ۳ : ۱۰۸ ، حدیث ۲۶۴۹)۔ آپؐ کے عزم و استقلال کا اظہار اس امر سے بخوبی ہوتا ہے کہ آپؐ نے دشمنوں کے خلاف جتنے بھی معرکے لڑے ان تمام میں (بجز غزوۂ حنین کے) آپؐ کے مقابلے میں دشمن کی طاقت کئی گنا ہوتی تھی ، مگر آپؐ کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ارادے میں تردد محسوس نہیں ہوا ؛ غزوۂ احد میں بعض نوجوانوں کے مشورے پر آپؐ کی مرضی کے خلاف ، مدینہ منورہ سے باہر نکل کر دفاع کرنے کا پروگرام بنا ۔ آپؐ یہ سن کر گھر میں تشریف لے گئے اور جنگی ہتھیار پہن کر باہر تشریف لائے ؛ اب نوجوان صحابہؓ کو اپنے اصرار پر ندامت ہوئی اور آپؐ سے عرض کیا کہ کیوں نہ آپؐ کی مرضی کے مطابق مدینہ میں رہ کر دفاع کیا جائے؟ آپؐ نے فرمایا : کہ نبی جب زرہ پہن لیتا ہے تو پھر اس وقت تک زرہ نہیں اتارتا، جب تک اس کے اور اس کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ نہیں ہو جاتا (ابن سعد، ۲ : ۳۸ ببعد) ۔ غزوۂ حنین میں بھی آپؐ کے عزم و استقلال نے جنگ کا پانسہ پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ایک موقع پر ایک دشمن نے آپؐ کو تنہا ایک درخت تلے استراحت فرماتے دیکھا تو تلوار سونت

marfat.com
Marfat.com

لی اور کہا: اے محمدؐ! اب تم کو میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ۔ یہ جواب سن کر بدوی لرز گیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ آپؐ نے اسے معاف کر دیا (البخاری، ۲: ۲۲۶).

(۲) شجاعت: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پیکر شجاعت و بسالت تھے۔ زندگی مبارک کے ایک ایک واقعے سے آپؐ کی شجاعت اور جوانمردی کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ آپؐ نے مادی اور ظاہری اسباب کی کمی، بلکہ بعض اوقات فقدان کے باوجود، اپنے مخالفین کی نہ صرف تدبیروں کو ناکام بنایا، بلکہ ہر معرکے میں ان پر غلبہ بھی حاصل کیا۔ زندگی مبارک میں جتنے بھی بڑے معرکے ہوے [بجز مؤتہ کے] آپؐ نے ان میں خود بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ ان جنگوں میں سے ایک جنگ میں بھی آپؐ نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ ان معرکوں میں حضرت علیؓ کے بقول آپ ہمیشہ آگے آگے ہوتے اور جب گھمسان کا رن پڑتا تو حضرت علیؓ جیسے بہادروں کو بھی آپؐ کے پہلو میں پناہ لینا پڑتی تھی (ابن الجوزی، ۲: ۳۳۴؛ احمد بن حنبل: مسند، ۱: ۱۲۶)۔ غزوۂ بدر میں، جو حضرت علیؓ کے بقول بہت ہی سخت معرکہ تھا صحابہؓ بار بار آپؐ کی آڑ میں پناہ لیتے، مگر آپؐ دشمن کے سب سے زیادہ قریب رہے (ابن الجوزی)۔ غزوہ حنین میں جب اچانک بنو ہوازن کے تیر اندازوں کی تیروں سے ہراول کے اور پھر پیچھے آنے والے لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور پلک جھپکنے میں میدان صاف ہوگیا تو میدان میں بجز آپؐ کے اور چند صحابہؓ کے کوئی موجود نہ رہا۔ آپؐ اپنے خچر کو آگے بڑھانا چاہتے تھے، مگر جاں نثار مانع ہوتے تھے؛ ادھر دشمن نے اپنے تیروں کا رخ آپؐ کی طرف پھیر لیا تھا، مگر آپؐ کے پاے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔ آپؐ اپنے خچر سے کود کر نیچے اتر آئے اور فرمایا: انا النبی لا کذب، انا ابن عبدالمطلب (مسلم، ۳: ۱۳۹۸، حدیث ۱۷۷۵؛ قاضی عیاض: الشفا، ص ۵۰ ببعد)، یعنی میں خدا کا سچا رسول اور عبدالمطلب (جیسے شجاع) کا پوتا ہوں۔ آپؐ کے ثابت قدم رہنے کی وجہ سے اہل اسلام نے یہ ہارا ہوا معرکہ دوبارہ جیت لیا۔ حضرت انسؓ فرمایا کرتے تھے: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سب سے زیادہ خوبصورت (خوب سیرت) اور سب سے زیادہ شجاع اور سخی تھے۔ ایک دفعہ مدینہ منورہ میں یہ افواہ پھیلی کہ کسی (ناگہانی) دشمن نے حملہ کر دیا ہے، جس سے لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ بعض لوگ تحقیق احوال کے لیے اس طرف گئے، دیکھا تو رسالت مآبؐ گلے میں تلوار ڈالے حضرت طلحہؓ کے گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہیں اور واپس آ رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: نہ ڈرو کوئی خطرہ نہیں (ابو داؤد، ۵: ۲۶۳ حدیث ۴۹۸۸؛ مسلم، ۴: ۱۸۰۲، حدیث ۲۳۰۷)۔ جنگوں میں وہی بہادر سمجھا جاتا تھا جو آپؐ کے قریب‌تر رہتا؛ کیونکہ آپؐ دشمن کے نزدیک ہوتے تھے (الشفا: ص ۵۱)۔ آپؐ صرف شجاع ہی نہیں بلکہ شجاع ساز بھی تھے! آپؐ نے ہزاروں صحابہؓ میں اپنے ارشادات کے ذریعے شجاعت اور بہادری کے ایسے اوصاف پیدا کر دیے کہ وہ کسی بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ آپؐ کا ارشاد تھا: الجنۃ تحت ظلال السیوف، یعنی جنت تلواروں کی چھاؤں میں ہے؛ نیز فرماتے تھے: ولوددت انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی فاقتل ثم احیی فاقتل (البخاری، ۳: ۲۰۱، الجہاد)، یعنی میں چاہتا ہوں کہ میں راہ خدا میں شہید ہو جاؤں؛ پھر زندگی ملے، پھر شہید کر دیا جاؤں، پھر زندگی عطا ہو؛ پھر شہادت سے ہم کنار ہوں۔

آپؐ کے یہ ارشادات عسکر اسلام کے حوصلے بلند کرنے اور ان کی ہمت بڑھانے کا موجب بنتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ کے ساتھیوں نے کسی

marfat.com
Marfat.com

معرکے میں بھی میدان جنگ سے منہ نہیں پھیرا ۔ غلط فہمی یا دشمن کے اچانک حملے کی وجہ سے اگر کبھی بھگدڑ مچی بھی تو جاں نثاران اسلام دوبارہ پہلے سے بھی زیادہ جوش اور ولولے سے آپؐ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے اور اس طرح جنگ کا پانسہ پلٹ گیا [نیز رک بہ غزوات]۔

(۳) حزم و احتیاط : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم انتہائی شجاع اور جملہ اوصاف سے متصف ہونے کے باوجود ، حزم و احتیاط کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ آپؐ جو فیصلہ کرتے ، یا جو قدم بھی اٹھاتے ، اسے ہر اعتبار سے سوچ سمجھ کر اٹھاتے اور اس میں حزم و احتیاط کو ہر صورت میں پیش نظر رکھتے ۔ غزوۂ بدر میں مدینہ منورہ کو دشمن کی یلغار سے محفوظ رکھنے کے لیے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کرنا ، غزوۂ احد میں دوران جنگ پہاڑ کو اپنی پشت کی طرف رکھنا ، درمیانی درے پر پچاس افراد کو بطور تیر انداز مقرر فرمانا، غزوۂ احزاب میں خندق کھودنا ، اس پر جگہ جگہ حفاظت کی غرض سے عسکری دستوں کا تعینات کرنا وغیرہ آپؐ کے حزم و احتیاط کی روشن مثالیں ہیں ۔ اگر یہ اوصاف (حزم واحتیاط) آپؐ کو کسی شخص میں دکھائی دیتے تو آپؐ اس کی تعریف فرماتے ۔ ایک مرتبہ اشجّ عبدالقیس کو فرمایا: تم میں دو ایسی خصوصیات ہیں جنھیں خدا پسند کرتا ہے اور وہ ہیں بردباری اور عاقبت اندیشی (مسلم، ۱:۴۹، حدیث۱۷)۔ آپؐ مزید فرمایا کرتے تھے: عجلت شیطانی امر ہے اور عاقبت اندیشی خدا کی طرف سے ہے (مشکوٰۃ ، ۲ : ۶۲۵ ، حدیث ۵۰۵۵)۔ ایک شخص نے کسی نصیحت کی درخواست کی تو فرمایا ہر معاملے کو سوچ سمجھ کر (تدبیر سے) اختیار کر ؛ اگر اس کے انجام میں بھلائی نظر آئے تو پھر کر گزرو (کتاب مذکور ، حدیث ۵۰۵۶) ۔ مزید فرمایا : تاخیر کرنا تمام کاموں میں بہتر ہوتا ہے، بجز آخرت کے امور کے (حدیث ۵۰۵۸) ۔ ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے میانہ روی اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے ، نیز خاموشی اختیار کرنے کو نبوت کا چوبیسواں حصہ قرار دیا (الترمذی ، مشکوٰۃ) ۔ حضرت ابو ذرؓ سے تدبیر کی اہمیت بیان کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا : لیس العقل کالتدبیر، یعنی تدبیر جیسی کوئی عقل نہیں (مشکوٰۃ ، ۲ : ۶۲۷ ، حدیث ۵۰۶۶) ۔ ایک اور روایت میں ہے : مؤمن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا (مسلم ، ۴ : ۲۲۹۵ ، حدیث ۲۹۹۸) ۔

آپؐ خود ہر کام سوچ سمجھ کر اور کامل حزم و احتیاط سے انجام دیتے تھے ، جو مسئلہ آپؐ کے سامنے ہوتا آپؐ اس کے ہر پہلو پر غور و خوض فرماتے ، پھر اس کے مطابق عمل کرتے ۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کے فیصلوں کی صداقت مسلمہ رہی ہے ۔

(۴) عدل و انصاف : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حکم خداوندی : اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶ [النحل] : ۹۰) ، یعنی خدا تعالٰی تم کو عدل و احسان کا حکم دیتا ہے ، کے مطابق پیکر عدل و انصاف تھے ۔ آپؐ نے تمام زندگی ظلم و جہالت کے مٹانے اور عدل و انصاف کے عام کرنے کے لیے جد و جہد جاری رکھی (دیکھیے البخاری، کتاب المظالم) ۔ ظلم و جہالت سے آپؐ کو کس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ اس دعا سے لگایا جا سکتا ہے جو آپؐ صبح و شام مانگا کرتے تھے : اللّٰھم انی اعوذبک ان اضل اواضل او ازلّ او ازلّ او اظلم او اظلم اَوْ اَجْھَلَ اَوْ یُجْھَلَ عَلَیَّ (ابو داوٗد ۵ : ۳۲۷ ، حدیث ۵۰۹۴ ؛ ابن ماجه، (الدعوات) حدیث ۳۸۸۴) ، یعنی اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ صحیح راہ سے بھٹکوں یا بھٹکا دیا جاؤں یا پھسلوں یا پھسلا دیا جاؤں ، یا کسی پر ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں ۔ آپؐ کے عدل و انصاف کا بتقاضاے ارشاد باری : وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ھُوَ

marfat.com
Marfat.com

اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵ [المآئدۃ] : ۸)، یعنی کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم ان سے نا انصافی کرو، ہر صورت میں انصاف کرو، یہی تقوٰی کے زیادہ قریب ہے۔ یہ عالم تھا کہ اس میں اپنے اور بیگانے، دوست اور دشمن کی کوئی تمیز نہ تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ظلم سے بہرحال روک دیا؛ فرمایا: اُنْصُرْ اخاک ظالماً اَو مظلوماً (البخاری، ۲ : ۸۹)، یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ظالم کو اس کے ظلم سے روکنا ہی اس کی مدد کرنا ہے (البخاری، ۲ : ۹۸)۔ آپؐ جن لوگوں کو حکمران بنا کر بھیجتے، انھیں فرماتے: اِتَّقِ دعوۃَ المظلومِ فانّہٗ لیس بینھا و بین اللہ حجاب (کتاب مذکور، ص ۸۹) یعنی مظلوم کی بد دعا سے بچنا، کیونکہ اس کے اور خدا کے مابین کوئی حجاب نہیں ہوتا۔ ارشاد باری تعالٰی ہے: وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ (۵ [المائدۃ]: ۲)، یعنی ایک دوسرے کی نیکی اور تقوٰی کے معاملے میں تو مدد کرو، مگر گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔

آپؐ عدل و انصاف میں کسی چھوٹے بڑے کی تمیز نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک عورت فاطمہ مخزومیہ نے چوری کی۔ خاندان کے لوگوں نے بے عزتی کے پیش نظر حضرت اُسامہؓ سے، جو آپؐ کے لاڈلے (حِبّ) تھے، سفارش چاہی۔ حضرت اسامہؓ نے سفارش کے لیے جونہی بات شروع کی تو آپؐ کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور فرمایا: اے اسامہ! کیا اللہ کے حق میں تو سفارش کرتا ہے؟ انھوں نے معافی مانگی۔ پھر آپؐ نے خطبہ دیا اور فرمایا: تم سے پہلے لوگ اسی بنا پر ہلاک ہوگئے کہ جب قوم کا کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور شخص اس کا مرتکب ہوتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ بخدا! اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس پر بھی حد جاری کر دیتا۔ پھر آپؐ نے اس عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا (مسلم، ۳: ۱۳۱۵، حدیث ۱۶۸۸؛ الترمذی، ۴: ۳۷ تا ۳۸، حدیث ۱۴۳۰)۔ اسی بنا پر آپؐ نے قبیلہ بنو نضیر اور بنو قریظہ کے خونبہا میں معادلت (= برابری) قائم فرمائی، اس سے پہلے اگر کوئی نضیری (بڑی قوم کا) کسی قریظی (چھوٹی قوم کے کسی شخص) کو ہلاک کر دیتا تو نصف دیت ادا کی جاتی اور برعکس صورت میں پوری دیت لازم سمجھی جاتی۔ آپؐ نے اس نا انصافی کو ختم کیا۔ (ابو داود، ۳ : ۱۷، حدیث ۳۵۹۱؛ النسائی، حدیث ۴۷۳۳)۔ یہود میں بھی اسی طرح اگر کوئی معزز آدمی زنا کرتا تو اسے معمولی سزا دے کر چھوڑ دیا جاتا اور غریب آدمی پر حد جاری کی جاتی۔ آپؐ نے اس عدم مساوات کو بھی ختم کیا (مسلم ۳: ۱۳۲۶، حدیث ۱۶۹۹ تا ۱۷۰۴)۔

انصاف کرنے میں آپؐ کے نزدیک مسلم اور غیر مسلم اپنے اور بیگانے میں کوئی فرق نہ تھا۔ متعدد مرتبہ آپؐ نے مسلمان کے خلاف غیر مسلم کے حق میں فیصلہ دیا۔ ایک یہودی کا ایک مسلمان پر قرض تھا۔ غزوۂ خیبر کے دوران میں اس نے تقاضا شروع کر دیا۔ مسلمان نے مہلت مانگی، مگر یہودی نے مہلت دینے سے انکار کیا۔ اس پر آپؐ نے مقروض کو فوری ادائی کا حکم دیا اور تعمیل نہ ہونے کی صورت میں قرض خواہ کو اس کے بعض کپڑے لے جانے کی بھی اجازت دی (احمد بن حنبل: مسند، ۳ : ۴۲۳)۔ فتح خیبر کے بعد آپؐ نے کھیتی باڑی کا سارا کام یہود کے سپرد کر دیا۔ یہودیوں نے آپؐ سے شکایت کی کہ مسلمان مساقات کے بعد بھی ان کی فصلوں اور سبزیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے حکم دیا کہ معاہد قوم کا مال مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے۔ اس کے بعد مسلمان سبزی وغیرہ قیمتاً خریدنے لگے (الواقدی، ۲: ۶۹۱)۔

marfat.com
Marfat.com

عدل و انصاف کی حکمرانی کے لیے آپؐ خود بھی ہمیشہ جواب دہی کے لیے آمادہ رہتے ۔ اگر آپؐ کے کسی سلوک سے (نادانستہ طور پر) کسی شخص کو ایذا پہنچتی تو آپؐ اسے اپنا بدلہ لینے کی فراخ دلانہ پیش کش فرماتے۔ ایک مرتبہ مال غنیمت کی تقسیم کے دوران میں ایک شخص کے چہرے پر، جو اپنا حصہ لینے کے لیے آپؐ پر جھک آیا تھا ، آپؐ کے نیزے کا زخم لگ گیا ۔ آپؐ نے فوراً اسے بدلہ لینے کی پیش کش کی، مگر اس نے معاف کر دیا (ابو داؤد ، ۳ : ۶۷۳، حدیث ۴۵۳۶؛ النسائی، ۴۷۷۴)۔ ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے ایک شخص کی کمر پر ، (جو ادھر اُدھر کی باتیں کرکے لوگوں کو ہنسا رہا تھا) ٹھوکا دیا، جس پر اس نے بدلہ لینے کی خواہش ظاہر کی ۔ آپؐ نے اپنی کمر آگے کر دی ، اس نے کہا : میں برہنہ تن تھا جب کہ آپؐ قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ آپؐ نے قمیص اٹھا دی ۔ اس نے آگے بڑھ کر مہر نبوت کو چوما اور کہا : میں تو صرف یہ چاہتا تھا (ابو داؤد ، ۵ : ۳۹۴ ، حدیث ۵۲۲۴) ۔ اسی طرح یہودی زید بن سعیہ نے نہ صرف قبل از وقت اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا بلکہ نہایت سختی اور درشتی سے آپؐ کے خاندان کی بھی ہتک کی۔ حضرت عمرؓ نے اس کو سزا دینا چاہی، مگر آپؐ نے فرمایا : اے عمرؓ ! تمھیں چاہیے تھا کہ اسے حسن تقاضا کی تلقین کرتے اور مجھے حسن ادا کی ۔ پھر اس کو نہ صرف معاف کیا، بلکہ اس کے حصے سے زیادہ اسے معاوضہ عنایت فرمایا (ابن الجوزی، ۲ : ۴۲۵)۔ وصال مبارک سے چند روز قبل آپؐ نے مجمع عام میں اعلان کیا کہ جس کسی کا مجھ پر کوئی حق ہو یا تو وہ وصول کرے اور یا پھر معاف کر دے ۔ ایک شخص نے چند درھموں کا مطالبہ کیا ، جو فوراً ادا کر دیے گئے (احمد بن حنبل : مسند، ۱ : ۲۰۹، حدیث ۱۷۸۴؛ آپؐ کے عدل و انصاف پر مبنی فیصلوں کے لیے دیکھیے ابن القیم : زاد المعاد، جلد ۵ ، مطبوعہ کویت ، ۱۳۹۹ ، ص ۵ تا ۸۳۴)۔

(۵) فیاضی و سخاوت : حضرت عبداللہ بن عباسؓ آپؐ کی سخاوت کا حال بیان کرتے ہوئے آپؐ کو چلنے والی ہوا (الرّیح المرسلة) سے بھی زیادہ سخی قرار دیتے ہیں ، بالخصوص رمضان المبارک میں (البخاری ، ۱ : ۶ تا ۷ ، باب کیف کان بدؤ الوحی ؛ مسلم ، ۴ : ۱۸۰۳ ، حدیث ۲۳۰۸) ۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ سے جب بھی کچھ مانگا گیا آپؐ نے کبھی انکار نہیں کیا (مسلم ، ۴ : ۱۸۰۵ ، حدیث ۲۳۱۱؛ البخاری، کتاب المناقب)۔ غزوۂ حنین میں تقریباً چھے ہزار مرد و زن گرفتار ہوئے، جو عرب کے قدیم دستور کے مطابق ہمیشہ کے لیے لونڈی غلام بنائے جا سکتے تھے ، مگر آپؐ نے ان تمام کو، ان کی قوم کے بقیہ لوگوں کے مطالبے پر، باعزت طور پر رہا فرما دیا (ابن سعد، الطبقات ، ۱۵۳ تا ۱۵۵) ۔ اس کے علاوہ اس موقع پر جو مال غنیمت ہاتھ لگا تھا اس میں چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی شامل تھی۔ آپؐ نے یہ تمام مال لوگوں میں تقسیم فرما دیا (الواقدی : المغازی، ۳: ۹۴۹ ببعد)۔ اس موقع پر آپؐ نے بہت سے لوگوں کو، جن میں بعض نو مسلم اور بعض غیر مسلم بھی شامل تھے، سو سو اونٹ عنایت فرمائے ۔ صفوان بن امیہ کو تین سو اونٹ مرحمت فرمائے (مسلم، ۴: ۱۸۰۶، حدیث ۲۳۱۳؛ قاضی عیاض: الشفاء، ص ۹۴) ۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو آپؐ نے دو پہاڑوں کے درمیان پھیلا ہوا ریوڑ عنایت فرمایا ۔ وہ اپنی قوم میں جا کر کہنے لگا کہ اسلام لے آؤ، کیونکہ حضرت محمدؐ اتنا دیتے ہیں کہ فقر کی پروا نہیں کرتے (مسلم ، ۴ : ۱۸۰۶ ، حدیث ۲۳۱۲) ۔ حضرت عباسؓ کو ایک مرتبہ اتنا سونا مرحمت فرمایا کہ ان سے اٹھایا نہیں جاتا تھا (قاضی عیاض : الشفا، ص ۵۰)۔ ایک مرتبہ، جب آپؐ کو ستر ہزار درہم کی رقم پیش کی گئی تو آپؐ نے اس کو مسجد میں چٹائی پر بکھیر

marfat.com
Marfat.com

دیا اور پھر جو سامنے آیا اسے دیتے گئے، یہاں تک کہ وہ رقم خرچ فرما دی (ابن الجوزی، ۲ : ۴۴۲)۔

آپ کی فیاضی و دریا دلی کا یہ عالم تھا کہ اگر پاس موجود نہ ہوتا تو قرض لے کر سائل کو مرحمت فرما دیتے (قاضی عیاض : الشفا، ۵۰)۔ فرط سخاوت سے، بقول حضرت انس، آپ کے پاس کوئی چیز ذخیرہ نہیں رہتی تھی (ابن الجوزی، ص ۴۴۲)۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے ذاتی معتمد اور خازن حضرت بلال کے پاس کچھ کھجوریں جمع دیکھیں تو پوچھا کہ اے بلال! یہ کیا ہے؟ حضرت بلال نے عرض کیا : یا رسول اللہ! کچھ ذخیرہ کر رہا ہوں تاکہ کسی برے وقت کام آ سکے۔ فرمایا : تجھے اس بات کا خوف نہیں کہ یہ جہنم کا دہکایا ہوا ٹکڑا بھی ہوسکتا ہے؛ پھر فرمایا : اے بلال! خرچ کر اور تنگی کا خوف نہ کر (حوالۂ مذکور)۔ فرط سخاوت سے آپ سائل کے سوال کی درشتی اور کرختگی کو بھی نظر انداز فرما دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بدو نے نہایت درشتی سے آ کر آپ کی چادر کو کھینچا، جس سے آپ کی گردن پر نشان پڑ گیا اور پھر کہا : محمد! یہ مال تیرا ہے اور نہ تیرے باپ کا، میرے ان دو اونٹوں پر کچھ مال لاد دے۔ آپ نے فرمایا : نہیں اور پھر تین مرتبہ استغفار پڑھا اور اسے نہ صرف معاف کیا بلکہ اس کے ایک اونٹ پر جَو اور دوسرے پر کھجور لادنے کا حکم دیا اور جب اونٹوں پر کھجوریں لاد دی گئیں تو فرمایا : اللہ کی برکت کے ساتھ رخصت ہو جاؤ (ابو داود، ۵ : ۱۴۳، حدیث ۴۷۷۵؛ النسائی حدیث ۴۷۸۰)۔ النسائی نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ صحابہ نے جب اس کی یہ بات سنی تو اسے پکڑنے کے لیے دوڑے، مگر آپ نے فرمایا : میں تمہیں پختہ حکم دیتا ہوں کہ اپنی جگہ سے اس وقت تک نہ ہلو جب تک میں اس کی اجازت نہ دوں۔ یہ بھی فرط سخاوت کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی آپ کے زیر استعمال بالکل نئی چیز کو آپ سے طلب کرتا، خواہ وہ آپ کو پسند ہی ہوتی، آپ اتار کر سائل کو سونپ دیتے (البخاری، ۴ : ۱۲۲، الادب)۔ بعض اوقات جس مالک سے چیز خریدتے، قیمت ادا کرنے کے بعد اسی کو ھبہ کر دیتے (البخاری، ۲ : ۵، البیع، باب ۳۳)۔ ایک مرتبہ حضرت عمر سے ایک اونٹ خریدا اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر کو ھبہ کر دیا۔ ایک دوسرے موقع پر حضرت جابر بن عبداللہ کو ان کے اونٹ کی قیمت ادا کر دینے کے بعد وہ اونٹ انہیں کو لوٹا دیا (کتاب مذکور، ص ۱۶، ۲۰، باب ۳۴ و ۴۷)۔

فرط سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اگر بربنائے تنگی وقت کچھ مال بچ رہتا، تو طبیعت پر گراں گزرتا اور آپ کا سکون و آرام ختم ہو جاتا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک شب میں نے آپ کو بستر پر کروٹیں بدلتے دیکھا تو عرض کیا : یا رسول اللہ! کیا طبیعت ناساز ہے یا اللہ کی طرف سے کوئی نیا حکم ملا ہے؟ فرمایا : یہ بات نہیں۔ پھر اپنے تکیے کے نیچے سے تین درہم نکال کر دکھائے اور فرمایا : گزشتہ روز کچھ مال آیا تھا اور یہ درہم تقسیم ہونے سے رہ گئے تھے؛ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اسی حال میں مجھے خدا کی طرف سے بلاوا نہ آ جائے (اعلام النبوۃ، ص ۱۵۵)۔ ایسے ہی ایک اور موقع پر رئیس فدک نے کچھ سامان بھیجا اور وہ رات گئے تک تقسیم ہونے سے بچ رہا تو آپ نے یہ رات مسجد میں گزاری (ابو داؤد، ۳ : ۴۴۰ تا ۴۴۲، حدیث ۳۰۵۵)۔ آپ نے یہ اعلان فرمایا ہوا تھا کہ مرنے والے کا ترکہ وارثوں کے لیے ہے اور قرضہ میرے ذمے (البخاری)۔

(۶) مروّت و حیا : عرب میں شرم و حیا کا بہت کم رواج تھا؛ لوگ ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہونے میں کوئی قباحت نہ سمجھتے تھے حتّٰی کہ کعبہ [رک بآں] کا طواف بھی بعض قبائل برہنہ کرتے

marfat.com
Marfat.com

تھے ، مگر آپ کے متعلق حضرت ابو سعید فرماتے ہیں : کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اشد حیاء من العذراء فی خدرھا (مسلم، ۴: ۱۸۰۹ حدیث ۲۳۲۰)، یعنی آپ دوشیزہ لڑکی سے بھی زیادہ حیا دار تھے ۔ آپ حیا کو ایمان کا شعبہ قرار دیتے تھے (البخاری ، ۱: ۳، الایمان، باب ۱۶)۔ آپ کے نزدیک حیا ھی انسان کا اصل سرمایہ ہے ، اگر وہ نہ رہے تو انسان جو چاہے کرے : اذالم تستح فافعل ماشئت (البخاری، کتاب الادب ؛ ابو داؤد ۵ : ۱۴۹ ، حدیث ۴۷۹۷ ؛ ابن ماجہ ، حدیث ۳۴۱۸ ؛ احمد بن حنبل ، مسند ، ۵ : ۲۷۳)۔ عموماً رفع حاجت کے لیے اتنے دور نکل جاتے کہ دور سے بھی کسی کو دکھائی نہ دیتے ۔ فرط حیا کا یہ عالم تھا کہ بنائے کعبہ کے وقت پتھر اٹھا کر لانے والوں نے چادریں (ازار) اتار کر کندھوں پر رکھ لی تھیں ۔ انھیں دیکھ کر آپ نے بھی ایسا ھی کیا ، مگر فوراً آپ بے ہوش ہوکر گر پڑے ۔ ہوش آیا تو زبان پر "ازاری ، ازاری" (میری چادر) کے الفاظ جاری تھے (ابن سعد ، ۱ : ۱۴۵ ببعد)۔ اسی بنا پر آپ صحابہ کو اس نوع کے مسائل سمجھانے کے لیے اشاروں کنایوں سے کام لیتے (عیاض : الشفا ، ۵۲)۔ فرط حیا کی وجہ سے آپ نے کبھی اپنی ازواج کے سامنے بھی برہنگی اختیار نہیں کی اور نہ پسند فرمائی (حوالۂ مذکور؛ نیز ابو داؤد ، ۴ : ۳۰۲ حدیث ۴۰۱۲ ببعد)۔ عموماً میت کو غسل دیتے وقت اس قسم کی بے احتیاطی ہو جاتی ہے ، مگر آپ نے یہ دعا (گویا وصیت) فرمائی کہ اے اللہ ! اس کی آنکھیں پھوڑ دے جو میرا ستر دیکھے (حوالۂ مذکور)؛ چنانچہ آپ کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا (ابو داؤد ، ۳ : ۲۵۰۲ ، حدیث ۳۱۴۱ ؛ ابن ماجہ ، حدیث ۱۴۶۴)۔

(۷) احکام الٰہی پر عمل کا اہتمام : سیرت طیبہ کے امتیازی اوصاف میں آپ کا یہ وصف نمایاں حیثیت رکھتا ہے کہ آپ کو اپنی تمام زندگی میں احکام الٰہی پر شدت سے عمل کا اہتمام رہا ۔ اسی بنا پر آپ کے جاننے والوں نے آپ کی زندگی کو مجسم قرآن قرار دیا (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۳۶۴)۔ قرآن کریم میں آپ کی طرف سے بار بار یہ اعلان دہرایا گیا ہے : اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۶ [الانعام] : ۵۰) ، یعنی میں (خود) انھی احکام کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیے جاتے ہیں ۔ دوسرے مقام پر ہے : قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶ [الانعام] : ۱۶۲) ، یعنی آپ فرما دیجیے میری نماز ، میری قربانی ، میری زندگی اور موت صرف خدا ہی کے لیے ہے۔ آپ کی عملی زندگی کا یہ پہلو آپ کی صداقت کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتا ہے، کیونکہ اس سے خدائی پیغام پر آپ کے پختہ اور غیر متزلزل یقین کا اظہار ہوتا ہے، جو کسی متنبّی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالٰی کی طرف سے جو بھی حکم نازل ہوتا آپ سب سے پہلے اس پر عمل کرتے ؛ پھر دوسروں کو عمل کی دعوت دیتے ۔ آپ کی طرف سے قرآن میں کہا گیا : يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱ [الصّف] : ۲)، یعنی اے اہل ایمان ! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو ۔ ایک اور جگہ یوں کہا گیا : اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (۲ [البقرۃ] : ۴۴) ، یعنی کیا تم دوسروں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھلا دیتے ہو ۔ آپ کے دشمنوں کو بھی یہ تسلیم تھا کہ آپ مجسمۂ عہد و وفا اور پیکر مہر و محبت ہیں ۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ نے اپنے پرانے دشمنوں سے، جو سر جھکائے آپ کے فیصلے کے منتظر کھڑے تھے، پوچھا : تمھیں اب (مجھ) سے کیا توقع ہے ؟ سب نے کہا : ہم آپ سے بھلائی ہی کی توقع رکھتے ہیں، کیونکہ آپ ایک شریف النفس باپ کے شریف النفس بیٹے ہیں (الواقدی :

marfat.com
Marfat.com

البخاری ، ۲ : ۸۳۵).

آپؐ نے خود کو کبھی بھی کسی ادنٰی سے ادنٰی حکم خداوندی کی تعمیل سے بالاتر خیال نہیں کیا۔ غزوۂ خندق کے موقع پر سب کے ساتھ مل کر خندق کھودی (البخاری ، ۴ : ۲۱۱)؛ مسجد نبوی کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر عملی طور پر حصہ لیا، بلکہ آپؐ نے فرط عبودیت سے اپنے اوپر دوسروں سے کچھ زیادہ ہی پابندیاں عائد کی ہوئی تھیں ، مثلاً آپؐ خود کو اور اپنے اہل و عیال کو زکوٰۃ [رک بآں] کا حق دار نہیں سمجھتے تھے (مسلم ۲ : ۷۵۱ ، حدیث ۱۰۶۹ تا ۱۰۷۱)۔ آپؐ نے نماز تہجّد کا عمر بھر فرض نماز کی طرح اہتمام فرمایا (کتاب مذکور، ص۵۰۸، حدیث ۷۳۶ ببعد)۔ آپؐ نماز میں اس قدر طوالت فرماتے کہ قیام میں کھڑے کھڑے پائے مبارک متورم ہو جاتے۔ سجدے میں جاتے تو لگتا آپؐ کی روح ہی نکل چکی ہے۔ ذاتی معاملات میں کبھی کسی سے مؤاخذہ نہ فرماتے؛ ہاں، اگر دین کا معاملہ ہوتا تو پھر کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے (مشکوٰۃ ، ۳ : ۱۹۱ ، حدیث ۵۷۱۷)۔ گویا آپؐ کی تمام زندگی اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، جس کی آپؐ دوسروں کو تعلیم دیتے تھے۔ اس طرح آپؐ کی سیرت طیبہ کا یہ سب سے روشن پہلو ہے اور پیغمبرانہ کردار کی یہی خصوصیت ہے۔

(۸) دینی معاملات میں میانہ روی: دین اور دینی مسائل کے بارے میں اتنے اہتمام کے باوجود آپؐ کو رہبانیت (ترک دنیا) کا اسلوب قطعی ناپسند تھا۔ اگر کسی نے اپنے طبعی میلان کی وجہ سے اس کی اجازت طلب بھی کی تو آپؐ نے سختی سے منع فرما دیا۔ خود آپؐ کا جو طرز عمل تھا اسے آپؐ نے یوں بیان فرمایا: "میں خدا سے تم سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں ، مگر میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا؛ نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں اور اسی طرح عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں"۔ پھر فرمایا: "یہی میرا طریقہ (سنت) ہے۔ جس نے میرے طریقے کو چھوڑا وہ میری امت سے نہیں" (البخاری ، ۳ : ۴۱۱ ، کتاب النکاح، باب ۱، مطبوعہ لائیڈن)۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص نے آپؐ سے ہمیشہ روزے سے رہنے کی اجازت مانگی تو فرمایا: "زیادہ سے زیادہ تم صوم داؤدؑ، یعنی ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھ سکتے ہو"۔ پھر فرمایا: "تیرے بدن کا بھی حق ہے؛ تیرے گھر والوں کا بھی حق ہے" (کتاب مذکور، ۱ : ۴۴۳ ، کتاب الصوم ، باب ۵۶ ، ۵۷)۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور بعض دیگر صحابہؓ نے عدم استطاعت نکاح کی وجہ سے اپنے آپ کو جسمانی طور پر ازدواجی زندگی کے ناقابل بنانے کا ارادہ کیا تو سختی سے منع فرما دیا (کتاب مذکور، ۳ : ۴۱۳ تا ۴۱۴)۔ ایک صحابی نے دنیا کے تمام بندھنوں سے الگ ہوکر ایک غار میں معتکف ہوکر عبادت الٰہی کرنے کی اجازت طلب کی تو فرمایا: "میں یہودیت یا عیسائیت کی طرح رہبانیت کی تعلیم نہیں لے کر آیا، بلکہ مجھے تو آسان اور سہل دین، دین ابراہیمؑ، ملا ہے (احمد بن حنبل: مسند، ۵ : ۲۶۶).

کتب احادیث و سیرت میں اس طرح کے بے شمار واقعات سے اس بات کی بخوبی شہادت ملتی ہے کہ آپؐ کو دنیا اور اس کے رشتوں سے قطع تعلق کرنا ہرگز گوارا نہ تھا۔ گویا اسے آپؐ ایک طرح کا عملی زندگی سے فرار اور قنوطیت سمجھتے تھے اور آپؐ کے نزدیک زندگی کی طرف یہ منفی رویہ کسی عالمگیر اور پائدار مذہب (اور اس کے بانی) کے شایان شان نہیں تھا۔ اس کے بالمقابل آپؐ کے رویے میں امید و رجا کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ آپؐ کا مسلک یہ رہا ہے کہ دنیا میں رچ بس کر دنیا کی اصلاح کی کوشش جاری رکھی جائے۔ اگر آپؐ کا کام رہبانیت،

marfat.com
Marfat.com

یعنی خود کو برائی سے بچانے تک محدود ہوتا، تو آپ کو اپنی عملی زندگی میں اتنی مشکلات اور مصائب و آلام کا سامنا ہرگز نہ کرنا پڑتا۔ واقعہ یہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے یہ از بس ضروری تھا کہ آپ خود ان معاملات میں عملاً حصہ لیتے اور آپ نے ایسا ہی کیا۔

(۹) تواضع: بارگاہ خداوندی سے آپ کو وہ بلند مرتبہ ملا تھا، جو مذہبی اور سیاسی اعتبار سے دنیا کے کسی فرد کو بھی نہیں ملا۔ با ایں ہمہ آپ ہمیشہ مجسّمۂ تواضع و انکسار رہے اور زبان مبارک سے ایسا لفظ کبھی نہ نکلا، جس سے کبر و غرور کا شائبہ تک محسوس ہوتا ہو۔ آپ فرمایا کرتے تھے، کسی کو یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ مجھے یونس بن متّٰی پر فوقیت دے (مسلم، الفضائل ۴: ۱۸۴۶، حدیث ۲۳۷۷؛ البخاری، ۲: ۳۶۰، الانبیاء)۔ ایک مرتبہ ایک یہودی کی ایک مسلمان سے حضرت موسیٰ اور آپ کی فضیلت کے بارے میں تکرار ہو گئی۔ آپ کو پتا چلا تو فرمایا: "مجھے موسیٰ پر فوقیت نہ دو، کیونکہ لوگ جب قیامت کے دن بے ہوش ہوں گے تو سب سے پہلے مجھے ہوش آئے گا میں دیکھوں گا کہ حضرت موسیٰ عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے ہوں گے، یا ان کو بے ہوشی سے مستثنیٰ رکھا گیا ہوگا (البخاری ۲: ۳۵۴، الانبیاء؛ مسلم، الفضائل، ۴: ۱۸۴۴، حدیث ۲۳۶۳؛ احمد بن حنبل: مسند، ۲: ۲۶۴)۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ کو "یا خیرَالبریّۃ!" کہہ کر پکارا۔ آپ نے فرمایا: "وہ تو ابراہیم تھے" (مسلم، الفضائل، ۴: ۱۸۳۹، حدیث ۲۳۶۹؛ ابو داؤد، ۵: ۵۴، حدیث ۴۶۷۲)۔ ایک دفعہ ایک وفد آیا اور کہنے لگا: "آپ ہمارے سردار ہیں"۔ آپ نے فرمایا: "تمھارا (اصلی) سردار تو اللہ تعالٰی ہے" وفد نے عرض کیا: "آپ ہم میں سب سے زیادہ افضل ہیں اور عظمت کے مالک ہیں"۔ فرمایا: "اپنی سی بات کہو، مبادا تمہیں شیطان بہکا دے" (ابو داؤد، ۵: ۱۵۴ تا ۱۵۵، حدیث ۴۸۰۱)۔ ایک دوسری روایت (احمد بن حنبل: مسند، ۳: ۱۵۳) میں اس کے آخر میں یہ اضافہ ہے: "میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول محمد بن عبداللہ ہوں۔ مجھے خدا نے جو رتبہ بخشا ہے، میں پسند نہیں کرتا کہ مجھے اس سے زیادہ بڑھایا جائے"۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا: "اللہ تعالٰی نے میری طرف یہ وحی نازل فرمائی ہے کہ تم سب انکسار اختیار کرو؛ کوئی کسی پر نہ زیادتی کرے اور نہ گالی گلوچ (ابن ماجہ، کتاب الزہد، حدیث ۴۲۱۴؛ ابو داؤد، ۵: ۲۰۳، حدیث ۴۸۹۵)۔ ایک دفعہ ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور آپ کی وجاہت کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ آپ نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے فرمایا: میں بادشاہ نہیں؛ میں تو ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو خشک گوشت (=قدید) کھاتی تھی (ابن الجوزی، ۲: ۴۳۷؛ حاکم: مستدرک، ۳: ۴۸، ذکر فتح مکہ)۔

ایک بار آپ نے بنی اسرائیل کے دو افراد کا واقعہ بیان فرمایا جن میں سے ایک اپنے نیک اعمال کی وجہ سے تکبّر کرتا تھا اور دوسرا اپنی بداعمالی پر نادم اور غم زدہ رہتا تھا؛ اللہ تعالٰی نے مؤخرالذکر کو بخش دیا اور اول الذکر کی گرفت فرمائی (ابو داؤد، ۵: ۲۰۷، حدیث ۴۹۰۱)۔ صرف زبانی حد تک ہی نہیں بلکہ خورد و نوش اور دوسرے تمام معاملات میں بھی آپ عجز و انکسار کو پسند فرماتے تھے۔ آپ کا ارشاد تھا: "میں ایک عبد کی طرح کھانا کھاتا ہوں اور ایک عبد کی طرح زمین پر بیٹھتا ہوں (ابن الجوزی: الوفا، ۲: ۴۳۸ [نیز دیکھیے نیچے، بذیل ضمنی عنوان: (۱۱) سادگی])۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ یہ پسند نہ فرماتے تھے کہ اپنی علو شان دکھانے کے لیے دوسروں پر اپنی

marfat.com
Marfat.com

فوقیت جتائی جائے، بلکہ آپؐ اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ آپؐ کے جان نثاروں کے سامنے دیگر انبیا اور مشاہیر عالم کے عمدہ پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے، ورنہ آپؐ کی عظمت و جلالت تو ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: "انا سیّد وُلد ادم، و اول من تنشق عنه الارض، و اول شافع و اول مشفّع" (مسلم، الفضائل، ۴: ۱۷۸۲، حدیث ۲۲۷۸؛ ابو داؤد، ۵: ۵۴، حدیث ۴۶۷۳)، یعنی میں بنی آدم کا سردار ہوں اور وہ پہلا شخص ہوں، جس کے لیے زمین شق ہوگی اور جس کو سب سے پہلے شفاعت کی اجازت ملے گی اور جس کی سب سے پہلے شفاعت قبول کی جائے گی"۔ قرآن مجید میں بھی دیگر انبیا پر آپؐ کی فضیلت کا کثرت سے ذکر کیا گیا ہے (مثلاً دیکھیے ۳ [آل عمران]: ۸۱).

(۱۰) بے جا مدح سے گریز: طبیعی انکسار اور تواضع کی وجہ سے آپؐ بے جا مدح کو سخت ناپسند فرماتے تھے اور ان موقعوں کے لیے یہ حکم دے رکھا تھا کہ ایسے شخص کے منہ میں مٹی ڈال دی جائے (مسلم، الزهد، ۴: ۲۲۹۷، حدیث ۳۰۰۲؛ الترمذی، ۴: ۶۰۰، الزهد، حدیث ۲۳۹۴؛ ابن ماجه، الادب، حدیث ۳۷۴۲)۔ ایک مرتبہ ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا: "ہم آپؐ کے ذریعے اللہ سے اور اللہ کے ذریعے آپؐ سے شفاعت کے طلب گار ہیں کہ ہمارے علاقے پر بارش ہو"۔ یہ سن کر آپؐ کو سخت غصہ آ گیا اور فرمایا: "تیرا ناس ہو"۔ پھر تسبیح پڑھی کہ اس کا اثر صحابہؓ کے چہروں پر ظاہر ہوگیا اور فرمایا: "اللہ کی شان اس سے بلند تر ہے کہ اس کے ذریعے کسی بندے سے سفارش کی جائے" (ابو داؤد، ۵: ۹۵، حدیث ۴۷۲۶)۔ ایک مرتبہ کسی بچی نے کہا: "وَفِینا نبیٌّ یعلَمُ ما فِي الغَدِ"، یعنی ہمارے ہاں وہ نبی ہیں جو کل ہونے والی باتیں بھی جانتے ہیں، تو آپؐ کو ناگوار گزرا اور فرمایا "یہ کہنا چھوڑ دو اور جو پہلے کہا کرتی تھی وہی کہو" (البخاری، النکاح؛ الترمذی، ۳: ۳۹۹ حدیث ۱۰۹۰)۔ ابن ماجه (باب الغناء والدف، حدیث ۱۸۹۷) نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ کل کی باتیں تو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا: "سیدنا خیرنا و ابن خیرنا"۔ آپؐ یہ سن کر خفا ہوئے اور فرمایا: لوگو! "مجھے میرے رتبے سے زیادہ نہ بڑھاؤ" (ابن الجوزی: الوفا، ۲: ۳۵۴)۔ آپؐ فرمایا کرتے: "میری اس طرح مدح نہ کرو جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی کرتے ہیں۔ میں تو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں" (البخاری، ۲: ۳۶۹، کتاب الانبیاء)۔ ایک مرتبہ بعض صحابہؓ نے آپؐ سے تعظیمی سجدے کی اجازت چاہی جو شام و عراق کے سرداروں میں رائج تھا تو آپؐ نے سختی سے فرمایا کہ اگر سجدہ مباح ہوتا، تو میں حکم دیتا کہ عورت اپنے خاوند کو سجدہ کرے (ابو داؤد، ۲: ۶۰۵، حدیث ۲۱۴۰؛ الترمذی، ۳: ۴۶۵، حدیث ۱۱۵۹؛ ابن ماجه، حدیث ۱۸۵۳)۔ ایک مرتبہ ایک بدو کے اونٹ کا آپؐ کی ناقہ سے مقابلہ ہوا۔ اتفاقاً بدّو کا اونٹ جیت گیا۔ صحابہؓ کو اس سے دکھ ہوا آپؐ نے فرمایا: "جو چیز بڑھتی ہے، خدا اسے گرا بھی دیتا ہے" (البخاری، ۴: ۳۸، الجهاد؛ ابو داؤد، ۵: ۱۵۲، حدیث ۴۸۰۲)۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے دوران گفتگو یہ کہہ دیا کہ جو اللہ اور اس کا رسول چاہے۔ آپؐ نے فرمایا: "تم نے مجھے اللہ کا شریک اور ہمسر ٹھیرا دیا"؛ یہ کہو کہ جو خدا چاہے (البخاری: ادب المفرد).

اپنے متعلق ہی نہیں، بلکہ اپنے متّبعین کے متعلق بھی آپؐ کا یہی طرز عمل تھا۔ ایک روز آپؐ کے سامنے کسی صحابیؓ نے ایک دوسرے صحابی کی تعریف کی۔ آپؐ خفا ہوئے اور فرمایا: "تو نے اسے ہلاک کر دیا" (یا یہ کہ: تو نے اس کی گردن توڑ ڈالی)

marfat.com
Marfat.com

(البخاری ۴ : ۱۲۷ ، باب الادب ، ۴۵ ؛ مسلم ، ۴ : ۲۲۹۶ ، حدیث ۳۰۰۰ ؛ ابن ماجہ ، حدیث ۳۷۴۴ ، المدح)۔

(۱۱) سادگی: آپ کو کھانے پینے ، پہننے اوڑھنے میں تکلف اور تصنع سخت ناپسند تھا ۔ سادگی اور بے تکلفی ہمیشہ آپ کا معمول رہی ۔ جو کچھ سامنے آ جاتا ، کھا لیتے ؛ جو کچھ ملتا ، پہن لیتے ؛ البتہ طبیعت میں نظافت ضرور تھی؛ چنانچہ کسی ایسی چیز کو پسند نہ فرماتے جس میں ظاہری یا معنوی طور پر نفاست نہ پائی جاتی ہو ۔ کچا پیاز ، لہسن اور گوہ کا گوشت ، گو آپ نے حرام نہیں ٹھیرایا ، مگر خود کبھی نہیں کھایا (الترمذی ، ۴ : ۲۶۱ ، حدیث ۱۸۰۶ ، ۱۸۰۷) ۔ اپنے متبعین سے بھی آپ یہی توقع رکھتے تھے کہ ان کے رہن سہن میں سادگی اور بے تکلفی رہے ۔ ایک مرتبہ آپ حضرت فاطمۃ الزہراء کے مکان پر تشریف لے گئے ، مگر دروازے ہی سے پلٹ آئے ۔ حضرت علیؓ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا : کسی پیغمبر کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی ایسے گھر میں داخل ہو جس میں زیب و زینت ہو (ابو داؤد ، ۴ : ۳۸۲ ، حدیث ۴۱۴۹) ۔ ہوا یہ تھا کہ آپ کی صاحبزادیؓ نے گھر کی سجاوٹ کے لیے رنگین پردے دروازے پر ڈال لیے تھے ؛ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں چھت گیر لگی دیکھی تو فوراً چاک کر دی اور فرمایا : "کپڑا خود پہننے کے لیے ہوتا ہے اینٹ کو پہنانے کے لیے نہیں" (ابو داؤد ، ۴ : ۳۸۵ ، حدیث ۴۱۵۳) ۔ ایک مرتبہ کسی نے آپ کو کمخواب کی بنی ہوئی بہت خوبصورت قبا بھیجی ۔ آپ نے پہنی، مگر پھر اتار کر حضرت عمر فاروقؓ کو بھیج دی کہ فروخت کرکے اپنے کام میں لائیں (البخاری : ۱ : ۲۳۶ ، کتاب الجمعہ ، باب ۷ ؛ مسلم ، ۳ : ۱۶۳۸ ، حدیث ۲۰۶۸) ۔ اسی طرح ایک موقع پر آپ کو کسی نے بہت خوبصورت چادر بھیجی ، جس کے حاشیے کاڑھے ہوئے تھے ۔ آپ نے پہنی تو بہت بھلی معلوم ہوئی ، مگر ایک شخص کے سوال کرنے پر اتار کر اسے مرحمت فرما دی (البخاری ، ۴ : ۱۲۳ ، الادب ، باب ۳۹) ۔ گو عورتوں کے لیے زیور ممنوع نہیں ، مگر آپ اپنی ازواج کے لیے یہ تکلف بھی پسند نہ فرماتے ۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن دیکھے تو فرمایا : "اگر تم ورس کے کنگنوں کو زعفران سے رنگ کر پہن لیتی ، تو بہتر ہوتا" (النسائی : السنن، مطبوعہ قاہرہ، ۸: ۱۵۹) ۔ ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ کو سونے کی زنجیر پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا : کیا تجھے یہ بات اچھی محسوس ہوگی کہ لوگ یہ کہیں کہ رسول اللہ کی بیٹی کے ہاتھ میں آگ کی زنجیر ہے ۔ پھر آپ بیٹھے بغیر لوٹ گئے ۔ اس پر حضرت فاطمہؓ نے اس زنجیر کو بیچ کر اس کی قیمت سے ایک غلام خرید کر آزاد کر دیا ، جس پر آپ بے حد خوش ہوئے (کتاب مذکور، ص ۱۵۵) ۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ آپ جمعے اور وفود وغیرہ کے اجتماعات کے لیے کوئی عمدہ لباس (حلۃ سیراء) خرید لیں ۔ فرمایا : "یہ تو وہ پہنے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو" (ابو داؤد ، ۱ : ۶۴۹ ، حدیث ۱۰۷۶) ۔ ایک مرتبہ آپ باہر نکلے تو ایک قبّہ بنتے ہوئے دیکھا ۔ دریافت فرمانے پر پتا چلا کہ یہ فلاں شخص کا ہے ۔ آپ یہ سن کر خاموش ہوگئے ۔ اگلے دن جب وہ شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس سے اعراض فرمایا ۔ اس نے اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا ۔ انھوں نے بتایا کہ کل آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تمہارے زیر تعمیر قبے کو دیکھا تھا ۔ اس نے یہ سن کر اپنا قبہ گرا دیا (ابو داؤد : السنن، ۵ : ۴۰۳)۔

آپ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ اگر مجلس سے گھر

marfat.com
Marfat.com

چلکر واپس آنا ہوتا تو اپنی جوتیاں وہیں چھوڑ جاتے اور برہنہ پاؤں جاتے اور واپس آتے (ابو داؤد ، ۵ : ۱۸۰ ، حدیث ۴۸۵۴)۔ ایک مرتبہ لوگ آپؐ کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے تو آپؐ کو ناگوار ہوا اور فرمایا: "تم عجمیوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ کر کھڑے نہ ہو جایا کرو (ابن ماجہ : السنن، حدیث ۳۸۳۹؛ ابو داؤد، ۵: ۳۹۸، حدیث ۵۲۳۰)۔ گھر میں جو گدا تھا، اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی (الترمذی ، ۴ : ۲۹۸ ، حدیث ۱۷۶۱)۔

(۱۲) زھد و قناعت : آپؐ کی سیرت طیبہ کا ایک اور نمایاں وصف آپؐ کا زندگی کے ہر دور میں زہد و قناعت اختیار کرنا بھی ہے۔ آپؐ کا یہ زھد و قناعت اضطراری نہیں ، اختیاری تھا۔ حیات مبارکہ کے مکی اور مدنی ، دونوں ادوار میں مال و دولت کی آپؐ کے پاس ہرگز کوئی کمی نہ تھی ، مگر آپؐ مال و متاع دنیوی سے ایک حد سے زیادہ استمتاع صحیح نہیں سمجھتے تھے؛ چنانچہ آپؐ کے زھد و قناعت کا اس دور میں بھی ، جب کہ فتوحات سے حاصل شدہ قیمتی مال و متاع کی کچھ کمی نہ تھی ، یہ عالم تھا کہ حضرت عبداللہ کہتے ہیں ، کہ ایک مرتبہ آپؐ ایک کھجور کی چٹائی (حصیر) پر آرام فرما رہے تھے اور جسم مبارک پر اس چٹائی کے نشانات بہت واضح دکھائی دے رہے تھے؛ میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر آپؐ اجازت دیں تو ہم اس سے زیادہ نرم چیز آپؐ کے نیچے بچھا دیا کریں"۔ فرمایا: "مجھے بھلا دنیا سے کیا غرض؟ میری مثال تو اس مسافر کی سی ہے جو تپتی دوپہر میں ذرا سی دیر سستانے کے لیے کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ جائے اور پھر آرام کرکے چل دے" (ابن الجوزی : الوفا ، ۲ : ۴۷۵)۔ اسی طرح حضرت ابو امامہؓ نقل کرتے ہیں کہ آپؐ کے سامنے بطحاے مکہ کو سونے کا بنا کر پیش کیا گیا ، مگر آپؐ نے فرمایا: "یا اللہ! مجھے یہ (مال و دولت) منظور نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن کچھ کھانے کو مل جائے اور ایک دن فاقہ رہے ، تاکہ سیر ہو کر تیری تعریف اور شکر ادا کروں اور بھوکا رہ کر تضرّع اختیار کروں اور تجھ سے دعا مانگوں" (حوالۂ مذکور)۔ حضرت عائشہؓ نے ایک رات بستر کو نرم رکھنے کے لیے لیف اور اذخر کے دو بچھونے بچھا دیئے ، مگر آپؐ نے ناپسند فرمایا (حوالۂ مذکور)۔

امّ المومنین حضرت عائشہؓ، جنہوں نے آپؐ کے ساتھ دس سال گزارے، فرماتی ہیں کہ آپؐ نے کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا اور نہ کبھی اپنے اس حال کی کسی سے شکایت کی! فاقہ کرنا آپؐ کو غنا سے زیادہ پسند تھا۔ اگرچہ آپؐ نے تمام رات بھوک کی شدت سے کروٹیں بدلتے ہوئے گزاری ہوتی، پھر بھی، آپؐ اگلے دن روزہ رکھنا نہ چھوڑتے۔ اگر آپؐ اللہ سے زمین کے تمام خزانے اور پھل وغیرہ مانگنا چاہتے تو آپؐ کو دے دیے جاتے (مگر آپؐ نے اسے پسند نہیں فرمایا)۔ میں آپؐ کی یہ حالت دیکھ کر ، فرط محبت سے ، رو پڑتی تھی۔ میں اپنا ہاتھ آپؐ کے شکم مبارک پر پھیرتی (کہ بھوک سے کیا حال ہوگیا ہے) اور کہتی: میری جان آپؐ پر فدا! اگر آپؐ اتنا ہی مال دنیا قبول فرما لیا کریں جو آپؐ کی جسمانی قوت کو بحال رکھ سکے تو بہتر ہو۔ آپؐ فرماتے: "مجھے مال دنیا سے کیا واسطہ؟ میرے اولوالعزم بھائیوں (سابق انبیاء) نے اپنے سخت احوال پر بھی صبر کیا۔ پھر وہ اپنے رب کے پاس جا پہنچے، جہاں انہیں ان اعمال کے بدلے پورا اعزاز و اکرام ملا۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میں عیش دنیا میں پڑ کر ان سے کم رہ جاؤں۔ میرے نزدیک سب سے اچھی بات اپنے بھائیوں سے ملنا ہے"۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد آپؐ کا وصال ہوگیا (قاضی عیاض : الشفا ، ص ۶۳)۔

جب وصال ہوا اس وقت بھی آپؐ کی ایک زرہ

marfat.com
Marfat.com

ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی جس کے عوض غلہ ادھار لیا گیا تھا (الشفا ، ص ۶۲) - کئی کئی مہینے گزر جاتے اور بیت نبوی میں چولھا گرم نہ ہوتا، صرف پانی اور کھجور پر گزران ہوتی (حوالۂ مذکور)۔ اس قسم کے واقعات کتب سیرت میں بے شمار ہیں (نیز دیکھیے ابن الجوزی ، ص ۴۷۵ تا ۴۸۳).

(۱۳) اپنے کام اپنے ہاتھ سے انجام دینا : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اردگرد جاں نثاروں کی کمی نہ تھی - یہ جاں نثار ہر طرح کی خدمت کے لیے تیار رہتے تھے ، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بغیر عذر کے کسی سے خدمت لینا قطعاً منظور نہ تھا - آپؐ اپنے زیادہ سے زیادہ کام خود کرنا چاہتے اور دوسروں پر کم سے کم بوجھ بننا پسند کرتے تھے- (یہاں یہ یاد دلایا جا سکتا ہے کہ بعض صحابہؓ سے آپؐ نے یہ عہد لیا تھا کہ وہ کسی شخص سے کسی قسم کی مدد نہیں لیں گے) - تعمیر خانۂ کعبہ کے وقت آپؐ نے سب کے ساتھ مل کر مزدوروں کی طرح کام کیا (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۱۴۵) - مسجد نبوی اور مسجد قبا کی تعمیر اور بعد ازاں احزاب کے موقع پر خندق کھودنے میں بھی صحابۂ کرامؓ کے ساتھ شریک عمل رہے - بلکہ خندق کھودنے کے دوران میں جب کوئی مشکل مرحلہ آ جاتا تو آپؐ ہی کو بلایا جاتا (الواقدی : المغازی ، ۲ : ۴۵۰ تا ۴۵۱).

خانگی امور کے متعلق آپؐ کے دیکھنے والوں کا بیان یہ ہے کہ کان یخدم نفسہٗ (قاضی عیاض : الشفا ، ص ۵۸) ، یعنی آپؐ اپنے کام خود کیا کرتے تھے- ایک دوسری روایت کے مطابق آپؐ گھر کے کام کاج میں اپنی ازواج کا ہاتھ بٹاتے ؛ کپڑوں میں پیوند لگاتے ، گھر میں جھاڑو دیتے ، دودھ دوہ لیتے ، بازار سے سودا سلف لے آتے ، ڈول درست کر دیتے ، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے ، غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھ دیتے (البخاری : الصحیح ، ۴ : ۱۲۲ ؛ الشفا ، ص ۵۸) ، کوئی جانور بیمار ہوتا تو اسے علاج کے طور پر داغ دیتے (مسلم)؛ کوئی چیز مرمت طلب ہوتی تو اس کی مرمت کر دیتے (احمد بن حنبل: مسند ، ۳ : ۲۶۹) ؛ دوران سفر اگر صحابہؓ کام بانٹنا چاہتے تو آپؐ بھی معاونت فرماتے.

صرف یہی نہیں بلکہ آپؐ کو دوسروں کے کام کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے - بعض مہمانوں کی خود خدمت گزاری کرتے (قاضی عیاض : الشفا)؛ اگر کسی صحابیؓ کے شریک جہاد ہونے کی بنا پر گھر میں کوئی ذمہ دار فرد نہ ہوتا تو آپؐ خود جا کر ان کے جانوروں کا دودھ دوہ دیتے.

آپؐ کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کے کام کرنے میں بھی تأمل نہیں ہوتا تھا، مثلاً کسی بیوہ یا مسکین کے ساتھ مل کر ان کا کام کر دیتے (ابن الجوزی : الوفا ، ص ۴۳۷) - نیم دیوانی باندی آپؐ کو کسی کام کے لیے بلانے آتی تو آپؐ چل پڑتے اور فرماتے: "تو جس جگہ چاہے چل ، میں تیرا کام کروں گا (حوالۂ مذکور)- بعض بدو آتے اور آپؐ کو مسجد سے اپنے کام کے لیے لے جاتے ، ان کے بدوی لب و لہجہ کے باوجود آپؐ کو ذرا ناگواری محسوس نہ ہوتی (مسلم).

۲- حسن معاشرت : انسانی معاشرہ باہمی ربط و ارتباط سے تشکیل پذیر ہوتا ہے - اسی بنا پر جدید سوشیالوجی (عمرانیات) کی اصطلاح میں انسان کو Social animal کہا جاتا ہے - اس باہمی ارتباط سے جو رشتے استوار ہوتے ہیں (جن کے لیے اسلام میں رحم (۴ [النساء] : ۱) کی وسیع اور معنی خیز اصطلاح استعمال کی گئی ہے) - ان کی خوش ادائی ہی کا نام خلق [رک بہ علم اخلاق] ہے - پھر اس خوش ادائی کے بھی کئی مراحل ہیں : کسی کی نظر صرف اپنے کنبے اور خاندان تک محدود ہوتی ہے ؛ کوئی صرف اپنی ملّت یا قوم کے لوگوں کو ہی خوش خلقی کا مستحق سمجھتا ہے ، جبکہ بعض لوگ اپنے ذاتی خواہشات و

marfat.com
Marfat.com

بنیاد ہی کو اس کا معیار ٹھیرا لیتے ہیں ، لیکن تاریخ عالم میں ایک بزرگ ہستی ایسی بھی گزری ہے جس نے پورے انسانی معاشرے کو بحیثیت ایک کنبے، ایک قبیلے اور ایک وحدت کے تصور کیا ، بنی آدم کو بلا امتیاز رنگ و نسل ان کے جائز اور فطری حقوق عطا کیے ۔ اس کی نگاہ میں عربی اور عجمی، کالے اور گورے کی تفریق ہمیشہ بے معنی رہی ۔ یہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مبارک و مسعود ہستی ہے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حیات طیبہ میں جس چیز نے سب سے زیادہ لوگوں کو متأثر کیا اور آپؐ کا گرویدہ بنایا وہ آپؐ کا حسن خلق اور جمیل طرز معاشرت ہی تھا ۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں آپؐ کی بے مثال کامیابی کو آپؐ کی نرمی اور شفقت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے : فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۳ [آل عمرٰن] ۱۵۹) ، یعنی پس اللہ کی مہربانی سے آپؐ ان (لوگوں) کے لیے نرم ہوگئے اور اگر آپؐ ترش رو ، سخت دل ہوتے تو سب لوگ آپؐ کے پاس سے منتشر ہو جاتے ۔ قرآن کریم میں آپؐ کو اسی بنا پر عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۹ التوبہ) : ۱۲۸) ؛ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (۳۳ [الاحزاب] : ۶) ؛ اور سب سے بڑھ کر رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱ [الانبیا]: ۱۰۷) قرار دیا گیا ہے ۔ اسی سے لوگوں سے آپؐ کے سلوک کا ایک مابہ الاشتراک کلیہ استنباط کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے آپؐ کی بنی نوع انسان کے لیے پدرانہ و پیغمبرانہ محبت و شفقت ، نرمی اور عفو و درگزر ۔ یہ مابہ الاشتراک جذبہ آپؐ کی تمام حیات طیبہ کا خلاصہ ہے ؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جذبات آپؐ کے سینۂ اطہر میں ہمیشہ موجزن رہے ، دور نبوت میں بھی اور عرصہ قبل از نبوت میں بھی ۔ آپؐ چونکہ خود یتیمی اور کس مپرسی کا زمانہ گزار چکے تھے اس لیے دوسروں کے دکھ اور غم کا آپؐ بہت اچھی طرح اندازہ لگا سکتے تھے ۔

زمانۂ ما قبل از نبوت میں بھی حضرت خدیجۃ الکبریؓ [رک باں] کی شہادت کے مطابق (دیکھیے البخاری ، ۱ : ۵) آپؐ ہمیشہ غریبوں ، محتاجوں اور بیکسوں کے ہمدرد ، مسافروں کے بہی خواہ ، بیواؤں اور ضعیفوں کے حامی و ناصر، بلکہ ان کو کما کر دینے والے رہے ۔ جنگ بُعاث [رکّ باں] سے جو تباہی ہوئی ، اس نے آپؐ کے قلب اطہر پر خاص اثر کیا ؛ چنانچہ خوں ریزی کو روکنے کے لیے آپؐ نے حِلف الفضول [رک باں] کے دوبارہ احیا کے لیے انتھک کام کیا (ابن سعد ، ۱ : ۱۲۹ ، مطبوعۂ بیروت) ۔ یہ عہد نامہ مظلوم کی حمایت پر کمربستہ رہنے سے متعلق تھا ۔ دوسروں کے لیے آپؐ کے دل میں جو شفقت و محبت کا بے پناہ جذبہ تھا اس کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپؐ کے ہاں دین کی تعبیر ہی دوسروں کی خیر خواہی سے تھی ۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے: الدِّین النصیحة (البخاری، ۱: ۲۳، کتاب الایمان، باب ۴۲ : مسلم، ۱ : ۷۴، حدیث ۵۵، کتاب الایمان؛ ابو داؤد، ۵ : ۲۳۴، حدیث ۴۹۴۴) ۔ یہ دوسروں کے لیے حد سے بڑھی ہوئی خیر خواہی ہی کا نتیجہ تھا کہ دوسروں کے ایمان قبول نہ کرنے کا غم ہمیشہ آپؐ کے لیے جان گسل رہا اور قرآن کریم کو بار بار آپؐ کی دل دہی کرنا پڑی : فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (۱۸ [الکہف] : ۶) ، یعنی کیا آپؐ اپنی جان کو اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لاتے ہلاک کر ڈالیں گے ۔

اسی بنا پر دوسروں سے معاملات کرنے میں ہمیشہ آپؐ کی طرف سے پیش رفت رہی ۔ آپؐ کے ہاں دوسروں سے اپنے حقوق لینے پر اصرار کے بجائے ہر شخص کو اس کے حقوق دینے کا اصول کارفرما تھا ۔

marfat.com

Marfat.com

قرآن کریم کی یہ آیت آپؐ کے اس جمیل طرز معاشرت پر بخوبی روشنی ڈالتی ہے : وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (۴۱ [حٰمٓ السجدۃ] : ۳۴)، یعنی بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ آپؐ (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس شخص میں اور تم میں دشمنی تھی وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے۔ اسی بنا پر آپؐ گفتگو کرنے، سلام و مصافحہ کرنے اور عمدہ برتاؤ کرنے میں ہمیشہ پہل فرماتے تھے۔

آپؐ کی معاشرتی زندگی کا تفصیلی بیان نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی اس کی گنجائش ہے، البتہ آپؐ کی حسین و دلآویز طرز معاشرت کے چند خصائص ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں، تاکہ آپؐ کے حسن معاشرت کا کچھ اندازہ ہو سکے :

(۱) جذبۂ اخوت و ہمدردی : دوسروں کے لیے آپؐ کے دل میں ہمیشہ ہمدردی اور مہربانی کے جذبات موجزن رہے۔ اس مسئلے میں آپؐ کے نزدیک اپنے بیگانے، آزاد اور غلام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ آپؐ اکثر فرمایا کرتے تھے : "میرے سامنے دوسروں کی ایسی باتیں نہ کیا کرو جنھیں سن کر میرے دل میں ان کے متعلق کوئی کدورت پیدا ہو جائے، کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میں سب سے صاف دل (سلیم الصدر) کے ساتھ ملوں (ابو داؤد : سنن، ۵ : ۱۸۳، حدیث ۴۸۶۰؛ الترمذی : ۵ : ۷۱۰، حدیث ۳۸۹۶، مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۶۵ء)۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے دو افراد کے متعلق آپؐ کو کوئی شکایت پہنچائی۔ یہ سن کر آپؐ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو کنایۃً فرمایا کہ اس طرح کی باتیں مجھے نہ پہنچایا کرو" (الترمذی، حوالۂ مذکور؛ البخاری، ۴ : ۱۲۷)۔ اس کے برعکس آپؐ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو ترغیب دلایا کرتے تھے کہ دوسروں کے حق میں اچھی باتیں کیا کرو۔ ایک موقع پر فرمایا : "لوگوں کی میرے سامنے سفارش کرو تاکہ تم اجر پاؤ اور اللہ اپنے نبیؐ کی زبان پر جو چاہے فیصلہ جاری کر دے (البخاری، الادب؛ مسلم (البر)، ۴ : ۲۰۲۶، حدیث ۲۶۲۷)۔ یہی ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ تھا کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے خدا سے پختہ عہد لے رکھا ہے، اگر بتقاضاے بشریت میری زبان سے کسی کے حق میں کوئی غیر مفید دعا یا جملہ نکل بھی جائے تو متعلقہ فرد کو اس کے بدلے میں رحمت، دل کی پاکیزگی اور روز قیامت کے لیے ذریعہ قربت بنا دے (مسلم، ۴ : ۲۰۰۰، حدیث ۲۶۰۰ تا ۲۶۰۴)؛ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اخلاق کی بلندی یہ نہیں کہ تم اس کے ساتھ نیکی کرو جو تمہارے ساتھ نیکی کرے اور اس کے ساتھ برائی کرو جو تمہارے ساتھ برائی کرے، بلکہ صحیح اخلاق تو یہ ہے کہ ہر شخص سے نیک سلوک کرو خواہ وہ تم سے برے طریقے ہی سے پیش آئے یا تم پر زیادتی کرے۔ اسی بنا پر آپؐ کے نزدیک نیکی کا مفہوم ہی حسن خلق، یعنی دوسروں سے اچھا برتاؤ تھا۔ آپؐ کا ارشاد ہے : البر حسن الخلق (مسلم، ۴ : ۱۹۸۰، حدیث ۲۵۵۲)۔ یہ بھی آپؐ ہی کا ارشاد ہے : اکمل المؤمنین ایماناً احسنھم خلقاً (الترمذی : السنن : ۳، ۴۶۹، حدیث ۱۱۶۲؛ ابو داؤد، ۵ : ۶، حدیث ۴۶۸۲)، یعنی ایمان کی تکمیل اخلاق اور طرز معاشرت کی تکمیل کے بغیر نہیں ہو سکتی : انّ خیارکم احاسنکم اخلاقاً (البخاری، ۴ : ۱۲۱، کتاب ۷۸، باب ۳۹)، یعنی تم میں وہی بہتر ہے جس کا اخلاق دوسروں سے اچھا ہو۔ ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ اچھے اخلاق والے کو اچھے اخلاق کی وجہ سے روزے دار اور قائم اللیل کا درجہ مل جاتا ہے (ابو داؤد : السنن، ۵ : ۱۳۱، حدیث ۴۷۹۸) آپؐ کے نزدیک حسن خلق سے مراد چہرے کی بشاشت، اچھائی کا پھیلانا اور

marfat.com
Marfat.com

لوگوں سے تکلیف دہ امور کا دور کرنا ہے (الترمذی ، ۴ : ۳۶۳، حدیث ۲۰۰۵)؛ صرف یہی نہیں، آپؐ اس جذبے کو پورے معاشرے میں رواں دواں دیکھنا چاہتے تھے ، ارشاد تھا : تم اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک دوسروں کے لیے بھی وہی پسند نہ کرنے لگو جو خود اپنے لیے پسند کرتے ہو (مسلم ، ۱ : ۶۷ ، حدیث ۴۵ ؛ احمد بن حنبل : مسند ، ۳ : ۲۷۲)۔ ایک موقع پر فرمایا : "ایک دوسرے پر بغض و حسد نہ کرو ، نہ ایک دوسرے سے رو گردانی اختیار کرو اور نہ ایک دوسرے کے اندرونی معاملات کی خواہ مخواہ ٹوہ لگاؤ اور اے اللہ کے بندو! سب بھائی بھائی ہو جاؤ" (مسلم، ۴ : ۱۹۸۵ ، حدیث ۲۵۶۳؛ البخاری ۴ : ۱۲۸ ، کتاب الادب) ۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی آپؐ کے در دولت سے پوری طرح مستفید ہوتے رہے ۔

(۲) حلم و بردباری : لوگوں کے ساتھ معاملات کرنے میں اکثر حوصلہ شکنی ہوتی ہے ، ایسے مواقع پر آپؐ کا طرز عمل ہمیشہ عفو و بردباری کا رہا ؛ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں : "آپؐ نے تمام زندگی اپنے اوپر کی گئی زیادتی کا بدلہ نہیں لیا ، بجز اس کے کہ خدائی حرمت کو پامال کیا گیا ہو ، پس اس صورت میں آپؐ سختی سے مؤاخذہ فرماتے تھے (البخاری ، ۳ : ۳۹۵ کتاب المناقب ، ؛ مسلم ، ۴ : ۱۸۱۲ ، کتاب الفضائل ، حدیث ۲۳۲۷ ۔ آپؐ کا یہ بھی فرمان تھا : طاقتور وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے بلکہ اصل طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت خود پر قابو رکھے" (البخاری ، ۴ : ۱۳۹ ، کتاب الادب ؛ مسلم، حدیث ۲۰۱۴) ۔ ایک شخص نے ایک موقع پر نصیحت سننے کی خواہش کی تو فرمایا : "غصہ نہ کیا کر اور اسے تین مرتبہ دہرایا (البخاری ، ۴ : ۱۳۹) - ایک مرتبہ ایک بدّو آیا اور پیچھے سے آپؐ کی چادر پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا، کہ گردن مبارک پر نشان پڑ گیا ۔ آپؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے نہایت درشتی سے کہا : "میرے ان اونٹوں پر کچھ مال لاد دے ، کیونکہ تو نہ اپنے مال سے لادے گا اور نہ اپنے باپ کے مال میں سے"۔ آپؐ نے فرمایا : "نہیں" اور تین مرتبہ استغفراللہ کہا ۔ پھر آپؐ نے نہ صرف اسے معاف کر دیا بلکہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لادنے کا حکم دیا (ابو داود ، ۵ : ۱۳۴ ، حدیث ۴۷۷۵ ؛ النسائی ، کتاب القسامہ، ۸ : ۳۳ و ۳۴، حدیث ۴۷۸۰) ۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے اس سے پوچھا : "تجھے کس چیز نے اس گستاخی پر ابھارا ؟" اس نے فوراً کہا : "آپؐ کے حلم اور بردباری نے"۔

ایک قبیلہ مسلمان ہوتے ہی قحط کا شکار ہو گیا ۔ وسائل کی کمی کے پیش نظر آپؐ نے ایک یہودی زید بن سَعْیہ سے اسّی دینار قرض لے کر انہیں خوراک مہیا کر دی ۔ ابھی اس کی ادائی کا وقت نہیں آیا تھا کہ زید آپؐ کی خدمت میں پہنچا اور نہایت درشتی اور کرختگی سے اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا اور کہا : "بخدا تم بنو عبدالمطلب بڑے ہی نادہند ہو"۔ حضرت عمرؓ اس کی اس گستاخی پر برافروختہ ہوگئے اور اس کا سر قلم کرنے کی اجازت چاہی ، مگر آپؐ نے فرمایا : "اے عمرؓ ! تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے حسن ادا کی تلقین کرتے اور اسے حسن طلب کی"۔ پھر نہ صرف اس کے قرض کی فوری واپسی کا حکم دیا ، بلکہ بیس صاع (تقریباً دو من) زیادہ کھجوریں دینے کا حکم دیا ۔ یہ سلوک دیکھ کر وہ مسلمان ہوگیا (خفاجی : شرح شفا ؛ ابن الجوزی : الوفا ، ۲ : ۴۲۵ ببعد).

(۳) عفو و کرم : آپؐ جس طرح اپنوں کے لیے پیکر حلم و بردباری تھے اسی طرح دشمنوں کے لیے سراپا جود و کرم تھے ۔ آپؐ نے حیات

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

مبارک میں کسی ذاتی دشمن سے انتقام نہیں لیا (الترمذی : شمائل) ۔ فتح مکہ کے موقع پر آپؐ کا اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کو معاف کر دینا ، اپنے قتل کے لیے آنے والے قاتلوں کو بار بار چھوڑ دینا ، اس سلسلے کی روشن مثالیں ہیں (دیکھیے سطور بالا ؛ [نیز رک بہ غزوات نبوی)]۔

مدینہ منورہ میں ایک بہت بڑی تعداد منافقوں کی تھی ، جن کے رئیس عبداللہ ابن اُبّی بن ابی سلول نے نہ صرف ہمیشہ در پردہ دشمنوں کی حمایت کا جرم کیا تھا ، بلکہ مختلف اوقات میں وہ آپؐ کے خلاف بغاوت ، افک وغیرہ کے واقعات میں براہ راست ملوث بھی رہا ، مگر آپؐ نے نہ صرف اسے معاف کیا بلکہ مرنے کے بعد اسے اپنی قمیص پہنائی اور ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کرنے کا وعدہ فرمایا (البخاری ، ۱ : ۳۴۳ ، کتاب الجنائز) ۔ متعدد مرتبہ صحابہؓ نے اسے قتل کرنے کی اجازت طلب کی ۔ مگر آپؐ نے سختی سے منع فرمایا (دیکھیے مفتی محمد شفیع: معارف القرآن، بذیل سورۃ المنافقون)۔

ایک بدوی نے ایک مرتبہ مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا ۔ صحابہؓ اسے مارنے کے لیے دوڑے ، مگر آپؐ نے روکا اور اسے اپنی حاجت سے فارغ ہونے دیا ۔ پھر آپؐ نے اس جگہ کو دھونے کا حکم دیا اور اسے نرمی سے سمجھا دیا (ابو داود ، ۴ : ۲۶۳ تا ۲۶۵ ، حدیث ۳۸۰؛ الترمذی، ۱ : ۲۷۶، حدیث ۱۴۷؛ البخاری ، ۱ : ۶۷ ؛ مسلم ، ۴ : ۲۳۶) ۔ آپؐ کے خدام سے اکثر غلطیاں ہوجاتیں مگر آپؐ انھیں معاف فرما دیتے (مسلم ، ۴ : ۱۸۰۴، حدیث ۲۳۱۰) ۔ اس سلسلے میں بے شمار واقعات مروی ہیں۔

(۴) دوسروں کے جذبات کا احترام : آپؐ دوسروں سے معاملہ کرنے میں ہمیشہ دوسروں کے جذبات کا احترام فرماتے؛ کبھی کسی پر زبردستی اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے تھے۔

حضرت عائشہؓ جب آپؐ کے عقد میں آئیں ، ابھی نوعمر تھیں ۔ اس عمر میں کھیل کود کی طرف ان کے فطری میلان کا آپؐ کو بخوبی احساس تھا ۔ اس بنا پر آپؐ نے حضرت عائشہؓ کو اپنے کھیل کود کے مشاغل جاری رکھنے سے منع نہ فرمایا ۔ خود حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں : "میرے ساتھ کھیلنے کے لیے میری ہمجولیاں میرے گھر آ جایا کرتی تھیں ۔ جب آپؐ تشریف لے آتے تو باہر نکل جاتیں ؛ جب آپؐ چلے جاتے تو پھر چلی آتیں (البخاری ، کتاب الادب ؛ مسلم ، ۴ : ۱۸۹۰، کتاب الفضائل ، حدیث ۲۴۴۰؛ ابو داود: السنن، ۵ : ۲۲۶، حدیث ۴۹۳۱) ۔ ایک مرتبہ کسی غزوے سے واپسی کے موقع پر جس ہودج میں حضرت عائشہؓ سوار تھیں ، ہوا کی وجہ سے اس کا پردہ ذرا سا اٹھ گیا ۔ آپؐ نے دیکھا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس گڑیاں ہیں اور ان میں ایک گھوڑا بھی ہے ، جس کے دو پر ہیں ۔ پوچھا : "اے عائشہؓ یہ کیا ہے" ؟ کہا : "میرے کھلونے ہیں"۔ فرمایا : "درمیان میں کیا ہے" ؟ کہا : "گھوڑا" ۔ فرمایا : "یہ اس پر کیا دکھائی دے رہا ہے ؟" کہا : "یہ دو پر ہیں"۔ آپؐ نے تعجب ظاہر فرماتے ہوئے پوچھا : "گھوڑا اور اس کے دو پر" ؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا : "آپؐ نے نہیں سنا کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس جو گھوڑا تھا اس کے کئی پر تھے"۔ یہ سن کر آپؐ اتنا ہنسے کہ آپؐ کی داڑھیں دکھائی دینے لگیں (ابو داود : السنن، ۵: ۲۲۷، حدیث ۴۹۳۲) ۔ دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے معاملات کرتے وقت بھی آپؐ ان کے جذبات کا خیال رکھتے تھے ۔ ایک مرتبہ آپؐ حضرت سعدؓ بن عبادہ (رئیس قبیلہ خزرج) کو ملنے کے لیے تشریف لے گئے اور اپنے معمول کے مطابق تین مرتبہ جا کر بلند آواز سے سلام کیا اور واپس پلٹنے لگے۔ حضرت سعدؓ، جو دانستہ پست آواز سے جواب دیتے جاتے تھے تاکہ آپؐ کی یہ دعا زیادہ

marfat.com
Marfat.com

[...]و پیچھے گئے اور عرض کیا: "یا رسول اللہ! آپؐ کیوں لوٹ رہے ہیں"؟ فرمایا: "تم نے تینوں مرتبہ سلام کا جواب نہیں دیا تھا اس لیے واپس جا رہا ہوں"۔ حضرت سعدؓ نے کہا: "یا رسول اللہ! میں اس لیے آہستہ جواب دے رہا تھا تا کہ آپؐ ہمارے حق میں اور دعا مانگیں"۔ آپؐ نے یہ سنتے ہی فرمایا: "اے اللہ! سعدؓ بن عبادہ کے اہل و عیال پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرما"۔ واپسی پر انھوں نے سواری کے لیے آپؐ کو گھوڑا پیش کیا اور خود پیدل چلنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا: "یا تو تم بھی سوار ہو جاؤ اور یا پھر واپس پلٹ جاؤ"۔ حضرت سعدؓ نے آپؐ کے برابر بیٹھنا سوے ادب خیال کیا اور واپس پلٹ گئے (ابو داؤد، ۵: ۳۷۲ تا ۳۷۴، حدیث ۵۱۸۵)۔

آپؐ اپنے جاں نثاروں کے جذبات کا اس حد تک احترام فرماتے تھے۔ ارشاد تھا: میں نماز لمبی کرنا چاہتا ہوں، مگر پیچھے سے مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو اس کی ماں کا خیال کر کے نماز مختصر کر دیتا ہوں (مسلم، ۱: ۳۴۲، حدیث ۴۷۰؛ النسائی، حدیث ۸۲۶)۔ لوگوں کی مشقت اور تکلیف کا خیال کر کے آپؐ نہایت مختصر وعظ فرماتے (ابو داؤد، ۱: ۶۶۳، حدیث ۱۱۰۷) اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیتے (کتاب مذکور، ۱: ۶۶۲، حدیث ۱۱۰۶)۔ جب کسی کو بطور حاکم مامور کر کے کسی جگہ بھیجتے تو فرماتے: "لوگوں کو خوشخبری دے کر اسلام سے مانوس کرنا اور انھیں (ڈرا دھمکا کر) متنفر نہ کرنا؛ ان کے لیے آسانی پیدا کرنا، مشکل نہیں (مسلم، ۳: ۱۳۵۸، حدیث ۱۷۳۲؛ ابو داؤد، ۵: ۱۷۰، حدیث ۴۸۳۵)۔

(۵) مرتبہ دانی: آپؐ کی معاشرتی زندگی کی ایک اور خصوصیت مرتبہ دانی تھی۔ آپؐ کے ہاں ہر شخص کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا اصول کارفرما نہ تھا، (مگر یاد رہے کہ اس عزت افزائی میں بھی: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ، ۴۹ [الحجرات]: ۱۳، کا اصول پیش نظر رہتا تھا)۔ آپؐ ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے: انزلوا النّاس مَنَازِلَھُمْ (ابو داؤد، ۵: ۱۷۳، حدیث ۴۸۴۲)، یعنی لوگوں سے ان کے مرتبے کے مطابق سلوک کرو۔ آپؐ کا یہ فرمان بھی تھا: "سفید مو (بزرگ) مسلمان، وہ حامل قرآن جو اس میں نہ غلو کرتا ہو اور نہ اس سے کنارہ، نیز انصاف دوست بادشاہ کا اکرام کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کا اکرام کرنا ہے" (ابو داؤد، ۵: ۱۷۸، حدیث ۴۸۴۳)۔ جب بنو قریظہ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کے حَکم ہونے پر اپنے قلعوں سے نکلنا منظور کر لیا اور حضرت سعدؓ بلاوے پر وہاں پہنچے تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا: قوموا الی سید کم او خیر کم (البخاری، ۴: ۷۵، الاستئذان، باب ۲۶؛ مسلم (الجہاد)، ۳: ۱۳۸۸، حدیث ۱۷۶۸)، یعنی اپنے سردار کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ مگر قانون اور حقوق میں آپؐ کے نزدیک چھوٹے بڑے سب برابر تھے؛ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "تمام مسلمانوں کی ذمہ داری برابر ہے۔ ان میں سے ادنٰی شخص بھی اگر چاہے تو کسی کو پناہ دے سکتا ہے" (الترمذی: السنن، ۴: ۱۴۲، حدیث ۱۵۸۰) آپؐ نے یہاں تک فرمایا کہ ایک عورت بھی کسی کو پناہ دینے کی مجاز ہے (حوالۂ مذکور)؛ چنانچہ ایک مرتبہ آپؐ کی چچا زاد بہن حضرت ام ہانیؓ نے اپنے خاندان کے دو آدمیوں کو پناہ دے دی؛ آپؐ کے سامنے ذکر ہوا تو فرمایا: "جسے تو نے امان دی اسے ہم نے بھی امان دے دی" (حوالۂ مذکور)۔

اسی طرح کسی بڑے آدمی کی خاطرداری کے لیے آپؐ کو اپنے کسی ادنٰی خادم کی دل شکنی بھی گوارا نہ تھی۔ ایک دفعہ مشرکین نے کہلا بھیجا کہ ہم اس شرط پر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے تیار ہیں کہ آپؐ اپنی مجلس سے چھوٹی قوم کے لوگوں

marfat.com
Marfat.com

کو اٹھا دیں ۔ اس موقع پر آپؐ کی طرف سے قرآن کریم میں یہ جواب دیا گیا : وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ (۶ [الانعام] : ۵۲) ، یعنی جو لوگ صبح و شام اپنے رب کو خاص اس کی رضا کے لیے پکارتے ہیں ان کو اپنے پاس سے مت نکالو۔

(۶) دوسروں کے متعلق حسن ظن : آپؐ ہمیشہ دوسروں کے متعلق حسن ظن رکھتے تھے۔ اسی بنا پر آپؐ کو کسی سے کوئی ایسی بات سننا گوارا نہ تھی جس سے آپؐ کے دل میں کسی کے خلاف کوئی کدورت پیدا ہونے کا احتمال ہو (الترمذی، ۵: ۱۰۷، حدیث ۳۸۹۶)۔ آپؐ کا ہمیشہ اس آیۂ کریمہ پر عمل رہا : یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (۴۹ [الحجرات] : ۱۲) ، یعنی اے اہل ایمان (دوسروں کے متعلق) بہت بدگمانی کرنے سے بچو کہ بعض گمان محض گناہ ہیں ۔ آپؐ کا ارشاد تھا : "حسن ظن اچھی عبادت ہے" (ابو داؤد ، ۵ : ۳۶۶ ، حدیث ۴۹۹۳) ۔ ایک مرتبہ ایک شخص حاضر ہو کر کہنے لگا : "یا رسول اللہ ! میری بیوی کے ہاں سیاہ رنگ کا لڑکا پیدا ہوا ہے" (یعنی شک کا اظہار کیا)۔ آپؐ نے فرمایا: "کیا تیرے پاس ایک کوہان والے اونٹ ہیں"؟ اس نے کہا : "ہاں"۔ فرمایا : "ان کا کیا رنگ ہے ؟" کہا: "سرخ"۔ فرمایا: "کیا ان میں مٹیالے رنگ کے بھی ہیں؟" کہا: "ہاں"۔ فرمایا: "وہ کہاں سے آئے؟" اس نے کہا : "شاید یہ کسی عرق نے اس کی طرف کھینچ لیا ہو"۔ فرمایا: "اپنے ہاں بھی یہی سمجھ لو" (الترمذی ، ۴ : ۴۳۹ ، حدیث ۲۱۲۸) ؛ آپؐ کا فرمان تھا : "تم خاص طور پر بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی بہت ہی بری بات ہے" (مسلم، البر، ۴: ۱۹۸۰، حدیث ۲۵۶۳؛ الترمذی، البر، ۴ : ۳۵۶ ، حدیث ۱۹۸۸)۔ بدگمانی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے سے خواہ مخواہ بدظنی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ ایک ایسی بیماری ہوتی ہے جس کی لپیٹ میں آنے سے کوئی شخص بھی نہیں بچ سکتا ۔ آپؐ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے ۔ اسی بنا پر خود بھی آپؐ بدگمانی سے بچتے اور دوسروں کو بھی بدگمانی سے بچنے کی تلقین فرماتے۔

اس کے ساتھ ہی آپؐ کا یہ بھی فرمان تھا کہ ان مواقع سے بھی بچو کہ جن سے دوسروں کو بدگمانی کا موقع مل سکتا ہے ۔ اسی بنا پر آپؐ عورت کو تنہا سفر کرنے ، یا کسی اجنبی مرد کے ساتھ خلوت کرنے سے روکتے تھے (البخاری ، ۳ : ۳۵۳ ، النکاح ، باب ۱۱۱ و ۱۱۲ ؛ ابو داؤد ، ۲ : ۳۳۶ ، ۳۴۷، حدیث ۱۷۲۳ ، ۱۷۲۴) ؛ آپؐ خود بھی ایسے مواقع سے بچتے تھے ، مثلاً ایک مرتبہ شام کو اپنی ایک بیوی کے ساتھ مصروف گفتگو تھے کہ دو صحابہؓ وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتے گزرنے لگے ۔ آپؐ نے فرمایا : "ٹھیر جاؤ ، یہ میرے ساتھ میری بیوی صفیہؓ ہے"! انھوں نے عرض کیا : "یا رسول اللہ ! معاذ اللہ کیا آپؐ کے متعلق بھی کسی کو بدگمانی ہو سکتی ہے" ؟ فرمایا : "شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے ۔ کیا خبر وہ تمھیں میرے متعلق بدگمانی میں مبتلا کر دے" (کتاب مذکور ، ۵ : ۲۶۷ ، حدیث ۴۹۹۴)۔

(۷) مکافات : معاملات میں انسانی فطرت عموماً بدلہ و مکافات کی طالب رہتی ہے ۔ آپؐ کو اس کا بخوبی احساس تھا ۔ اسی بنا پر آپؐ اپنے ملنے جلنے والوں کی ہمدردی کا ہمدردی سے جانثاری کا جانثاری سے اور احسان کا احسان سے بدلہ دیتے۔ غزوۂ احد میں جب حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ آپؐ کی طرف سے مدافعت میں تیر اندازی کر رہے تھے تو آپؐ ان کا ان الفاظ سے حوصلہ بڑھاتے: "ارم فداک ابی و امی" (البخاری ، ۳ : ۱۵۶ ؛ مسلم ، ۴ : ۱۸۷۶ ، حدیث ۲۴۱۱) ، یعنی تیر اندازی کر ، تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہوں ۔ ہدایا کے بارے میں آپؐ کا یہ

marfat.com
Marfat.com

الزامی معمول بیان کیا گیا ہے: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم یقبل الھدیۃ و یثیب علیھا (ابو داؤد ، ۳ : ۸۰۶ ، حدیث ۳۵۳۶) ، یعنی آپ ہدیہ قبول فرماتے اور اس پر بدلہ بھی مرحمت فرماتے۔ اس بارے میں آپ کا فرمان تھا : تَھَادُوا تَحَابُّوا (مشکوٰۃ ، ۲ : ۵۵۰ ، حدیث ۳۶۹۳ ؛ مالک : موطأ) یعنی ایک دوسرے کو ھدیہ دیا کرو ، اس سے باھمی الفت بڑھتی ہے ۔ بدلہ دینے میں آپ یہ لحاظ نہ فرماتے کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے ؛ چنانچہ ایک بدوی صحابی زاہر دیہاتی اشیا لا کر آپ کی خدمت میں پیش کرتے ، آپ اس کو شہری چیزیں عنایت فرمایا کرتے اور کہا کرتے: ان زاھرًا بادینا ونحن حاضروہ (مشکوٰۃ ، ۲ : ۵۹۱ ، حدیث ۳۸۸۹ ؛ ابن الجوزی ، الوفا ، ۲ : ۴۴۴) ، یعنی زاہر ھمارا دیہاتی دوست ہے اور ہم اس کے شہری دوست ہیں۔

آپ کے نزدیک شکر گزاری بھی مکافات کی ایک صورت تھی ؛ آپ کا ارشاد تھا : اگر تم میں سے کوئی کسی کو کچھ دے تو اسے اول تو اس کا بدلہ دینا چاہیے؛ اگر اس کی گنجائش نہ ہو تو اسے ھدیہ دینے والے کی تعریف کرنی چاہیے؛ جس نے ھدیہ دینے والے کی تعریف کی اس نے اس کا شکریہ ادا کر دیا اور جس نے اسے چھپایا اس نے اس کی ناشکری کی (ابو داؤد ، ۵ : ۱۵۸ ، حدیث ۴۸۱۳) ۔ آپ کا یہ بھی ارشاد تھا کہ جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ خدا کا بھی شکرگزار نہیں ہو سکتا (ابو داؤد ، ۵ : ۱۵۷ ، حدیث ۴۸۱۱ ؛ الترمذی)۔ ایک مرتبہ یمن کے ایک حکمران نے آپ کو ایک قیمتی حلّہ بھیجا، جو ۳۳ اونٹوں کے عوض خریدا گیا تھا ؛ آپ نے قبول فرمایا اور پھر آپ نے ۲۰ سے کچھ زیادہ اونٹوں سے خریدا ھوا حلہ اسے ارسال فرمایا (ابو داؤد ، ۴ : ۳۱۶ ، حدیث ۴۰۳۴) ۔ اگر کوئی شخص ھدیہ دے کر اس کا بدلہ لینے سے ھچکچاتا تو آپ کو سخت تکلیف ہوتی ؛ چنانچہ ایک بار ایک اعرابی نے آپ کو ایک اونٹ (ناقہ) دیا ۔ تو آپ نے اسے اس کے بدلے میں چھ دو دو سال کے اونٹ (بکر) دینا چاھے اس نے قبول کرنے سے انکار کیا ۔ آپ نے اس موقع پر خطبہ دیا اور فرمایا: اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بجز قریشی، انصاری ، ثقفی اور دوسی شخص کے کسی کا ھدیہ قبول نہ کروں گا (الترمذی، ۵ : ۷۳۰ ، حدیث ۳۹۴۵).

(۷) خوش معاملگی : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم معاملات کو اس خوش اسلوبی سے نبھاتے کہ معاملہ کرنے والا شخص ھمیشہ کے لیے آپ کا گرویدہ ہو جاتا ۔ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے کچھ ادھار لیا ۔ وقت آنے پر نہ صرف یہ کہ آپ نے وہ قرضہ ادا فرمایا، بلکہ اس سے بھی زیادہ دیا (النسائی (البیوع)، ۷: ۲۸۳ تا ۲۸۴؛ ابو داؤد، ۳ : ۶۴۲ ، حدیث ۳۳۴۷)۔ حضرت جابر کی ایک دوسری روایت سے مزید آپ کی خوش معاملگی پر روشنی پڑتی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دوران سفر میں ان کا اونٹ ذرا سست رفتاری سے چل رہا تھا، آپ نے دیکھا تو پوچھا کہ اے جابر ! کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا : یا رسول اللہ یہ اونٹ سست چل رہا ہے۔ آپ نے دعاے خیر فرمائی جس کی برکت سے سست رفتار اونٹ تیز چلنے لگا ۔ پھر فرمایا کہ کیا تو اپنے اس اونٹ کو بیچنا چاھتا ہے؟ کہا ھاں؛ آپ نے کچھ اوقیہ چاندی پر خرید لیا۔ مدینہ پہنچنے پر قیمت بھی ادا فرما دی اور اس اونٹ کو بھی واپس لوٹا دیا (البخاری ، ۲ : ۱۶ ، البیوع ، ۳۴) ۔ اسی قسم کا واقعہ حضرت عمر کے ساتھ بھی پیش آیا (دیکھیے کتاب مذکور ، باب ۳۳) ۔ ایک مرتبہ ایک شخص سے آپ نے ایک اونٹ لیا جو بکر یعنی چھوٹی عمر کا تھا ۔ بعد میں اونٹ آ گئے ۔ تو آپ نے اپنے خادم کو اس اونٹ کی واپسی کا حکم دیا۔ خادم نے آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ! ان اونٹوں میں چھوٹی عمر کا (بکر) کوئی اونٹ نہیں

marfat.com
Marfat.com

ہے ، سارے بڑے (یعنی چھ سات سال کے) ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا : وہی دے دو ، کیونکہ لوگوں میں سب سے اچھا وہی ہے جو دوسروں کو ادائیگی اچھے طریقے سے کرتا ہو (ابو داؤد ، ۳ : ۶۴۲ ؛ حدیث ۳۳۴۶ ؛ مسلم، حدیث ۱۶۰۰ ؛ الترمذی (البیوع) حدیث ۱۳۱۸)۔ ایک مرتبہ آپؐ کے ایک پرانے شریک کار حضرت سائبؓ مجلس میں آئے ۔ لوگ ان کی تعریفیں کرنے لگے ۔ آپؐ نے فرمایا : میں انھیں بخوبی جانتا ہوں یہ میرے شریک کار رہ چکے ہیں ؛ انھوں نے کہا : کُنتَ لا تُدارِی و لاتُمارِی (ابن ماجہ، (تجارات) حدیث ۲۲۸۷) یعنی آپؐ کسی کو شک و شبہے کا کوئی موقع نہ دیتے تھے (بلکہ معاملہ صاف رکھتے تھے) ۔ اسی خوش معاملگی کا یہ نتیجہ تھا کہ آپؐ نے جس سے بھی معاملہ کیا ، اس نے آپؐ کی تعریف کی اور وہ آپؐ کے اخلاق کا گرویدہ ہوگیا۔

(۸) پاس وعدۂ و امانت : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے وعدے اور امانت کا ہمیشہ خیال رہتا اور کسی نازک سے نازک گھڑی میں بھی اپنی اس ذمہ داری سے خود کو سبکدوش نہ سمجھتے تھے ۔ حضرت عبداللہ بن الحمساء زمانۂ ما قبل از بعثت کا واقعہ نقل کرتے ہیں کہ میں نے آپؐ سے معاملہ کیا ، مگر میری طرف سے کچھ بقایا رہ گیا ۔ میں نے کہا کہ میں ابھی گھر سے بقایا رقم لے کر آتا ہوں ، مگر گھر میں آ کر اپنا یہ وعدہ بھول گیا اور تین دن کے بعد مجھے اپنا وعدہ یاد آیا تو اس جگہ پہنچا جہاں آپؐ سے وعدہ کیا تھا ۔ میں جب وہاں پہنچا تو آپؐ کو اپنا منتظر پایا ۔ آپؐ نے مجھے دیکھا تو فرمایا : اے نوجوان ! تو نے مجھے بڑی مشقت میں ڈالا ہے ، میں تین دن سے تیرا منتظر ہوں (ابو داؤد ، ۵ : ۲۶۸ ، حدیث ۴۹۹۵) ۔ قبل از بعثت کے دور میں خاندان بنو ہاشم اور بعض دیگر نیک دل لوگوں کے درمیان معاہدہ حِلف الفضول [رک باں] طے پایا ، آپؐ کو اس معاہدے کی اہمیت کا جس طرح احساس تھا اس کا اندازہ ابن سعد (الطبقات ، ۱ : ۱۲۹ ، مطبوعۂ بیروت) کی اس صراحت سے ہوتا ہے کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے اس سے کنارہ کش رہنے کے لیے کوئی اعلٰی نسل کے سو اونٹ بھی دے تو تب بھی اسے قبول نہ کروں اور اگر اب بھی مجھے کوئی اس معاہدے کا نام لے کر پکارے تو میں ضرور اس کی آواز پر لبّیک کہوں۔

اہل مکہ آپؐ کی صداقت و امانت پر اس درجہ یقین رکھتے تھے کہ انھوں نے نہ صرف آپؐ کو الصادق اور الامین کے القاب دے رکھے تھے ، بلکہ دشمنی کے سخت ترین ایام میں بھی وہ اپنی امانتیں آپؐ کے پاس رکھ جاتے تھے ؛ چنانچہ جس وقت آپؐ نے ہجرت کی، اس وقت مکے کے بہت سے گھرانوں کی امانتیں آپؐ کے گھر میں رکھی ہوئی تھیں جن کا لحاظ کرکے آپؐ نے اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ کو پیچھے چھوڑا ، جنھوں نے تین دن رہ کر یہ امانتیں لوگوں کو واپس کیں [رک بہ علیؓ ؛ ہجرت]۔

(۹) صحابہؓ کرام کی حوصلہ افزائی : ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ آپؐ کے اخلاق عالیہ کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ گو آپؐ کو منہ پر تعریف پسند نہ تھی کہ اس سے دل میں بڑائی کے احساس پیدا ہونے کا امکان ہوسکتا ہے تاہم آپؐ حسب موقع اپنے متوسلین کی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے تھے؛ چنانچہ آپؐ نے اپنے دس ساتھیوں کو نام بنام جنت کی خوش خبری سنائی [رک بہ عشرہ مبشرہ]۔ غزوۂ موتہ [رک باں] سے جب لشکر واپس آیا تو لوگوں نے اسے میدان جنگ سے فرار کا طعنہ دیا ، مگر آپؐ نے فرمایا کہ یہ تو کرّار، یعنی لوٹ کر حملہ کرنے والے ، ہیں ۔ حضرت طلحہؓ کے گھوڑے پر ایک مرتبہ سواری کی تو فرمایا : ہم نے اسے سمندر پایا ہے اور فی الواقع وہ سمندر ہے (البخاری (الجہاد) ؛ مسلم (الفضائل)، ۴ : ۱۸۰۲ ، حدیث ۲۳۰۷ ؛ الترمذی،

marfat.com
Marfat.com

(الجهاد)؛ ۴ : ۹۹، حدیث ۱۶۸۴، ۱۶۸۶، وغیرہ) حضرت ابوبکرؓ کو فرمایا : تم میری امت میں سے سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگے (مشکوٰۃ، ۳ : ۲۲۳، حدیث ۶۲۴) اور گو کہ تمہاری چادر (نادانستہ طور پر) ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتی ہے، مگر تم ان (اہل کبر) میں سے نہیں ہو (البخاری، ۴ : ۱۲۷)۔ حضرت عمرؓ کو فرمایا : بخدا، شیطان تمہیں دیکھ کر اپنا راستہ بدل دیتا ہے (مسلم، ۴ : ۱۸۶۳، حدیث ۲۳۹۶)۔ حضرت زبیرؓ کی بابت فرمایا: ہر نبی کا کوئی خاص حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیرؓ ہے (کتاب مذکور، ۴ : ۱۸۷۹، حدیث ۲۴۱۵)۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو "امین ہذہ الامۃ" قرار دیا (کتاب مذکور، ۴ : ۱۸۸۱، حدیث ۲۴۱۹)۔ حضرت بلالؓ کو فرمایا : تیرے جوتوں کی آہٹ میں نے جنت میں اپنے آگے سنی ہے (کتاب مذکور، ۴ : ۱۹۱۲، حدیث ۲۴۵۸)۔ حضرت عبداللہ بن سلام کی بابت فرمایا کہ وہ دنیا میں چلتے پھرتے جنّتی ہیں (البخاری، مطبوعہ لائیڈن، ۴ : ۱۲۷)۔ ایک انصاری کے گھر میں تشریف لے گئے اور ان کے لیے میں دعاے خیر فرمائی (کتاب مذکور، ص ۳۱۰).

(۱۰) عدم تجسس : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دوسروں کے خفیہ حالات کا تجسس سخت ناپسند تھا، گویا قرآنی حکم: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا (۴۹ [الحجرات] : ۱۲)، یعنی اے اہل ایمان! بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ نہ لگاؤ، پر آپؐ کا شدت سے عمل تھا۔ ایک موقع پر آپؐ نے تجسس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا : مسلمانوں کے خفیہ حالات کی ٹوہ نہ لگاؤ، کیونکہ جو دوسروں کے حالات کی ٹوہ لگاتا ہے، اللہ تعالٰی اس کے عیوب کو ظاہر کر دیتا ہے اور جس کے عیوب کو خدا تعالٰی ظاہر کرنے پر آمادہ ہوجائے اسے دوسروں کے سامنے رسوا کر دیتا ہے (ابو داؤد : السنن، ۵: ۱۹۴، حدیث ۴۸۸۰)۔ ان امرا کی آپؐ نے یوں مذمت کی کہ جو لوگوں کے خفیہ حالات کی ٹوہ لگاتے ہیں، کہ جب کوئی امیر لوگوں کی خفیہ باتوں کی ٹوہ میں لگا رہے تو وہ لوگوں (معاشرے) کو فاسد کر دیتا ہے (البخاری (النکاح)؛ مسلم (البر)؛ الترمذی، ۴ : ۳۵۶ حدیث ۱۹۸۸)؛ چنانچہ ایک مرتبہ آپؐ اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص دروازے کی درزوں سے اندر جھانکنے لگا، آپؐ ایک لمبا تیر لیے ہوئے تیزی سے اس کی آنکھوں کی طرف مارنے کے لیے بڑھے (ابو داؤد، ۵ : ۳۶۶، حدث ۵۱۷۱)۔ الترمذی (۵ : ۶۴، حدیث ۲۷۰۹) کے مطابق آپؐ نے اس موقع پر فرمایا: اگر مجھے تیرے دیکھنے کا علم ہوتا تو تیری آنکھیں پھوڑ دیتا؛ تیرا ناس ہو، اجازت مانگنے کا حکم آنکھوں کے لیے ہی تو ہے (نیز مسلم، الادب، حدیث ۲۱۵۷)۔ اسی بنا پر آپؐ کا اپنا بھی یہی معمول تھا اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیتے تھے کہ اجازت طلب کرنے کے لیے دروازے کے بالکل سامنے کھڑے ہونے کے بجاے ذرا ہٹ کر کھڑے ہونا چاہیے (ابو داؤد، ۵ : ۳۶۷، حدیث ۵۱۷۴)۔

(۱۱) چشم پوشی : دوسروں کے خفیہ حالات کا تجسس کرنے کے بجاے آپؐ ہمیشہ دوسروں کے عیوب سے چشم پوشی فرماتے اور اسی کا دوسروں کو حکم دیتے تھے۔ آپؐ کا فرمان تھا : جو کوئی کسی مسلمان کے عیب کو دیکھ کر چشم پوشی کرتا ہے وہ گویا کسی زندہ دفن کی جانی والی بچی کو زندگی بخشتا ہے (ابو داؤد، ۵ : ۲۰۰، حدیث ۴۸۹۱)؛ مزید فرمایا: جو کسی مسلمان کے عیب سے چشم پوشی کرے گا خدا تعالٰی قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا (مسلم، البر، حدیث ۲۵۸۰؛ الترمذی، ۴ :

marfat.com
Marfat.com

۳۵، حدیث ۱۳۲۲)۔

آپؐ اگر خود بھی کسی کا عیب دیکھتے تو حتی الوسع چشم پوشی فرماتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص حاضر ہوا اور بدکاری کا اعتراف کرتے ہوئے حد جاری کرنے کی درخواست کی۔ آپؐ نے اس سے اعراض فرمایا۔ اس نے مکرر درخواست کی؛ آپؐ نے مکرر اعراض کیا، تا آنکہ اس نے چار مرتبہ اقرار کر لیا، پھر آپؐ نے اس سے پوچھا: کیا تجھے جنون ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ تب آپؐ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم جاری فرمایا (مسلم، ۳: ۱۳۱۸، حدیث ۱۶۹۱ ببعد)؛ اسی طرح ایک عورت (الغامدیہ) کے بارے میں جب تک آپؐ نے مکرر تحقیق نہ کر لی، حد کا حکم جاری نہ کیا (کتاب مذکور، ۳: ۱۳۲۲، حدیث ۱۶۹۵)۔ تاہم جب جرم اچھی طرح ثابت ہو جاتا تو پھر آپؐ سزا دینے میں کوتاہی نہ فرماتے تھے تاکہ دوسروں کے لیے اسے عبرت بنایا جائے (حوالۂ مذکور)۔ مقصد یہ تھا کہ معاشرے میں خواہ مخواہ ایک دوسرے سے متعلق بدگمانیاں نہ پنپنے پائیں؛ ہاں اگر صریحاً کوئی جرم ثابت ہو جائے تو سزا دیکر اسے دوسروں کے لیے عبرت کا ذریعہ بنا دیا جائے۔

(۱۲) ایذا رسانی سے گریز: آپؐ ہمیشہ اس بات کا شدت سے اہتمام فرماتے تھے کہ آپؐ کی کسی بات یا کسی طرز عمل کی وجہ سے کسی کو دلی تکلیف نہ پہنچے؛ آپؐ کا ارشاد تھا: سچا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے اس کے مسلمان بھائی محفوظ رہیں (البخاری)۔ اسی بنا پر آپؐ نے اگر کسی شخص میں موجود برائی کا ذکر کرنا ہوتا تو اس کا نام کبھی نہ لیتے، البتہ یہ فرماتے: لوگوں کا کیا حال ہے؟ کہ وہ یہ کہتے یا کرتے ہیں (ابو داؤد، ۵: ۱۴۳، حدیث ۴۷۸۸)۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا: خدا کے نزدیک سب سے برا شخص وہ ہے کہ جس کی برائی کے ڈر سے لوگ اسے چھوڑ دیں (البخاری (الادب)؛ مسلم (البر) ۴۴: ۲۰۰۲، حدیث ۲۵۹۱؛ مالک: موطأ، (حسن الخلق)؛ احمد بن حنبل، مسند)۔ آپؐ اپنے متوسلین کی بابت بھی یہ التزام فرماتے تھے کہ ان کی زبان اور کلام سے بھی کسی کا دل مجروح نہ ہو۔ ایک موقع پر ام المؤمنین حضرت زینبؓ نے بتقضائے بشریت ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کو یہودیہ کہہ دیا۔ آپؐ کو اس سے سخت صدمہ ہوا اور کئی دن تک حضرت زینبؓ سے کلام نہ فرمایا (ابو داؤد، ۵: ۹، حدیث ۴۶۰۲)۔ ایک مجلس میں ایک شخص حضرت ابوبکرؓ کے سامنے ان کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور حضرت ابوبکرؓ خاموش تھے، لیکن جب وہ حد سے بڑھا تو حضرت ابوبکرؓ نے اسے جواب دیا۔ یہ دیکھ کر آپؐ مجلس سے اٹھ کر چل دیے۔ حضرت ابوبکرؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا: پہلے تمھاری طرف سے ایک فرشتہ مأمور تھا، مگر جب تم نے جواب دیا تو وہ چلا گیا اور اس کی جگہ شیطان نے لے لی اور میں کسی ایسی مجلس میں نہیں ٹھیر سکتا جہاں شیطان ہو (ابو داؤد، ۵: ۲۰۴، حدیث ۴۸۹۶)۔ ایک مرتبہ حضرت ابو ذرؓ نے ایک صحابیؓ کو اس کی ماں کی غلامی کا طعنہ دیا۔ آپؐ کو پتا چلا تو فرمایا: اے ابو ذر! ابھی تم میں جاہلی عادات باقی ہیں اور پھر اس سے معاملہ صاف کرنے کا حکم دیا (ابو داؤد، ۵: ۳۵۹، حدیث ۵۱۵۷)۔ لوگوں کی دل آزاری سے آپؐ کتنا گریز فرماتے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپؐ کا یہ ارشاد تھا کہ اگر تین آدمی کسی مجلس میں ہوں تو دو الگ ہوکر باہم سرگوشی نہ کریں اس سے تیسرے آدمی کا دل دکھے گا (مسلم (تحریم مناجات)، ۴: ۱۷۱۸، حدیث ۲۱۸۴؛ ابن ماجہ (الادب) ۳۷۷۵؛ ابو داؤد، ۵: ۱۷۸، حدیث ۴۸۵۱)۔ اسی طرح آپؐ دوگفتگو کرنے والے افراد

marfat.com
Marfat.com

کے درمیان ان کی اجازت کے بغیر بیٹھنے سے منع فرماتے تھے (الترمذی، ۵ : ۸۹ ، حدیث ۲۷۵۲)؛ کسی مسلمان کو گالی دینا آپؐ کے نزدیک فِسق (بد عملی) (کتاب مذکور، ۵ : ۲۱، حدیث ۲۶۳۴، ۲۶۳۵) اور اسے کافر کہنا کفر کے مترادف ہے (کتاب مذکور، ۵ : ۲۲، حدیث ۲۶۳۶ ببعد).

آپؐ غیبت کرنے کی بھی اسی بنا پر سخت مذمّت فرماتے تھے کہ اس سے دوسروں کی دل شکنی ہوتی ہے - فرمایا : جنت میں چغلخور کبھی داخل نہیں ہو سکے گا (البخاری (الادب)؛ مسلم (الایمان) ۱۵۰ ؛ الترمذی (البر))، ۴ : ۳۷۵، حدیث ۲۰۲۶) اور آپؐ کے نزدیک غیبت کا مفہوم یہ تھا ذکرکُ اخاکَ بما یکرہ (الترمذی، ۴ : ۳۲۹ ، حدیث ۱۹۳۴) یعنی کسی کا اس انداز سے پس پشت ذکر کرنا کہ اگر وہ سنے تو ناپسند کرے - اس کے برعکس ہر کام میں نرمی اور ملائمت، خوش گوئی اور مسلمان بھائی سے نیکی کے کاموں میں تعاون آپؐ کا معمول تھا (البخاری، ۴ : ۱۱۹).

۱- مختلف طبقوں سے آپؐ کا حسن سلوک : اولاد سے محبت و شفقت : یوں تو آپؐ کے دل میں تمام بنی نوع انسانی کے لیے محبت و شفقت کے جذبات پائے جاتے تھے، مگر چونکہ فطری طور پر انسان اپنے اہل و عیال اور قبیلہ کی نسبت سے پہنچانا جاتا ہے، اسی بنا پر آپؐ نے اپنی اولاد سے محبت و شفقت کا ایک اعلٰی نمونہ قائم کیا؛ اہل عرب اپنے بچوں کو چومنا، ان سے لاڈ پیار کرنا، اپنی سرداری کے منافی سمجھتے تھے، مگر آپؐ نے ہمیشہ اس رسم بد کی مذمت فرمائی - آپؐ اپنے بچوں کو گود میں اٹھا لیتے، بعض اوقات کندھے پر بٹھا لیتے؛ سواری پر ہوتے تو اپنے آگے پیچھے انھیں سوار کر لیتے؛ ان کی پیشانی کو چومتے اور انھیں خیر و برکت کی دعا دیتے (البخاری، ۲ : ۳۴۴، باب ۲۲)؛ آپؐ انھیں جنت کے گلدستے قرار دیتے، انھیں سونگھتے اور اپنے سینے سے چمٹا لیتے - ایک سردار (اقرعؓ بن حابس) نے آپؐ کو بچوں سے پیار کرتے دیکھا تو کہا : میرے دس بیٹے ہیں، میں نے آج تک ان سے پیار نہیں کیا - آپؐ نے یہ سنا تو فرمایا: جو کسی پر رحم نہیں کرتا، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا (مسلم، ۴ : ۸۰۸ حدیث ۲۳۱۸ ؛ الترمذی، (البر)، ۴ : ۳۱۸، حدیث ۱۹۱۱)، یا اگر خدا نے ہی تیرے دل سے رحم کا جذبہ نکال دیا ہے تو میں کیا کروں (البخاری، ۴ : ۱۱۴، الادب، باب ۱۸) - آخری عمر میں جب اللہ تعالٰی نے آپؐ کو ایک بیٹا عطا کیا تو آپؐ کو از حد مسرت ہوئی- آپؐ نے اس کا نام ابراہیمؑ رکھا- ان کی دودھ پلائی ایک لوہار کی بیوی امّ سیف (امّ بردہ بنت المنذر، ابن سعد : الطبقات، ۱۳۱ تا ۱۳۷) تھیں - آپؐ وقتاً فوقتاً اپنے لخت جگر کو دیکھنے کے لیے ان کے ہاں تشریف لے جاتے اور دھویں سے معمور مکان میں بیٹھ کر اپنے بیٹے کو پیار کرتے، جب ان کا وصال ہوا تو آپؐ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں - کسی نے پوچھا : آپؐ رو رہے ہیں، حالانکہ آپؐ تو رونے سے منع کیا کرتے ہیں - فرمایا : یہ تو فرط محبت (رحم) ہے، جبکہ میں نوحہ کرنے (النیاحة) سے منع کرتا ہوں- پھر دفن کرتے وقت فرمایا : دل غمگیں ہے اور آنکھیں اشکبار، مگر ہم وہی کہتے ہیں جو خدا کو پسند ہے- پھر فرمایا : اے ابراہیمؑ ہم تیرے جدا ہونے پر افسردہ ہیں - (ابن سعد، ۱ : ۱۳۸ تا ۱۳۹).

آپؐ کی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی؛ البتہ چار صاحبزادیاں زندہ رہیں اور شادی شدہ ہونے کے بعد واصل بالحق ہوئیں - آپؐ نے ان سے اور ان کی اولاد سے جو محبت اور شفقت کا برتاؤ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے - حضرت زینبؓ [رک بآں] کی صاحبزادی اُمامہؓ سے آپؐ بے حد شفقت فرماتے تھے - ایک مرتبہ اس حال میں نماز پڑھائی کہ حضرت امامہؓ آپؐ کے

marfat.com
Marfat.com

کندھے پر سوار تھیں ، جب رکوع کرتے تو نیچے اتار دیتے ، جب قیام فرماتے تو دوبارہ اٹھا لیتے (البخاری ، ۱ : ۱۴۰، الصلوٰۃ، باب ۱۰۶) - [حضرت فاطمہؓ کے سوا سب صاحبزادیاں آپؐ کی زندگی میں اور وفد نجران کی آمد سے پہلے وفات پا چکی تھیں] .

آپؐ کی چھوٹی اور سب سے آخر میں وفات پانے والی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے آپؐ کو بے حد محبت تھی - آپؐ انہیں اپنے دل کا ٹکڑا قرار دیتے (البخاری ، مناقب ، ۲ : ۵۲۶ ؛ الترمذی ، ۵ : ۶۹۹ ، حدیث ۳۸۶۹) - آپؐ سفر کرنے سے پہلے سب سے آخر میں اور واپسی پر سب سے پہلے انہیں سے ملتے (احمد بن حنبل : مسند، ۵ : ۲۷۵، حدیث ثوبان) ۔ وہ جب آپؐ کو ملنے تشریف لاتیں تو اٹھ کر ان کا استقبال فرماتے اور شفقت سے ان کا ہاتھ چومتے اور انہیں اپنی جگہ بٹھاتے (الترمذی ، ۵ : ۷۰۰ ، حدیث ۳۸۷۲) ؛ ان کے صاحبزادوں حضرت حسنؓ و حسینؓ سے بھی آپؐ بے حد محبت آمیز برتاؤ فرماتے ؛ انہیں گود میں اٹھاتے ، چومتے اور دعا فرماتے : اے اللہ جس طرح میں ان سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت رکھ (البخاری ، ۲ : ۴۴۳) - ایک مرتبہ عین خطبۂ جمعہ کے دوران میں یہ دونوں صاحبزادے گرتے پڑتے مسجد میں جا پہنچے - آپؐ نے انہیں دیکھا تو سلسلۂ کلام منقطع کرکے نیچے اترے اور انہیں اپنی گود میں اٹھا لیا اور فرمایا : اللہ تعالٰی نے سچ کہا ہے کہ تمہاری اولاد اور تمہارے مال تمہارے لیے آزمائش ہیں (۶۴ [التغابن] : ۱۵) ، میں نے انہیں آتے دیکھا ، تو ضبط نہ کر سکا (ابو داؤد ، ۱ : ۶۹۳ تا ۶۹۴ ، حدیث ۱۱۰۹ ؛ الترمذی، ۵ : ۶۵۸ ، حدیث ۳۷۷۴) - آپؐ انہیں چادر میں لپیٹ لیتے اور اٹھائے رکھتے (الترمذی ، ۴ : ۶۵۲ ، حدیث ۳۷۶۹) - ایک مرتبہ آپؐ انہیں اسی طرح اٹھا کر نکلے تو کسی نے کہا : اے لڑکے ! تم کتنے خوش قسمت ہو کہ تمہیں کتنی عمدہ سواری ملی ہے - آپؐ نے فرمایا: اور سوار بھی تو کتنا اچھا ہے (الترمذی ، ۵ : ۶۶ ، حدیث ۳۷۸۴) - آپؐ ایک ران پر حضرت حسنؓ کو اور دوسری پر حضرت امامہؓ کو بٹھا لیتے اور پھر انہیں ملاتے اور فرماتے : اے اللہ جس طرح میں ان پر شفقت کرتا ہوں تو بھی شفقت فرما (البخاری ، ۴ : ۱۱۵، بعد).

۲- رشتہ داروں سے مروّت و احسان : گو آپؐ کی نظروں میں خاندانی اور قبائلی حد بندیاں بے معنی تھیں، مگر پھر بھی آپؐ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ خاندان اس بڑے معاشرے کا ایک حصّہ ہیں جو پوری بنی نوع انسان سے عبارت ہے ، اس بنا پر آپؐ نے ان تعلقات کی خوش ادائی ، یعنی صلہ رحمی پر زور دیا اور آپؐ خود بھی ان تعلقات کا حق ادا فرماتے رہے .

خاندان ابو طالب سے جو محبت و شفقت تھی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس خاندان کے ہر فرد سے آپؐ نے آخر تک مروّت واحسان کا سلوک جاری رکھا - حضرت علیؓ کی والدہ محترمہ حضرت فاطمہؓ بنت اسد، جو اسلام لے آئی تھیں ، جب فوت ہوئیں تو آپؐ نے تبرّک کے لیے اپنی قمیض اتار کر پہنائی اور قبر میں کچھ دیر تک لیٹے رہے [رکّ بہ علیؓ]؛ حضرت علیؓ کو اپنے خاندان کا ایک فرد بنایا ہوا تھا؛ حضرت ام ھانی [رکّ باں] اور ان کی والدہ (ابن سعد ، ۸ : ۲۲۲) کے گھر میں آپؐ اکثر تشریف لے جاتے اور وہیں استراحت فرماتے - معراج [رکّ باں] کے موقع پر بھی ایک روایت کے مطابق ، آپؐ انہیں کے گھر میں استراحت فرما تھے- ایک مرتبہ جب حضرت ام ھانیؓ آپؐ کے ھاں آئیں ، تو آپؐ نے انہیں مرحبا کہا (البخاری ، ۴ : ۱۵۴) - حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کئی برسوں کے بعد حبشہ [رکّ باں] سے لوٹے- اس وقت آپؐ خیبر کی مہم سر کر رہے تھے - آپؐ نے اس موقع پر خوشی کا یوں اظہار فرمایا : میں نہیں جانتا فتح خیبر کی خوشی زیادہ ہے یا جعفرؓ کے آنے

marfat.com
Marfat.com

کی (ابن سعد)؛ ایک مرتبہ حضرت جعفرؓ آئے تو آپؐ نے اٹھ کر ان کو گلے لگایا اور ان کی پیشانی کو چوما (ابو داؤد، ۵ : ۳۹۲، حدیث ۵۲۲۰).

حضرت عبداللہ بن عباسؓ (آپؐ کے چچا زاد بھائی) کو آپؐ سینے سے لگا لیتے اور فرماتے : اے خدا! اسے علم و حکمت عطا فرما (البخاری، ۲ : ۴۴۵، المناقب، باب ۴۲)؛ اپنے رضاعی ماں باپ کو ہمیشہ اپنے اصلی والدین کی نظر سے دیکھتے؛ فتح مکہ کے بعد جب آپؐ مقام جعّرانہ میں قیام فرما تھے تو آپؐ کے رضاعی والد تشریف لے آئے، آپؐ نے اپنی چادر بچھا دی اور اس پر باعزت طریقے سے بٹھایا۔ وہیں ان کی رضاعی ماں (یا کوئی اور رضاعی رشتہ دار خاتون) آئیں۔ آپؐ نے اسی کپڑے کے دوسرے کونے پر انہیں بٹھایا، پھر آپؐ کے رضاعی بھائی عبداللہ بن الحارث آئے، آپؐ نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور انہیں اپنی جگہ بٹھایا (ابو داؤد، ۵ : ۳۵۴، حدیث ۵۱۴۵).

۳۔ دوست احباب سے سلوک : آپؐ اپنے دوستوں [صحابہؓ؛ رک بآں] سے بہت مہربانی اور لطف و محبت سے پیش آتے تھے۔ ان سے جب ملتے تو مصافحہ کرتے اور بعض اوقات محبت سے انہیں اپنے سینے سے لگا لیتے (ابو داؤد، ۵ : ۳۸۰، حدیث ۵۲۱۴)؛ انہیں دیکھ کر ہمیشہ آپؐ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر جاتی (مسلم، ۴ : ۱۹۱۵، حدیث ۲۴۷۵، مناقب جریر بن عبداللہ)؛ آپؐ کا فرمان تھا کہ آدمی کا کسی کو خندہ پیشانی (وجہ طلق) سے ملنا بھی نیکی ہے (الترمذی، ۴ : ۳۴۷، حدیث ۱۹۷۰)۔ اگر کوئی دوست ھدیہ دیتا تو اسے قبول فرماتے اور اس کا حسب توفیق بدلہ بھی دیتے : (ابو داؤد، ۳ : ۸۰۶، حدیث ۳۵۳۶؛ البخاری؛ ۳ : ۲۰۶؛ الترمذی، ۴ : ۳۳۸، حدیث ۹۹۵۳)۔ آپؐ فرماتے : باہم ھدیہ لینے دینے سے دل کی کدورت دور ہوتی ہے اور یہ کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز، خواہ بکری کے پائے ہی ہوں، ھدیہ دینے میں حقیر نہیں سمجھنا چاہیے (الترمذی، ۴ تا ۴۴، حدیث ۲۱۳۰).

بعض اوقات اپنے دوستوں سے آپؐ بے تکلفی فرماتے، ان کی آنکھوں پر پیچھے سے جا کر ہاتھ رکھ لیتے (ابن الجوزی: الوفا، ۲ : ۴۴۴) : اپنے ایک دیہاتی دوست حضرت زاہرؓ کو آپؐ نے ایک مرتبہ بازار میں دیکھا تو پیچھے سے جا کر ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور فرمانے لگے اس عبد (بندے) کو کون لے گا؟ حضرت زاہرؓ نے کہا : بیچوگے تو کھوٹا پاؤگے، فرمایا : تم خدا کے ہاں تو کھوٹے نہیں ہو (مشکوٰۃ، ۲ : ۵۹۱، حدیث ۴۸۸۹، باب المزا).

اپنے صحابہ کو آپؐ ہمشہ اپنے مشوروں میں شریک رکھتے، حضرت عائشہؓ کے بقول : آپؐ سے زیادہ لوگوں سے مشورہ لینے والا میں نے کوئی نہیں دیکھا (ابن الجوزی : الوفا، ۲ : ۲۶۷)۔ مجلس میں ان کے ساتھ مل جل کر بیٹھتے کہ باہر سے آنے والے کو کوئی امتیاز محسوس نہ ہوتا، جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے؛ مجلس کے ہر شریک پر اپنی پوری توجہ دیتے کہ کوئی شخص خود سے زیادہ کسی کو آپؐ کے ہاں مقرّب نہ سمجھتا (کتاب مذکور، ۴۶۷)۔ کوئی مشورہ طلب کرتا تو اسے صحیح مشورہ دیتے؛ کوئی مدد مانگتا تو اس کی حسب توفیق مدد فرماتے؛ کوئی سرگوشی کرنا چاہتا تو اس کی طرف کان جھکا دیتے اور اس وقت تک اپنا سر اس سے نہ ہٹاتے جب تک وہ اپنی بات مکمل کرکے اپنا سر پیچھے نہ ہٹا لیتا (ابو داؤد، ۵ : ۱۴۶ تا ۱۴۷، حدیث ۴۷۹۴)۔ مصافحہ کرتے وقت اپنا پورا پنجہ استعمال فرماتے اور تاوقتیکہ دوسرا شخص خود اپنا پنجہ نہ چھڑا لیتا آپؐ اپنا ہاتھ نہیں چھڑاتے (ابو داؤد، ۵ : ۱۴۶، حدیث ۴۷۹۴).

اپنے تمام دوستوں سے ایسا محبت بھرا سلوک کرتے کہ ان کو یہ گمان گزرتا کہ وہی آپؐ کے

marfat.com
Marfat.com

نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہیں (البخاری، ۲: ۴۱۹)؛ اگر کوئی غلطی پر ہوتا تو بڑے پیار سے اسے سمجھا دیتے ۔ ایک مرتبہ آپؐ ایک مجلس میں تشریف لائے جہاں ایک شخص ادھر ادھر کی باتیں کرکے دوسروں کو ہنسا رہا تھا ۔ آپؐ نے اس کی کمر پر لکڑی چبھو دی ، وہ کہنے لگا آپؐ مجھے اس کا بدلہ دیجیے ، آپؐ نے اپنی قمیص اٹھا دی اس نے اٹھ کر آپؐ کی کمر کو بوسہ دیا اور کہا کہ میں تو صرف یہ چاہتا تھا (ابو داؤد ، ۵ : ۳۹۴ ، حدیث ۵۲۲۴)۔

کوئی جان نثاری کرتا تو اس کا احسان یاد رکھتے اور اس کے حق میں دعاے خیر فرماتے۔ حضرت سعدؓ کو غزوۂ احد میں جان نثاری کرنے پر اِرمِ فداک ابی و امّی، یعنی تیراندازی کرو ، تم پر میرا باپ اور میری ماں قربان ہوں کہا (البخاری ، ۴ : ۱۵۶) ؛ حضرت قتادہؓ نے ایک رات پہرہ دیا ، صبح ہوئی تو فرمایا : جس طرح تم نے اپنے نبیؐ کی حفاظت کی ہے ، خدا تمہاری حفاظت فرمائے (مسلم ، ۱ : ۴۷۲، حدیث ۶۸۱) ؛ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق کوئی نا زیبا بات سننے میں آئی تو فرمایا : اللہ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا تو تم نے تکذیب کی، مگر ابوبکرؓ نے تصدیق کی اور اپنے جان و مال سے میری غمخواری کی۔ بس کیا تم میرے لیے میرے ساتھی کو نہیں چھوڑو گے؟ (البخاری، ۲ : ۴۱۹ ، مناقب)۔ کوئی دوست بیمار ہوتا تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتے؛ کوئی ملنے جلنے والا فوت ہو جاتا ہے تو اس کے جنازے میں شریک ہوتے اور اگر ایسا ممکن نہ ہوتا تو اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھتے [رک بہ نجاشی] یا قبر پر کھڑے ہو کر دعاے مغفرت کر آتے ۔

آپؐ اپنے ملنے جلنے والوں کو وفات یا شہید ہو جانے کے بعد بھی یاد رکھتے ۔ گاہے بگاہے قبرستان جاتے اور ان کے حق میں دعاے خیر فرماتے ۔ عمومی اجتماعات میں بھی ان کا ذکر آتا تو اشکبار ہو جاتے اور ان کی وفاداری اور جذبہ و خلوص کی تعریف فرماتے ؛ اگر کوئی دوست تنگدست ہوتا تو اس کی مدد فرماتے ، اگر کوئی اسے پسند نہ کرتا تو اس سے کوئی چیز خرید کر اسے یا اس کے کسی عزیز کو لوٹا دیتے (البخاری ، البیوع ، باب ۳۳ ، ۳۴، ۲ : ۱۵ تا ۱۶) .

۴۔ غریبوں اور مسکینوں سے ہمدردی: آپؐ کو غربا اور مساکین کے ساتھ بہت ہمدردی تھی۔ حضرت خدیجہؓ (البخاری ۱ : ۵ ببعد) کے بقول آپؐ غریبوں کے بھی خواہ اور ان کو کما کر دینے والے تھے۔ آپؐ کسی کو تکلیف میں مبتلا دیکھتے تو بے حال ہو جاتے؛ جب تک اس کا بندوبست نہ ہوتا آپؐ کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھنے میں نہ آتی (مسلم، الصدقات، ۲ : ۷۰۴ تا ۷۰۵، حدیث ۱۰۱۷) ؛ اگر کوئی شخص غربا پر اپنی تعلّی ظاہر کرتا تو آپؐ فرماتے : تمھیں جو کچھ بھی میسر ہے انہیں محنت کشوں کی وجہ سے ہے (ابو داؤد ، ۳ : ۷۳ ، حدیث ۲۵۹۴ ؛ احمد بن حنبل : مسند ، ۵ : ۱۹۸ ؛ الترمذی ، ۲ : ۱۷)۔ کہیں سے لونڈی غلام آتے تو آپؐ اپنے رشتہ داروں حتّٰی کہ اپنے جگر گوشہ بتول جنت سے بھی زیادہ غریبوں کا حق سمجھتے (ابو داؤد : السنن ، ۵ : ۳۱۰ حدیث ۵۰۶۶)۔ آپؐ کو یہ منظور تھا کہ آپؐ کی بیٹی چکی پیسے ، اپنی کمر پر پانی کا مشکیزہ اٹھائے ، مگر یہ منظور نہ تھا کہ غریبوں (یتامٰی بدر) سے پہلے ان کو آنے والے مال سے حصہ ملے (ابن الاثیر : اسد الغابۃ، ترجمہ امِّ حکیم)۔ آپؐ ظاہر سے زیادہ باطن پر زور دیتے اور فرماتے کہ اگر تمام روے زمین بد باطن امیروں سے بھر جائے تب بھی وہ ایک پاک باطن غریب کے برابر نہیں ہو سکتے (البخاری ؛ مسلم ؛ مشکوٰۃ ، ۲ : ۶۶۴ ، حدیث ۵۲۳۶) ۔ اگر کوئی کسی غریب کو برا بھلا کہتا تو آپؐ سخت ناراض ہوتے اور اسے جاہلیت قرار دیتے (ابو داؤد، ۵ : ۳۵۹، حدیث ۱۵۵۷)۔

marfat.com
Marfat.com

اگر حضرت ابوبکر رضی جیسے با اثر افراد بھی حضرت بلال رضی اور حضرت صہیب رضی جیسے غربا کو آزردہ کرتے تو آپ ص انھیں ان سے معافی مانگنے کی تلقین فرماتے اور ان کی ناراضگی کو خدا کی ناراضگی سے تعبیر فرماتے (مسلم، ۴ : ۱۹۴۷، حدیث ۲۵۰۴)۔ اگر کوئی غریب فوت ہو جاتا اور آپ ص کی اطلاع کے بغیر اسے دفن کر دیا جاتا تو معلوم ہونے پر خفا ہوتے اور قبر پر کھڑے ہوکر نماز جنازہ ادا فرماتے (النسائی : السنن ، کتاب الجنائز ؛ البخاری ، ۱ : ۳۳۵) .

خود آپ ص کا غریبوں کے ساتھ جو طرز عمل تھا اس کا اس ارشاد سے اندازہ ہو سکتا ہے : اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ ، مسکین اٹھا اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرما (مشکوٰۃ ، ۲ : ۶۶۵، حدیث ۵۲۴۴)؛ آپ ص نے یہ بھی ارشاد فرمایا : اے عائشہ رض ! کسی مسکین کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ پھیر ، خواہ چھوہارے کا ٹکڑا ہی دو ؛ کبھی فرماتے کہ تم ظاہر کی طرف نہ دیکھا کرو ؛ بعض اوقات ایک پراگندہ حال شخص خدا کے ہاں یہ مرتبہ رکھتا ہے کہ اگر وہ کوئی قسم کھا لے تو خدا اسے پورا کر دے (مسلم ، ۴ : ۲۰۲۴ ، حدیث ۲۶۲۲) - کبھی فرماتے جنت میں داخل ہونے والے اکثر فقرا ہی ہوں گے (مسلم ، ۴ : ۲۰۹۶) ؛ آپ ص غریبوں کی ہمدردی کا یوں سبق دیتے : اے عائشہ رض ! غریبوں سے محبت رکھو اور ان کو نزدیک کرو خدا بھی نزدیک ہوگا (مشکوٰۃ، ۲ : ۶۶۵ ، حدیث ۵۲۴۴) - آپ ص مسجد نبوی میں تشریف لاتے تو نہایت خستہ حال غربا کے ساتھ جسم سے جسم ملا کر بیٹھتے اور فرماتے : تم کو بشارت ہو، تم دولتمندوں سے ۴۰ برس پہلے جنت میں داخل ہوگے۔ یہ ارشاد سن کر ان کے چہرے خوشی سے جگمگا اٹھتے (مشکوٰۃ ، ۲ : ۶۶۸ ، حدیث ۵۲۵۸) - کبھی فرماتے : خدا نے مجھے تم میں بیٹھنے کا حکم دیا ہے (ابن الجوزی ، ۲ : ۴۳۸) .

آپ ص کی نظروں میں غریب اور امیر کی تفریق بے معنی تھی ؛ اصل قدر و قیمت کی چیز انسان کا جذبہ اور اس کا خلوص تھا؛ چنانچہ غربا کے خلوص کی اس حد تک حوصلہ افزائی فرماتے کہ بعض اوقات ان کے معمولی صدقوں کو امیروں کے بڑے بڑے عطیوں پر اس خیال سے پھیلا دیتے کہ اس کی برکت سے وہ بڑے عطیات بھی قبول کیے جائیں .

بایں ہمہ آپ ص غریبوں کو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے اور دوسروں کے مال پر نظر رکھنے کے بجائے جدوجہد اور محنت کی تلقین فرماتے - آپ ص کا ارشاد تھا : دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے (مسلم، ۲ : ۷۱۷ ببعد، نیز حدیث ۱۰۳۳ تا ۱۰۴۴) ؛ نیز فرمایا : بہترین روزی وہی ہے جو انسان اپنی محنت سے کمائے اور اللہ کے نبی حضرت داؤد ع اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔ غریبوں کو اشد ضرورت کے سوا مانگنے سے سخت منع فرماتے اور اسے قیامت کے دن کی رسوائی قرار دیتے - حضرت عوف بن مالک اشجعی رض بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ ص نے مجلس میں موجود چند صحابہ کرام رض سے اس پر بھی بیعت لی کہ وہ کسی سے سوال نہیں کریں گے (مسلم، ۲ : ۶۲۱، حدیث ۱۰۴۳) - آپ ص سوال کرنے کے بجائے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے اور بازار میں فروخت کرکے روزی کمانے کی ترغیب دلاتے (البخاری، ۱ : ۳۷۳ (الزکوٰۃ) باب ۵۰ ؛ [نیز رک بہ مسکین ، فقیر] .

۵- بیوہ اور یتیموں سے خصوصی شفقت : یتیموں اور بیواؤں سے آپ ص خصوصی شفقت فرماتے اور آپ ص ہمیشہ ان کی بھلائی اور خیر خواہی کے لیے کوشاں رہتے تھے - آپ ص فرمایا کرتے تھے : الساعی علی الارملۃ والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ او کالذی یصوم النھار و یقوم اللیل (الترمذی ، ۴ : ۳۴۷ ، حدیث ۱۹۵۱) ، یعنی جو کوئی کسی بیوہ یا مسکین کی بہتری کے لیے کوشاں رہتا ہے ، وہ اللہ کے راستے

marfat.com
Marfat.com

میں جہاد کرنے والے مجاھد یا دن کو روزہ رکھنے اور رات بھر نوافل پڑھنے والے عابد کی طرح ہے؛ مزید فرمایا : یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں میرے ساتھ اس طرح ہوگا جس طرح ہاتھ کی دو انگلیاں (کتاب مذکور ، ص ۳۲۱ ، حدیث ۱۹۱۸) .

آپ نے بیواؤں کے ساتھ جس ہمدردی کا سلوک فرمایا ، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اہل عرب بیواؤں سے نکاح کرنا پسند نہ کرتے تھے اور انہیں معاشی اور سماجی تحفظ سے محروم رکھتے تھے، مگر آپ نے نہ صرف اس کی ترغیب دی ، بلکہ خود بھی ، بجز حضرت عائشہ صدیقہؓ کے تمام نکاح بیوہ عورتوں سے کیے اور اس طرح نکاح بیوگان کی علمی و عملی ترغیب دے کر تاریخ میں ایک مثال قائم کی.

۶- بیماروں کی تیمارداری : آپ کو بیماروں کا بڑا خیال رھتا تھا اور اگر کسی دوست یا کسی عزیز کی بیماری کی خبر ملتی تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے (البخاری ، ۴ : ۴۲ (المرضی) ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۴۷۱ ببعد ، حدیث ۳۰۹۲ ببعد) اور اس میں اپنے اور بیگانے کی تمیز روا نہ رکھتے تھے، حتّٰی کہ یہودیوں کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جاتے (البخاری، ۴ : باب ۴۴ ، عیادة المشرک) اور بیماری خواہ تھوڑی ہوتی ، مثلاً آشوب چشم (ابو داؤد ، ۳ : ۴۷۷، حدیث ۳۱۰۲) یا زیادہ ، نیز فاصلہ تھوڑا ہوتا کہ پیدل جانا ممکن ہوتا، یا زیادہ، کہ سواری درکار ہوتی، آپ اس اہتمام میں فرق نہ آنے دیتے (البخاری ، ۳ : ۲۲۴ ، تفسیر سورة النساء، باب ۴؛ ابو داؤد، ۳ : ۴۷۴، حدیث ۳۰۹۶)۔ حضرت سعدؓ بیمار ہوئے تو علاج اور عیادت کی آسانی کے لیے آپ نے مسجد ھی میں ان کا خیمہ لگوا دیا تھا (ابو داؤد ، ۳ : ۴۷۷ ، حدیث ۳۱۰۱)۔ آپ فرمایا کرتے تھے: جس کسی نے اپنے بیمار بھائی کی عیادت کی ، ایک پکارنے والا (فرشتہ) پکارتا ہے کہ تو خوش و خرم زندہ رہے اور خوش و خرم جنت میں جائے (الترمذی ۳۰ : ۳۶۵ ، حدیث ۲۰۰۸)۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جو کوئی باوضو حالت میں کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرے ، وہ جہنم سے ستر سال دور کر دیا جاتا ہے (ابو داؤد ، ۳ : ۴۷۵ ، حدیث ، ۳۰۹۷)۔ آپ بیماروں کو جا کر تسلی دیتے ، ان کا حوصلہ بڑھاتے اور فرماتے : اے اللہ کے بندو ! اپنی بیماریوں کی دوا کرو ، کیونکہ اللہ تعالی نے ہر بیماری کا علاج مقرر کیا ہے (الترمذی ، ۴ : ۳۸۳ ، حدیث ۲۰۳۸)۔ آپ خود بھی لوگوں کو مختلف سادہ علاج بتلایا کرتے تھے (دیکھیے الترمذی، کتاب الطب ، ص ۳۸۳ تا ۴۱۲)۔ آپ بیماروں سے نفرت کرنے اور ان کو الگ تھلگ رکھنے کے بھی مخالف تھے ؛ چنانچہ بعض اوقات آپ بیمار کے ساتھ شریک ہوکر کھانا تناول فرماتے (الترمذی ، ۴ : ۲۶۶ ، حدیث ۱۸۱۷)۔ تاہم آپ نے صحابہ کرامؓ کو جان بوجھ کر وبائی علاقے میں جانے اور یوں کسی متعدی مرض کا شکار ہونے سے منع فرمایا (ابو داؤد ، ۳ : ۴۷۸ ، حدیث ۱۳۰۳).

آپ بیمار کے چہرے اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور فرماتے ! اے اللہ فلاں کو شفا دے (البخاری، ۴ : ۴۴)۔ آپ بیماروں کی تسلی کے لیے فرماتے : لا بأس طہور انشاء اللہ (کتاب مذکور ، ص ۴۵) یعنی کوئی بات نہیں انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے ۔ کبھی ارشاد ہوتا : جب کسی مسلمان کو کوئی بیماری یا تکلیف پہنچتی ہے تو اس سے اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں ، جس طرح سردی میں درختوں کے پتے (حوالۂ مذکور)۔ آپ کا ارشاد تھا کہ کسی مریض کی موت کا وقت نہ آیا ہو تو اس کے پاس یہ دعا سات مرتبہ پڑھنے سے اسے شفا ہو جاتی ہے ۔ اسل اللہ رب العرش العظیم ان یشفیک (ابوداؤد، ۳ : ۴۷۹، حدیث ۳۱۰۶؛ الترمذی ، ۴ : ۴۱۰ ، حدیث ۲۰۸۳)۔ آپ بیماری کی شدت میں بھی موت کی تمنا کرنے سے منع فرماتے

marfat.com
Marfat.com

...۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ اگر بیماری زیادہ ہی سخت ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے: اللہم أحینی ما کانت الحیاۃ خیرا لی و توفنی ما کانت الوفاۃ خیرا لی (البخاری، ۴ : ۴۸؛ ابو داؤد، ۳ : ۴۸۰، حدیث ۳۱۰۸).

۷۔ غلاموں سے سلوک: معاشرے کے پسماندہ طبقوں کا آپؐ کو خصوصی طور پر خیال رہتا تھا۔ جن میں غلام خاص طور پر شامل ہیں۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ آپؐ نے غلاموں کو ان کے جائز اور فطری حقوق عطا کیے جانے کی تبلیغ فرمائی [رک بہ غلامی]۔ متعدد عبادتوں میں غلاموں کی آزادی کو شامل کیا [رک بہ کفارہ] اور غلاموں کو اپنے جیسا انسان سمجھنے اور ان کی جائز ضروریات پورا کرنے کی بار بار تاکید فرمائی، حتّٰی کہ اپنی آخری وصیت میں اسے پھر دھرایا [دیکھیے بالا مقالہ (حضرت) محمدؐ].

آپؐ فرمایا کرتے تھے: یہ غلام بھی تمھاری طرح کے انسان اور تمھارے بھائی بند ہیں، جن کو خدا نے تمھارا مطیع کر دیا ہے، ان غلاموں کو اپنے جیسا کھانا دو، اپنے جیسا کپڑا پہناؤ اور انھیں ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو، اگر ایسی صورت ہو تو پھر خود ان کی مدد کرو (ابو داؤد، ۵ : ۳۶۰، حدیث ۵۱۵۸؛ مسلم (الایمان)، ۳ : ۱۲۸۲، حدیث ۱۶۶۱؛ الترمذی (البر)، ۴ : ۳۴۴، جدیث ۱۹۴).

آپؐ نے خود اپنے غلام حضرت زیدؓ کو آزاد کرکے اپنا متبنّٰی کر لیا تھا۔ ان کے بیٹے حضرت اسامہؓ سے اس قدر آپؐ پیار فرماتے کہ اپنے کسی رشتہ دار بچے سے بھی اتنا پیار دیکھنے میں نہ آتا تھا۔ ایک ران پر ان کو اور دوسری پر حضرت حسنؓ کو بٹھاتے اور فرماتے: اے خدا جس طرح مجھے ان پر شفقت ہے تو بھی ان پر شفقت فرما (البخاری، ۴ : ۱۱۵)۔ ایک مرتبہ جب لوگوں کو آپؐ کی بارگاہ میں سفارش کی ضرورت ہوئی، تو انھیں اسامہؓ سے زیادہ کوئی آپؐ کے قریب تر نظر نہ آیا (الترمذی، ۴ : ۳۷۰ تا ۳۷۱، حدیث ۱۴۳۰)۔ انھیں صحابہؓ حِبّ رسول (آپؐ کے لاڈلے) کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اپنی خادمہ حضرت ام ایمنؓ کو آپؐ ہمیشہ یا امہ (اے امی) کہہ کر پکارتے (ابن سعد، ۸ : ۲۳۶، ذکر ام ایمن)۔ انھیں اپنے اہل بیت میں سے شمار کرتے اور انھیں خاتون جنت قرار دیتے (کتاب مذکور)؛ انھیں آزاد کرکے آپؐ نے اپنے آزادہ کردہ غلام حضرت زیدؓ سے بیاہ دیا تھا۔ آپؐ کو غلاموں کی فلاح و بہبود کا اس قدر خیال تھا کہ آپؐ کو ان کے حق میں لفظ غلام کا استعمال بھی پسند نہ تھا۔ آپؐ فرماتے تھے: تم میں سے کوئی اپنے غلام کو میرا غلام اور میری لونڈی نہ کہے اور نہ ہی غلام اپنے آقا کو میرے دیوتا اور میری دیوی کہا کرے، بلکہ آقا کہے: میرے بچے یا بچی، اور غلام کہے: اے میرے سردار (ابو داؤد، ۵ : ۲۵۶، حدیث ۴۹۷۵)۔ ان کو مارنے کی آپؐ سختی سے مذمت فرماتے اور حکم دیتے: جس نے اپنے لونڈی غلام کو تھپڑ مارا، یا کوئی اور ضرب لگائی تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دیا جائے (مسلم، (الایمان)، ۳ : ۱۲۷۸، حدیث ۱۶۵۷؛ ابو داؤد، ۵ : ۳۶۴، حدیث ۵۱۶۶)۔ نیز فرماتے کہ اگر دن میں ستر مرتبہ بھی خادم غلطی کرے تو اسے معاف کر دیا جائے (الترمذی ۴ : ۳۳۶، حدیث ۱۹۴۹)۔ اگر کسی خادم کی پٹائی کا آپؐ کو علم ہوتا تو آپؐ اس کے مالکان کو اسے آزاد کر دینے کی ترغیب دیتے (مسلم، الایمان والنذور، ۳ : ۱۲۷۹، حدیث ۱۶۵۸؛ الترمذی، النذور، ۴ : ۱۱۴ تا ۱۱۵، حدیث ۱۹۵۸)۔ اگر آپؐ کسی مالک کو اپنے کسی خادم کو مارتے دیکھتے تو فرماتے: یاد رکھو خدا تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنی تم اس غلام پر رکھتے ہو (مسلم، ۳ : ۱۲۸۱، حدیث ۱۶۵۹؛ ابو داؤد، ۵ : ۳۶۱، حدیث ۵۱۵۹؛ الترمذی، ۴ : ۳۳۵، حدیث ۱۹۴۸).

marfat.com
Marfat.com

آپ ؐ نے غلاموں کو ان کے جائز حقوق دلانے کے سلسلے میں جو اہم انتظامی اقدامات فرمائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپ ؐ نے ان کے نکاح کی ترغیب دلائی اور ان کے مابین جبری تفریق کو بالکل باطل ٹھیرایا (ابن ماجہ، سنن (الطلاق)) ۔ انھیں مال غنیمت میں سے حصہ دیا جاتا رہا (ابو داؤد، ۳ : ۱۶۹، حدیث ۲۷۲۷) ۔ آپ ؐ ان کی آزادی کو بہت بڑی عبادت قرار دیتے اور فرماتے جو کوئی غلام آزاد کرے ، خدا اس کے ہر عضو کو جہنم سے آزاد کر دے گا (مسلم ، ۲ : ۱۱۴۷، حدیث ۱۵۰۹) ۔ ان کے جذبات کا احترام فرماتے ، ان کا ہدیہ قبول کرتے ، (مسلم ، ۲ : ۱۱۴۴ ، حدیث ۱۵۰۴) ۔ اگر کسی غیر مسلم کا غلام بھاگ کر آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تو آپ ؐ اسے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے آزاد فرما دیتے احمد بن حنبل (مسند ، ۱ : ۲۴۳ ابو داؤد، ۳: ۱۴۸، حدیث ۲۷۰۰)۔ آزاد شدہ غلاموں کی آباد کاری اور ضروریات زندگی کی فراہمی آپ ؐ کے نزدیک دوسرے کاموں سے مقدم ہوتی تھی ۔ آپ ؐ کو غلاموں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت کا بہت خیال رہتا تھا ۔

۸- مہمانوں کی خدمت : آپ ؐ اپنے جدامجد حضرت ابراہیم ؑ کی طرح بہت فیاض اور مہمان نواز واقع ہوئے تھے ۔ آپ ؐ مہمان نوازی کو جزو اسلام قرار دیتے تھے (مسلم ، ۱ : ۶۸ ، حدیث ۴۷ تا ۴۸ ببعد)۔ آپ ؐ کا گھر اچھا خاصا مہمان خانہ بنا ہوا تھا۔ ان سرکاری مہمانوں کو زیادہ تر مسجد نبوی میں ٹھیرایا جاتا اور آپ ؐ بنفس نفیس ان کی تواضع فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ دو انصاری خواتین رملہ وام شریک کے مکانات بھی دارالضیوف کا کام دیتے تھے (الزرقانی، جلد ۴ : ۱ تا ۸۰ ، ذکر وفود ؛ مسلم ، ۲ : ۵۱۹) اور اس بارے میں مسلم یا کافر کی کوئی تمیز نہ تھی ۔ آپ ؐ کے پاس غیر مسلم مہمان بھی آتے رہتے تھے، جو بعض اوقات بڑی بھاری ضیافت سے شکم سیر ہوتے ، مثلاً ایک مرتبہ ایک غیر مسلم مہمان نے سات بکریوں کا دودھ پی لیا (الترمذی، ۴ : ۲۶۷، حدیث ۱۸۱۹)۔ اکثر مہمان نوازی سے آپ ؐ کو اور آپ ؐ کے گھر والوں کو فاقہ کرنا پڑتا ، مگر آپ ؐ کی پیشانی پر کوئی شکن نمودار نہ ہوتی (احمد بن حنبل : مسند ، ۶ : ۳۹۷) ۔ آپ کا یہ طرز عمل دیکھ کر کافر مشرف باسلام ہو جاتے (حوالہ مذکور) ۔ آپ ؐ رات کو اٹھ کر مہمانوں کی خبرگیری فرماتے ۔ اگر گھر میں گنجائش نہ ہوتی تو آپ ؐ مہمانوں کو صحابہ ؓ میں تقسیم فرما دیتے اور فرماتے : جس کے گھر میں دو آدمیوں کا کھانا ہو ، وہ تین کو لے جائے ، چار کا ہو تو پانچ چھ کو لے جائے (مسلم ، ۳ : ۱۶۲۷، حدیث ۲۰۵۷) ۔ مہمان بعض اوقات غلط حرکتیں کر بیٹھتے، آپ ؐ ان کو شفقت اور محبت سے سمجھا دیتے ۔ ایک مرتبہ ایک مہمان نے آپ ؐ کا حصہ بھی تناول کر لیا۔ آپ ؐ نے بجز دعاے خیر کے کچھ نہ کہا (کتاب مذکور، ۱۶۲۳، حدیث ۲۰۵۴) ۔ ایک بدوی نے ایک مرتبہ صحن مسجد میں پیشاب کر دیا ، صحابہ ؓ مارنے کے لیے دوڑے، مگر آپ ؐ نے منع فرما دیا (ابو داؤد، ۱ : ۲۶۳ تا ۲۶۴، حدیث ۳۸۰) ۔ کئی کئی روز قیام کے بعد جب مہمان رخصت ہونا چاہتے تو آپ ؐ حضرت بلال ؓ کو فرماتے : اجزهم کما تجیز الوافد (ابن سعد، ۱ : ۲۹۸) ؛ یعنی ان کو اسی طرح سامان دو ، جس طرح آنے والے مہمان کو دیا جاتا ہے ۔ دستور کے مطابق بوقت رخصت عام طور پر فی کس پانچ اوقیہ چاندی دی جاتی تھی (کتاب مذکور، ص ۳۱۲)۔

آپ ؐ کی مجلس میں بعض غیر مسلم مہمان آداب مجلس ملحوظ نہ رکھتے مگر آپ ؐ انھیں معاف فرما دیتے ۔ بعض یہودی مجلس میں آ کر السلام علیکم کے بجائے (معاذ اللہ) السام علیکم کی بد دعا دیتے ، مگر آپ ؐ درگزر فرماتے ۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ ؓ نے

marfat.com

Marfat.com

جواب میں و علیکم السلام کے الفاظ کہے ، آپؐ نے ناپسند کیا (ابو داؤد ، ۵ : ۳۸۴ ، حدیث ۵۲۰۶)۔ یہودی اس کے علاوہ بھی طرح طرح کی بد زبانیاں کرتے (۴ [النساء] : ۴۶)۔ بعض لوگ انھیں ترکی بترکی جواب دینا چاہتے ، مگر آپؐ تحمل اور بردباری کا سلوک فرماتے (الترمذی ، ۴ : ۱۵۵ ، حدیث ۱۶۰۳)۔

آپؐ کے گھر میں اگر کوئی غیر مسلم مہمان آتا تو اس کی خاطر مدارت میں کمی نہ کی جاتی ؛ آپؐ خود بنفس نفیس ان کی خدمت فرماتے (دیکھیے بالا)۔ نصاریٰ نجران کو نہ صرف مسجد میں ٹھیرایا، بلکہ ان کو اپنے طریقے کے مطابق مسجد ھی میں عبادت کرنے کی اجازت فرما دی (ابن القیم : زاد المعاد ، نیز دیکھیے البخاری کتاب الادب، باب حق الضیف، اکرام الضیف و خدمتہ ایاہ بنفسہ ، ۴ : ۱۴۲ ببعد)۔

۹- بچوں سے الفت : آپؐ تمام بچوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے اور ان سے الفت بھرا سلوک فرماتے اور یہی تعلیم دوسروں کو دیتے ، آپؐ کا ارشاد ھے : مَن لّم یرحم صغیرنا و یعرف حق کبیرنا فَلَیسَ منا (ابو داؤد، ۵ : ۲۳۳ ، حدیث ۴۹۴۳)، یعنی جو کوئی چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا اور بڑوں کا حق نہیں پہچانتا وہ ھم میں سے نہیں ؛ مزید فرماتے : رحمت تو بد قسمت لوگوں کے دلوں سے ہی نکالی جاتی ھے (الترمذی ، ۴ : ۳۲۴ ، حدیث ۱۹۲۳)۔ راستے میں کھیلنے والے بچوں پر سے گزر ھوتا تو مسکرا کر سلام فرماتے (البخاری ۴ : ۱۷۱ ؛ مسلم ۴ : ۱۷۰۸ ، حدیث ۲۱۶۸ ؛ الترمذی ۵ : ۵۷ ، حدیث ۲۶۹۶)۔ اگر آپؐ سواری پر سوار ھوتے ، تو اپنے آگے اور پیچھے بچوں کو سوار کر لیتے اور اسی حال میں گھر تشریف لاتے (مسلم ، الفضائل ، ۴ : ۱۸۸۵ ، حدیث ۲۴۲۸ ؛ ابن ماجہ (الادب) ۳۷۷۳)۔

آپؐ بچوں کو چومنا، ان سے لاڈ پیار کرنا، ان کا حق سمجھتے تھے۔ اور اپنے دل میں موجود جذبۂ شفقت و رحمت کا نتیجہ قرار دیتے (الترمذی، (البر)، ۴: ۳۱۸، حدیث ۱۹۱۱)۔ ان والدین کی تعریف فرماتے جو اپنی اولاد، بالخصوص بچیوں، کے لیے تکالیف جھیلتے اور انھیں آسائش پہنچانے کی سعی کرتے ھیں (الترمذی ، ۴ : ۳۱۹ ، حدیث 1915 ؛ البخاری ، ۲ : ۱۱۴ ، باب ۱۸)۔ آپؐ تمام بچوں کو سلوک اور مروت میں یکساں سمجھنے کی تلقین فرماتے ، اگر کوئی صحابیؓ کسی ایک کو دوسروں پر بلاوجہ ترجیح دیتا تو اسے ظلم قرار دیتے (النسائی ، حدیث ۳۷۱۸ ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۸۱۵ ، حدیث ۳۵۴۴ ، ۳۵۴۵)۔

آپؐ کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا ھمیشہ خیال رھتا تھا ۔ آپؐ ان والدین کو ، جو بالخصوص تین (یا دو) بچیوں کی تعلیم و تربیت کا اچھی طرح حق ادا کرکے ، ان کا مناسب گھرانوں میں نکاح کر دیتے ھیں جنت میں داخلے کی بشارت سناتے تھے ۔

آپؐ کے نزدیک بچوں کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ کرنے سے افضل تھا (الترمذی ، ۴:۳۳۷ ، ۱۹۵۱)۔ اگر کسی بچے سے غلطی ھو جاتی، تو نہایت محبت اور پیار سے اسے سمجھا دیتے اور پھر شفقت سے سر پر ھاتھ پھیر کر دعا دے کر رخصت فرماتے۔ آپؐ کا طریق تربیت بڑا مشفقانہ اور حکیمانہ تھا ۔ (ابو داؤد کتاب الجہاد)، اگر کوئی بچہ بغیر سلام کیے اور اجازت مانگے اندر چلا آتا تو آپؐ اسے نہایت نرمی سے فرماتے : پہلے باھر جا کر سلام کرو اور کہو کیا میں اندر آ سکتا ھوں ۔ جب اجازت مل جائے تو پھر اندر آنا (الترمذی ، الاستیذان ، ۵ : ۶۵، حدیث ۲۷۱۰ ؛ ابو داؤد ، ۵ : ۳۶۸ ، حدیث ۵۱۷۶)۔

آپؐ کے پاس بہت چھوٹی عمر کے بچے لائے جاتے؛ آپؐ انھیں اٹھاتے ، پیار کرتے ، خیر و برکت کی دعا دیتے اور تحنیک فرماتے یعنی کھجور وغیرہ چبا کر ان کے منہ میں ڈالتے (ابوداؤد، ۵ : ۳۳۳، حدیث ۵۱۰۶)۔ بعض بچے آپؐ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیتے، مگر آپؐ

marfat.com
Marfat.com

ان کو کچھ نہ کہتے اور پانی منگوا کر کپڑے صاف فرما لیتے (البخاری، ۴ : ۱۱۵ ، باب ۲۱)؛ بعض بچے آپ کی مہر نبوت [رک بہ شمائل و اخلاق نبوی] سے کھیلنے لگ جاتے ؛ لوگ منع کرنا چاہتے ، مگر آپ روک دیتے (کتاب مذکور، ۷۸/۱۷، ۴ : ۱۱۳، باب من ترک صبیۃ غیرہ حتّٰی تلعب) ۔ بچوں سے ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق بات کرتے ۔ حبشہ سے آنے والی ایک بچی کو اسی کے زبان میں حسنہ کے بجائے سَنَہ سَنَہ فرماتے (حوالۂ مذکور) ۔ کہیں سے کوئی تحفے آتے تو ان میں بچوں کا حصہ مخصوص رکھتے؛ ایک مرتبہ سیاہ دھاری دار کپڑا آپ کی خدمت میں آیا تو آپ نے ام خالد نامی بچی کو بلایا اور اپنے ھاتھ سے پہنا کر فرمایا : پہن اور بوسیدہ کر، پہن اور بوسیدہ کر (البخاری ، ۷۷/۳۲، ۴ : ۸۶)۔کوئی میوہ ھوتا تو سب سے کم عمر بچے کو کھلاتے (الطبرانی: معجم صغیر، بذیل میم)

بچوں کو بلانا ھوتا تو یَا بُنَیَّ (اے پیارے بچے) کہہ کر بلاتے (ابو داؤد ، ۵ : ۲۴۸ ، ۴۹۶۴) ۔ بچوں سے دل لگی فرماتے : حضرت انس کو بعض اوقات اے دو کانوں والے (یا ذَالاذنین) کہہ کر پکارتے (الترمذی، ۴ : ۳۵۸ ، ۱۹۹۲ ؛ ابو داؤد ۲۷۲:۵ ، حدیث ۵۰۰۲) ۔ ان کے چھوٹے بھائی عمیر کی ایک پالتو چڑیا مر گئی تو آپ دل لگی کے طور پر فرماتے ، یا عمیر ما فعل النغیر ، یعنی اے عمیر تیری نغیر نے کیا کیا (البخاری ، ۱۱۲/۷۸ ، ۴ : ۱۵۹ ؛ الترمذی (الصلاۃ) ۲ : ۱۵۴ ، حدیث ۳۳۳).

القصہ آپ بچوں سے لاڈ پیار ، شفقت و محبت کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال رکھتے تھے ۔

۱۰- دشمنوں سے سلوک : آپ صرف اپنوں کے لیے ھی نہیں بلکہ دشمنوں کے لیے بھی مجسمہ رحمت و شفقت تھے ۔ آپ نے کبھی کسی دشمن سے اپنی ذاتی عداوت کا انتقام نہیں لیا (ابو داؤد، ۵ : ۱۴۲، حدیث ۴۷۸۶) ؛ آپ سے متعدد مرتبہ مشرکین کے حق میں بددعا کرنے کی درخواست کی گئی؛ آپ نے ایسے موقعوں پر فرمایا: اے اللہ ! میری قوم کو ھدایت فرما؛ کیوں کہ وہ نہیں جانتے (البخاری) ۔ ایک دوسرے مرقعے پر بنو دوس کے حق میں اسی قسم کی بد دعا کی درخواست کی گئی تو فرمایا : اے اللہ ! بنو دوس کو ھدایت دے اور انھیں مسلمان کر کے لا (مسلم ، ۴ : ۱۹۵۷ حدیث ۲۵۲۴) ۔ ایک اور موقع پر فرمایا : میں ذریعہ لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ھوں (مسلم ، ۴ : ۲۰۰۷ ، حدیث ۲۵۹۹)۔ ھجرت کے بعد مکے والوں پر کوئی قدرتی وبا (مثلاً قحط) آتی اور وہ آپ کے پاس دعا کے لیے حاضر ھوتے تو آپ ان کی دشمنی کے باوجود ان کے حق میں دعاے خیر فرماتے ۔ (البخاری ، ۳ : ۳۲۸ ، تفسیر (الدخان))۔ بنو ثقیف کے حق میں بددعا کی درخواست کی گئی تو فرمایا : اے اللہ ! بنو ثقیف کو ھدایت دے اور ان کو مسلمان بنا کر لا (ابن سعد، ۲ : ۱۵۹).

جہاں تک مروت و احسان کا تعلق تھا تو اس میں آپ اپنے اور بیگانے میں تمیز روا نہ رکھتے ۔ آپ مشرکین کے تحفے تحائف قبول فرماتے اور انھیں بدلہ بھی دیتے (الترمذی، ۴ : ۱۴۰، حدیث ۱۵۷۷)۔ آپ کی اسی وسعت قلبی کا نتیجہ تھا کہ خیبر کی ایک یہودیہ عورت نے آپ کو گوشت میں زھر ملا کر پیش کر دیا ، گو آپ نے کم کھایا ، مگر ایک صحابی اس کو کھانے کے نتیجے میں انتقال کر گئے (البخاری ، ۳ : ۱۳۲ ، غزوۂ خیبر).

آپ بعض یہودیوں کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جاتے اور انھیں اسلام کی دعوت دیتے (البخاری، ۷۵/ ۱۱ ، ۴ : ۴۴ ، عیادۃ المشرک) ۔ اگر کوئی یہودی رضا کارانہ طور پر آپ کی خدمت کرنا چاھتا تو اسے منع نہ فرماتے (حوالۂ مذکور) ۔ اگر کسی یہودی کا

marfat.com
Marfat.com

کسی مسلمان سے ، حتیٰ کہ آپؐ اور حضرت موسیٰؑ کی فضیلت کے بارے میں بھی ، جھگڑا ہو جاتا تو آپؐ نرمی سے مسلمان کو سمجھا دیتے (البخاری، ۲ : ۳۵۴) - بعض یہودی آپؐ کی شان میں گستاخی کرتے ، مگر آپ ہمیشہ درگزر اور تحمل سے کام لیتے.

۱۱- حیوانات پر مہربانی : آپؐ کے قلب اطہر میں بنی نوع انسان کے لیے ھی نہیں بلکہ تمام جانداروں کے لیے بھی شفقت و رحمت کا جذبہ موجزن رہتا تھا - اسی بنا پر آپؐ صحابہؓ کو جانوروں کی عمدہ دیکھ بھال کرنے کی تلقین فرماتے - اگر کسی جانور کو بدحال دیکھتے تو فرماتے : ان بے زبانوں کے بارے میں خدا سے ڈرو ؛ ان پر سواری بھی اچھے طریقے سے کرو اور ان کو کھانا بھی عمدہ طریقے سے دو (ابو داؤد ، ۳ : ۴۹ ، حدیث ۲۵۴۸) - اگر کسی جانور کے منہ پر داغ لگے نظر آتے تو سخت خفا ہوتے اور فرماتے : کیا تمھیں میری بات نہیں پہنچی کہ میں نے بے زبانوں کے منہ پر داغ لگانے اور ان کی شکلیں بگاڑنے سے منع کیا ھے (مسلم ، اللباس ، ۳ : ۱۶۷۳ ، حدیث ۲۱۱۷ ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۵۷ ، حدیث ۲۵۶۴) - اگر کسی کو مرغ کی سحر خیزی کی وجہ سے شکایت پیدا ہوتی ھو تو فرماتے : مرغ کو برا بھلا نہ کہو، کیوں کہ وہ نماز کے لیے جگاتا ھے، مزید فرمایا: جب تم مرغ کی بانگ سنو تو خدا سے اس کا فضل مانگو ، کیوں کہ وہ کسی رحمت کے فرشتے کو دیکھ کر بولتا ہے (ابو داؤد ، ۵ : ۳۳۱ ، حدیث ۵۱۰۱ ، ۵۱۰۲؛ البخاری، (بدؤ الخلق)، ۴ : ۱۵۵ ؛ مسلم، الذکر ، ۴ : ۲۰۹۱، حدیث ۲۷۲۹ ، الترمذی، الدعوات ، ۵ : ۵۰۸ ، حدیث ۳۴۵۹) - مزید فرمایا : اگر کسی کے لگائے ہوئے کھیت یا پودے کو کوئی جانور یا پرندہ چر جائے تو لگانے والے کو صدقے کا اجر ملے گا (البخاری ، ۸/۲۷ ، ۴ : ۱۱۷).

رحمت دو عالمؐ نے نہ صرف جانوروں کے ساتھ مہربانی کے سلوک کی تعلیم دی، بلکہ دور جاہلی کی وہ رسمیں بھی ختم کرائیں جو جانوروں کو ایذا پہنچاتی تھیں ، مثلاً زندہ جانور کا گوشت یا ان کی دم یا ایال کے بال کاٹنا ان کو باھم لڑانا، ان پر نشانہ بازی کرنا وغیرہ ، ان تمام امور کو آپؐ نے بے رحمی سے تعبیر کیا اور ان کی ممانعت کی.

پرندوں کے انڈوں کو چرا لینا ، یا ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ لینا عرب میں عام طور پر رائج تھا - آپ کے سامنے ایک دو مرتبہ ان کو دھرایا گیا تو آپ نے ہر بار سختی سے منع فرمایا (ابو داؤد ، ۳ : ۴۶۹ ، حدیث ۳۰۸۹).

خلاصہ یہ کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ، تمام موجود و غیر موجود ، اپنوں اور بیگانوں ، انسانوں اور جانوروں سبھی کے لیے مجسمۂ رحمت و شفقت تھے - آپؐ کی شفقت اور مہربانی بلا امتیاز رنگ و نسل ہر شخص کے لیے تھی- آپؐ کے پاکیزہ اخلاق کا یہ بیان اس قدر طویل ھے کہ اس کے لیے بڑی سے بڑی ضخامت بھی ناکافی ھے، یہ مختصر بیان جو اس مقالے میں ہوا ، صرف آپؐ کے اخلاق عالیہ کی طرف مجمل اشارات پر مشتمل تھا ، تفصیل کے لیے متن میں مذکور حدیث و سیرۃ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ھے .

مآخذ : متن میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ دیکھیے مآخذ وکتب سیرت [محمود الحسن عارف رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم بحیثیت مبلّغِ اعظم: (لغوی اور اصطلاحی بحث کے لیے رک بہ مبلّغ/ تبلیغ)، اللہ تعالٰی کی طرف سے مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں جو انبیاے کرام مبعوث ہوے ان تمام کا امتیازی وصف یہ ہوتا تھا : مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ (۵ [المائدۃ] : ۹۹) ، یعنی رسول کے ذمے تو فقط (احکام خداوندی کا) پہنچانا (بلاغ) ہی ھے - اس

marfat.com
Marfat.com

لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہر نبی بنیادی طور پر ایک داعی اور ایک مبلّغ قوم ہی ہوتا تھا جو اِنذار (ڈر سنانے) اور تبشیر (بشارت دینے) کے ذریعے اقوام و ملل کو گمراہی کی دلدل سے نکالنے کی سعی بلیغ کرتا تھا (۶ [الاعراف] : ۴۸) - ان کی تبلیغ نذیر عریان کی مانند ہوتی تھی جو کسی بہت بڑے خطرے کو مسلط ہوتا ہوا دیکھ کر اپنی قوم کو خواب غفلت سے جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا ہے اور جو لوگ اس کی آواز پر کان دھرتے ہیں وہ نجات پا جاتے ہیں اور جو لوگ مخالفت کرتے ہیں تباہ ہو جاتے ہیں (البخاری : الجامع الصحیح، کتاب الرقاق، باب ۲۶، ۴ : ۲۲۷، مطبوعہ لائیڈن).

نبوت و رسالت بجائے خود تبلیغ ہے اور اس لحاظ سے جملہ انبیا اصولاً مبلّغ ہی تھے، لیکن آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کامیاب ترین مبلغ ثابت ہوے ہیں، جنھوں نے اپنے خاص الخاص طریق تبلیغ سے وہ انقلاب برپا کیا، جو تاریخ عالم میں بے مثال ہے (سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبی، ۴ : ۳۹۸ تا ۴۰۳)- آپؐ کی تمام زندگی ایک بے مثال داعی اور کامیاب مبلّغ کی زندگی ہے - ہجرت مدینہ کے بعد، گو آپؐ کو مدینہ منورہ میں حکمران کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، مگر آپؐ پھر بھی ایک مبلّغ ہی رہے (Sir Thomas Arnold : *The Preaching of Islam*، ص ۵۱، ترجمہ عنایت اللہ، کراچی ۱۹۶۴ء) - حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کی بے مثال کامیابی کا راز صرف اور صرف آپؐ کی کامیاب اور با اصول تبلیغ میں مضمر ہے.

آلحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی تبلیغی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : پہلا دور مکّی ہے جو تقریباً تیرہ سال کے عرصے پر محیط ہے ؛ دوسرا مدنی دور ہے جو تقریباً دس سال کے زمانے پر حاوی ہے - ان دونوں عرصوں میں آپؐ یکساں جذبے اور وفور انہماک سے مصروف تبلیغ رہے، مگر ان دونوں ادوار میں آپؐ کی تبلیغ اور اس کا اسلوب قدرے مختلف رہا - مکی زندگی میں تبلیغ زیادہ تر نجی اور انفرادی سطح پر کی جاتی رہی، جب کہ مدنی دور میں انفرادی سطح پر تبلیغ کے علاوہ خطوط اور وفود کی صورت میں بھی تبلیغ کی گئی.

مکی زندگی میں آپؐ کی تبلیغ کے تین درجے تھے: (۱) تبلیغ بہ نفس خود : یعنی وہ عرصہ جو آپؐ نے غار حرا میں تحنث کرتے ہوے گزارا (البخاری، ۱ : ۵، باب کیف کان بدؤ الوحی) ؛ تحنث کے معنی ہیں ایک قسم کا غور و فکر، جو آپؐ کائنات کے متعلق اور خود اپنے متعلق فرمایا کرتے تھے (شبلی : سیرۃ النبی، ۱ : ۲۰۲) یا تزکیۂ باطن کے لیے گناہوں سے اجتناب، ملت حنیفی، یعنی دین ابراہیمی کی اتباع میں عبادات یا پھر کائنات میں گہرا غور و فکر (الزرقانی: شرح المواھب، ۱ : ۲۱۰) ؛ (۲) تبلیغ بہ خویش و اقارب : اپنوں کو تبلیغ، آپؐ کو اس کا حکم (۲۶ [الشعرآء] : ۲۱۴) میں دیا گیا ؛ چنانچہ تقریباً تین سال تک آپؐ نہایت خاموشی سے اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب میں تبلیغ فرماتے رہے، جس کے نتیجے میں تقریباً چالیس مرد و زن مشرف باسلام ہوے - یہ عرصہ جو فترۃ وحی کا عرصہ کہلاتا ہے، مکی دور میں تبلیغ نبوی کے کامیاب ترین ادوار میں سے ہے - اس عرصے میں ایسی نیک فطرت ہستیوں نے اسلام قبول کیا جنھوں نے مستقبل میں نہایت اہم کام سرانجام دیے - یہ چالیس نفوس قدسیہ السابقون الاولون (۹ [التوبہ] : ۱۰۰) کا مصداق ہیں (دیکھیے *The Preaching of Islam*، مترجمہ، عنایت اللہ، ص ۲۹ تا ۲۰۷ ؛ محمد یوسف: حیاۃ الصحابۃ، ۱ : ۴۸ تا ۶۱ ؛ اس عرصے میں اسلام قبول کرنے والے افراد کے ناموں کے لیے ابن ھشام: سیرۃ، ۱ : ۲۵۰ تا ۲۹۰، مطبوعۂ قاھرہ ۱۳۹۶ء)- آپؐ کا یہ انداز تبلیغ نفسیات انسانی کے عین مطابق تھا، اس لیے کہ دوسروں کو تبلیغ کرنے سے

marfat.com
Marfat.com

اپنے خود کو ، اپنے رشتہ داروں کو اور اپنے دوست احباب کو ساتھ ملانا اور اپنی کاوش کے عملی نمونے پیش کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ کج طبع لوگ بہانہ بسیار تلاش کر لیتے ہیں؛ اور ویسے بھی انسان اپنی نجی زندگی میں سب سے زیادہ اپنے قریبی لوگوں کو متاثر کرتا ہے.

۳۔ تبلیغ عام یا بعثت عامّہ : اس کے اختتام پر آپؐ کو سورہ ۱۵ [الحجر] : ۹۴ کے ذریعے حکم دیا گیا کہ آپؐ تبلیغ کے حلقے کو وسیع کر دیں اور خاص و عام کو پیغام حق پنہچائیں ۔ آپؐ نے تبلیغ عامہ کا آغاز قریش مکہ کو کوہ صفا کے پاس "یا آل غالب" کہہ کر جمع کرنے اور اپنے خاندان والوں کو کھانے کی دعوت پر بلانے سے کیا (البخاری : الصحیح، ۲ : ۷۰۲ ؛ ابن ھشام : السیرة ، ۱ : ۲۵۰ تا ۲۸۰). آپؐ نے امر خداوندی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے فریضۂ تبلیغ ادا کیا ۔ جس میں آپؐ بڑی حد تک کامیاب رہے ۔

بہرحال ۱۳ سالہ مکی دور میں آپؐ نے تبلیغ کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار فرمائے : (۱) انفرادی تبلیغ : آپؐ نے تبلیغ کا آغاز انفرادی اور نجی سطح سے فرمایا، چنانچہ سب سے پہلے امّ المؤمنین حضرت خدیجہؓ کو تبلیغ فرمائی وہ اسلام لے آئیں ، اپنے رفیق خاص حضرت ابوبکرؓ کو تبلیغ کی انہوں نے اسلام قبول کیا ، اپنے ابن عمّ حضرت علیؓ کو دعوت اسلام دی وہ مشرف باسلام ہوگئے اور اپنے غلام زیدؓ بن حارثہ کو تبلیغ کی اور وہ اسلام لے آئے ؛ حضرت ابوبکرؓ کی انفرادی سطح کی کوششوں سے تقریباً پانچ افراد نے اسلام سے قبول کیا ، تین سال کے عرصے میں چالیس افراد کا اسلام قبول کرنا اس طریقۂ تبلیغ کی خصوصی نوعیت (پر امن ترغیبی روحانی طریق) کی کامیابی کی روشن دلیل ہے (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۱۹۹ تا ۲۰۱ ، بیروت ۱۹۶۰ء و ابن ھشام) ؛

(۲) اجتماعی تبلیغ : آپؐ نے مختلف مواقع پر اجتماع کی صورت میں بھی تبلیغ حق فرمائی ۔ سب سے پہلے آپؐ نے پہاڑی والے وعظ سے اس کا آغاز فرمایا ؛ پھر آپؐ نے اپنے خاندان کو کھانے کی دعوت پر بلایا ، جس میں کم و بیش چالیس نفوس تھے ، ان کے سامنے اسلام کی تبلیغ فرمائی (السہیلی : روض الانف ، ۱ : ۱۶۵ تا ۱۷۰ ، قاھرہ ۱۹۱۴ء ؛ شبلی نعمانی : سیرة النبی ، ۱ : ۱۱۰ ، مطبوعہ اعظم گڑھ)۔ اسی طرح حج کے موقع پر سارے عرب سے زائرین مکہ مکرمہ آتے تھے ۔ اس لیے اس موسم میں کہی ہوئی بات بہت جلد اطراف و اکناف عرب تک پھیل جاتی تھی اور دوسرے ان دنوں آپؐ کو تبلیغ حق سے کوئی ممانعت نہ ہوتی تھی ۔ شعب ابی طالب میں محصوری (۷ تا ۱۰ نبوی کے دوران میں صرف انہی دنوں میں آپؐ کو باہر نکلنے کی اجازت ملتی تھی ۔ بنابریں ان دنوں میں آپؐ کی سرگرمیاں عروج پر ہوتیں ۔ آپؐ مختلف قبائل کی خیمہ گاھوں میں تشریف لے جاتے ۔ ان کے سامنے نہایت پیار اور ہمدردانہ لہجے میں دعوت پیش فرماتے ۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک حجاج حج سے فارغ ہوکر اپنے اپنے گھروں کو نہ لوٹ جاتے ۔ گو ابتدا میں اس طریقہ تبلیغ کو بہت کم پذیرائی ہوئی ، مگر ۱۱ نبوی میں اسی موقع پر یثرب کے چھے حق پرست افراد کے قبول اسلام سے بالآخر یثرب (= المدینة المنورہ) اسلام کا مرکز بن گیا (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۱۶ تا ۲۱۸ ؛ البلاذری : انساب الاشراف) ۔ اجتماعی تبلیغ کی غرض سے ہی آپؐ عرب کے مشہور میلوں اور منڈیوں (مثلاً مجنہ ، عکاظ و ذوالمجاز) میں تشریف لے جاتے اور وہاں پر آئے ہوئے تمام افراد کو تبلیغ اسلام فرماتے (شرح المواھب ، ۱ : ۳۰۹) ۔ ایسے موقعوں پر ابو لہب [رک باں] اور کبھی کبھار

marfat.com
Marfat.com

ابو جہل [رک بآں] آپؐ کا تعاقب کرتا ۔ اور چلا چلا کر لوگوں کو آپؐ کی بات اور تبلیغ سننے سے منع کرتا رہتا (ابن ہشام : سیرۃ، ۲ : ۶۴، ۶۵؛ ابن سعد : طبقات، ۱ : ۱۲۱۶؛ سیرۃ النبی، ۱ : ۲۵۲-۲۵۳)؛

(۵) تبلیغ کے لیے دور دراز کے شہروں کا سفر : آپؐ نے تبلیغ حق کے لیے دور دراز کے سفر بھی اختیار فرمائے؛ چنانچہ اہل طائف کی تبلیغ کے لیے کئی روز کے پر مشقت سفر کے بعد طائف تشریف لے گئے، جہاں کے باشندوں نے آپؐ سے روح فرسا سلوک کیا اور نہایت بیدردی سے آپؐ پر پتھر برسائے اور آپؐ کو شہر سے نکال دیا (السہیلی : روض الانف، ۱ : ۲۶۰)؛ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تبلیغ و دعوت کے لیے دور دراز کے قبیلوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو اسلام کی دعوت پہنچائی ۔ (دیکھیے محمد یوسف : حیاۃ الصحابہ ۱ : ۱۰۸؛ سیرۃ النبی ۱ : ۲۵۲ - ۲۵۳)- جن قبائل کے پاس آپؐ تشریف لے گئے ان میں بنو عامر بن صعصعہ، بنو محارب بن خصفہ، بنو فزارہ (=غطفان)، بنو غسان، بنو مرہ، وغیرہ بنو سلیم، بنو کندہ، بنو کلب، بنو حارث، بنو کعب، بنو عبس، بنو نضر، بنو البکاء، بنو عذرۃ، وغیرہ کے متعدد قبائل شامل ہیں، مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی قبول حق کی توفیق نہ ملی (ابن سعد : طبقات، ۱ : ۲۱۶؛ ابن ہشام (۲ : ۶۳ تا ۶۵) اور ابن الجوزی : الوفا باحوال المصطفی، ص ۲۱۵ تا ۲۱۶) نے یہ تصریح کی ہے کہ آپؐ ان قبائل کو تبلیغ فرمانے کے لیے ان کے قیام گاہوں (منازلہم) میں تشریف لے جاتے تھے ۔ تبلیغ کا یہ فریضہ رنج ہو یا راحت، ہر حالت اور ہر صورت میں جاری رہتا؛ شعب ابی طالب میں تین سال کی فاقہ کشی کے باوجود جب بھی آپؐ کو موقع ملا آپؐ نے تبلیغ حق کا فریضہ ادا کیا ۔ سفر ہجرت میں آپؐ کی تبلیغ سے کئی افراد نے اسلام قبول کیا ۔ (شرح المواہب، ۱ : ۳۲۵ تا ۳۵۰)؛

(۶) تبلیغ کے لیے سفیروں کا تقرر : مکی دور ہی میں آپؐ نے دور دراز کے لوگوں کی طرف مختلف افراد بطور سفیر نامزد کرکے بھیجے تاکہ وہ آپؐ کی طرف سے اپنی قوموں کو خدائی پیغام پہنچائیں، چنانچہ حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی کو ان کی قوم پر اور حضرت مصعبؓ بن عمیر کو یثرب کے علاقے میں اپنی طرف سے مبلغ نامزد کرکے بھیجا (ابن ہشام، ۲ : ۲۱ تا ۲۵، ۷۵ تا ۷۶).

مکی دور کی کامیاب اور پر عزم تبلیغ کے باعث اب آپؐ اس لائق ہوگئے تھے کہ اپنے جانثاروں پر اعتماد کرتے ہوے یثرب (مدینہ منورہ) کو اپنا مستقل مرکز اور مستقر قرار دے لیں ۔ چنانچہ ۱۳ نبوی ۴ ربیع الاول کو آپؐ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت [رک بآں] فرمائی ۔ یہاں سے آپؐ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جو ایک داعی حق کے ساتھ ساتھ آپؐ کی حکمرانی کا دور بھی ہے، مگر اس دور میں بھی آپؐ کی داعی کی حیثیت تبدیل نہیں ہوئی، البتہ طریقہ تبلیغ میں کسی قدر عمومیت اور وسعت پیدا ہوگئی، جو زمانی و مکانی تبدیلیوں کا ناگزیر نتیجہ تھی ۔ اس عرصے میں انفرادی تبلیغ کے علاوہ (جو تمام زندگی آپؐ کا شعار رہی) تبلیغ حق کے لیے آپؐ نے مندرجہ ذیل طریقے اختیار فرمائے :

(۱) تبلیغی وفود کی ترسیل : اس دور میں افراد کے علاوہ آپؐ نے وفود کو بھی تبلیغ اسلام کے لیے مأمور فرمایا ۔ جن میں سے دو تبلیغی وفود کے ساتھ مشرکین نے دھوکہ کیا اور فریب کاری سے قتل کر دیا ۔ ان میں سے ایک وفد کو، جو ستر تربیت یافتہ قاری حضرات (= قراء) پر مشتمل تھا ۴ھ/۶۲۵ء میں، ابو براء الکلابی رئیس قبیلہ کی درخواست پر قبیلہ کلاب کی طرف بھیجا، گیا مگر عامر بن طفیل الکلابی نے بئر معونہ [رک بآں] کے مقام پر ان تمام افراد کو شہید کر دیا ۔ صرف ایک صحابی بمشکل جان بچا سکے؛ دوسری

marfat.com
Marfat.com

جماعت کو، جو کم و بیش دس افراد پر مشتمل تھی، قبائل عَضَل وقارہ کی طرف اسی سال بھیجا گیا جنہیں مقام رجیع [رکّ بہ الرجیع] پر بنو لحیان کی مدد سے شہید کر دیا گیا (الواقدی : المغازی، ۱ : ۳۴۶، آکسفرڈ، ۱۹۶۶ء؛ السہیلی : روض الانف، ۲ : ۱۷۴)۔ آپ کی بعض تبلیغی رسالتیں کامیاب بھی رہیں اور ان کے نتیجے میں متعدد افراد کو قبول حق کی توفیق ہوئی۔

(۲) میدان کار زار اور فریضہ تبلیغ : مدنی دور میں غزوات و سرایا کا سلسلہ شروع ہوا جس کو مخالفین اسلام بہت زیادہ اچھالتے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ آپ نے ناگزیر صورت کے سوا کبھی جنگ کو پسند نہیں فرمایا اور اسی لیے آپ کے واضح احکام تھے کہ عین لڑائی کی حالت میں پہلے مخالفین کو تبلیغ کی جائے۔

سریۂ مؤتہ کے موقع پر جب آپ نے عسکر اسلام کو الوداع کہا تو سالار جیش حضرت زید بن حارثہ کو مندرجہ ذیل نصیحت فرمائی : جب تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو اس کے سامنے اولاً تین باتیں پیش کرنا؛ اگر وہ ان میں سے کوئی ایک بھی قبول کر لیں تو لڑائی سے رک جانا : (۱) ان کو قبول اسلام کی دعوت دینا؛ (۲) جزیہ ادا کرنے پر صلح کی ترغیب (۳) تیسری اور ناگزیر صورت لڑائی کی ہے، (الواقدی : کتاب المغازی، ۲ : ۷۵۵ ببعد)۔ اسی طرح غزوۂ احزاب میں حضرت علی نے عمرو بن عبدود (ایک مشرک سردار) کے سامنے یہی تین شرائط پیش کیں (ابن ہشام : سیرۃ)۔ غرضیکہ ہر معرکے میں آپ کی یہ اصول پرستی دیکھنے میں آئی۔

(۳) مذہبی اجتماعات : مدنی دور میں تبلیغ نبوی کے لیے ایک سازگار ماحول میسر آیا؛ چنانچہ آپ مذہبی اجتماعات کے مواقع سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس ضمن میں جمعہ، و عیدین کے علاوہ، حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے جو وعظ فرمایا وہ تبلیغ کے باب میں اہم دستاویز ہے۔

(۴) عورتوں کے اجتماعات میں تبلیغ : البخاری (الصحیح، کتاب ۳، باب ۳۲، ۳۷) کے مطابق عورتوں نے آپ سے درخواست کی کہ ان کے لیے ایک الگ دن مقرر کیا جائے جس میں صرف عورتیں ہی شریک مجلس ہو کر آپ کے ارشادات سن سکیں۔ اس پر آپ نے ان کے لیے ایک الگ دن مقرر فرمایا۔ اس روز آپ حضرت بلال کی معیت میں خواتین کے اجتماع میں تشریف لے جاتے اور عورتوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔

(۵) تبلیغی خطوط کی ترسیل : اس کے بعد آپ نے مختلف ممالک کے حکمرانوں اور اہل اقتدار کو تبلیغی مکتوبات ارسال فرمائے جن میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا۔ بعض کا جواب نفی کی صورت میں ملا۔ تبلیغی خطوط کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ والی یمامہ ہوذہ بن علی الحنفی، قاصد حضرت سلیط بن عمرو العامری؛ ۲۔ والی بحرین منذر بن ساوی بن الاخنس التمیمی العبدی، قاصد حضرت علاء بن الحضرمی؛ ۳۔ والی عمان جیفر بن جلندی ابن عامر و عبد بن جلندی ابن عامر، قاصد حضرت عمرو بن العاص؛ ۴۔ والی دمشق حارث بن ابی شمر، قاصد شجاع بن وہب الاسدی؛ ۵۔ شہنشاہ حبش نجاشی اصحم بن ابجر، قاصد حضرت جعفر طیار و حضرت عمرو بن امیہ الضمری؛ ۶۔ حاکم مصر مقوقس (جریج بن مینا) قاصد حضرت حاطب بن ابی بلتعہ القرشی، اللخمی؛ ۷۔ شہنشاہ فارس کسری خسرو پرویز ابن ہرمز ابن نوشیروان، قاصد حضرت عبداللہ بن حذافہ القرشی، السہمی؛ ۸۔ قیصر روم ہرقل، قاصد حضرت دحیہ بن خلیفہ الکلبی؛ ۹۔ پاپائے روم ضغاطر الاسقف، قاصد نا معلوم؛ (الزرقانی : شرح المواہب، ۳ : ۳۳۴ تا ۳۷۰؛ محمد حمید اللہ : الوثائق السیاسیہ،

marfat.com
Marfat.com

مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۶ء، ص ۴۲ تا ۱۷۵؛ نیز Leone Caetani : *Annali dell, Islam*، ۶ : ۵۰؛ نیز بمدد اشاریہ؛ A. Sprenger : *Das Leben uud die Lepre des Mohammad*، ۳ : ۲۶۹؛ نیز بمدد اشاریہ)۔ اس کے علاوہ عرب میں آباد مختلف قبائل کے شیوخ کو بھی آپ نے اسی قسم کے تبلیغی خطوط ارسال کیے (الوثائق السیاسیہ؛ نیز حفظ الرحمن سیوہاروی : بلاغ مبین، مطبوعہ بجنور ص ۲۹ - ۲۳۶)۔

اس موقع پر معاندین اسلام کے ان حربوں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جن کا مقصد آپ کو تبلیغ حق سے روکنا اور اشاعت کی تحریک کو مسدود کرنا تھا، مگر آپ نے ان تمام مصائب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا : ۱- سبّ و شتم: معاندین اسلام کی طرف سے آپ کو وقتاً فوقتاً (معاذ اللہ) برا بھلا کہا جاتا تھا جس کا مقصد آپ کو پریشان و ہراساں کرنا اور آپ کو اپنے مشن کی تکمیل سے روکنا تھا۔ اس کا آغاز اسی وقت سے ہوگیا تھا جب کہ آپ نے کوہ صفا سے اپنی رسالت حقہ کا اعلان فرمایا تھا۔ اس موقع پر ابو لہب نے کہا : تبا لک الھذا جمعتنا (ابن کثیر : تفسیر، بذیل ۱۱۱ (اللھب)؛ ابن سعد : طبقات، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۰ء، ۱ : ۱۹۹ ببعد) یعنی (معاذ اللہ) تو ہلاک ہو، کیا تو نے ہمیں اس لیے بلایا تھا۔ اس کے علاوہ مشرکین آپ کو ساحر، مجنون، مفتون اور محمد کی بجائے مذمم کے نام سے پکارتے تھے (سیرۃ النبی، ۱ : ۲۵۴ تا ۲۵۵)؛

۲- استہزا : استہزائیہ جملے سب و شتم کے جملوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ حربہ جس شدت کے ساتھ آپ کے خلاف آزمایا گیا اس کی تاریخ میں کم ہی مثالیں ملتی ہیں۔ آپ جس طرف جاتے، لوگ استہزا کے زہریلے جملوں سے آپ کا استقبال کرتے۔ قرآن کریم میں ہے : وَ اِذَا رَاَوْکَ اِنْ یَّتَّخِذُوْنَکَ اِلَّا ھُزُوًاط اَھٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰہُ رَسُوْلًا ط (۲۵ [الفرقان] : ۴۱)، یعنی وہ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ سے تمسخر کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا یہی ہے جس کو خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ سنہ ۱۰ نبوی میں جب آپ طائف تشریف لے گئے تو سرداران طائف میں سے ایک نے کہا کہ کیا خدا کو تیرے سوا نبی بنانے کے لیے کوئی اور ملا ہی نہ تھا؟ دوسرے نے کہا کہ اگر خدا نے تجھے نبی بنا کر بھیجا ہے تو کعبے کا پردہ چاک کر دیا ہے (السہیلی : روض الانف، ۱ : ۲۶۰ تا ۲۶۳)۔ بعض لوگوں، مثلاً اسود بن عبد یغوث وغیرہ نے آپ کا مذاق اڑانے میں بہت نام پیدا کیا تھا (حوالۂ مذکور، ص ۲۵۵)۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا : انا کَفَیْنٰکَ المستھزِءِیْنَ (۱۵ [الحجر] : ۹۶)، یعنی ہم آپ کے لیے تمسخر کرنے والوں کے مقابلہ میں کافی ہیں۔

۳- جسمانی ایذائیں : اس کے علاوہ رحمت دو عالم کو مختلف موقعوں پر جسمانی اذیتیں بھی پہنچائی گئیں۔ جب آپ نے پہلے پہل بیت اللہ شریف کے سامنے تبلیغ کی تو مشرکین نے آپ پر حملہ بول دیا۔ آپ کو بچانے کی غرض سے حارث بن ابی ہالہ آگے بڑھے، مشرکین نے مار مار کر انھیں شہید کر دیا یہ اسلام کے پہلے شہید تھے (ابن حجر : الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ، ذکر حارث بن ابی ہالہ)؛ ایک دفعہ غلاظت سے بھری ہوئی اوجھ عین حالت نماز میں جسم اطہر پر رکھ دی گئی (سیرۃ النبی، ۱ : ۲۵۵)۔ ام جمیل زوجہ ابی لہب [آپ کی چچی] آپ کے راستے میں کانٹے بکھیرتی اور آپ پر غلاظت پھینک دیتی تھی (مفتی محمد شفیع : معارف القرآن، ۸ : ۸۴۰-۸۴۱)۔ ۱۰ نبوت میں آپ طائف میں بغرض تبلیغ تشریف لے گئے اور دس روز تک بنو ثقیف کو دعوت حق دیتے رہے، لیکن ان ظالموں نے آپ کو اتنا مارا کہ جسم اطہر لہولہان ہوگیا اور جوتے پاؤں سے چپک کر رہ گئے

marfat.com
Marfat.com

(ابن سعد : طبقات، ۱ : ۲۰۲ ؛ السہیلی : روض الانف، ۱ : ۲۶۰ ؛ الزرقانی : شرح المواہب، ۱ : ۲۹۶).

۴۔ دنیاوی منافع کا لالچ : ان سب طریقوں کے باوجود، جب آپؐ تبلیغ رسالت سے نہ رکے تو مشرکین کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ نے آپؐ کو دعوت حق سے دستبردار ہونے کی صورت میں مکہ مکرمہ کی ریاست، بڑے گھرانوں کی خوبصورت عورتوں سے شادی اور مال و دولت کے ذخیروں کی پیشکش کی، لیکن آپؐ نے جواب میں حٰم، السجدۃ کی آیات تلاوت فرما کر ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا (ابن ہشام : سیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۱۳)۔ ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے فرمایا : بخدا اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند بھی لا کے رکھ دیں، تب بھی میں تبلیغ حق سے نہ رکوں گا (حوالۂ مذکور، ۱ : ۲۸۲ ببعد).

۵۔ اہل اسلام پر ظلم و ستم : اس پر بھی جب اسلام کی اشاعت نہ رکی تو آپؐ کے ملنے والوں پر ظلم و ستم اور جور و تعدی کی انتہا کر دی گئی۔ مشرکین کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے والے بیکس مسلمانوں میں حضرت خبابؓ بن الارت (م ۳۷ھ)، حضرت بلالؓ حبشی (م ۱۷ھ یا ۱۸ھ یا ۲۱ھ)، حضرت عمار بن یاسرؓ (م ۳۷ھ/۶۵۷ء) اور ان کی والدہؓ حضرت سمیہؓ، حضرت صہیبؓ رومی، حضرت ابو فکیہہ (م تقریباً ۲ھ)، حضرت لبیبہؓ، زنیرہ وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں جن کو روح فرسا طریقوں سے مارا پیٹا گیا۔ (السہیلی : روض الانف، ۱ : ۲۰۲ ؛ شبلی نعمانی : سیرۃ النبی، ۱ : ۲۲۹ تا ۲۳۱).

۶۔ معاشی و معاشرتی عدم تعاون : اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو بالآخر ۷ نبوی میں رؤسائے قریش کی باہمی مشاورت سے ایک معاہدہ ترتیب دیا گیا جس کے مطابق قریش اور ان کے حلیفوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپؐ کے حلیفوں سے معاشی و معاشرتی عدم تعاون کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس ضمن میں تین باتوں پر تمام اہل مکہ سے حلف لیا گیا : (۱) ان سے مناکحت نہ کی جائے؛ (۲) ان کو کوئی چیز فروخت نہ کی جائے، (۳) ان سے کوئی چیز نہ خریدی جائے (ابن الجوزی : الوفا باحوال المصطفٰی، ۱ : ۱۹۷)۔ اسے باقاعدہ معاہدے کی صورت میں لکھ کر بیت اللہ شریف پر لٹکا دیا گیا اور یہ سلسلہ تین سال (از ۷ھ تا ۱۰ھ) تک جاری رہا۔ اس دوران میں بنو ہاشم کے لوگوں، بالخصوص بچوں، کی حالت انتہائی نازک رہی۔ یہ لوگ سوکھے چمڑے کھا کھا کر گزارا کرتے رہے، مگر دشمنوں کو اس پر ذرا رحم نہ آیا (السہیلی : روض الانف، ۱ : ۲۱۹ و بعد، ۲۳۱ و ببعد)۔ اندازہ کیجیے جب آپؐ اپنے خاندان کے معصوم بچوں کو بھوک سے بلبلاتا ہوا دیکھتے ہوں گے، تو آپؐ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی.

۷۔ تذلیل و تحقیر : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اور صحابہؓ کرام کی ہر ممکن طریقے سے تذلیل و تحقیر کی کوشش کی جاتی تھی، یہاں تک کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں دو بدترین ہمسایوں ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط میں گھرا ہوا تھا اور وہ دونوں اپنے گھر کی غلاظت اور گندگی لا کر میرے دروازے پر ڈال دیتے تھے۔ آپؐ برآمد ہو کر صرف یہ فرماتے : اے عبد مناف کی اولاد! یہ کس قسم کی ہمسائیگی ہے؟ پھر آپؐ اسے راستے سے ہٹا دیتے (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۲۰۱ ؛ ابن کثیر : تفسیر، ۴ : ۵۶۳، بذیل سورہ ابی لہب).

۸۔ ذات نبویؐ کا تعاقب : اس کے باوجود جب روز بروز اسلام ترقی کرتا رہا تو مخالفین نے اس کی

marfat.com
Marfat.com

اشاعت کو روکنے کے لیے ایک یہ تدبیر اختیار کی کہ تبلیغ کے مواقع پر ابولہب اور بعض اوقات ابوجہل آپؐ کے تعاقب میں لگا رہتا؛ آپ جس علاقے میں تشریف لے جاتے، وہ چلا چلا کر لوگوں کو آپؐ کی باتیں سننے سے روکتا (ابن الجوزی : الوفا، ۲۱۵ تا ۲۱۶؛ حاکم: مستدرک، ۱ : ۱۵، مطبوعہ حیدر آباد دکن، بقول مفسرین قرآن کریم (۴۱ [حٰمٓ السجدۃ] ۲۶) میں اسی کی طرف اشارہ ہے.

۸- بے سر و پا سوالات : مشرکین مکہ نے جب یہ تمام حربے ناکام ہوتے دیکھے تو بے سروپا سوالات کرنے شروع کر دیے؛ چنانچہ ایک موقع پر یہ مطالبہ کیا کہ ہم اس صورت میں آپؐ کو نبی مان سکتے ہیں کہ آپ (۱) مکہ مکرمہ کی خشک پہاڑیوں سے میٹھے پانی کے چشمے جاری کر کے دکھائیں؛ (۲) آپؐ اس سر زمین میں اپنے لیے کھجوروں، انگوروں کا باغ اگا کر دکھائیں جس کے درمیان نہریں چلتی ہوں؛ (۳) آسمان کا کوئی ٹکڑا بطور عذاب ہم پر گرا کر دکھائیں؛ (۴) خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نمودار کر کے دکھائیں؛ (۵) یا اپنے لیے کوئی موتیوں کا محل بنا کر پیش کردیں اور یا پھر (۶) ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور ہم سب کے نام خدا تعالیٰ کی طرف سے لکھے لکھائے خطوط لا کے پیش کریں۔ ان تمام باتوں کے جواب میں آپؐ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ کہ دیں کہ میں تو رسول بشر ہوں (۱۷ [بنی اسرائیل] : ۹۰ تا ۹۴؛ آلوسی : روح المعانی، بذیل آیات مذکورہ؛ ابن کثیر : البدایة والنهایه، ۳ : ۵۰، ۵۱ وغیرہ).

۹- بڑے پائے کے علمی سوالات : مشرکین کی ان باتوں کا بھی اثر نہ ہوا اور آپ اپنے موقف پر قائم رہے تو انہوں نے یہود یثرب سے کچھ ایسے علمی سوالات دریافت کیے جو انبیا کے سوا کسی کو نہ آتے ہوں؛ چنانچہ ان کے مشورے سے تین سوالات پیش کیے گئے : (۱) نفس اور روح کی حقیقت کیا ہے؟ (۲) اصحاب کہف کا کیا قصہ ہے؟ (۳) ذوالقرنین کون تھا؟ ان سوالوں کا جواب علی الترتیب ۱۷ [بنی اسرائیل] : ۸۵؛ ۱۸ [الکہف] : ۹ تا ۲۶، ۸۳ تا ۹۸ میں دیا گیا.

(۱۰) جھوٹا اور بے بنیاد پروپیگنڈہ : اس کے علاوہ اسلام کے خلاف جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈے کا حربہ جس وسیع پیمانے پر اختیار کیا گیا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ہر آنے جانے والے کو آگاہ کر دیا جاتا کہ یہاں ایک ساحر، مجنون رہتا ہے اس سے بچنا۔ جیسا کہ طفیل بن عمر دوسی کو روکا گیا تھا (ابن ہشام : سیرة، ۲ : ۲۲ و ببعد)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے آبائی دین کا منکر بتایا جاتا، صحابہ کرامؓ کو صابئی کہا جاتا۔ جب قرآن کریم کی تلاوت ہو رہی ہوتی تو شور و غل مچا دیا جاتا، معاذ اللہ قرآن اور صاحب قرآن کو برا بھلا کہا جاتا؛ بچوں کو پیچھے لگا دیا جاتا کہ وہ مجنون، ساحر وغیرہ کا شور برپا رکھیں، مبادا کوئی آپؐ کی بات سن کر متاثر ہو جائے جیسا کہ ضماد الا زدی کو ذاتی مشاہدہ ہوا احمد بن حنبل : مسند، ۱ : ۳۰۲؛ البخاری : الصحیح، ۸۶۷ ؛ (۱۱) اور سب سے آخر میں، آپؐ کے خلاف ایکا کر کے معاذ اللہ آپؐ کو قتل کرنے کی ناپاک سازش تیار کی گئی جس سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بال بال بچا لیا (رک بہ ھجرة).

معاندین اسلام کے یہ وہ حربے تھے جو انہوں نے مکی دور میں روا رکھے۔ ۱۳ نبوی میں آپؐ نے اس وقت ہجرت کرنے کا فیصلہ فرمایا جبکہ تمام اہل مکہ نے آپؐ کے قتل کا ناپاک منصوبہ بنا لیا تھا۔ آپؐ نے جب ارض یثرب میں قدم رنجہ فرمایا اور وہیں سکونت اختیار کر لی تو معاندین اور مخالفین اسلام کے طریقوں میں بھی تبدیلی اور وسعت پیدا

marfat.com
Marfat.com

ہو گئی ۔ چنانچہ مدنی دور میں آپؐ کو تبلیغ اسلام سے روکنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے گئے :

(۱) قریش کا عبداللہ بن ابی کے نام خط : ابھی آپؐ مدینہ منورہ میں فروکش ہوئے ہی تھے کہ قریش مکہ نے عبداللہ بن ابیّ کو خط لکھا جس میں انصار مدینہ کو برا بھلا کہنے کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ وہ آپؐ کو (معاذ اللہ) مشرکین کے حوالے کر دیں ، ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں (دیکھیے محمد حمید اللہ : الوثائق السیاسیہ ، شمارہ ۳/ب) (۲) قریش اور ان کے حلیفوں کا اعلان جنگ : جب اس طرح ان کی مقصد براری نہ ہوئی تو قریش مکہ اور ان کے حلیفوں کی طرف سے آپؐ اور صحابہؓ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا ۔ قریش مکہ اور یہودان خیبر نے اپنے شعلہ بیان مقرروں اور آتش نوا شاعروں کے ذریعے تمام قبائل عرب کو اسلام کے خلاف متحد کر دیا ؛ چنانچہ نو سال کے مختصر عرصے میں (اگر ۱۰ھ کو نکال دیا جائے) آپؐ کو مخالفین کے خلاف ۸۲ جنگیں لڑنا پڑیں ۔ جن میں سے ۲۷ (غزوات) وہ ہیں جن میں آپؐ نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی اور ۵۴ (سرایا) وہ کہ جن میں آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو مامور کر کے روانہ فرمایا (ابن سعد : طبقات ، ۲ : ۵ و ۶ ؛ شرح المواہب ، ۱ : ۳۸۷ تا ۳۹۰) ؛ گویا آپؐ کو ایک سال میں آٹھ نو بار مخالفین کے خلاف صف آرا ہونا پڑا ۔ اسی سے مشرکین عرب کی اسلام دشمنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے (دیکھیے غزوات) (۳) مبلغین اسلام کا قتل : بعض قبائل عرب نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو روکنے کے لیے انوکھا اور منفرد طریقہ اختیار کیا ۔ وہ یہ کہ ان کی طرف سے کوئی آدمی یا کوئی وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنے قبیلے کے لیے مبلغین بھیجنے کی درخواست پیش کرتا ۔ آپؐ ان کی دعوت پر مبلّغین کو ارسال فرما دیتے تو انھیں دھوکے سے راستے میں شہید کر دیا جاتا ۔ یہ واقعہ دو دفعہ دہرایا گیا ۔ پہلی دفعہ بئر معونہ [رکَ باں] کے مقام پر ستّر صحابہؓ کرام کو اور دوسری دفعہ رجیع کے مقام پر دس صحابہؓ کرام کو نہایت بیدردی سے شہید کر دیا گیا ۔ یہ صحابہؓ انھی قبائل کے سرکردہ افراد کی درخواست پر تبلیغ اسلام کے پر امن مشن کے لیے جا رہے تھے ، (الیعقوبی : تاریخ ، ۲ : ۷۰۱ ، ۷۰ ، ۷۲ مطبوعۂ بیروت ۱۹۶۰ء ؛ الواقدی : المغازی ، ۱ : ۳۴۳ تا ۳۶۲) ؛ (۴) قاصدان نبوی کا قتل : ۸ھ میں آپؐ نے ایک خط شاہ بصری کے نام لکھا تھا جسے حضرت حارث بن عمیر الازدی لے کر جا رہے تھے ، شرحبیل بن عمرو الغسانی رئیس علاقہ بلقاء نے انھیں مؤتہ کے مقام پر گلا گھونٹ کر شہید کر دیا (ابو اقدی : کتاب المغازی ، ۲ : ۷۵۵ ، مطبوعہ آکسفرڈ ؛ ابن سعد : طبقات ، ۲ : ۱۲۸) .

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی تبلیغی خصوصیات : آپؐ کی تبلیغی زندگی کے کوائف مختصرًا بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی ان تبلیغی خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے ، جن کی بدولت آپؐ کی تبلیغ کو وہ کامیابی نصیب ہوئی جو دنیا کی کسی تحریک کو بھی نصیب نہ ہو سکی ۔ قرآن کریم (۱۶ [النحل] : ۱۲۵) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور موعظۂ حسنہ سے دعوت دینے کا حکم ہوا ہے : اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۱۶ [النحل] : ۱۲۵) ، یعنی (اے پیغمبر! لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریقے سے ان سے بحث کیجیے ۔ یہ آیۂ کریمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے طریقۂ تبلیغ، آپؐ کے اسلوب دعوت پر بخوبی روشنی ڈالتی ہے ۔ اس آیۂ کریمہ سے آپؐ کی حسب ذیل

marfat.com
Marfat.com

تبلیغی خصوصیات واضح ہوتی ہیں : (۱) پہلا اصول جو اس کے ابتدائی جملے اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ سے مستنبط ہوتا ہے (مفتی محمد شفیع : معارف القرآن ، ۵ : ۴۰۸ بذیل آیۃ)، دعوت اسلامی میں تدریج کا لحاظ رکھنا ہے۔ آپؐ نے مکی اور مدنی دونوں ادوار میں ہمیشہ تبلیغ میں اس تدریج کے اصول کو ملحوظ خاطر رکھا ۔ اِسی بنا پر ۱۳ سالہ مکی دور میں صرف ارکان اسلام : توحید، رسالت ، معاد ، اور مسئلہ تقدیر کی تبلیغ کی گئی اور دوسرے احکام مدنی زندگی میں رفتہ رفتہ دیے گئے ۔ اس کی حکمت ام المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ یوں بیان فرماتی ہیں کہ قرآن کریم میں جو پہلی سورت نازل ہوئی اس میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے ۔ جب معتدبہ لوگ اسلام کے دائرے میں آ گئے تو پھر حلال و حرام کے احکام دیے گئے ۔ اگر شروع میں امتناعی احکام آ جاتے تو لوگوں کو گراں گزرتے اور تعمیل میں تأمّل بلکہ انکار ممکن تھا (البخاری : الصحیح ، ۶۶/۶ ، ۳ : ۳۹۵) ۔ در اصل یہ طریقہ طبع انسانی کی گہری خصوصیات کے ادراک کا پتا دیتا ہے ۔ آسان سے مشکل کی طرف بڑھنا زیادہ مؤثر ہوتا ہے ۔ آپؐ نے حضرت معاذ رضؓ بن جبل کو یمن کی طرف روانہ کرتے وقت بھی تبلیغ میں اسی اصول تدریج کو ملوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی ؛ آپؐ نے فرمایا کہ پہلے ان کو توحید و رسالت کی دعوت دینا ؛ اگر وہ مان جائیں تو پھر ان کو نماز کی تعلیم دینا ؛ اگر وہ یہ بھی مان لیں پھر ان کو فریضۂ زکوٰۃ سے آگاہ کرنا (البخاری : ۴۳/۱ ، ۱ : ۳۵۲) ؛ (۲) آپؐ کی دوسری تبلیغی خصوصیت حکمت ہے ۔ حکمت کے یوں تو بہت سے مفہوم بیان ہوے ہیں ، مگر ابو حیان الاندلسی (صاحب بحر المحیط) کی یہ تعبیر عام طور سے قبول کی جاتی ہے کہ حکمت وہ کلام یا سلوک ہے جس میں اکراہ کا پہلو موجود نہ ہو اور طبع انسانی اسے فوراً قبول کرے اور وہ عقل و قلب ہر دو کو متأثر کرے ؛ حکمت اس درست کلام اور موثر طرز ابلاغ کا نام ہے جو انسان کے دل میں اتر جائے اور مخاطب کو مسحور کر دے ؛ نیز دیکھیے مفتی محمد شفیع : معارف القرآن ، ۵ : ۴۰۸)۔ اس بارے میں آپؐ کو جو اختصاص و امتیاز حاصل تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ عرب کے مشہور کاھن ضماد الازدی نے جب آپؐ کا اثر انگیز خطبہ سنا تو اعتراف کیا کہ ایسا کلام نہ کاھنوں کے پاس ہے نہ جادو گروں اور شاعروں کے پاس؛ اس پر اس نے اسلام قبول کر لیا (احمد بن حنبل: مسند، ۱ : ۳۰۲)- مشہور شاعر اور رئیس دوس طفیل بن عمرو الدوسی (م ۱۱ھ/۶۳۲ع) کو کلام نبوی سن کر اعتراف کرنا پڑا : ماسمعت قولاً قطّ احسن منه ، یعنی میں نے اس سے عمدہ کلام آج تک نہیں سنا ۔ غزوۂ حنین کے بعد جب انصار میں کچھ بد دلی پیدا ہوئی تو آپؐ کے پر اثر خطبہ سے ان کے جملہ شکوک و شبہات کا ازالہ ہوگیا ۔ (البخاری ، ۵۶/۵۶ ، ۳ : ۱۵۳ تا ۱۵۶ ؛ ابن حجر: فتح الباری، بذیل احادیث مذکورہ) ؛ (۳) آپؐ کی تیسری خصوصیت موعظۃ الحسنہ ہے ۔ موعظۃ کا مادہ وعظ ہے اور وعظ کے معنی ھیں کسی کی خیرخواھی کی بات کو اس طرح اس کے سامنے بیان کیا جائے کہ جس سے اس کا ناگوار حصّہ بھی قابل قبول ہو جائے اور مخاطب کا دل قبولیّت کے لیے نرم ہو جائے ؛ الحسنہ کے معنی ھیں کہ اس کا عنوان بھی ایسا ہو کہ جس سے مخاطب کا قلب مطمئن ہو جائے (معارف القرآن، ۵ : ۴۰۹)۔ آپؐ کی تبلیغ و دعوت کی یہ بھی خصوصیت قابل ذکر ہے کہ آپؐ کا ظاھری اندازِ تبلیغ بھی ایسا دلکش اور جامع ہوتا تھا کہ سوائے ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کے کوئی شخص بھی آپؐ سے دور نہ رہ سکتا تھا؛ اثر انگیزی کی اسی کیفیت سے متأثر ہو کر قریش مکہ نے آپؐ کو ''ساحر'' (جادوگر) کا نام دیا تھا ۔ خود رؤساے قریش

marfat.com
Marfat.com

مثلاً ابوجہل ، ابو سفیان ، الاَخنس بن شَریق جیسے لوگ رات کو چھپ چھپ کر کلام اللہی کی معجزاتی بلاغت کو سنتے اور سر دھنتے تھے (ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۳۳۷ تا ۳۳۸)۔ یہ اسی موعظۂ حسنہ کا اثر تھا کہ عُمیر بن وہب الجمحی جو آپؐ کو قتل کرنے کی نیت سے گھر سے روانہ ہوا تھا آپؐ کی خدمت میں پہنچ کر مشرف باسلام ہو گیا (کتاب مذکور ، ۲ : ۳۱۶ ببعد).

(۴) چوتھی خصوصیت آپؐ کی مجادلہ احسن ہے ۔ قرآن مجید میں دو قسم کے مجادلوں کا ذکر آتا ہے: (۱) مجادلۂ احسن اور (۲) مجادلۂ باطل۔ مجادلۂ باطل کو کفار و مشرکین کی طرف منسوب کیا گیا ہے ۔ جس سے مراد بلا کسی معقول دلیل کے اپنے موقف پر اصرار، غیر متعلق باتوں میں مسئلے کو الجھا دینے کا طریقۂ بےفائدہ کج بحثیوں میں تضیع اوقات ، اور خواہ مخواہ کی موشگافیاں کرنا ہے ۔ یہ ہمیشہ سے اہل باطل کا شیوہ رہا ہے ۔ اس کے برعکس اہل حق کو ابتداءً تو یہ تلقین کی گئی کہ جہاں تک ہو سکے معاملے کو مجادلے تک نہ پہنچنے دیں ۔ اگر مجادلے کی ضرورت پیش آ ہی جائے تو مجادلے کو مجادلۂ احسن بنائیں، نیز ۱۶ [النحل] : ۲۵ جس کا مطلب ہے کہ مخاطب کے سامنے پہلے ان باتوں کو پیش کریں جن میں اصولی طور سے اشتراک ہے (۳ [آل عمران] : ۶۴) ؛ مخاطب کو مطمئن اور قائل کرنے کے لیے محبت ، اعتماد ، حسن اخلاق اور حسن استدلال سے کام لیا جائے (امین احسن اصلاحی : دعوت دین ور اس کا طریق کار ، ص ۱۱۵-۱۱۷) ۔ سیرت نبوی میں مدینہ منورہ کی زندگی میں آپؐ کا یہودیوں سے (سیرۃ النبی، ۱ : ۳۹۵ تا ۴۰۳) اور اہل نجران کے عیسائیوں سے مباحثہ ([رک بہ مباہلہ] ؛ ابن سعد : طبقات ، ۳۵۷ تا ۳۵۹) اس کی نمائندہ مثالیں ہیں۔

۵- ایک اور خصوصیت قول لین ہے ۔ قول لین کا مطلب نرم بات ہے ۔ بلا شبہ مبلغ حق کی باتوں میں نرمی کے عنصر کا پایا جانا ضروری ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وصلم میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی ۔ قرآن مجید میں آپؐ کے اس وصف کا یوں ذکر کیا گیا ہے : فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۳ [آل عمران] : ۱۵۹) ، یعنی پھر یہ اللہ کی رحمت کے سبب ہی سے ہے کہ آپؐ ان کے لیے نرم ہو گئے اور اگر آپؐ تند خو ، سخت طبع ہوتے تو لوگ آپؐ کے پاس سے منتشر ہو جاتے ۔ نرمی ، ملاطفت اور مہربانی کا برتاؤ آپؐ نے جو اپنے دشمنوں سے کیا اور جس نے ابو سفیان بن حرب ، عِکرمہ بن ابی جہل ، عَمرو بن وہب الجُمعی ، ہند بنت عتبہ اور صفوان بن امیہ جیسے بےشمار لوگوں کی کایا پلٹ دی ، وہ دنیا کی تاریخ میں ایک مثال ہے آپؐ نے اپنے جانی دشمنوں کو بھی اپنی نرمی اور شیریں گفتار سے اپنا اور اسلام کا گرویدہ کر لیا۔

۶- سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک اور تبلیغی خصوصیت تالیف قلب ہے ۔ یعنی آپؐ کا وہ سلوک ہے جو غیرمسلموں اور بعض نومسلموں کے ساتھ اس غرض سے آپؐ نے کیا کہ وہ اسلام کو شفقت اور حسن سلوک کا نمونہ خیال کریں ۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے اپنے قدیمی دشمنوں کی عام معافی کا اعلان فرمایا (السہیلی : روض الانف، ۲ : ۲۶۳ تا ۲۷۸) ۔ یہ اقدام تالیف قلوب میں معاون ہوا اور صرف چند دنوں میں دو ہزار قریش مسلمان ہوگئے ۔ غزوہ حنین کی فتح کے بعد مال غنیمت میں سے آپ نے بالخصوص نو مسلموں کو زیادہ حصہ دیا جس کا مقصد بھی تالیف قلب تھا ۔ تفصیل یہ ہے : (۱) ابو سفیان مع اولاد ۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰ اوقیہ چاندی ، (۲) حکیم بن حزام ۲۰۰ اونٹ ، (۳) حارث بن ہشام ۱۰۰

marfat.com
Marfat.com

اونٹ ، (۴) صفوان بن امیہ ۱۰۰ اونٹ ، (۵) قیس بن عدی ، ۱۰۰ اونٹ ، (۶) سہیل بن عمرو ۱۰۰ اونٹ ، (۷) اقرع بن حابس ۱۰۰ اونٹ ، (۸) عُیَینہ بن حصن فزاری ۱۰۰ اونٹ ، (۹) مالک بن عوف ۱۰۰ اونٹ ۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ دیے گئے ۔ آپ کے اس طرز عمل نے ان لوگوں کو اور مخلص بنانے میں اہم کردار ادا کیا (الزرقانی : شرح المواهب اللدنیة ، ۳ : ۳۵ تا ۴۲، ابن سعد : طبقات، ۲ : ۱۵۱ تا ۱۵۳، مطبوعه بیروت).

۷۔ آپ کی تبلیغی زندگی کی اہم خصوصیت شفقت و رافت ہے ۔ آپ سے معاملہ کرنے والوں کا یہ متفقہ قول ہے کہ آپ مجسمہ شفقت و رافت تھے (۹ [التوبة] : ۱۲۸) ۔ آپ فرط رحمت سے امت کے عدم قبول حق کی وجہ سے مسلسل غم و فکر میں گھلتے رہتے ۔ جس پر قرآن کریم میں آپ کو تنبیہ کی گئی : فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰۤی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا (۱۸ [الکهف] : ۶)، یعنی کیا آپ اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لاتے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے ۔ آپ کے متعلق صحابہؓ کرام کا یہ کہنا تھا کہ من رہ بداهة هابه و من خالطه معرفة احبه (شرح شمایل ترمذی ، ص ۱۲ ، مطبوعه ۱۲۵۲ھ) ، یعنی جو کوئی آپ کو پہلی مرتبہ دیکھتا وہ آپ کے دبدبے سے مرعوب ہو جاتا اور جو آپ سے معاملہ کرتا وہ آپ سے محبت کرنے لگتا ہے ۔ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے آپ سے زیادہ کسی کو مسکرانے والا نہ پایا (الترمذی : الجامع السنن ، ۲ : ۲۷۸)؛ اس سے آپ کی انسان شناسی اور فطرت انسانی کے وسیع ادراک کا پتہ چلتا ہے۔

آپ کی تبلیغی زندگی میں جس وصف نے سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا وہ آپ کی صفت عفو و درگزر اور حسن خلق ہے ۔ آپ نے اپنے سخت ترین دشمنوں کو عام معافی عطا فرمائی (سیرة النبی ، ۱ : ۵۱۵ ، ۵۲۰)؛ قتل کی نیت سے آنے والوں کو معاف فرمایا (ابن هشام ، سیرة ، ۲ : ۳۱۶)؛ اہل طائف کے ظلم و تعدی کے باوجود یہ کہ کر ان کو معاف کر دیا کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو مجھے امید ہے کہ ان کی اولاد اس سے بہرہ ور ہوگی (ابن حجر : فتح الباری ، ۶ : ۲۲۵) ۔ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں نے آپ کو لہولہان دیکھ کر مشرکین کے حق میں بد دعا کرنے کی درخواست کی تو رحمت مجسم نے فرمایا: "اے اللہ! میری قوم کو ہدایت فرما، کیونکہ وہ نہیں جانتے (مسلم : الصحیح ، ۲ غزوہ احد) ۔ عبداللہ ابن ابی سرح ، عکرمہ بن ابی جہل ، ہند زوجہ ابو سفیان ، صفوان ابن امیہ ، وحشی بن حرب وغیرہ کو جس طرح معافی عطا کی گئی ہے وہ تاریخ عالم کا منفرد واقعہ ہے (سیرة النبی ، ۱ : ۵۲۱ ، ۵۲۲) اس کے علاوہ آپ کا مضبوط کردار ، آپ کا اپنی دعوت پر منفرد طرز عمل لوگوں کے دل و دماغ کو آپ کی تبلیغ کی طرف متوجہ کرنے میں بہت مددگار تھا ، کیونکہ آپ کے عمل میں آپ کے قول کی صداقت بڑی عمدگی سے دیکھی جا سکتی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغی زندگی کی خصوصیات اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو احاطہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا ۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کی تمام زندگی ایک داعی اور مبلغ کی زندگی ہے ۔ اسلامی انقلاب کے پس منظر میں سب سے زیادہ جس عامل نے کام کیا وہ آپ کی تبلیغ تھی جو نفسیات انسانی کے عمیق مطالعے پر مبنی تھی ۔ ہر شخص کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا اصول آپ کی تبلیغی زندگی سے عنقا ہے ۔ حالات و طبائع میں فرق کے ساتھ آپ کے طریقہ تبلیغ میں تبدیلی آ جاتی تھی ۔ کلّموا الناس علی قدر عقولهم کا مقولہ ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہا ۔

marfat.com
Marfat.com

آپؐ نے ہر شخص سے وہی سلوک فرمایا جس کا وہ حق دار تھا ؛ آپؐ ہر شخص سے کامل بشاشت ، وفور مسرت اور مسکراتے چہرے کے ساتھ پیش آتے جس سے لوگوں کے دل باغ باغ ہو جاتے ۔ اگر مخاطب ترش روئی ، تند خوئی سے پیش آتا آپ قطعاً برا نہ مناتے ؛ اگر نازیبا گفتگو کرتا آپؐ تحمل فرماتے ۔ ایک شخص کو آپؐ نے اسلام کی دعوت دی ، اس نے کہا کہ مجھے سب باتیں منظور ہیں مگر میں فلاں کام نہیں چھوڑ سکتا ۔ یہ سن کر بعض صحابہ ناراض ہوے، مگر آپ نے مسکراتے ہوے اسے اپنے قریب بلایا اور نرمی سے اس کام کی قباحت ذہن نشین کرا دی کہ وہ خود ہی اس سے تائب ہوگیا ۔ ایک بدو نے مسجد نبوی کے ایک گوشے میں پیشاب کر دیا ۔ صحابہؓ اس کو مارنے کے لیے دوڑے ، مگر آپ نے منع فرما دیا ۔ جب وہ حاجت سے فارغ ہوگیا تو نہایت نرمی اور پیار سے اسے مسجد کی عزت و حرمت سے آگاہ فرمایا ۔ ایک بدو ضمام بن ثعلبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کئی قسمیں دے کر آپ سے پوچھا کہ کیا واقعی آپ اللہ کے فرستادہ ہیں ۔ آپؐ نے تحمل سے جواب دیا ۔ اس نے اپنے اکھڑ انداز میں اور بھی کئی سوالات کیے ، مگر آپ نے کامل بشاشت سے جواب دیا ۔ جب وہ چلا گیا تو آپؐ نے اس کی درشتگی کو نظر انداز کرتے ہوے اس کی سادہ لوحی اور جذبہ اخلاص کی تعریف فرمائی (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۹۹ ، البخاری ، کتاب الایمان).

اختتام : بعض مستشرقین آپؐ کو محض ایک لیڈر اور ہیرو کے طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں القاب درست نہیں ، اس لیے کہ آپؐ نبی اور رسول تھے جو تائید ایزدی سے بہرہ ور تھے ۔ دوم آپ کا نصب العین کسی دنیوی قائد کی طرح مادی نہ تھا ، بلکہ روحانی تھا ۔ سوم اس کے لیے کہ آپ سارے عالم کے لیے تھے کسی گروپ کے لیے نہ تھے۔

مآخذ : متن مقالہ میں مذکور ہیں (محمود الحسن عارف رکن ادارہ نے لکھا).

(ادارہ)

میثاق مدینہ : میثاق مدینہ انحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بصیرت الہامی کا شاہکار ہے ۔ ایک عظیم الشان ریاست کی تأسیس اور تدبیر و تنظیم سرور دو عالم کا وہ کارنامہ ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی ۔ ایک ایسا شخص جسے اپنے ہم وطنوں نے وطن چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا ہو ، ہجرت کے سفر کی مشکلات برداشت کرتے ہوے یثرب (مدینہ) پہنچتا ہے اور اس شہر کے چند محلوں پر مشتمل ایک شہری ریاست قائم کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قبائلی عصبیت و قومیت کے بت کو پاش پاش کرکے اس کی جگہ ایک عالم گیر برادری قائم کی ۔ رنگ ، نسل ، خاندان ، زبان اور وطن سے بالاتر ایک امت اور ملت کا قیام عمل میں لائے ۔ غیر مسلموں اور مختلف مذہبی جماعتوں کے حقوق و فرائض کا تعین کیا ؛ ریاست اور شہریوں کے حقوق و فرائض کی نشاندھی کی ۔ انصاف اور قانون کی حکومت قائم کی اور قانون کے سامنے مساوات کا اصول تسلیم کیا ۔ انتظامیہ ، مقننہ اور عدلیہ کے اصول و ضوابط مرتب کیے ۔ الغرض انسانی معاشرے کی تشکیل و تعمیر اور فلاح و بہبود نیز ایک اعلٰی و ارفع اسلامی فلاحی مملکت کے قیام کے سلسلے میں ، جتنے بھی ضروری اقدامات ہو سکتے ہیں ، کیے گئے ۔

ایک نئی ریاست کی تاسیس و تشکیل کے سلسلے میں میثاق مدینہ کو بڑی اہم اور بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف

marfat.com
Marfat.com

لائے تو بہت سے مسائل کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت تھی مثلاً : (۱) مسلمانوں کو یکجا اور متحد کرنے کا مسئلہ ؛ ۲۔ مسلمانوں کی روحانی و معاشرتی اصلاح و تربیت کا مسئلہ؛ (۳) مدینے میں بسنے والے مختلف گروہوں کے باهمی تعلقات کو مضبوط کرنے کا مسئلہ ۔ اس وقت مدینے میں یہود کے دس قبائل اور اوس و خزرج کے بارہ قبائل آباد تھے۔ اوس و خزرج میں مسلمان بھی تھے اور بت پرست بھی ۔ اوس و خزرج اسلام کی آمد سے پہلے باہم ایک خونریز جنگ میں مبتلا رہ چکے تھے جسے جنگ بُعاث کہا جاتا ہے ؛ (۴) شہر کی سیاسی تنظیم اور اس کے تحفظ و دفاع کا انتظام.

سرور دو عالم[ؐ] نے حکمت نبوی سے ان تمام مسائل کو پوری کامیابی سے اس طرح حل کیا : (۱) مسلمانوں کو رنگ و نسل کے امتیازات سے بالاتر کر کے انھیں رشتۂ اخوت [مؤاخات ، رکَ بآں] میں منسلک کر دیا اور ایک ایسی نئی ملت تیار کی جو خالص دینی اور انسانی اقدار پر مبنی تھی۔ اسے ایک خدا ، ایک رسول ، ایک قوم اور ایک هی مقصد زندگی سے وابستہ کر دیا ؛ (۲) مسلمانوں کی روحانی و معاشرتی تربیت و اصلاح اور ان میں مرکزیت پیدا کرنے کے لیے مسجد نبوی کی تعمیر کی اور اسے اهل اسلام کی روحانی ، سماجی ، تعلیمی و عدالتی سرگرمیوں کا مرکز و محور قرار دیا ؛ (۳ ، ۴) مدینے میں بسنے والے مختلف گروہوں کے باهمی تعلقات اور حقوق و فرائض کو متعین و منضبط کرنے کے لیے نیز اس شہر کی سیاسی تنظیم اور تحفظ و دفاع کے لیے ایک ایسا تحریری معاهدہ کیا جسے میثاق مدینہ کہا جاتا ہے.

آپ نے اس معاهدے کی اهمیت کے پیش نظر اسے تحریر کروایا ۔ اس میثاق کے لیے آپ نے ”کتاب“ اور ”صحیفہ“ کے الفاظ استعمال فرمائے جس سے اس دستاویز کی اهمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے ۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اپنی کتاب "The First Written Constitution in the World" (لاهور ۱۹۷۵ء، ص ۴ تا ۹) میں مضبوط دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ میثاق مدینہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور ہے جسے خود ریاست کے حاکم اعلٰی نے نافذ کیا (نیز رکَ بہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ حیثیت مقنن).

میثاق مدینہ کی تفصیلات کا علم همیں مختلف بنیادی اور ثانوی مآخذ و مصادر سے ہوتا ہے؛ وہ اهم بنیادی مآخذ جنھوں نے اس معاهدے کی مکمل تفصیلات درج کی هیں : (۱) محمد بن اسحاق : سیرت النبی (جس کا فارسی اور انگریزی ترجمہ دستیاب ہے) ؛ (۲) ابن هشام : السیرة النبویة ؛ (۳) ابو عبید القاسم بن سلام : کتاب الاموال ؛ اور (۴) ابن کثیر : البدایة و النهایة ۔

ابن سعد ، البلاذری ، ابن جریر الطبری ، ابن خلدون اور دیگر قدیم مؤرخین نے اس معاهدے کی تفصیلات درج نہیں کیں ۔ البتہ اس کا ذکر ضرور کیا ہے ۔ احادیث کی کم و بیش جملہ اهم کتب میں بھی اس معاهدے کا ذکر ہے ، مگر تفصیلات نہیں هیں ۔ الزرقانی ، المقریزی اور لسان العرب کے مصنف ابن منظور نے بھی میثاق مدینہ پر جزوی روشنی ڈالی ہے.

ثانوی مآخذ میں زیادہ اهم یہ هیں :

(۱) محمد حمید اللہ : الوثائق السیاسیة ، جس کا اردو ترجمہ ”سیاسی وثیقہ جات“ کے عنوان سے شائع هو چکا هے) ؛ (۲) وهی مصنف : عہد نبوی میں نظام حکمرانی ؛ (۳) وهی مصنف "The First Written Constitution in the World" ، لاهور ۱۹۷۵ء ؛ (۴) Leone Caetani : Annali dell' Islam (۵) Wellhausen : Gemeni deardung Von Medina, Skizzen aud vordrbaten (۶) : منٹگمری واٹ : Muhammad at Medina ؛ (۷) مجید خدوری : The Law of War and Peace in Islam ، لنڈن ؛

marfat.com
Marfat.com

(۸) لیوی: *Social Structure of Islam*؛ (۹) قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری: رحمۃ للعالمین؛ (۱۰) امیر علی: *The Spirit of Islam*؛

اس معاهدے کے مستند اور ثقه ہونے میں کوئی شک نہیں ۔ بعض اہل علم کا یہ اعتراض کہ اس معاهدے کے ضمن میں محمد ابن اسحاق اپنے سے پہلے راویوں کا ذکر نہیں کرتا ، دیگر قوی تاریخی شواہد کی بنا پر رفع ہو جاتا ہے ۔ ابو عبید القاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ/۸۳۸ء) بڑے پائے کے قابل اعتماد ، ثقه اور قدیم عالم ہیں ۔ انہوں نے یہ معاهدہ ابن شہاب الزہری (۵۸ھ/۶۷۶ تا ۱۲۴ھ/۷۴۲ء) کی سند سے بیان کیا ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی "کتاب اموال" (۱ : ۳۵۹ ، اسلام آباد) میں یہ عبارت درج ہے : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عہد نامہ جو آپ نے مدینہ منورہ تشریف آوری پر اہل ایمان اور اہل مدینہ کے درمیان لکھوایا ، جس میں مدینے کے یہود سے مصالحت کا پیمان بھی ہے ، ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھے روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ معاهدہ تحریر فرمایا :

اس معاهدے کی ایک اہم شق کہ بنی عوف کے یہود بذات خود اور اپنے خلفا و موالی کے ساتھ مل کر مسلمان کے ساتھ ایک امت ہوں گے . . ." کی وضاحت کرکے ابو عبید نے بعد میں آنے والے محدثین کی الجھن دور کر دی ۔ امام موصوف کہتے ہیں: معاهدے کی اس شق سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ دشمنان اسلام کے خلاف (جنگ کی صورت میں) شرط کے مطابق اخراجات کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد کرتے رہیں گے ۔ رہ گیا دین کا مسئلہ ، سو وہ بالکل جداگانہ ہے۔ اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس سے آگے بھی آپ نے تصریح فرما دی کہ یہود اپنے دین پر کاربند رہیں گے اور اہل ایمان اپنے دین پر (کتاب مذکور ، ۱ : ۳۶۴) ۔ المقریزی کے بیان کے مطابق یہ تحریر شدہ دستور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تلوار سے لٹکا رہتا تھا ۔ آنحضرت کے بعد یہ تلوار حضرت علیؓ کو ملی ۔ حضرت علیؓ نے لوگوں کو اس دستاویز کے حصے کوفہ میں پڑھ کر سنائے (المقریزی ، امتاع الاسماع (مطبوعہ قاہرہ ۱ : ۴۹ ، ۱۰۴ ، ۱۰۷ ؛ محمد حمید اللہ : *The First Written Constitution in the World* ، ص ۳۹ تا ۴۰ ، ۶۸).

اس معاهدے کے مستند ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ پوری عبارت میں کوئی بھی ایسی شق نہیں جو اسلام کی پالیسی یا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو ؛ مزید براں یہ ایک مسلسل اور مربوط عبارت ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ اس کا مصنف ایک ہی تھا. پھر دور حاضر کے کم و بیش جملہ مسلمان اہل علم اور مستشرقین اس میثاق کے مستند ہونے کے قائل ہیں.

معاهدے کی تاریخ : اس معاهدے کی تاریخ کے بارے میں قدیم مؤرخین و محدثین کے ہاں کوئی واضح اختلاف نہیں پایا جاتا ۔ سبھی اسے ہجرت مدینہ کے فوری بعد اور غزوۂ بدر سے پہلے کا معاهدہ قرار دیتے ہیں ۔ امام ابو عبید کی رائے سب سے وزنی معلوم ہوتی ہے ۔ ان کے الفاظ یہ ہیں : ہماری رائے میں یہ معاهدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے آغاز کے وقت کیا گیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کو استحکام و غلبہ حاصل نہیں ہوا تھا ؛ نہ اس وقت تک اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم صادر ہوا تھا ۔ یہ (مدینہ کے) اہل کتاب تین گروہوں پر مشتمل تھے : بنو قینقاع ، بنو نضیر اور بنو قریظه (کتاب الاموال ، ۱ : ۳۶۴) ۔ دور جدید کے اہل علم نے میثاق مدینہ کی تاریخ کو بھی موضوع بحث بنایا ہے ۔ ولهاوزن اور کائتانی اسے غزوہ بدر سے پہلے کی ہی دستاویز قرار دیتے ہیں؛ اسی طرح

marfat.com
Marfat.com

مجید خدوری بھی بڑے یقین سے اسے غزوہ بدر سے پہلے کی دستاویز قرار دیتا ہے (دیکھیے *The Law of War and Peace in Islam*، ۱۹۵۵ء، ص ۲۰۶)۔

محمد حمید اللہ نے اس معاهدے کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے اور یہ رائے قائم کی ہے کہ اس کا پہلا حصہ غزوۂ بدر سے پہلے کا ہے اور دوسرا حصہ غزوۂ بدر سے بعد کا؛ انھوں نے بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور مضبوط عقلی دلائل دیئے ہیں، لیکن قدیم مآخذ سے کوئی واضح حوالہ نہیں دیا (دیکھیے *The First Written Constitution in the World*، ۲۲ تا ۲۶)۔

مقالہ نگار کی رائے میں یہ معاہدہ مکمل طور پر غزوۂ بدر سے پہلے ھی لکھا گیا۔ بنو قینقاع جو اس معاهدے کے ایک فریق تھے، انھیں غزوۂ بدر کے ایک ھی ماہ بعد، اس معاهدے کی خلاف ورزی کرنے پر، مدینے سے نکال دیا گیا تھا۔ ابن اسحاق نے اس واقعے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ان بنی قینقاع کانوا اول یهود نقضوا ما بینهم و بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و حاربوا فیما بین بدر و احد "(ابن هشام: السیرۃ النبویۃ، قاهرہ ۱۹۳۴ء، ۳: ۵۱)، یعنی یہود میں سے بنو قینقاع پہلی جماعت تھی جس نے اس معاهدے کو توڑا جو ان کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے درمیان ہوا تھا اور انھوں نے بدر و احد کی درمیانی مدت میں لڑائی کی۔ اسی طرح کا بیان ابن سعد نے بھی دیا ہے (دیکھیے طبقات، بیروت ۱۹۵۷ء، ۲: ۲۹)۔ یہ عبارت اس بات کو پوری طرح سے واضح کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جملہ یہود سے، جن میں بنو قینقاع بھی موجود تھے، یہ معاہدہ غزوۂ بدر سے پہلے ھی کیا تھا۔ رہ گیا یہ مسئلہ کہ معاهدے کے متن میں باقاعدہ طور پر بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کا نام درج نہیں ہے۔ تو اس کا ایک واضح جواب یہ ہے کہ ان قبائل کو اوس و خزرج کے حلفا کی صورت میں معاهدے میں شریک کیا گیا۔ ان تینوں قبائل کا اوس و خزرج کے ساتھ حلیف ہونا مضبوط تاریخی شواهد سے ثابت ہوتا ہے۔ ابن هشام کی درج ذیل عبارت اس معاهدے پر خوب روشنی ڈالتی ہے:

"فکانوا اذا کانت بین الاوس و الخزرج حرب خرجت بنو قینقاع مع الخزرج و خرجت النضیر و القریظه مع الاوس یظاهر کل واحد من الفریقین حلفاء علی اخوانه" (ابن هشام، ۲: ۱۸۸)۔ یعنی جب کبھی اوس و خزرج میں لڑائی ہوتی تو بنو قینقاع خزرج کے ساتھ نکلتے اور بنو نضیر اور قریظہ اوس کے ساتھی بن کر نکلتے اور ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک اپنے حلیفوں کی مدد کرتا تھا بمقابلہ ان کے (یا اپنے) بھائیوں کے)۔

میثاق مدینہ کا متن: ابن هشام اور کتاب الاموال میں درج شدہ میثاق مدینہ چھوٹے بڑے ملے جلے فقروں پر مشتمل ہے۔ دور جدید کے اکثر اهل علم نے ان فقروں کو دستوری دفعات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ ولهاؤزن نے اس دستاویز کو ۴۷ دفعات پر منقسم کیا ہے۔ اکثر مغربی مؤرخین نے اسی تقسیم کو تسلیم کیا ہے۔ محمد حمید اللہ نے اس دستاویز کی باون دفعات گنوائی ہیں، لیکن قارئین کو جو یورپی مآخذ کا مطالعہ بھی کرتے ہیں، الجھن سے بچانے کے لیے ان دفعات کی تعداد ۴۷ ھی رکھی ہے اور بعض بڑی دفعات کو الف اور ب دو اجزا پر تقسیم کر دیا ہے۔

یہ معاہدہ واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے: پہلے حصے میں تئیس دفعات ہیں اور دوسرے میں چوبیس۔ پہلا حصہ مسلمانوں کے باهمی تعلقات اور حقوق و فرائض کی نشاندهی کرتا ہے، جبکہ دوسرا حصہ اهل اسلام اور یہود اور دیگر اهل مدینہ کے باهمی تعلقات، حقوق و فرائض اور دیگر اهم امور کی وضاحت کرتا ہے۔

marfat.com
Marfat.com

مقالہ نگار کے نزدیک چونکہ امام ابو عبید القاسم بن سلام کا متن سب سے زیادہ مستند ہے ، اس لیے ذیل میں وہی درج کیا جاتا ہے، [البتہ ابن ہشام کا متن بھی جو اس سے کسی جگہ مختلف ہو جاتا ہے ، بڑی بریکٹوں کے درمیان اضافہ کر دیا گیا ہے]:

(١) یہ محمد نبی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا عہد نامہ ہے جو قریشی اور مدنی مسلمانوں کے درمیان ، نیز ان لوگوں کے درمیان جو ان کی پیروی کر کے ان میں اس طرح آ ملیں اور ان کے ساتھ رہیں کہ ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں ، کے درمیان طے پایا ؛ (٢) یہ سب لوگ مل کر دوسرے لوگوں سے الگ ہو کر ایک امت قرار پائیں گے ؛ (٣) قریشی مہاجرین اپنے نظام قبیلہ کے مطابق باہم اپنی دیتیں ادا کریں گے ؛ اسی طرح وہ اپنے قیدیوں کا فدیہ مومنوں اور مسلمانوں میں مروجہ دستور و انصاف سے ادا کریں گے ؛ (٤) بنو عوف اپنے نظام قبیلہ کے مطابق اپنی پہلی دیتیں ادا کریں گے اور ان میں سے ہر گروہ اپنے قیدیوں کو واگزار کروانے کے لیے مسلمانوں میں مروجہ دستور اور عدل و انصاف کے مطابق فدیہ دے گا] ؛ (٥) بنو الحارث [بن خزرج] اپنے نظام کے مطابق اپنی پہلی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدیوں کا فدیہ مسلمانوں میں مروجہ دستور و انصاف کے مطابق دے گا؛ (٦) بنو ساعدہ؛(٧)بنو جشم؛ (٨) بنو نجار ؛ (٩) بنو عمرو بن عوف ؛ (١٠) بنو نَبیت اور (١١) بنو اوس اپنے اپنے نظام کے مطابق اپنی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدی کا فدیہ مسلمانوں کے مروجہ دستور و انصاف کے مطابق دے گا ؛ [آخر کی عبارت ہر جگہ دہرائی گئی ہے] (١٢) اہل ایمان اپنے کسی زیر بار قرضدار کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے ، بلکہ قاعدے کے مطابق فدیہ ، دیت اور تاوان ادا کرنے میں اس کی مدد کریں گے ؛ (١٣) اور یہ کہ تقویٰ شعار مسلمان متحد ہو کر ہر اس شخص کی مخالفت کریں گے جو ان میں سے مومنوں کے درمیان ظلم ، گناہ ، زیادتی ، سرکشی اور فساد و بغاوت کا موجب ہوگا ؛ وہ سب اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے خواہ وہ ظالم ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو ؛ (١٤) کوئی مؤمن کسی مؤمن کو کافر کے عوض قتل نہیں کرے گا اور نہ کسی مؤمن کے خلاف وہ کسی کافر کی مدد کرے گا؛ (١٥) سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے مددگار و کارساز ہوں گے؛ (١٦) یہودیوں میں سے جو بھی ہمارا تابع ہو جائے گا اس کے ساتھ دستور کے مطابق معاملہ و انصاف و مساوات کا سلوک روا رکھا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ؛ نہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی ؛ (١٧) مسلمانوں کی صلح یکساں اور برابر کی حیثیت رکھتی ہے ؛ کوئی مسلمان قتال فی سبیل اللہ میں دوسرے مسلمان سے الگ ہو کر صلح نہیں کرے گا ؛ ایسے مسلمانوں کے درمیان مساوات و عدل ملحوظ رکھنا ہوگا ؛ (١٨) ہر غازی جماعت کے افراد آپس میں ایک دوسرے کی جانشینی کریں گے ؛ (١٩) تقوی شعار مسلمان اس معاہدے کی شرائط پر کاربند رہیں گے؛ (٢٠)کوئی مشرک [یہودی] قریش کے مال کو پناہ نہیں دے گا اور نہ کسی مسلمان کے مقابلے میں وہ قریش کی مدد کرے گا ؛ (٢١) جو کسی مؤمن کا ناحق خون کرے گا اسے مقتول کے عوض قتل کیا جائے گا ، اِلّا یہ کہ اس مقتول کا ولی اس کے عوض خون بہا لینے پر رضامند ہو جائے اور تمام اہلِ ایمان قاتل کے خلاف رہیں گے ؛ (٢٢) کسی مؤمن کے لیے جو اس معاہدے کی پابندی کا اقرار کر چکا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان لا چکا ہے ، یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ کسی قانون شکن کی مدد کرے یا اسے پناہ دے ؛ جو ایسے مجرم کی مدد کرے گا یا پناہ دے گا تو اس پر قیامت کے دن تک اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کا غضب ہو؛ اس سے نہ بدلہ

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

قبول کیا جائے گا اور نہ فدیہ؛ (۲۳) اور تم لوگ جب بھی کسی معاملے میں باہم اختلاف کرو گے تو اس کے فیصلے کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے گا.

[یہاں تک کی دفعات اہل اسلام کے باہمی معاملات سے متعلق تھیں۔ سطور ذیل کی دفعات غیر مسلم قبائل سے تعلقات کی نوعیت بیان کرتی ہیں :] (۲۴) مسلمان جب تک جنگ میں مصروف رہیں گے جنگی اخراجات میں یہودی ان کے شریک رہیں گے ؛ (۲۵) بنو عوف کے یہود بذات خود اور اپنے حلیفوں اور موالی کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ ایک فریق اور جماعت ہوں گے۔ یہودی اپنے دین پر کاربند رہیں گے اور مسلمان اپنے دین پر، البتہ جس نے ظلم و گناہ کیا وہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو مصیبت میں ڈالے گا؛ (۲۶) بنی نجار، (۲۷) بنو حارث؛ (۲۸) بنو ساعدہ (۲۹) بنو جشم؛ (۳۰) بنو اوس (۳۱) اور بنو ثعلبہ کے یہود کے لیے بھی وہی کچھ (مراعات، فرائض) ہے جو یہود بنی عوف کے لیے ہے۔ (آخر کی عبارت ہر جگہ دھرائی گئی ہے)، لیکن ان میں سے جس نے ظلم و زیادتی کی تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے گھروالوں کو تباہی میں ڈالے گا؛ [(۳۲) یہ کہ بنو ثعلبہ کا بطن (شاخ) بنو جفنہ بھی بنو ثعلبہ کی طرح ہوں گے (۳۳) اور یہ کہ بنو شُطیبہ کے لیے بھی وہی کچھ ہے جو یہود بنی عوف کے لیے ہے، اور یہ کہ نیکی گناہ سے الگ ہوگی؛ (۳۴) بنو ثعلبہ کے موالی (حلفاء وغیرہ) حقوق و فرائض میں انھی کی طرح ہوں گے ؛ (۳۵) اور یہ کہ یہودیوں کی کوئی شاخ ان کی ھی طرح ہوگی :]، (۳۶) اور ان قبائل میں سے کوئی فرد حضرت محمد صلی اللہ و آلہ وسلم کی اجازت کے بغیر [مدینہ سے، معاھدے سے] باھر نہیں نکلے گا ؛ (۳۶ ب) [اور یہ کہ کوئی شخص زخم (جرم) کا بدلہ لینے سے مانع نہیں ہوگا اور جو کوئی کسی کو قتل کرے گا پس وہ خود کو اور اپنے اہل خاندان کو ھی ہلاک کرے گا] ؛ (۳۷) اور یہ کہ اہل اسلام پر اپنے اخراجات اور یہود پر اپنے اخراجات واجب ہوں گے ؛ نیز جو اس معاھدے کے شرکا سے جنگ کرے گا تو تمام شرکا اس کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے؛ (۳۷ ب) وہ آپس میں ایک دوسرے کے خیر خواہ رہیں گے اور ہر حال میں مظلوم کی مدد کریں گے ؛ (۳۸) [اور یہ کہ یہودی جب تک مسلمانوں کے ساتھ رہیں گے اپنا خرچہ برداشت کریں گے ؛ (۳۹) اس معاھدے والوں کے لیے مدینہ کی حدود کا داخلی علاقہ حرم کی حیثیت رکھے گا ؛ [(۴۰) اور یہ کہ ھمسایہ اپنے آپ کی طرح ہوگا، نہ اسے نقصان پہنچایا جائے گا اور نہ اس پر زیادتی کی جائے گی] ؛ (۴۱) [اور یہ کہ کسی کی زیر کفالت چیز کو اس کی اجازت کے بغیر پناہ نہ دی جائے گی ؛ (۴۲) اس معاھدے والوں کے درمیان جو بھی نیا معاملہ یا قانون شکنی کا واقعہ پیش آئے گا جس سے نقصان اور فساد کا امکان ہو تو اس کے فیصلے کے لیے اللہ اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی طرف رجوع کیا جائے گا [اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس صحیفے میں نیکی اور تقوی کے مضمون پر گواہ ہیں۔]' (۴۳) قریش اور ان کے مددگاروں کو کوئی پناہ نہیں دے گا ؛ (۴۴) اور جو کوئی یثرب (مدینہ منورہ) پر یلغار کرے گا تو یہ معاھدہ کرنے والے باھمی امداد سے اس کا مقابلہ کریں گے ؛ (۴۵) ان (مسلمانوں) میں سے جو اپنے حلیف کے ساتھ صلح کرنے کے لیے یہود کو دعوت دے تو یہود اس سے صلح کریں گے۔ اسی طرح اگر وہ (یہود) ھمیں کسی ایسی ھی صلح کی دعوت دیں تو مسلمان بھی اس دعوت کو قبول کریں گے ، بشرطیکہ وہ حلیف دین (اسلام) سے برسر پیکار نہ ہوں ؛ (۴۵ ب) اخراجات میں تمام

marfat.com
Marfat.com

لوگ اپنے حصے کے ذمہ دار ہوں گے ؛ (۴۶) قبیلۂ اوس کے یہود بذات خود اور ان کے حامی اور حلیف اس عہد نامے پر خوبی و عمدگی سے عمل پیرا ہونے والوں کے ساتھ رہیں گے۔ گناہ کی حدود سے ورے نیکی اور وفاداری ہے : ہر کام کرنے والا اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا ؛ زیادتی کرنے والا اپنے نفس پر زیادتی کرے گا۔ اس معاہدے پر سچائی اور نیکی سے کاربند رہنے والوں کا اللہ مددگار ہوگا ؛ (۴۸) یہ معاہدہ ظالم اور گناہ گار کو اس کے عمل بد کے انجام سے نہیں بچائے گا ؛ جو (مدینے سے) باہر نکل جائے گا وہ مامون رہے گا اور جو (مدینے میں) بیٹھا رہے گا وہ بھی مامون ہوگا ، لیکن جو ظلم و گناہ کرے گا وہ مامون نہیں رہے گا۔ اللہ اور اس کا رسول نیکو کار اور متقی لوگوں کے حامی و محافظ ہیں (کتاب الاموال ، ۱ : ۳۵۹ تا ۳۶۵ ؛ محمد حمیداللہ : الوثائق السیاسیہ ، ص ۱۵ تا ۲۱ ؛ ابن ہشام ، سیرۃ ، ۲ : ۱۴۹ ببعد).

میثاق مدینہ کی اہمیت و افادیت : میثاق مدینہ کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اس معاہدے کی اہمیت و افادیت کے بارے میں جو اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں : (۱) اس معاہدے کی بدولت مدینے کی شہری ریاست کا آغاز ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی طرف سے اس ریاست کے سربراہ تسلیم کر لیے گئے اور اس طرح ایک بین الاقوامی معاشرہ تشکیل دینے میں مصروف ہو گئے ؛ (۲) اس معاہدے کی بدولت ، بقول سرولیم میور ، آپؐ نے ایک عظیم مدبّر اور سیاست دان کی طرح مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ اور آپس میں منتشر لوگوں کو متحد اور یکجا کرنے کا کام بڑی مہارت سے سرانجام دیا۔ آپؐ ایک ایسی ریاست اور ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جو بین الاقوامی اصول پر مبنی تھا (دیکھیے سید امیر علی : *The Spirit of Islam* ، کراچی ۱۹۶۹ء ، ص ۵۸) ؛ (۳) اس میثاق کی بدولت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عدالتی ، تشریعی ، فوجی اور تنفیذی اختیارات اپنے اور اہل اسلام کے لیے محفوظ کر لیے ؛ (۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سیاست میں اخلاقی عناصر کو داخل کیا۔ اصل سرچشمۂ اقتدار اللہ تعالٰی کو قرار دیا اور خود اللہ تعالٰی کے نائب کی حیثیت اختیار کی ؛ (۵) حقوق شہریت، تنظیم حکومت، سیاسی رواداری ، فراست اور حکمت عملی کا عمدہ اظہار بھی اسی معاہدے کے ذریعے سے ہوا ؛ (۵) اسی معاہدے کی بدولت مذہبی آزادی کا اصول وضع ہوا۔ نیز جن بنیادوں پر غیر مسلموں سے اتحاد و تعاون ہو سکتا ہے اس کی نشاندھی ہوئی ؛ (۷) اسی معاہدے نے اہل اسلام کے باہمی حقوق و فرائض اور جملہ شہریوں کے آپس میں تعلّقات ، فرائض اور حقوق کا تعین کیا ؛ (۸) اسی معاہدے نے ظلم ، ناانصافی ، عدم مساوات اور ایسی ہی دیگر خرابیوں کا سدّباب کیا۔ عربوں کے قتل کا بدلہ لینے کا پرانا انفرادی طریق ختم کرکے اسے اجتماعی فریضہ قرار دیا ؛ کمزوروں ، ناداروں اور مظلوموں کی داد رسی کا پورا پورا اہتمام بھی اسی معاہدے کی رو سے ہوا ؛ (۹) حالت امن اور حالت جنگ کا لائحہ عمل مرتب ہوا ؛ (۱۰) یہ معاہدہ قریش کے خلاف ایک مشترکہ اتحاد بن گیا اور دشمنان اسلام کا داخلہ مدینہ منورہ میں بند کر دیا گیا ؛ (۱۱) مدینے کو حرم قرار دیا گیا اور یوں اس نئی شہری ریاست کی حرمت قائم ہوئی ؛ نیز اس کے داخلی امن اور تحفظ و دفاع کا خاطر خواہ انتظام ہوا ؛ (۱۳) قبائل کی باہمی خانہ جنگی کا انسداد بھی اسی معاہدے کی بدولت ہوا ؛ (۱۴) اسی معاہدے نے اہل اسلام کے بڑے دشمن مشرکین مکہ کو دوسرے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف

marfat.com
Marfat.com

بر انگیختہ کرنے سے روک دیا ؛ (۱۵) اسی معاہدے نے شہریوں کے اندر قانون ، اخلاق ، مذہب اور انسانی قدروں کے احترام کا بھرپور جذبہ پیدا کیا ؛ (۱۶) اسی معاہدے نے اللہ تعالی کے احکام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فیصلوں کو حتمی اور فائق حیثیت دے دی ؛ (۱۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جاری کردہ اسی نظام کی بدولت ایک مضبوط اسلامی ریاست اور ایک صالح معاشرہ معرض وجود میں آیا ۔ [نیز رک بہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت مقنّن؛ آپؐ کا نظام حکمرانی؛]

مآخذ : (۱) ابو عبیدالقاسم بن سلام : کتاب الاموال ، اردو ترجمہ، مطبوعۂ اسلام آباد، ۱ : ۳۵۹ تا ۳۶۵ ؛ (۲) ابن ہشام: السیرة النبویة ، قاہرہ ۱۹۳۶ء، ۲ : ۱۴۷ تا ۱۵۰ ؛ (۳) ابن کثیر: البدایة و النہایة، مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۳۲ء، ۳ : ۲۲۴ تا ۲۲۶ ؛ (۴) ابن اسحاق : سیرة رسول اللہ ؐ ، لنڈن ۱۹۵۵ء انگریزی ترجمہ از A. Guillaume ، ص ۲۳۱ تا ۲۳۳ ؛ (۵) محمد حمید اللہ: *The First Written Constitution in the World* ، لاہور ۱۹۷۵ء ؛ (۶) وہی مصنف : الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی و الخلافة الراشدہ ، بیروت ۱۹۶۹ء [ص ۱۵ تا ۲۱] ؛ (۷) وہی مصنف : عہد نبوی میں نظام حکمرانی، حیدر آباد دکن، ص ۶۷ تا ۱۱۱ ؛ (۸) Montgomery Watt : *Muhammad at Medina* ، لنڈن ۱۹۵۶ء، ص ۲۲۱ تا ۲۲۸ ؛ (۹) مجید خدوّری : *War and Peace in the Law of Islam* ، نیویارک ۱۹۵۵ء ؛ (۱۰) Reuben Levy : *The Social Structure of Islam*، کیمبرج ۱۹۵۷ء، ص ۲۷۱ تا ۲۷۶ ؛ (۱۱) ابن سعد : الطبقات ، بیروت ۱۹۵۷ء ، ۲ : ۲۹ ؛ (۱۲) المقریزی : امتاع الاسماع ، قاہرہ ، ۱ : ۴۹ ، ۱۰۳ ، ۱۰۷ ؛ (۱۳) سید امیر علی : *The Spirit of Islam* ، کراچی ۱۹۶۹ء ، ص ۵۸ تا ۵۹ ؛ (۱۴) قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری : رحمة للعالمین ، لاہور ، ۱ : ۱۱۵ تا ۱۱۷ ۔

(امان اللہ خان [و ادارہ])

معاہدات عہد نبوی، صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم :⊛ معاہدات ، جمع معاہدہ از باب مفاعلہ (مادہ ۔ ع ۔ ہ ۔ د) ، یعنی قسم کھا کر پختہ عہد کرنا ۔ یہ عموماً فریقین میں طے پاتا ہے [تفصیل کے لیے دیکھیے ابن منظور : لسان العرب، بذیل مادہ] ۔ معاہدات عہد نبوی ؐ کا اطلاق ان معاہدات پر ہوتا ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہجرت کے بعد اور بالخصوص قیام ریاست مدینہ کے بعد [مختلف اقوام و ملل سے کیے گئے ۔ یہاں پر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت مبارکہ کا اصل مقصد اعلاے کلمة اللہ تھا (۹ [التوبة] : ۳۳ ؛ ۴۸ [الفتح] : ۲۸ ؛ ۶۱ [الصف] : ۹) ، جنگ ایک ناگزیر لائحہ عمل تھی اور صرف ایسے مجبوری کے مواقع پر یہ انتہائی قدم اٹھایا جاتا جب کہ مخالفین کسی طرح راہ راست پر نہ آتے تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پوری طرح کوشش فرماتے کہ کسی طرح جنگ ٹل جائے : چنانچہ اس مقصد کے تحت آپ ؐ خود بھی اور آپ ؐ کے جاں نثار بھی عین میدان جنگ میں مخالفین کے سامنے شرائط صلح پیش کرتے ۔ اگر مخالفین ان میں سے کوئی ایک شرط قبول کر لیتے تو ان سے جنگ فوراً بند کر دی جاتی ۔ لڑائی کے دوران میں بھی اگر کوئی صلح کی درخواست کرتا تو آپ ؐ شرف قبول بخشتے ۔ اسی بنا پر ، صلح اور اس کے معاہدات مزاج نبوی کے عین مطابق ہیں ، کیوں کہ آپ ؐ کا اصلی مشن امن و امان کا قیام اور عدل و انصاف کا اجرا و نفاذ تھا ۔ صلح حدیبیہ میں آپ ؐ نے صحابہ کرام ؓ کی ناگواری کے باوجود بعض ایسی شرائط بھی قبول فرمائیں ، جو بظاہر آپ ؐ کے خلاف جاتی تھیں ۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح امن و امان قائم ہو

marfat.com

Marfat.com

جانتے ۔ فتح خیبر میں بھی آپؐ نے اپنی مفتوح اقوام سے ان کی مرضی کے مطابق معاہدہ فرمایا ۔ اس طرح بے شمار مثالیں سیرت نبوی سے مل سکتی ہیں اور پھر اگر آپؐ کسی سے معاہدہ فرماتے تو اس کا پورا احترام فرماتے ۔ آپؐ کے دشمنوں کو بھی آپؐ سے کبھی بدعہدی اور بے وفائی کی شکایت نہ ہوئی] .

معاہدے کی پابندی پر جس قدر اسلام نے زور دیا ہے اتنا کسی دوسرے مذہب یا مکتب خیال نے نہیں دیا [رکّ بہ معاہدۃ] ۔ معاہدات عہد نبوی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں سے ہر معاہدے کی کامل پابندی کی گئی ۔ سیاسی ، اور عسکری حالات میں تفاوت کے باوجود ان معاہدات کی ہر شق اب بھی اسی طرح قابل عمل اور باعث امن عالم انسانی ہو سکتی ہے ۔

عہد نبوی کے معاہدوں کی مختلف نوعیتیں ہیں اور یہ مختلف نوعیتیں مختلف ادوار سے متعلق ہیں : معاہدات کا پہلا دور غزوۂ بدر سے قبل کے زمانے (۲ھ) کا ہے ۔ اس دور کے معاہدات کے پس منظر میں قریش مکہ کا اعلان جنگ کارفرما ہے ، اس لیے جن قبائل کے ساتھ دوستی ، حلف یا ان کی غیر جانب داری سے مدینہ کی نوزائیدہ مملکت کو فائدہ پہنچ سکتا تھا ان کے ساتھ معاہدات طے پائے ۔ قریش مکہ کی سیاسی اور اقتصادی برتری اور ان کے اعلیٰ معاشرتی مقام کی وجہ سے اس طرح کے معاہدوں کی تعداد زیادہ نہ ہو سکی ، البتہ جو تین معاہدے اس دور میں طے پائے وہ اس دور میں مملکت مدینہ کی کمزور عسکری حالت کے پیش نظر سود مند ثابت ہوئے ۔

دوسرے دور کا واحد مگر اہم معاہدہ صلح حدیبیہ ہے ۔ اس معاہدے کے اثرات دور رس تھے اور سیرت نبوی کا یہ واقعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے ۔ فقہا نے اس معاہدے کی شقوں سے امور خارجہ سے متعلق اہم اصول وضع کیے ہیں ۔

معاہدات عہد نبوی کا تیسرا دور صلح حدیبیہ سے لے کر فتح مکہ تک کا ہے ۔ اب وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جب یہ معاہدے معاہدات سے زیادہ امان ناموں کا مقام رکھتے ہیں ۔ یہ معاہدے یک طرفہ قسم کی ان مراعات پر مبنی ہیں ، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مفتوح قبائل کو ازخود عطا فرماتے تھے ، جیسا کہ وادی خیبر کی شکست خوردہ یہودی آبادی کے معاہدے سے ثابت ہوگا ۔ اگر آپؐ ان مفتوح یہودیوں کو غلام بنا لیتے یا قتل کر دیتے یا ملک بدر کر دیتے تو آپؐ کا یہ عمل اس دور کے رواج اور خود شریعت موسوی کے عین مطابق ہوتا ۔

فتح مکہ کے بعد تقریباً پورا عرب اسلامی مملکت میں شامل ہو چکا تھا ۔ جو قبائل اسلام قبول کرتے تھے ان کے ساتھ کسی طرح کے معاہدے کا سوال ھی پیدا نہیں ہوتا ، البتّہ جو قبائل یا قبائل کے وہ افراد جو خارج از اسلام رہنا چاہتے تھے انہیں جزیہ کے عوض امان عطا کی جاتی تھی ۔ اس دور کے عہد ناموں کو معاہدات کی فہرست میں اس لیے شامل کیا جا رہا ہے کہ ان امان ناموں میں ان مراعات کا ذکر ہے جو حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے ان ذمیوں کو عطا فرمائی تھیں ۔

میثاق مدینہ : ھجرت کے فوراً بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ کی ریاست قائم کی اور قیادت اپنے ہاتھ میں رکھی ۔ مدینہ منورہ میں اس سے قبل باقاعدہ ریاست کا وجود نہ تھا ۔ قبائل آزاد و خود مختار حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے ۔ ھجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا چھوٹا سا گروہ داخل ھوا ، جو منضبط اور منظّم زندگی گزارنے کی استطاعت رکھتا تھا ۔ مکی زندگی کے دوران میں آپؐ نے جو تربیت اپنے اصحابؓ کو دی تھی وہ بیک وقت اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھی ۔ تھوڑے ھی عرصے بعد انصار کرامؓ

marfat.com
Marfat.com

بھی اس قابل ہوگئے کہ ریاستی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکیں - مدینہ منورہ میں ریاست کا قیام باقاعدہ آئین کے ذریعے کیا گیا تھا - یہ آئین میثاق مدینہ [رک بآں] کے نام سے معروف ہے - حالانکہ اس کی حیثیت ایک آئینی حکم نامے (Constitutional Charter) کی سی ہے ، مگر چونکہ آئین ایک طرح کا عہد نامہ ہوتا ہے جو ایک طرف حکومت اور دوسری طرف افراد کے حقوق و فرائض کی حدود متعین کرتا ہے ، اسی بنا پر اس کو معاہدات میں شمار کیا جا سکتا ہے ، چنانچہ عہد نبوی کے عہد ناموں میں اولیت اسی دستاویز کو دی جاتی ہے۔

دوسرا اہم نکتہ جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ دستاویز صرف مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات ہی کا احاطہ نہیں کرتی ، بلکہ اس کی مخاطب پوری مدنی آبادی (مسلم ، مشرک ، یہودی) تھی - اس کا عنوان تھا : یہ دستاویز محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی جانب سے ہے [رک بہ میثاق مدینہ؛ ابن ہشام : سیرۃ ، ص ۳۴۱ ، لائپزگ ۱۸٦۰ء] - اس کے یہ معنی ہوے کہ یہ دستاویز رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عطا فرمائی - اس کے اندر جو فرائض اور حقوق درج تھے آپؐ کی طرف سے آئین کی صورت میں عطا کیے گئے تھے ؛ دوم یہ کہ اس کے دو فریق تھے : پہلا فریق اہل اسلام پر اور دوسرا فریق ہر اس شخص یا ہر اس قبیلے پر مشتمل تھا ، جو آزادانہ طور پر اپنی آزادی فریق اول کے حوالے کرنے کا خواہش مند ہو ؛ سوم یہ کہ یہ آزادی مکمل طور پر فریق اوّل کے رحم و کرم پر چھوڑی جا رہی تھی، اس لیے کہ دوسرا فریق تین باتوں کو قبول کرتا تھا: ایک یہ کہ وہ مسلمانوں کے پیچھے چلے گا ؛ دوم یہ کہ ان کی جماعت کا فرد بن کر رہے گا اور سوم یہ کہ جب قتال کی ضرورت ہوگی تو مسلمانوں کے شانہ بشانہ جنگ میں شریک ہوگا [متن کے لیے رک بہ میثاق مدینہ] - یہاں اس کی چند دفعات ذیل میں درج نکات کی رو سے قابل توجہ ہیں :

فریق اول کا امن غیر منقسم قرار دیا گیا تھا ، یعنی یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کے ایک حصے سے دشمنی ہو اور دوسرے کے ساتھ دوستی - مسلمان ملت واحدہ قرار دیے گئے تھے - (دیکھیے شق ۱۷) - جنگ شروع ہونے کے بعد فریق ثانی علیحدہ صلح کرنے کا مجاز نہ تھا ، یعنی مسلمانوں کے ساتھ شامل ہونے کے بعد فریق ثانی کو دشمن کے ساتھ صلح کرنے کی اجازت نہ تھی (شق نمبر ۲۰ ب) - فریق ثانی قریش مکہ کی جانب سے کسی معاملہ میں دخل نہ دے سکتے تھے (شق ۲۰ ب) - فریق ثانی کے کسی بات میں اختلاف کی صورت میں معاملہ اللہ (قانون الٰہی) اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے پیش کیا جاتا تھا (شق ۲۳) - یہاں بھی حاکمیت اللہ کے قانون اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہاتھ میں رکھی گئی [رک بہ میثاق مدینہ]۔

یہ دفعات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ حکومت کے سربراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے اور حزب اقتدار مسلمانوں پر مشتمل تھی - فریق ثانی کو حکومت میں صرف اسی قدر دخل تھا ، جہاں تک وہ قانون الٰہی پر کاربند رہتے تھے - انہیں جہاد میں شریک ہونے کی اجازت تھی ، مگر مشروط - اس میثاق معاہدے کی یہودیوں نے خلاف ورزی کی اور اس کے نتیجے میں ان سے مملکت مدینہ کی شہریت واپس لے لی گئی [تفاصیل کے لیے رک بہ غزوات نبوی] - باغی گروہوں کو ملک بدر کرنے کا قانونی جواز عہد حاضر کی ریاستیں بھی قبول کرتی ہیں کہ جو شخص یا گروہ ملک کے آئین کی صریحًا خلاف ورزی کرتا ہے وہ اس آئین کو عملی طور پر رد کر رہا ہوتا ہے اور جو فرد یا گروہ کسی ریاست کے آئین کو قبول کرنے

marfat.com

Marfat.com

پر آمادہ نہ ہو وہ اس ریاست کا شہری نہیں رہتا۔

حدود مملکت سے جن یہودی قبائل کو نکالا گیا تھا وہ بغاوت کے مجرم تھے اور یہ ان کی جائز سزا تھی، مگر آپؐ نے از راہ شفقت انہیں ملک سے چلے جانے اور اپنی تمام منقولہ جائداد اور مال ساتھ لے جانے کی بھی اجازت دے دی تھی۔

دوسرا معاہدہ: [غزوۂ ابواء میں، جسے غزوہ وَدّان بھی کہتے ہیں، بنو ضمرہ کے ساتھ صلح ہوگئی تھی۔ شرائط صلح یہ تھیں کہ بنو ضمرہ نہ مسلمانوں سے جنگ کریں گے اور نہ مسلمانوں کے کسی دشمن کی مدد کریں گے اور نہ مسلمانوں کو کبھی دھوکا دیں گے اور عند الضّرورت انہیں مسلمانوں کی امداد اور اعانت کرنی ہوگی (ابن سعد: الطبقات، ۲: ۸، مطبوعۂ بیروت)]۔

معاہدہ سوم: جُمادَی الآخرۃ سنہ ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ذات العُشیرہ تشریف لے گئے، جو کہ ینبع اور مدینے کے درمیان واقع ہے اور بنو مُدلِج سے معاہدہ کرکے مدینے تشریف لائے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اگر کوئی مدینے پر حملہ آور ہوا تو وہ مسلمانوں کو مدد دیں گے اور اگر ان کے علاقے پر کوئی حملہ آور ہوگا تو مسلمان ان کی مدد کریں گے۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے قافلے گزرا کرتے تھے۔

میثاق مدینہ اور غزوہ ودّان کے بعد (معاہدات کے دوسرے دور میں) جو اہم معاہدہ طے پایا وہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ تھا۔ یہ تاریخی معاہدہ وقت اور مندرجات دونوں کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

یکم ذو القعدہ سنہ ۶ھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عمرہ ادا کرنے کے لیے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے؛ تقریبا چودہ یا پندرہ سو صحابہؓ آپؐ کے ساتھ تھے۔ چونکہ آپؐ کا ارادہ جنگ کا نہ تھا، اس لیے کسی قسم کا اسلحہ ساتھ نہیں لیا۔ جب آپؐ غدیر اشطاط پہنچے تو آپؐ کو اطلاع ملی کہ قریش نے آپؐ کی آمد کی خبر سن کر لشکر جمع کر لیا ہے اور آپؐ کے مقابلے کے لیے تل گئے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ خالد بن ولید بطور مقدمۃ الجیش دو سو سواروں کو لے کر مقام غمیم میں پہنچ گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ خبر سن کر وہ راستہ چھوڑ دیا اور دوسرے راستے سے نکل کر مقام حدیبیہ میں پہنچ گئے۔ حدیبیہ میں قیام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک قاصد کے ذریعے اہل مکہ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ ہم صرف بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں، لیکن آپؐ کا قاصد بمشکل جان بچا کر واپس آیا۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت عثمانؓ کو مکہ مکرمہ بھیجا۔ حضرت عثمانؓ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو قریش نے ان کو روک لیا ادھر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمان غنیؓ شہید کر دیے گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب یہ خبر سنی تو آپؐ کو بہت صدمہ ہوا اور یہ فرمایا کہ جب تک میں قریش سے بدلہ نہ لے لوں گا یہاں سے نہ جاؤں گا۔ آپؐ نے درخت کے نیچے کھڑے ہوکر اپنے اصحابؓ سے شہادت پر بیعت لی؛ تمام صحابہؓ اس میں شامل ہوئے۔ اس بیعت کو بیعت رضوان کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے: لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ (۴۸ [الفتح]: ۱۸)، یعنی اللہ ایمان والوں پر (اس وقت) راضی ہوا جب کہ وہ درخت کے نیچے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ مدنی معسکر کے باہر جو لوگ موجود تھے، انہوں نے اس بیعت کا منظر دیکھا تو اس کی اطلاع اہل مکہ تک پہنچا دی۔ قریش مکہ کو جب اس بیعت کا علم ہوا تو انہوں نے صلح کے لیے نامہ و پیام

marfat.com
Marfat.com

کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے سہیل بن عمرو کو یہ ہدایات دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا کہ ہم صلح کا معاہدہ اس شرط پر قبول کرتے ہیں کہ اس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم عمرہ کیے بغیر ہی مدینہ منورہ لوٹ جائیں گے۔ حضور اقدس کا اصل مقصد ہمیشہ تبلیغ و اشاعت اسلام رہا اور تبلیغ دین صرف صلح و امن اور دوستی کے ماحول ہی میں ہو سکتی ہے؛ اس لیے آپؐ نے صلح نامہ قبول فرما لیا۔ [آپؐ اپنے عظیم سیاسی تدبّر کی روشنی میں یہ دیکھ رہے تھے کہ اس صلح کے عواقب و نتائج اسلام اور اہل اسلام کے حق میں کس قدر مفید ثابت ہوں گے اور اس دورِ صلح میں کس طرح اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا سازگار ماحول میسر آ سکے گا۔ اسی بنا پر اگرچہ] ان کے سفارتی وفد کے سردار کا رویہ غیر مصالحانہ تھا، مگر آپؐ نے انتہائی تدبر اور تحمل سے کام لیا اور اس طرح آپؐ کو یہ معاہدہ کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ جب صلح نامے کی شرائط طے پا گئیں تو حضرت علیؓ نے لکھنا شروع کیا اور آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے کیا۔ اس پر قریشی نمائندے سہیل نے اعتراض کیا اور کہا: صرف باسمک اللّٰھم لکھو؛ چنانچہ حضرت علیؓ نے آپؐ کے حکم سے باسمک اللّٰھم لکھا۔ اس کے بعد سہیل بن عمرو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رسول اللہ لکھنے پر اعتراض کیا۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا: لکھو یہ ہے جس پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو کے ساتھ اتفاق کیا۔ شرائط صلح یہ تھیں:

(۱) دس سال کے لیے باہمی جنگ و جدال کو موقوف کر دیا جائے؛ اس دوران میں کوئی کسی سے تعرّض نہ کرے، جو مدنی مکہ کی طرف آئے جائے یا جو مکی مدینہ منورہ کی طرف کسی بھی سلسلے میں سفر کرے اس کا جان و مال محفوظ تصور کیا جائے گا؛

(۲) اگر کوئی مکی نوجوان اپنے ولی اور آقا کی مرضی کے خلاف مدینہ ہجرت کر جائے تو وہ واپس کیا جائے، اگرچہ وہ مسلمان ہو کر جائے؛ البتہ اگر کوئی مسلمان مدینہ چھوڑ کر مکہ مکرمہ چلا جائے تو قریش مکہ اسے واپس کرنے کے مکلّف نہ ہوں گے؛ (۳) ایک دوسرے کے ساتھ کسی طرح کی عداوت نہیں رکھی جائے گی اور خفیہ طور پر کوئی بدعہدی نہ ہوگی؛ (۴) جو کوئی (قبیلہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے اس عہد نامے میں شرکت کرنا چاہے وہ کر سکے گا اور جو قبیلہ چاہے قریش کی طرف سے اس معاہدے میں شمولیت اختیار کر سکتا ہے۔ ان حلیفوں کے ساتھ وہی سلوک اور برتاؤ کیا جائے گا جو اس عہد نامے کی رو سے فریقین کا حق ہے (جب یہ شرائط ضبط تحریر میں آ گئیں تو بنو خزاعہ نے اہل اسلام کے ساتھ اور بنو بکر نے قریش مکہ کے ساتھ معاہدے میں شرکت کرنے کا اعلان کیا)؛ (۵) اس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ان کے ساتھی عمرہ کیے بغیر واپس لوٹ جائیں گے اور اگلے سال عمرہ کے لیے آئیں گے اور مکہ مکرمہ میں تین رات قیام کر سکیں گے؛ اس دوران میں اہل مکہ شہر خالی کر جائیں گے۔ اس موقع پر مسلمانوں کے ساتھ سوا ے تلواروں کے کوئی دوسرا ہتیار نہ ہوگا [دیکھیے الزرقانی: شرح المواہب اللدنیہ، ۲: ۱۹۳ تا ۲۰۸، مطبوعہ قاہرہ؛ الوثائق السیاسیہ، شمارہ ۱۱ (نیز رکّ بہ حدیبیہ)]۔

بادی النظر میں یہ شرائط مسلمانوں کے لیے سخت تھیں، [مگر سیاسی اور عسکری نقطۂ نظر سے یہ تمام شرائط اہل اسلام کے فائدے میں تھیں]۔ مسلمانوں کو اس سال عمرہ کی اجازت نہ ملی تھی، جس کا ازالہ دوسرے سال تین رات کے قیام اور شہر کو مسلمانوں کی تحویل میں دیے جانے سے ہوا۔ جس دفعہ میں کسی مسلمان کے اہل مکہ کو واپس

marfat.com
Marfat.com

دینے کا ذکر تھا - [یہ دفعہ ابو بصیرؓ اور حضرت جندلؓ بن سہیل کی وجہ سے قریش مکہ کے لیے تلخ ثابت ہوئی ، چنانچہ بعد ازاں انھوں نے خود کہہ کر] اس شرط کو عہد نامہ سے خارج کروایا؛ جو مسلمان اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو کر مکے چلا آتا اسے واپس لینے کا کوئی فائدہ نہ تھا .

صلح حدیبیہ دراصل تبلیغ اور وسعت اسلام کا دیباچہ تھی، اس لیے ارشاد باری تعالی ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (۴۸: ۱)، یعنی ہم نے تیرے لیے فتح مبین کا فیصلہ کر دیا ہے.

انجام : اہل مکہ نے ۸ھ میں حلیفوں کو معاہدے میں شامل کرنے والی شرط کی خلاف ورزی کی [اور بنو بکر کی حمایت میں بنو خزاعہ کا، جو مسلمانوں کے حلیف تھے ، عین صحن کعبہ میں قتل عام کیا] ، مگر جب انھیں [شرائط صلح حدیبیہ کے مطابق] خون بہا ادا کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ جہاں تک ان کا تعلق ہے وہ صلح حدیبیہ کو ختم کر چکے ہیں - اس کے نتیجے میں سنہ ۸ میں مکہ مکرمہ پر حملہ کیا گیا [اور یوں فتح مکہ پر اہل اسلام اور قریش مکہ کی طویل کشمکش اختتام پذیر ہوگئی].

فتح خیبر کا معاہدہ : [مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کو ایک طرف سے یہود خیبر اور دوسری طرف سے قریش مکہ ایسے خطرناک دشمنوں سے پالا پڑا تھا - اسلام دشمنی میں یہود خیبر قریش مکہ سے بھی بڑھ گئے تھے - ایک تو اس بنا پر کہ آپؐ کی آمد سے عرب کے یہودیوں کی علمی و معاشرتی برتری ختم ہوگئی تھی اور دوسرے اس لیے کہ یثرب کے دو عظیم یہودی قبیلے بنو قینقاع اور بنو نضیر مدینہ منورہ سے خارج کیے جانے کے بعد خیبر میں جا کر آباد ہوگئے تھے - اور وہاں یہ لوگ پورے عرب میں اہل اسلام کے خلاف جنگ اور نفرت کی آگ بھڑکانے میں مصروف تھے - اس طرح وہی غزوۂ خندق کا باعث ہوئے تھے ، جس میں تقریبا تمام قبائل یا ان کے نمائندے شامل ہوئے تھے] اور ان کی شرارتیں ختم ہونے کا کوئی امکان نہ تھا - وہ نجد کے قبیلے بنو غطفان کو بھی ابھارتے رہتے تھے ، جنھوں نے اپنے ایک ہزار ہتیار بند جوان خیبر کے قلعوں کی حفاظت کے لیے روانہ کیے تھے اور دونوں کے درمیان معاہدہ طے پا چکا تھا - حدیبیہ سے واپسی کے دوران میں اللہ تعالی نے ایک اور بڑی فتح کی خوشخبری بھی سنائی تھی - آپؐ نے اس خوشخبری سے یہی نتیجہ نکالا کہ یہ فتح خیبر کی بشارت ہے - آپؐ کچھ دنوں کی تیاری کے بعد اپنے انھیں جاں نثاروں سمیت خیبر پر حملہ آور ہوئے اور تقریبا دو ماہ بعد خیبر کے بارہ قلعے مکمل طور پر مفتوح ہوگئے - اہل خیبر نے آپؐ سے معاہدہ صلح کی درخواست کی ، جو قبول کر لی گئی ، چنانچہ حسب ذیل شرائط پر صلح نامہ ترتیب پایا :

(الف) یہود کو خیبر (یعنی وادی خیبر) میں رہنے کی اجازت ہوگی ؛ (ب) جب کبھی مدینہ منورہ کی حکومت چاہے گی انھیں خیبر خالی کرنا پڑے گا ؛ (چنانچہ حضرت عمرؓ کے عہد میں انھیں خیبر خالی کرنے کا حکم دیا گیا) ؛ (ج) خیبر میں قیام کے دوران میں انھیں قلعوں میں آباد رہنے کی اجازت نہ ہوگی ، (اس لیے انھوں نے قلعوں سے باہر نئی بستیاں آباد کر لیں) ؛ (د) وہ خیبر کی زمین پر بطور مزارع کے قابض رہ سکیں گے اور مروجہ طریقے پر فصلوں کی بٹائی مدینہ منورہ کے نمائندے کے حوالے کرتے رہیں گے (عبداللہؓ بن رواحہ سب سے پہلے صحابی تھے جو اس کام پر متعین ہوئے) ؛ (ہ) وہ جنگ کے ہتیار اور اسلحہ اسلامی لشکر کے حوالے کر دیں گے (اس شق پر فوراً عمل کیا گیا) - اس معاہدے کے بعد بھی

marfat.com
Marfat.com

اگر فریق ثانی بھی کسی قسم کی کوتاہی کرتا تو آپ[ؐ] اسے نرمی سے سمجھاتے ، لیکن وہ اگر کسی طرح باز نہ آتا ، تو مجبور ہو کر آپ[ؐ] اس پر لشکر کشی کرتے۔

اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان معاہدات کو اچھے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ معاہدات نبوی کو آپ[ؐ] کی جنگی حکمت عملی کے ساتھ گہرا رابطہ تھا ۔ آپ[ؐ] کے مقابلے میں اگر دو جماعتیں برسر پیکار ہوتیں تو آپ[ؐ] ان میں سے ایک فریق سے قابل قبول شرائط پر صلح کر لیتے ۔ آپ[ؐ] نے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہی وہاں پر آباد مختلف اقوام سے جو معاہدہ کیا ، اس نے ان فریقوں کو آپ[ؐ] کے مخالفین سے الگ کر دیا ۔ شاہراہ شام پر آباد مختلف قبائل بنو ضمرہ ، بنو جہینہ ، وغیرہ سے معاہدات بھی آپ[ؐ] کی عسکری حکمت عملی کا نتیجہ ہیں ، جس کے نتیجے میں آپ[ؐ] قریش مکہ کی اقتصادی شاہراہ کی ناکہ بندی کرنے میں کامیاب ہوگئے [نیز رک بہ غزوات] ۔ غرض آپ[ؐ] کے تمام معاہدات واضح اور منظم طور پر اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں جس کا مقصد دنیا میں عدل و انصاف اور امن و امان کا قیام و رواج کرنا تھا] ۔

مآخذ : [(۱) محمد حمید اللہ : مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ ، قاہرہ ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء ؛ (۲) ابن ہشام : السیرۃ النبویۃ، طبع مصطفی السقا وغیرہ ، قاہرہ ۱۳۰۵ھ/۱۹۳۶ء (نیز مآخذ مقالۂ غزوات)]۔

(گلزار احمد [و ادارہ]

⊗ **غزوات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم :** [غزوات جمع غزوۃ (از مادہ غ - ز - و = غزا الشیٔ غزوا ، یعنی کسی چیز کی تلاش کرنا ، ارادہ کرنا ؛ کہا جاتا ہے : غزوتُ فلانا ، یعنی میں نے فلاں کو ملنے کا قصد کیا ؛ اسی مادے سے غزوۃ بمعنی وہ چیز جو طلب کی جائے ، ہے غزا غزوا و غزاوۃ و غزوانًا القوم ، یعنی کسی قوم کی سکونت کی طرف لڑائی یا انتباہ کے ارادے سے بڑھنا ؛ غازی (ج: غُزاۃ و غُزّی و غُزّاء مؤنث : غازیہ، ج: غوازٍ و غازیات) بمعنی جنگجو (ابن منظور : لسان العرب ؛ الزبیدی : تاج العروس ، بذیل مادہ) ۔ ابن منظور نے بہت سی مثالیں دی ہیں ، جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اس مادے کا استعمال جنگ کے معنوں میں عام تھا ؛ قرآن کریم میں عام طور پر لڑائی کے موقع پر جہاد اور قتال کے لیے اس کا استعمال ہوا ہے ، تاہم ایک جگہ اس مادے سے غُزّی (جمع غازی) کا بھی استعمال ہوا ہے (معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم ، بذیل مادہ) ؛ البتہ کتب سیرت میں عہد نبوی کی جنگوں کے لیے دو الفاظ ملتے ہیں : (۱) جس جنگ میں آپ[ؐ] نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی ہو اسے غزوہ کہا جاتا ہے ؛ (۲) جس جنگ میں آپ[ؐ] نے شرکت نہ فرمائی ہو اور اپنی طرف سے کسی کو لشکر کی قیادت پر مامور کرکے روانہ فرما دیا ہو اسے سَرِیَّہ (ج سرایا ، از مادہ سَرَی سریً و سَرْیَۃً و سُرْیَۃً و سَرایۃً و سَرَیانًا و مَسْرًی ، بمعنی رات کو چلنا) کہا جاتا ہے ؛ سریہ ایک چھوٹا فوجی دستہ ، اس لیے کہ اس کا چلنا مخفی ہوتا ہے (لسان العرب ، بذیل مادہ) اس کو "بَعْث" بھی کہتے ہیں (الزرقانی : شرح المواہب اللّدنیۃ، ۱ : ۳۸۷ ، قاہرہ ، ۱۳۲۵ھ) ۔ غزوات و سرایا جہاد کا حصہ ہیں (رک بہ جہاد ؛ انفال ؛ نیز ابو الاعلی مودودی : الجہاد فی الاسلام)] ۔ چونکہ یہ تمام مہمیں انہی کوششوں کا حصہ تھیں ، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم [کو اپنے اور اہل اسلام اور مملکت مدینہ کے دفاع اور اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے کرنا پڑیں] ، اس لیے غزوات و سرایا [اور تبلیغ و دعوت کی کوششوں] کا جب تک بہم مطالعہ نہ کیا جائے اس وقت تک صحیح صورت حال سامنے نہیں آتی۔

غزوات نبوی کو چند واضح ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلا دور مکّی اعلان جنگ سے شروع

marfat.com
Marfat.com

ہوکر بدر کی لڑائی پر ختم ہو جاتا ہے؛ دوسرا دور غزوۂ احد تک کا ہے؛ تیسرا دور احد کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور غزوۂ خندق تک مشتمل ہے؛ چوتھا دور صلح حدیبیہ سے لےکر غزوۂ خیبر کے اختتام تک ہے؛ چھٹا دور خیبر سے لےکر فتح مکہ تک کے عرصے کو محیط ہے اور ساتواں دور فتح مکہ کے بعد غزوات اور سرایا پر مشتمل ہے۔ ان میں اکثر ادوار کے حالات اور ان کے پس منظر میں معتدبہ فرق ہے، اس لیے حضورؐ کو ہر دور میں مختلف قسم کے اقدامات کرنے پڑے اور یہی وجہ ہے کہ ہر دور کی تدبیرات جنگ (Strategy of war)، جو آپؐ نے اختیار کیں ان میں بھی فرق ہے۔ ہر اعلٰی کمان دار اپنے گرد و پیش کے حالات کے مطابق اپنی تدبیرات اور طریق (tactics) کو تشکیل دیتا ہے۔ حضورؐ نے جو اصول جنگ (Principles of War) اور جنگی تدبیرات و طریق استعمال کیے ان کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

ابتدا: جب اہل مکہ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، مدینہ منورہ پہنچنے میں کامیاب ہو چکے ہیں، تو انہوں نے باہمی مشورے سے عبداللہ بن اُبَی کو خط لکھا [جس میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مدینہ منورہ میں پناہ دینے پر اظہار عتاب کیا اور آپؐ کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا اور بصورت دیگر سخت اقدامات کی دھمکی دی (ابو داؤد: السنن، ۳: ۴۰۴، باب خبر النضیر؛ الوثائق السیاسیہ، شمارہ ۳/ب)]؛ یہ گویا آپؐ کے خلاف اعلان جنگ تھا۔

[مشرکین مکہ کے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف بغض و عداوت کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہجرت مدینہ کے کچھ عرصے بعد حضرت سعدؓ بن معاذ کا مکہ مکرمہ کے پاس سے گزر ہوا، سوچا عمرہ کرتا چلوں؛ ان کی صفوان بن امیہ سے دور جاہلی میں گاڑی چھنتی تھی، وہ ان کے پاس جا کے ٹھیرے اور ان کی معیت میں نصف النّہار کے قریب طواف کرنے کے لیے نکلے؛ راستے میں ابو جہل [رَکْ بآں] ملا، اس نے پوچھا صفوان یہ تمہارے ہمراہ کون ہے؟ اس نے کہا: سعدؓ ہیں؛ ابو جہل بولا: کیا میں ان کو حالت امن میں خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوے دیکھ رہا ہوں؟ حالانکہ انہوں نے صابئین کو پناہ دی اور ہمارے خلاف ان کی مدد کی ہے؛ پھر کہا: بخدا اگر صفوان تیرے ساتھ نہ ہوتا تو تو اپنے گھر کبھی واپس نہ لوٹ سکتا (البخاری، ۳: ۵۳، کتاب المغازی، باب ۲)۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے مدینہ منورہ کے آس پاس بسنے والے قبائل میں اہل اسلام کے خلاف دشمنی کی آگ اس حد تک بھڑکا دی تھی کہ مدینہ منورہ میں کئی سال تک راتوں کو پہرہ دیا جاتا تھا، صحابہ کرامؓ ہتھیار پہن کر سوتے، ہر وقت کسی ناگہانی حملے کا دھڑکا لگا رہتا۔ البخاری (۲: ۲۲۰ کتاب الجہاد، باب ۷۰) نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے حوالے سے اسی زمانے کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک رات آپؐ حملے کے خطرے کے پیش نظر دیر تک جاگتے رہے، آپؐ نے آرام کی ضرورت کے پیش نظر فرمایا: کاش کوئی صالح شخص رات کو پہرہ دے (تاکہ میں آرام کر سکوں)! اسی وقت باہر سے ہتھیاروں کے کھٹکنے کی آواز سنائی دی؛ پوچھا: کون ہے؟ جواب ملا: سعدؓ بن ابی وقاص رات کے پہرہ دینے کے لیے حاضر ہے؛ تب آپؐ سو سکے۔ قبائل عرب کے دلوں میں پیغمبر اسلامؐ کے خلاف اٹھائے جانے والے اسی طوفان کا ہی اثر تھا کہ ایک مرتبہ جب آپؐ ایک غزوے سے واپسی کے موقع پر ایک درخت کے نیچے استراحت فرما رہے تھے تو ایک اعرابی نے، جو وہیں تاک میں تھا، اچک کر آپؐ کی تلوار اٹھا لی اور اسے لہراتے ہوے آپؐ سے کہنے لگا: تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ آپؐ

marfat.com
Marfat.com

نے فرمایا : اللہ ۔ یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی ۔ آپ ؐ نے اسے معاف کر دیا (کتاب مذکور، ۲۲۶ ، ۸۳/۵۶).

ان حالات میں آپ ؐ اگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تو اس کا نتیجہ مدینے کی تباہی کی صورت میں برآمد ہو سکتا تھا ۔ آپ ؐ نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوے ایسی تدابیر اختیار فرمائیں جس سے مدینے کا دفاع مضبوط ہوا اور مسلمانوں میں مقاومت کی لہر پیدا ہوئی] ۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دفاع مدینہ کے ضمن میں دو طرح کے اقدامات فرمائے : اولاً، داخلی سطح پر آپ ؐ نے مدینہ منورہ کی ریاست کا باقاعدہ طور پر انتظام و انصرام کیا اور اس امر کی توثیق میثاق مدینہ [رک باں] کے ذریعے کی گئی ۔ میثاق مدینہ کی حیثیت بنیادی قانون (Fundamental Law) یا ملکی آئین (Constitution of the State) کی سی ہے اور اس کے دفاعی اندراجات نہایت واضح اور غیر مبہم ہیں ۔ چونکہ امور دفاع اور امور خارجہ اس آئین کی رو سے حضور اکرم ؐ کے ہاتھ میں تھے، اس لیے خارجی سطح پر حضور ؐ نے ایسے سفر اختیار کیے جن کے ذریعے دو طرح کے فائدے حاصل ہوے : ایک تو یہ کہ ریاست مدینہ کی حدود کا تعین ہوا اور دوسرے ان سفروں کے دوران میں آپ ؐ نے مختلف قبائل کے ساتھ معاہدات کیے ؛ بعض نے ریاست مدینہ کے ساتھ شمولیت اختیار کی اور بعض نے دفاعی سمجھوتے کیے ۔ ایک قبیلے نے جنگ کی صورت میں غیر جانب دار رہنے کی شرط پر معاہدہ کیا [ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۵ تا ۱۰] ۔ ممکن ہے بین الاقوامی سطح پر جنگ کے دوران میں غیر جانب داری کا یہ پہلا معاہدہ ہو ۔ [اس کے علاوہ آپ ؐ نے اس ہلچل کے ذریعے قریش مکہ کی تجارتی شاہراہ کے لیے جو بحیرۂ احمر کے ساحل کے قریب سے گزرتی تھی خطرہ پیدا کر دیا].

اسی طرح کے ایک سفر پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پہلی بار تشریف لے گئے تو اس سفر کو غزوہ وَدّان اور غزوہ ابواء کا نام دیا گیا [یہ غزوہ ہجرت کے بارھویں مہینے ، صفر ۲ھ ، میں پیش آیا] ۔ اس سفر کے دوران میں حضور ؐ نے اپنے صحابہ رض سمیت ان دونوں مقامات پر [جن کے مابین چھے میلوں کا فاصلہ ہے] قیام فرمایا تھا ۔ یہ مقامات بحیرۂ احمر کے ساحل کے قریب واقع ہیں اور یہیں سے شام کو جانے والی شاہراہ گزرتی ہے ۔ اس علاقے پر بنو ضمرہ کا تسلط تھا [آپ ؐ نے بنو ضمرہ کے رئیس مَخْشِیّ بن عمرو الضمری کے ساتھ غیر جانب دار رہنے کا معاہدہ فرمایا ۔ پندرہ دنوں کے بعد آپ ؐ مدینہ منورہ واپس آئے (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۸)] ۔ اس غزوے کے دوران میں حضرت حمزہ رض بن عبدالمطلب کو جیش مدینہ کا سفید علم اٹھانے پر مامور کیا گیا تھا ، جب کہ سعد رض بن عبادہ کو نائب مقرر کرکے مدینہ منورہ میں چھوڑا گیا تھا ۔ حضور ؐ نے [کسی سفر میں، جس کی وضاحت نہیں ملتی] بنو جہینہ کے ساتھ بھی معاہدہ کیا ، جس کی رو سے اس قبیلے نے مکی ، مدنی جنگ کے دوران میں غیر جانب دار رہنے کا اقرار کیا ۔ اس غزوہ کے دوران میں کسی دشمن سے مقابلہ نہیں ہوا اور نہ ہی وہاں کوئی لشکر یا قافلہ موجود تھا [آپ ؐ کا سفر تبلیغی سفارتی تھا].

مہاجرین مدینہ منورہ اور اس کے گرد و نواح سے اچھی طرح واقف نہ تھے ۔ مکہ کی جانب سے اعلان جنگ ہو چکا تھا ، مگر آپ ؐ کو ابھی فوج کی تربیت کرنا تھی ۔ [ان سفروں سے مہاجرین کی تربیت کا پہلو بھی مدنظر تھا] اور یہ تربیت اس کے علاوہ تھی جو آپ ؐ مدینہ منورہ میں جاری رکھتے تھے ۔ اسی لیے ہم ان سفروں کو ، اور باتوں کے علاوہ تربیتی سفر بھی قرار دے سکتے ہیں۔

سریۂ عبیدہ بن الحارث : جب اہل مکہ نے سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے شاہراہ شام پر

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

قابض قبائل کے ساتھ دوستانہ معاھدے کر لیے ھیں تو انھیں سخت تشویش ھوئی۔ قریش مکہ نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ دو سو سواروں پر مشتمل ایک جیش [عِکرمہ بن ابی جہل یا ابو سفیان یا مِکْرَز بن حفص کی زیر قیادت] اس علاقے کی گشت پر روانہ کیا تا کہ یہ لشکر عام گشت (Flag March) کے ذریعے قریش مکہ کی برتری کو پھر سے قائم کرے ؛ یا شاید مقصد یہ ھو کہ یہ لشکر قریش کے اعلان جنگ کے مطابق ، اھل مدینہ کو مجبور کر دے کہ حضور کو (معاذ اللہ) قتل کر دیں یا مدینہ منورہ سے نکال دیں۔جب اس کی خبر آنحضرت کو پہنچی تو آپ نے فوراً حضرت عبیدۃ ابن الحارث کے زیر کمان ساٹھ [یا اسی] مہاجر صحابہ پر مشتمل ایک دستہ روانہ فرمایا تاکہ وہ قریش کے لشکر کو ریاست مدینہ کی حدود کے اندر داخل نہ ھونے دے۔ ثَنِیَّۃ المَرَّہ کے دامن میں، حجاز کے [ایک چشمہ اَحْیاء] کے قریب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ھوا۔ لڑائی تو نہ ھوئی البتہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے اس موقع پر اسلامی لشکر کی جانب سے لشکر قریش پر تیر اندازی کی ۔ دو با اثر مکی [مِقداد بن عمرو اور عُتبہ بن غزوان بن جابر] اپنے لشکر سے نکل کر اسلامی لشکر میں آ ملے ۔ [در حقیقت یہ دونوں مسلمان ھوچکے تھے ،لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۷ ؛ ابن ھشام : سیرۃ ، ۲ : ۲۴۲)] ۔ اھل اسلام نے واپسی کے دوران میں فوجی ترتیب (Formation) قائم رکھی ۔ اس سے یہی ثابت ھوتا ھے کہ مقابلے میں ایک قافلہ نہ تھا بلکہ باقاعدہ لشکر تھا، ورنہ واپسی کے دوران میں فوجی ترتیب قائم نہ رکھی جاتی۔ یہی نہیں ، بلکہ اگر قافلہ ھوتا تو اسلامی دستہ اس کو بچ کر نہ جانے دیتا ۔ اس مہم کو سریۂ رابغ [رابغ جُحفہ سے دس میل پر واقع مقام کا نام بھی دیا گیا ھے۔[الواقدی اور ابن سعد نے ھجرت کے آٹھ ماہ بعد ۱ھ کا واقع بتایا ھے (دیکھیے ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۷ ؛ کتاب المغازی ، ۱ : ۲)] ۔ بہرحال اس طرح بغیر مزاحمت کے دونوں لشکر اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ گئے۔

سریۂ سعد بن ابی وقاص : ھجرت کے تقریباً آٹھ ماہ بعد حضرت سعد بن ابی وقّاص کو بیس اکیس پیادہ مجاھدوں کے ساتھ الخرّار (ایک چشمہ یا وادی ، جُحفہ سے قریب) کی طرف روانہ کیا۔ یہ جیش مقام الخرار پر پہنچا ، مگر کسی مخالف جیش سے تصادم نہ ھوا اور بخیریت واپسی ھوگئی (الزرقانی : شرح المواھب ، ۱ : ۳۹۲ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۷)].

سریہ حمزہ بن عبدالمطلب : قریش مکہ اپنی اس ناکامی پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے ۔ انھوں نے ایک اور لشکر تیار کیا اور اس کی کمان ابو جہل نے اپنے ھاتھ میں لی ۔ اس لشکر کی تعداد تین سو تھی۔ آپ نے اس مرتبہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے زیر کمان تیس صحابہ پر مشتمل لشکر روانہ کیا [ابن سعد، ۲ : ۹]۔ ان لشکروں کا ساحل سمندر پر آمنا سامنا ھوا ۔ دونوں لشکر لڑائی کے لیے صف بستہ ھو چکے تھے ۔ ابھی لڑائی شروع نہیں ھوئی تھی کہ [مَجدی بن عمرو الجُھنی ، جو دونوں کا حلیف تھا] پہنچ گیا اور اس نے دونوں لشکروں کو اپنے معاھدے کی رو سے مجبور کیا کہ لڑائی سے باز رھیں ۔ ابو جہل نے اپنے ان اشعار میں اس بات کا افسوس کیا ھے [جو اس کی طرف منسوب ھیں (دیکھیے ابن ھشام : سیرۃ ، ۲ : ۲۴۷)].

وہ اپنے اشعار [عدد ۱۴ ، ۱۵] میں امید ظاھر کرتا ھے کہ آئندہ ضرور مسلمانوں پر یلغار کر سکے گا۔ خلاصہ کلام یہ ھے کہ سریۂ رابغ اور سریہ [سِیف البحر کے متعلق جن روایات میں بتایا گیا ھے کہ یہ دونوں مہمیں قافلہ لوٹنے کی غرض سے روانہ کی گئی تھیں وہ ناقابل التفات ھیں ؛ کیونکہ مدینہ ابھی کسی

marfat.com
Marfat.com

جارحانہ کارروائی کے اہل نہ تھا ۔ یہ وہ دور ہے جس کے متعلق قرآن حکیم کی شہادت یہ ہے کہ : تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک نہ لیں [۹ [الانفال] : ۲۶] ۔ [ایسی حالت میں اپنے سے طاقتور دشمن کے قافلے لوٹنے کے لیے ہر دوسرے مہینے نکل کھڑا ہونا قرین قیاس نہیں ؛ جن روایات کا سہارا لیا جاتا ہے ان کو حالات کے سیاق و سباق کی روشنی میں پڑھنا چاہیے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا]۔

غزوۂ بُواط : قریش کی جانب سے دو حملوں کے بعد ، توازن قائم رکھنے کے لیے ، حضور اکرمؐ کا دوبارہ ان کے علاقوں میں تشریف لے جانا ضروری تھا ۔ اس کے علاوہ جن قبائل کے ساتھ پہلے غزوات کے دوران میں معاہدے کیے جا چکے تھے ان کے ساتھ سربراہ مملکت کی سطح پر تعلقات قائم رکھنے اور ان کی ہمت بڑھانے کے لیے بھی یہ ضروری تھا ؛ اس لیے جونہیں حضرت حمزہؓ کا دستہ، یا [آج کی فوجی زبان میں] لڑاکا گشت (Fighting Patrol) ، مدینہ منورہ واپس پہنچا ، آپؐ نے دوسری تبلیغی اور سفارتی مہم تیار کی اور [ربیع الاول ۲ھ میں] دوبارہ ساحلی علاقے کا رخ کیا ۔ اس بار لشکر اسلام کی تعداد [دو سو افراد پر مشتمل تھی (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۹)] ۔ اس مہم میں آپؐ نے دیگر مقامات کے علاوہ رَضوٰی (کوہ) کی جانب سے جبال جُہینہ کے قریب مقام بواط پر قیام فرمایا اور علاقے کی نگرانی کی ۔ اس دوران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی والدہ ماجدہ کے مزار پر بھی تشریف لے گئے ۔ اس غزوے کے دوران میں آپؐ کا سفید علم حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اٹھائے ہوئے تھے جب کہ مدینہ منورہ میں السائبؓ بن عثمان [بن مظعون] کو نائب کے طور پر چھوڑا گیا تھا ۔ اس غزوے میں بھی دشمن سے سامنا نہ ہوا [الزرقانی : شرح المواہب اللدنیہ، ۱ : ۳۹۳] ۔

غزوۂ ذی الُعشَیرہ : غزوۂ بواط سے واپسی کے دو ماہ بعد] یعنی [جمادی الاُولٰی یا جمادی الآخرہ] ۲ھ میں آپؐ ایک اور سفارتی سفر پر روانہ ہوئے ؛ اس بار بھی آپؐ وادی ینبع میں ذوالعشیرہ اور دوسرے مقامات پر ٹھیرے اور شام کی اس تجارتی شاہراہ پر [بنو مُدلج اور ان کے حلفا بنو ضَمرہ (ابن ہشام : السیرۃ النبویۃ ، ۲ : ۲۴۸) سے معاہدۂ صلح کیا ۔ غالباً یہ معاہدہ بھی ریاست مدینہ میں شمولیت کا معاہدہ تھا ۔ آپؐ کے ساتھ ڈیڑھ سو یا دو سو صحابہؓ شریک سفر تھے ؛ لِواء حضرت حمزہؓ کے پاس تھا ؛ (حوالۂ مذکور ؛ الزرقانی : شرح المواہب ، ۱ : ۳۹۰)]۔

غزوہ سَفوان یا بدرالاُولٰی : اس طرح اسلام اور اہل اسلام کی طاقت روز افزوں رہی ، جو مشرکین مکّہ کے لیے ناقابل برداشت تھی؛ چنانچہ چھاپہ مارنے کے لیے قریش مکّہ نے چھوٹی سی چھاپہ مار جماعت کُرز بن جابر الفہری [جو بعد میں مسلمان ہوئے اور ۸ھ میں فتح مکّہ کے موقع پر شہید ہوئے (ابن حجر: الاصابۃ)] کی کمان میں روانہ کی ۔ یہ جماعت رات کی تاریکی میں مدینہ منورہ کی چراگاہ پر حملہ آور ہوئی اور صبح ہونے سے قبل چند اونٹ ہانک کر تیز رفتاری سے واپس لوٹ گئی ۔ حضورؐ غزوۂ عشیرہ سے چند روز قبل لوٹے تھے ۔ [ممکن ہے وہ کسی بڑے ارادے سے آیا ہو ، مگر مدینہ منورہ آنے کے بعد] اس نے اس شب خون کو ہی کافی سمجھا۔دوسری صبح حضورؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ نے جلدی سے چھوٹا سا لشکر تیار کیا اور کُرز کا تعاقب کرنے کے لیے نکلے ، مگر وہ غیر معروف راستوں سے ہوتا ہوا نکل چکا تھا ۔ اس مہم میں آپؐ سفوان کے مقام تک تشریف لے گئے ؛ یہ مقام بدر کے قریب ہے ، اسی لیے اس غزوے کو غزوۂ سفوان اور غزوۂ بدرالاولی کہتے ہیں ۔ علمبرداری کے فرائض حضرت علیؓ بن ابی طالب کو تفویض

marfat.com
Marfat.com

کیے گئے تھے - مدینہ منورہ میں زیدؓ بن حارثہ الکلبی کو نائب کے طور پر چھوڑا گیا تھا [ابن سعد، ۲ : ۹]۔

سریہ عبداللہ بن جحش : [رجب ۲ھ میں] حضور اقدس صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو آٹھ [یا بارہ افراد] کی کمان دے کر ایک خفیہ مہم پر روانہ فرمایا اور حکم دیا کہ ملفوف اقدامی احکامات (operational orders) کو دو روز کی مسافت کے بعد کھولا جائے۔ انھوں نے ایسا ھی کیا۔ اس میں تحریر تھا کہ مکہ اور طائف کے درمیان [مقام نخلہ میں ٹھیر] کر قریش مکہ کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں کو زیر نظر رکھا جائے اور چند روز کے بعد واپس آ کر روداد پیش کی جائے۔ اتفاق کی بات ھے کہ جب حضرت عبداللہؓ بن جحش نخلہ کے مقام پر پہنچے تو پاس ھی قریش مکہ کا ایک چھوٹا سا تجارتی قافلہ پڑاؤ ڈالے ھوے تھا - حضرت عبداللہؓ نے [آپؐ کی مرضی کے بغیر] اس قافلے پر حملہ کرکے ان کے محافظوں میں سے ایک محافظ [یعنی عمرو بن الحضرمی] کو قتل کر دیا اور دو افراد [یعنی عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان] کو قیدی بنا لیا اور قافلہ لوٹ لیا - ایک محافظ بھاگنے میں کامیاب ھوگیا - چونکہ یہ حملہ حضورؐ کے حکم کے خلاف کیا گیا تھا ؛ اس لیے آپؐ نے مقتول کا خون بہا ادا کیا ؛ [البتہ خمس وصول کرکے مال غنیمت تقسیم کر دیا (ابن ھشام : سیرۃ، ۲ : ۲۵۲ تا ۲۵۳ ؛ الزرقانی : شرح المواھب، ۱ : ۳۹۷ ببعد)] - اس طرح غزوۂ بدر کے لیے اسباب پیدا ھوگئے ، اور غزوات کا پہلا دور اختتام کو پہنچ گیا۔

غزوۂ بدر : اس اولین ، مگر اھم ترین دور پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ھوگا کہ اس دور میں چند عوامل تھے جو حالات کو بتدریج بڑی تیزی کے ساتھ کسی اھم نتیجے کی طرف لے جا رہے تھے۔ اعلان جنگ کے بعد حضورؐ کے لیے داخلی اور خارجی امور کو اطمینان بخش طور سے پائدار بنیادوں پر استوار کرنا ضروری تھا۔ اس اقدام سے قریش کے موقف میں کمزوری واقع ھوگئی - دوم ، اھل مکہ نے بار بار کوشش کی کہ وہ اپنے گھٹتے ھوے وقار کو سنبھالا دے کر مدینہ کی وسعت حدود کو بایں غرض روک لیں کہ بالآخر مدینہ منورہ کی ریاست کو ختم کیا جا سکے ، مگر وہ کامیاب نہ ھو سکے - بہرحال ان کوششوں میں بتدریج تیزی آتی گئی - طرفین کو ایک ایک بار ھدف تک مار کرنے میں کامیابی ھو چکی تھی- یہ بات قریش مکہ کو گوارا نہ ھو سکتی تھی - [اھل بصیرت کے لیے قابل غور ھے] کہ افق پر نئی طاقت کے ابھرنے سے پرانی طاقت کو اپنی ابتدائی ناکامیوں سے ازحد مایوسی ھوئی - اب تک یہ اپنی عسکری برتری اور وافر مادی وسائل کو صحیح طور پر استعمال بھی نہ کر سکے تھے - [اس لیے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل امر نہیں] کہ قریش کے لیے [اب اس کے سوا چارہ کار نہ رہا تھا کہ کوئی] ایسا قدم اٹھائیں جس کے ذریعے وہ اپنی پوری عسکری طاقت ، اپنے حلیف قبائل کی افرادی قوت ، اور اپنے مادی وسائل کو بروئے کار لاتے ھوے مدینہ منورہ کی نئی اور کمزور سی ریاست کے وجود کو ختم کرکے اپنے مقصد میں کامیاب ھونے کی کوشش کریں۔

قریش مکہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھے - وہ طاقتور ھوتے ھوے اپنی پوری طاقت استعمال کرنے سے جھجھکتے تھے - اس کی دو وجوہ تھیں : اگر وہ بغیر کسی واضح اور حق بجانب وجہ کے مدینہ منورہ پر بھرپور حملہ کر دیتے تو مدینہ منورہ کے حلیف قبائل ان کا رستہ روک لیتے ؛ نیز اس طرح کے جارحانہ حملے کی صورت میں قریش مکہ کے اھل انصاف حلیف، جو مسلمانوں کے ساتھ خواہ مخواہ کی عداوت کے قائل نہ تھے ، ان کے ساتھ شامل نہ ھوتے اور ان کے کچھ حلیف قبائل بھی علیحدگی اختیار

marfat.com
Marfat.com

کر لیتے ۔ دوسری دقت یہ تھی کہ قریش مکہ اور ان کے پڑوسی قبیلے (بنو بکر) کے درمیان پرانی دشمنی تھی ۔ اگر قریش اپنا پورا لشکر لے کر مدینہ منوہ پر حملہ کرنے کے لیے مکہ مکرمہ سے نکل کھڑے ہوتے تو خطرہ تھا کہ بنو بکر ان کی غیر حاضری میں مکّہ پر حملہ آور ہو جائیں گے ۔ ان دونوں دقتوں کو رفع کرنے کی غرض سے مکہ کے ارباب اختیار نے نہایت خفیہ منصوبہ تیار کیا؛ چنانچہ اسی منصوبے کے تحت شام کی طرف ایک بہت بڑا قافلہ روانہ کیا گیا ، جس کا ظاہری مقصد دیگر اشیا کے علاوہ جنگی ساز و سامان خرید کر لانا تھا۔

ابو سفیان جو اس مکی تجارتی قافلے کا سالار تھا، شام سے لوٹتے ہوے جب مدینہ منورہ کی محاذاۃ میں، شاہراہ شام پر پہنچا تو اسے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں مسلمان اس پر حملہ آور نہ ہو جائیں ۔ ادھر ، اتفاقاً آنحضرت صَلَّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے روانہ کردہ دو افراد پر مشتمل ایک دستے کا ، جو اس علاقے میں آپؐ نے مشرکین کی سرگرمیاں معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا ، اسے سراغ مل گیا ، جو اسی شاہراہ کے آس پاس موجود تھے ۔ اس نے جنوب کی جانب زرقا کے مقام سے ضمضم بن [عمرو الغفاری] کو مکّہ مکرّمہ روانہ کیا تاکہ وہ وہاں پہنچ کر شور مچا دے کہ محمدؐ اور آپؐ کے ساتھی قافلہ لوٹنا چاہتے ہیں [ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۲ ببعد] ۔ قافلے کے ساتھ صرف تیس محافظ تھے [الزرقانی ، ۱ : ۴۰۱ ببعد]، اس لیے چاہیے کہ پورا مکہ اس قافلے کو بچانے کی تدبیر کرے ۔ ضمضمِ غفاری جب مکّے میں داخل ہوا تو اس نے [نذیر العریان کے طور پر] اپنا پیرہن پھاڑ لیا اور اونٹ کا پالان الٹا کر واویلا شروع کر دیا کہ قافلہ لٹ گیا ہے ، جلد مدد کو پہنچو ۔ اس ڈرامائی انداز سے پورے شہر میں غصے کی لہر دوڑ گئی اور فوراً لڑائی کی تیاریاں شروع ہوگئیں ، ساتھ ہی رؤسا ے مکّہ بنو بکر کے پاس پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ وہ شہر سے ان کی عدم موجودگی کے دوران میں مکّے پر حملہ نہ کریں ۔ وہ مان گئے ۔ بنو بکر کے ساتھ مباحث چار دن تک جاری رہے اور قریش کے لشکر نے بدر پہنچنے تک دس دن لیے ۔ اس کے باوجود قرآنی شہادت کے مطابق بدر کی لڑائی کے روز قریشی قافلہ بدر کے قریب نچلی جانب تھا [ارشاد ہے : اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی وَ الرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنْکُمْ (۸ [انفال]) : ۴۲)، یعنی جس وقت تم (میدان جنگ) کے قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر اور قافلہ تم سے نیچے کی جانب تھا] ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضمضم کو بدر سے نہیں بلکہ الزرقاء سے ہی روانہ کیا گیا تھا [الواقدی ، ۱ : ۲۸] ۔ جن روایات کی رو سے ابو سفیان نے ضمضم کو آنحضرت کے لشکر کا علم ہونے کے بعد بدر سے روانہ کیا تھا وہ روایات غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتی ہیں ۔ غور کیجیے کہ ۱۲ رمضان ۲ھ یا اس سے ایک دن قبل حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اطلاع ملی کہ ایک بہت بڑا مکی لشکر مدینہ پر حملہ کے لیے چل پڑا ہے، اس پر آپؐ نے مہاجرین و انصار کو جمع کیا اور یہ اطلاع ان کے سامنے رکھی۔ قرآن مجید کی آیات سے واضح ہے کہ اس اجلاس کے وقت سرور دو عالمؐ کو علم ہو چکا تھا کہ میدان میں قریش مکہ کا لشکر بھی ہے اور قافلہ بھی [ارشاد باری تعالٰی ہے : وَ اِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰهُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَکُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَةِ تَکُوْنُ لَکُمْ وَ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِهٖ وَ یَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ (۸ [انفال] : ۷)، یعنی اور اس وقت کو یاد کرو جب خدا تم سے وعدہ کرتا تھا کہ (ابوسفیان اور ابو جہل کے دو گروہوں میں سے ایک گروہ تمہارا (مسخر) ہو جائے گا اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے ہتیار ہے وہ تمہارے ہاتھ آ جائے اور خدا یہ چاہتا تھا کہ اپنے فرمان سے حق کو قائم رکھے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے] ۔ حضورؐ نے جب صحابہؓ کی

marfat.com
Marfat.com

رائے دریافت کی تو مہاجر اور انصار صحابہؓ نے مقابلہ کرنے کے فیصلے کے ساتھ اتفاق کیا [آراء معلوم کرنے کے لیے دیکھیے : البخاری : الصحیح ، کتاب المغازی ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۴)] - ۱۲ رمضان المبارک کو حضور اقدسؐ نے مسجد نبوی سے روانہ ہوکر ۱۶ رمضان المبارک کو بدر کی وادی کے شمالی سرے [العدوۃ الدنیا (۸ [انفال] : ۴۲) پر پہنچے ؛ بدر ایک بستی ہے جو مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے درمیان واقع ہے - مدینہ منورہ سے اس کا فاصلہ چار منزل کے قریب (شرح مواہب ، ۱ : ۴۰۶) یا ۲۸ فرسخ ہے (معجم ما استعجم، بذیل مادہ بدر)؛ [نیز رک بہ بدر)]۔ یہاں پہنچ کر آپؐ نے لشکر کو شمالی سرے پر چھوڑا اور دو صحابہ کو ساتھ لے کر قریشی لشکر کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے آگے تشریف لے گئے - اتفاق سے اسی وقت قریشی لشکر کے تین افراد وہاں پانی بھرنے کے لیے پہنچے تھے - آپؐ کے ساتھیوں نے ان میں سے ایک کو پکڑ لیا - اس نے مکی لشکر کی تفاصیل سے حضورؐ کو آگاہ کیا، [جس سے معلوم ہوا کہ مشرکین کا لشکر ٹیلے کی پرلی جانب پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے] - اب آپؐ لشکر کو لے کر آگے بڑھے اور بدر کے چشموں کے شمال کی جانب اونچی ریتلی زمین پر اپنا معسکر قائم کیا - اس مقام سے آپؐ پانی کے چشموں کو اپنی نگرانی میں رکھ سکتے تھے۔

آپؐ نے صحابہؓ کے مشورے سے ایسے مقام کو لڑائی کے لیے منتخب کیا جو کسی قدر اونچا اور عساکر مشرکین کے مشرق جانب واقع تھا ؛ اس کے پاس ہی ایک کنواں بھی تھا - رات کو بارش ہوگئی ، جس سے ریت جم گئی ، مگر مشرکین کے لشکر میں کیچڑ پھیل گئی [ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۴ ، ۱۵] - دوسری صبح ، یعنی ۱۷ رمضان المبارک پیر [شرح المواہب ، ۱ : ۴۱۰] کو نماز فجر سے فارغ ہوکر خاتم الرسل صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے اپنے لشکر کو ترتیب دینا شروع کیا ؛ دو صفیں درست کی گئیں - اگلی صف میں تلوار بند اور نیزہ بردار تھے؛ پچھلی صف میں تیر انداز متعین کیے گئے - کمان کا صدر مقام (Command Headquarter) پچھلی صف کے عقب میں ، مگر اس کے بالکل قریب اونچی زمین پر قائم کیا گیا اور اس پر سایہ کے لیے کھجور کی ٹہنیوں اور پتوں سے سائبان تیار کر دیا گیا - اسی موقعہ پر ٹولیوں (Sections) اور دستوں (Platoons) کے کمان دار مقرر کیے گئے - چونکہ دشمن کے پاس سوارہ (Cavalry) بھی موجود تھا ، اس لیے دونوں پہلوؤں پر تیر انداز متعین کیے گئے ؛ انھیں مرکزی لشکر (Main Army) سے ترچھی ترتیب میں عقب کی جانب جھکاؤ دے دیا گیا تھا ، تاکہ سوارہ کا حملہ روکنے میں آسانی پیدا ہو - مبادا قریشی کمان دار اپنے سوارہ کے استعمال سے اسلامی لشکر کے پہلوؤں کو لپیٹ میں لے لے - اونٹوں کو لشکر کے عقب میں ایک نشیبی زمین میں پہلے سے ہی چھپا دیا گیا تھا - جنوب کی جانب سے اور وادی کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ جو راستہ عقب کو جاتا تھا اس پر ایک ٹولی (Section) متعین کی گئی تاکہ دشمن عقب سے حملہ آور نہ ہو سکے اور نہ ہی اونٹوں پر حملہ کر سکے - لشکر کو یوں تدبیراتی (Tactical) پہلو سے ترتیب دینے کے بعد آپؐ نے قریشی لشکر کے انتظار کا وقت دعا و سجود میں گزارا - آپؐ کی دعا کا ایک فقرہ روح اسلام کا نچوڑ ہے ؛ آپؐ کے الفاظ ہیں : [اَللّٰھُمَّ اِنْ تَہْلِکْ ھٰذہ العِصابَۃُ الْیَوْمَ لَا تُعْبَدْ (ابن ہشام : سیرۃ ، ۲ : ۲۷۹) ، یعنی] اے اللہ اگر یہ چھوٹی سی جماعت آج ختم ہوگئی تو قیامت تک تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔

طلوع آفتاب کے ساتھ قریشی لشکر وادی بدر کے جنوب کی جانب العَقَنقل کے ٹیلے کے عقب سے نمودار ہوا - آپؐ نے اسے دیکھا تو فرمایا : [اَللّٰھُمَّ ھٰذہ قُرَیْشٌ قد اَقْبَلَتْ بِخُیَلائِھا وَ فَخْرِھا ، تُحادُّکَ وَ تُکَذِّبُ رَسُوْلَکَ ،

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

اللّٰہم فَنصرک الّذی و عدتنی ، اللّٰہمّ احنہم الغَداۃ (ابن ہشام ، ۲ : ۶۷۳) ، یعنی] اے اللہ ! یہ قریش طاقت کے نشے اور غرور میں سرمست تجھ سے مقابلہ کرنے اور تیرے رسول کی تکذیب کرنے آئے ہیں ۔ اے اللہ ! ان کو ہلاک فرما ۔ پھر آپؐ نے اپنے لشکر کو آخری ہدایات دیں اور جہاد کے مقام سے روشناس [الواقدی : المغازی ، ۱ : ۵۹] ؛ جہاد کے دوران میں جس صبر و استقلال کی ضرورت ہوتی ہے، اس پر روشنی ڈالی اور حکم دیا کہ کوئی شخص اپنے مقام سے نہیں ہلے گا ۔ جب تک دشمن بالکل قریب نہ آ جائے ، اس وقت تک ہتھیار استعمال نہ ہوں ، ہر وار کارگر ہو اور اس وقت تک وار نہ کیا جائے جب تک ہدف پوری طرح زد میں نہ آ جائے [الواقدی: کتاب المغازی، ۱ : ۶۷] ۔ یہ تھا وہ اسلحتی انضباط (Armament Discipline) ، جسے آج کل کی اصطلاح میں Fire Discipline کہا جاتا ہے اور جس کے بغیر کوئی فوج اپنے ہتھیاروں کا صحیح استعمال نہیں کر سکتی ۔ ان ہدایات کے بعد حضور اکرمؐ بڑھتے ہوئے دشمن کے قریب آنے کا انتظار فرمانے لگے ۔ ایک طرف تعداد کی کثرت اور ہتھیاروں کی فراوانی اور دوسری طرف جذبۂ ایمان اور اللہ کے آخری رسولؐ کی تربیت یافتہ چھوٹی سی جماعت تھی ، جس کی ایمانی قوت کا امتحان منظور تھا ۔ قریش لشکر اسلامی کے قریب پہنچ کر رک گئے اور مبارزت [رَکِ بان] طلب کی ؛ چنانچہ قریشی لشکر سے تین افراد عُتبہ بن ربیعہ ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ آگے بڑھے اور دونوں لشکروں کے درمیان پہنچ کر اسلامی لشکر میں سے اپنا مبارز طلب کیا ۔ اسلامی لشکر سے تین انصاری نوجوان آگے بڑھے ۔ یہ تینوں انصار مدینہ [معاذؓ، معوذؓ اور عوفؓ]، حارث کے بیٹے تھے [یا پھر معاذ کی جگہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ تھے (ابن ہشام ، ۲ : ۲۷۷؛ ابن سعد : الطبقات، ۲ : ۱۷)]۔ مگر عتبہ بن ربیعہ نے انصار کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا اورکہا : ہمیں تم سے لڑنے کی ضرورت نہیں ۔ [بعض روایات کے مطابق آپؐ نے خود ان صحابہؓ کا مقابلے کے لیے نکلنا ناپسند فرمایا اور ان کو واپس بلا لیا (ابن سعد ، ۲ : ۱۷)] ۔ بعد ازاں] آپؐ نے حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب ، حضرت علیؓ بن ابی طالب اور حضرت عبیدہؓ بن الحارث کو مقابلے کے لیے نکلنے کا حکم دیا ۔ حضرت حمزہؓ عتبہ بن ربیعہ کے ، حضرت علیؓ ولید بن عتبہ کے اور حضرت عبیدہؓ بن الحارث اپنے ہم عمر عتبہ بن ربیعہ کے مقابلے میں نکلے ۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے اپنے اپنے مدّ مقابل کو زیر کر کے قتل کر دیا ؛ جب کہ حضرت عبیدہؓ [جو کسی قدر عمر رسیدہ تھے] اور عتبہ نے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا تھا ۔ مبارزت کے دستور کے مطابق جب ایک بار خون بہہ نکلے تو مبارزت میں حصہ لینے والے ایک دوسرے کی مدد کو آ سکتے تھے ؛ چنانچہ سیدالشہدا حضرت حمزہؓ نے جھپٹ کر عتبہ کو ختم کر دیا [ابن سعد ، ۲ : ۱۷]۔ قریشی کمان دار اس منظر کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے فوراً پورے لشکر کو عام حملے کا حکم دے دیا [محمد حسین ہیکل : حیاۃ محمدؐ، ص ۲۶۳].

ادھر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم اسی قسم کے غیر منضبط حملے کی توقع کیے ہوئے تھے ؛ گزشتہ رات کی بارش کی وجہ سے مشرکین کی سمت کسی حد تک پھسلن تھی ؛ اسلامی لشکر نسبتاً بلندی پر تھا ؛ قریشی لشکر کو سامنے سے سورج آنکھوں میں پڑ رہا تھا اور فاصلہ بھی کافی تھا ، جو دوڑ کر عبور کرنا ہر ایک کے لیے آسان نہ تھا ؛ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حملے کے جوش میں کچھ آگے بڑھ آئے اور کچھ پیچھے رہ گئے ؛ اس طرح قریش مکہ کی پیادہ فوج کے حملے میں توازن نہ رہا ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جنگ کے لیے تدبیراتی طور پر ایک

marfat.com
Marfat.com

ایسا مقام چنا تھا ، جو اسلامی جیش کے لیے فائدہ مند تھا ۔ اس کے ساتھ ہی مکی سوارہ بھی لڑائی شروع ہونے ہی دقتوں سے دو چار ہونا شروع ہو گیا ؛ اسلامی لشکر کے دونوں پہلوؤں پر تیر انداز متعین تھے اور ان کی ترچھی ترتیب کی وجہ سے انھوں نے دشمن کی جانب سے دائراتی (encircling) حرکت کو فوراً روک لیا ۔ زمین اور دیگر جغرافیائی دقتوں نے قریشی پیادہ اور سوارہ کی پیش قدمی (Advance) کو سست اور غیر مربوط (Uncoordinated) بنا دیا تھا ۔ اسلامی لشکر کی موزوں تدبیراتی ترتیب (Tactical Fomration) کی وجہ سے قریشی لشکر کا رسالہ رک گیا تھا اور کچھ ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ لڑائی کے میدان سے ہی خارج ہو گیا ہے ۔ رسالہ صرف اسی صورت میں لڑائی پر اثر انداز ہوا کرتا ہے جب وہ ہلّہ بولنے (Charge) کے قابل ہو ۔ اسلامی لشکر کے تیر اندازوں نے قریشی رسالہ کو اپنے قریب تک نہ آنے دیا تھا ؛ وہ ہلّہ کیسے بول سکتا تھا ۔

اس دہری رکاوٹ نے حملے کو کلّیةً غیر متوازن (Unbalanced) بنا دیا ۔ [لشکر قریش کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ لگاتار اس کے دو کمان دار مارے گئے ؛ عتبہ پہلے قتل ہوا ۔ عین گھمسان کی جنگ میں ابو جہل ، جو عتبہ کا قائم مقام اور فساد کی جڑ تھا ، مارا گیا ۔ اس طرح قریشی لشکر میں افراتفری سے ملتی جلتی حالت پیدا ہو گئی : تمام لشکر منتشر اور غیر مرتب ہو کر مختلف ٹولیوں میں بٹ گیا اور اس طرح جیش اسلام پر لگاتار ، مگر غیر منظم حملے جاری رہے ، جب کہ دوسری طرف جیش اسلام منظم اور مربوط وحدت بن کر استقلال سے اپنی جگہ جما رہا اور مشرکین کے تمام حملوں کے باوجود وہ اپنی جگہ سے نہ ھل سکا] ۔ دوسری طرف اسلامی کمان دار کی نظر اپنے ہیڈ کوارٹر [العریش] سے محاذ (Front) کے چپے چپے پر تھی اور حسب ضرورت احکام جاری کیے جا رہے تھے ۔ دشمن کا پیادہ یوں بھی ھجوم کی شکل میں روانہ ہوا تھا ۔ (یاد رہے کہ عرب میں صف بندی کا دستور نہ تھا ، یہ بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایجاد ہے) ۔

لشکر قریش کے تیز رفتار افراد جب پتھروں کی زد میں پہنچے تو ان پر پتھروں کی بوچھاڑ کی گئی ؛ وہ رک رک کر ہتھیاروں کی زد میں آتے اور باری باری موزوں ہتیار کے ذریعے نشانہ بنا لیے جاتے ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم صفوں کے پیچھے کھڑے ہوئے نہایت ٹھنڈے دل سے دشمن کی ان اٹھتی ، بڑھتی ، پھیلتی اور پھر اسلام کے مجاھدوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتی ہوئی لہروں کو بغور دیکھ رہے تھے ۔ اگرچہ دشمن کے تیر اندازوں کا ھدف آپ[3] کا ہیڈ کوارٹر [العریش] (گھاس پھونس کا چھپر) تھا ، مگر آپ[3] تمام خطرات سے بے نیاز تھے ۔ جب آپ[3] نے دیکھا کہ دشمن کی بڑھتی ہوئی غیر مربوط لہروں میں وہ پہلا سا جوش نہیں رہا تو آپ[3] نے جھک کر زمین سے مٹھی بھر کنکر اٹھائے ، ان پر کلمات دعا و برکت فرمائے اور دشمن پر پھینکتے ہوئے بلند آواز سے فرمایا : اب حملہ کرو ، ان کو شکست ہو گی ۔ [یہ گویا پیش قدمی کا حکم تھا ؛ چنانچہ جیش اسلام "سیسہ پلائی ہوئی دیوار" کے مانند آگے بڑھنا شروع ہوا ۔ قاعدہ ہے کہ ایک ساتھ بڑھنے والی فوج کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا؛ چنانچہ مشرکین کی فوج بھی لمحہ بھر میں پیچھے کو ہٹنا اور دوسرے ہی لمحے میں بھاگنا شروع ہو گئی ۔

اس موقع پر دشمن کے ستّر نامور افراد قتل ہوے اور اسی قدر قید کر لیے گئے ۔ زخمیوں کی تعداد کو تحریر میں نہیں لایا گیا ، [جب کہ جیش اسلامی کے کل ۱۴ افراد ، ۶ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے شہید ہوے (البخاری : الصحیح ، کتاب

marfat.com
Marfat.com

المغازی ، باب ۳ تا ۱۳ ؛ الزرقانی : شرح المواهب ، ۱ : ۴۰۶ تا ۴۳۵ ؛ ابن هشام : سیرة ، ۲ : ۲۵۷ تا ۳۷۴ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۱ تا ۲۷)] - اہل مکہ کو یقیناً ہر پہلو سے نقصان ہوا تھا - سب سے بڑھ کر جو نقصان ہوا وہ عزت و وقار کا نقصان تھا - قریش مکہ کو جزیرة العرب میں ممتاز مقام حاصل تھا ؛ وہ عرب کے سابقہ نظام کے داعی اور محافظ تھے اور نئے دین کے سب سے بڑے دشمن ؛ ان کو نئے نظام کی علمبردار چھوٹی سی تربیت یافتہ جماعت نے شکست دے دی تھی - جزیرة العرب کے دور دراز علاقوں میں اس انجام کا ذکر ہونا بدیہی تھا ؛ چنانچہ بدنامی سے بچنے کے لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس شکست پر خاموش سوگ منایا جائے گا ؛ کوئی اپنے مقتولین کی یاد میں (اشعار میں) گریہ و نوحہ نہ کرے گا - اس خاموش سوگ کے ساتھ ساتھ یہ عزم برقرار رکھا جائے کہ بدر کی شکست کا بدلہ جلد از جلد لیا جائے گا - رؤسائے قریش ، بالخصوص ابو جہل کے قتل ہونے کی وجہ سے ابوسفیان بلا شرکت غیرے مکّی فوج کا کمان دار اعظم بن چکا تھا - اس نے قسم کھائی کہ وہ جب تک خون کا بدلہ نہ لے گا سر پر تیل نہ لگائے گا اور اپنی بیوی سے الگ رہے گا ؛ [چنانچہ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے اس نے برائے نام مدینہ منورہ پر حملہ کیا (دیکھیے نیچے)- آپ[ؐ] نے قیدیوں کے لیے عرب کے مروجہ دستور (قتل یا ہمیشہ کی غلامی) کے برعکس فدیہ لے کر رہا کرنے کا فیصلہ کیا ؛ جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ، ان کی رہائی کے لیے دس دس افراد کو اس کی تعلیم دینا کافی قرار دیا؛ اس طرح تمام قیدی رہا ہو گئے (ابن هشام : سیرة ، ۲ : ۲۹۸ تا ۳۰۲)].

غزوۂ بنی قینقاع : فتح بدر کے نتیجے میں ، ریاست مدینہ کے بین القبائل مقام میں معتد بہ اضافہ ہوا ، کیونکہ تعداد میں معمولی لشکر ، جس کے پاس تجہیزات جنگ (Arms and Equipment) بھی ناکافی تھے، وہ اپنے مقابلے میں تین گنا فوج پر صرف فتح مند نہیں ہوا ، بلکہ اس نے دشمن کے ستر سے زیادہ آدمی قتل کر دیے اور اتنے ہی قیدی بنا لیے تھے اور اس کی اپنی فوج کے صرف چودہ افراد شہید ہوئے تھے .

ظاہر ہے جس کمان دار کی تربیت یافتہ فوج ایسی شاندار کامیابی حاصل کر لے ، اس کی عسکری قابلیت کی شہرت فطری امر ہوتا ہے ، مگر اس کے ساتھ مخالفت کا بھی امکان تھا - [لہذا اسلامی مملکت کے آس پاس قبائل کا رد عمل ملا جلا تھا] ؛ البتہ مدینہ منورہ کے اندر جو یہودی آباد تھے اور میثاق مدینہ میں بھی شامل تھے انھیں مسلمانوں کی اس کامیابی پر از حد صدمہ ہوا - مدینہ منورہ کے مضافات میں یہودیوں کی تین بستیاں تھیں ، اور ان میں قلعے بھی تھے - ان بستیوں میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے- ان میں سے سب سے پہلے بنو قینقاع نے حرکت کی، جو اہل مکہ سے ساز باز رکھتے تھے- [وہ فنون حرب سے واقفیت کے علاوہ خاصی افرادی قوت بھی رکھتے تھے] - مدنی فوج کی مدینے میں واپسی پر انھوں نے میثاق مدینہ سے انحراف کرتے ہوئے بغاوت پر آمادگی کا اظہار کیا - آپ[ؐ] نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی ، مگر انھوں نے بگڑ کر کہا : ”کیا تم ہمیں بھی قریش مکہ کی طرح سمجھتے ہو؟ بخدا اگر تم ہمارے ساتھ لڑو گے تو صحیح معنوں میں مردوں سے سامنا کرو گے - ہم لڑنا جانتے ہیں [ابن هشام : سیرة ، ۳ : ۵] ؛ چنانچہ آپ نے ۱۵ شوال ۲ھ بروز ہفتہ کو ان کے [قلعے کے محاصرہ کا حکم دے دیا - پندرہ دن کے شدید محاصرے سے تنگ آ کر انھوں نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے اور مدینہ چھوڑنا قبول کر لیا] - حضور[ؐ] نے ان کی بغاوت کا قصور معاف کر دیا اور

marfat.com
Marfat.com

انھیں ہتھیاروں کے علاوہ باقی ساز و سامان اور مال و دولت بھی ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی [ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۵۰ تا ۵۲]۔

غزوۂ سَوِیق : ابوسفیان [اپنی قسم پوری کرنے کے لیے] جب مدینہ منورہ پہنچا تو بنو قینقاع مدینہ منورہ سے جلا وطن کیے جا چکے تھے ۔ وہ ایک یہودی سردار سلاّم بن [مِشکم] کے گھر گیا اور وہاں اسے سب حالات معلوم ہوئے ۔ [رات کے آخری پہر میں اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ] مدینہ منورہ کے مضافات میں [مقام العُرَیض میں کچھ درختوں کو جلایا اور دو انصاری صحابہؓ کو قتل کیا] اور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے واپس لوٹ گیا ۔ اس طرح اس نے اپنی قسم کو پورا کیا (ابن ہشام سیرۃ ، ۳ : ۴۷ تا ۴۹) کے مطابق یہ واقعہ غزوۂ بنی قینقاع سے قبل پیش آیا]۔

آنحضرت صَلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اطلاع ملتے ہی اس کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے ۔ پکڑے جانے کے اندیشے سے اس نے راستے میں جا بجا ستوؤں کے تھیلے پھینکنے شروع کر دیے تاکہ وزن کم ہو جائے ، اسی بنا پر اس غزوے کو غزوہ سویق (= ستو) کا نام دیا گیا ہے [الواقدی : المغازی ، ۱ : ۱۸۱ تا ۱۸۲ ؛ ابن ہشام ، سیرۃ ، ۳ : ۴۷ تا ۴۹]۔

غزوہ قَرقَرۃ الکُدر : ادھر بنو سُلیم مدینہ منورہ پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے ۔ اس کی اطلاع آنحضرت صَلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ملی تو آپؐ نے [غزوۂ بدر سے واپسی کے سات دن بعد (ابن ہشام، ۳ : ۴۶) یا وسط محرم الحرام ۳ھ میں (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۳۱)] بنو سُلیم کی خیمہ گاہوں کا رخ کیا ۔ حضورؐ کا لشکر نہایت تیزی سے بنو سلیم کے علاقے [قرقرۃ الکدر یا قراۃ الکدر] میں پہنچا ، مگر وہ اطلاع ملتے ہی پہاڑوں میں چھپ گئے ؛ کچھ جانور اپنی خیمہ گاہوں کے آس پاس چھوڑ گئے جنھیں پکڑ لیا گیا ۔ اس غزوہ کو غزوۂ بنی سلیم بھی کہا جاتا ہے ۔ [جیش اسلام کی تعداد دو سو تھی (ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۴۶ ؛ الواقدی : المغازی، ۱ : ۱۸۲ تا ۱۸۴ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۳۱)]۔

غزوہ بنی سلیم ثانی : بنو سلیم نے مقام [بَحران میں جمع ہو کر] دوبارہ حملے کی تیاریاں شروع کر دیں ۔ پھر جب ان پر [ربیع الاوّل ۳ھ (ابن سعد ، ۲ : ۳۴) یا جمادی الاولی (الواقدی ، ۱ : ۱۹۶) میں] لشکر کشی کی گئی تو وہ پہاڑوں میں چلے گئے ۔ اس بار اسلامی لشکر کی تعداد [تین سو] تھی اور اس میں مہاجر اور انصار دونوں شامل تھے ۔ اس غزوہ کو غزوۂ بنی سلیم ثانی کہا گیا ہے [ابن سعد: الطبقات، ۲ : ۳۵ تا ۳۶؛ الواقدی ، کتاب المغازی ، ۱ : ۱۹۶ تا ۱۹۷) ؛ ابن ہشام: (سیرۃ ، ۳ : ۵۰) نے اس مہم کو قریش مکہ کے خلاف بیان کیا ہے]۔

غزوۂ بنی غطفان: [۱۲] ربیع الاوّل ۳ھ / ۶۲۴ء میں آپؐ کو اطلاع ملی کہ قریش کا دوسرا نجدی حلیف قبیلہ بنو غطفان مدینہ منوّرہ پر چڑھائی کی تیاریوں میں مصروف ہے ۔ آپؐ ساڑھے چار سو صحابہؓ کو ساتھ لے کر نجد [مقام ذی اَمَر] کی طرف روانہ ہوئے [اور اس تیزی سے دشمن کے سر پر جا پہنچے کہ دشمن حواس باختہ ہو گیا] ؛ انھیں اسلامی لشکر کی آمد پر پہاڑوں میں غائب ہو جانا پڑا ۔ اس مہم کا نام غزوۂ ذی امر بھی ہے (ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۴۹؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۳۴)]۔

آپؐ کے اس طرح کے سفر اس قدر کامیاب ثابت ہوئے کہ قریش نے [آپؐ کو ایک مسلّمہ طاقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا اور] راستے کا استعمال ترک کر دیا ، جو ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ ، مدینہ کے پاس سے گزرتا تھا ۔ انھوں نے اس کے بعد جو قافلہ روانہ کیا ، اسے نجد کے راستے سے روانہ کیا ۔ رسول اللہ صَلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم

marfat.com
Marfat.com

نے شروع سے خبریں حاصل کرنے کے عسکری ذرائع (Military Intelligence) کو اعلیٰ پیمانے پر منظم کر لیا تھا۔ اس قافلے کی روانگی کی تاریخ اور اس کے سفر کی سمت معلوم ہونے پر آپ[ؐ] نے جمادی الآخرۃ ۳ھ میں حضرت زید بن حارثہ[رض] کو [ایک سو افراد پر مشتمل] دستۂ فوج دے کر روانہ فرمایا۔ اس قریشی قافلے کی قیادت ابوسفیان بن حرب [(ابن ہشام، ۳:۵۳) یا صفوان ابن امیہ (ابن سعد، ۲ : ۳۶)] کر رہا تھا۔ حضرت زید[رض] نے قافلے کو روک لیا اور سامان اپنی تحویل میں لے لیا۔ قافلے کے محافظ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ؛ چند ایک اسیر بھی ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آپ[ؐ] نے قریش مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی کا حکم دیا۔ یہ قافلہ مکہ کے حلیف قبائل کے علاقے سے ہو کر گزر رہا تھا، مگر آپ[ؐ] کی عسکری منصوبہ بندی (Military Planning) اور اس پر بہتر عمل کا یہ نتیجہ تھا کہ یہ قافلہ اپنی منزل مقصود پر نہ پہنچ سکا [الواقدی : المغازی، ۱ : ۹۷ تا ۱۹۸؛ ابن ہشام، ۳ : ۵۳]۔ جن مہموں کے متعلق مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ[ؐ] کی فوج قافلوں کو لوٹنے کے لیے ہر دوسرے مہینے نکل کھڑی ہوتی تھی اور قافلے ہاتھ نہ آتے تھے، [یہ خیال ضعیف روایات پر مبنی ہے]۔ یہ مؤرخ عسکری یا تنظیمی منصوبہ بندی کے اصولوں کی اہمیت نہیں سمجھ سکے، حالانکہ ان کا تعلق محارباتی منصوبہ بندی سے ہے اور یہ ایک علم (science) ہے اور آنحضرت[ؐ] کو اس کا ادراک تائید ایزدی کا مرہون منت ہے۔ جب جنگ شروع ہوچکی تھی اور مسلسل ہو رہی تھی تو اس قسم کے اقدامات کو محض تجارتی قافلوں کی روک ٹوک تک محدود سمجھنا درست نہیں ہوسکتا۔ حالات اور واقعات کی روشنی میں ایسی روایات فہم راوی کے دخل کی وجہ سے ناقابل اعتماد ہو جاتی ہیں۔

اس دوسرے دور کے واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس دور میں مدینہ منورہ سے آٹھ مہمیں روانہ کی گئیں۔ ان میں سے سات کی قیادت خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے کی۔ جس مہم کی کمان آپ[ؐ] نے ایک صحابی[رض] کو عطا کی وہ انسدادی کارروائی تھی۔ اس دور میں، عسکری تربیت کی طرف پہلے سے زیادہ توجّہ دی گئی ؛ البتہ سفارتی سفر پہلے دور کی نسبت کم ہوئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اب دشمن علانیہ میدان میں آ گیا تھا اور دفاعی اقدامات کی ضرورت بڑھ چکی تھی۔ اس دور میں اقتصادی ناکہ بندی کو بھی بطور ہتھیار کے استعال کیا گیا ؛ قریش مکہ کے لیے شمال اور مغرب کی تجارتی شاہراہیں بڑی حد تک مسدود کی جا چکی تھیں ؛ اول الذّکر کے دائیں بائیں مدینہ منوّرہ کے حلیف قبائل آباد تھے ؛ آخرالذّکر پر مکہ مکرمہ کے حلیف قبائل کی موجودگی میں قریشی قافلہ روک لیا گیا تھا۔

مدینہ منورہ کی عسکری قابلیت کی اس قدر دھاک بیٹھ چکی تھی کہ کوئی قبیلہ آسانی سے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا ؛ [چنانچہ یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ] اب مخالف ضرور بڑے پیمانے پر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوں گے، کیونکہ دشمنوں کو اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے یہ موقع کھو دیا تو پھر مدینہ منورہ اتنی طاقت پکڑ لے گا اور وہ خود اقتصادی طور پر اتنے کمزور ہو جائیں گے کہ ان کے لیے مسلمانوں کو شکست دینا ناممکن ہو جائے گا۔

غزوۂ احد : [ادھر قریش مکہ بھی خاموش نہ تھے، انھوں نے غزوۂ بدر کے بعد سے اب تک اس حقیقت کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کیا تھا کہ مسلمانوں نے ان کو میدان بدر میں شکست سے ہم کنار کیا ہے ؛ چنانچہ انھوں نے ایک منظّم طریقے سے جنگ کی تیاریوں کا آغاز کر دیا : (۱) اپنے شعلہ بیان اور آتش نوا شاعروں کو اپنے حلیف قبائل میں روانہ کیا تاکہ اہل اسلام کے خلاف غیظ و

marfat.com
Marfat.com

غضب کی آگ بھڑکا کر انفرادی قوت حاصل کی جا سکے ؛ (۲) دوسری طرف تمام اہل مکہ سے چندہ لے کر سامان جنگ مہیا کیا گیا ؛ اس کے علاوہ خیبر کے یہودی ، بالخصوص یہود بنی قینقاع قبائل عرب کو بھڑکانے میں ان کے ہم نوا تھے (ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۶۴ ببعد)]۔

چنانچہ شوال المکرم ۳ھ میں ابوسفیان کی قیادت میں قریش مکہ تین ہزار کا لشکر لے کر مدینہ منوّرہ پر حملہ آور ہوئے [جس میں احابیش ، بنو کِنانہ اور اہل تہامہ کے بہت سے حلیف قبائل بھی شریک تھے؛ یہ لشکر تین ہزار جنگجو افراد پر مشتمل تھا جس میں دو سو گھڑ سوار ، سات سو زرہ پوش اور تین ہزار اونٹ تھے ؛ پانچ سو عورتیں بھی ہمراہ آئی تھیں (ابن سعد ، ۲: ۳۷)]۔ جب کفار کا لشکر مدینہ منورہ کے باہر کوہ احد کی مغربی جانب خیمہ زن ہوا تو آپؐ نے مجلس مشاورت طلب فرمائی اور دفاع کے طریق پر غور فرمایا ۔ آپؐ کا ارادہ تھا کہ شہر کے اندر رہ کر دفاع کیا جائے ؛ نوجوانوں ، خصوصاً وہ ، جنھیں غزوۂ بدر میں حصہ لینے کا موقع نہ ملا تھا ، کی خواہش تھی کہ مکی لشکر کا مقابلہ باہر نکل کر کیا جائے ۔ حضور اکرمؐ نوجوانوں کے اصرار پر اٹھ کر گھر کے اندر تشریف لے گئے اور زرہ پہن [کر باہر تشریف لائے ۔ اب نوجوانوں کو منشائے نبوی کے خلاف اصرار پر ندامت ہوئی] ، اس لیے معذرت کی اور کہا کہ آپ کی تجویز کے مطابق شہر کے اندر رہ کر دفاع کیا جائے ، مگر آپؐ نے فرمایا : پیغمبر کے لیے مناسب نہیں کہ جب وہ زرہ پہن لے تو لڑائی سے قبل اپنی زرہ اتار دے [ابن ہشام: سیرۃ، ۳ : ۶۸]۔ اب حضورؐ نے تین نیزے منگوا کر تین عَلَم تیار کیے؛ مہاجرین کا عَلَم [جو آپؐ کا علم ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتا تھا ، حضرت علیؓ یا حضرت مصعبؓ بن عمیر] کو عطا ہوا ۔ بنو اوس کا عَلَم [حضرت اُسَیدؓ بن حُضَیر] کو اور بنو خزرج کا عَلَم [حضرت سعدؓ بن عُبادہ کو مرحمت ہوا] ۔ حضرت عبداللہؓ بن امّ مکتوم کو نائب مقرر کر کے مدینہ منورہ میں چھوڑا اور ایک ہزار کا لشکر احد کی طرف روانہ ہوا [(ابن ہشام ، ۳ : ۶۸)؛ لشکر میں ایک سو زرہ پوش بھی تھے (ابن سعد ، ۲ : ۳۹)]۔ مدینہ منورہ سے تقریباً دو میل باہر جا کر [الشیخین کے مقام] پر رات کے لیے پڑاؤ ڈالا گیا [اور لشکر کی نگہبانی پر حضرت سلمہؓ بن خالد کا پچاس جانبازوں کے ساتھ تقرر ہوا (حوالۂ مذکور) ۔ دوسری طرف مشرکین کے لشکر میں عِکرمہ بن ابی جہل ، پچاس جوانوں کے ساتھ پہرے پر متعین تھا]۔

دوسری صبح ، پو پھٹنے سے پہلے حضورؐ جب کوچ کے لیے تیار ہوئے تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر علیحدہ ہو گیا اور وجہ یہ بتائی کہ چونکہ اس کی رائے ، یعنی شہر کے اندر رہ کر لڑنے ، کو قبول نہیں کیا گیا [اور چونکہ اس کے نزدیک باہر نکل کر مقابلہ کرنا صریحًا قتل ہو جانے کے مترادف ہے] اور وہ اپنے آدمیوں کو قتل کرانا نہیں چاہتا ۔

اب اسلامی لشکر میں صرف سات سو کے قریب مجاہد رہ گئے تھے۔ [اگر پہلے تعداد ہزار تھی تو اب سات سو اور اگر نو سو تھی تو اب باقی رہنے والوں کی مجموعی تعداد چھ سو رہ گئی (الزرقانی ، ۲ : ۲۶)]، مگر آپؐ اس کے باوجود بھی نہایت اطمینان سے آگے بڑھے اور جبل احد کے جنوب مشرق سے ہوتے ہوئے پہاڑ کے جنوب مغربی کونے کے قریب صف آرا ہوئے۔ آپؐ نے یہ اہتمام کیا کہ اپنے عقب کی جانب چھوٹی سی پہاڑی [عَینان] پر حضرت عبداللہؓ بن جبیر کی قیادت میں پچاس تیر انداز متعین فرما دیے تاکہ دشمن اپنے سوارہ سے عقبی حملہ نہ کر سکے ۔ ان

marfat.com
Marfat.com

تیر اندازوں کو [تاکیدی] حکم دیا گیا کہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنا مقام ہرگز نہ چھوڑیں (حوالۂ مذکور، ۲ : ۲۸) ؛ [ابن سعد (۲ : ۴۰) کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا تم نے ہمارے عقب کی حفاظت کرنی ہے ، ہمیں فتح ہو یا شکست تم نے اپنی جگہ سے ہرگز نہیں ہٹنا] ۔ اس پہاڑی کا نام جبل عینین بھی ہے اور جبل رُماۃ بھی ۔ آپؐ ان انتظامات میں مصروف تھے کہ آپؐ نے دیکھا کہ مکّی لشکر کے تین ہزار سپاہی وادی قناۃ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں ۔ حضورؐ کے لشکر کا دایاں بازو جبل احد کے کونے کے ساتھ تھا اور بایاں بازو وادی قناۃ کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا ، اس لیے مکی کمان دار کو روبرو حملہ (Frontal Attack) کرنا پڑ رہا تھا اور وہ اپنے سوارہ کو پہلو سے حملے (Flanking Attack) کے لیے استعمال نہ کر سکتا تھا ۔ دشمن کو روبرو حملے پر مجبور کرنے کے علاوہ آپؐ نے محاذ اس قدر محدود چنا تھا کہ مکی لشکر کی افرادی برتری (Numerical Superiority) بروئے کار نہیں لائی جا سکتی تھی ۔

مکی لشکر اسلامی لشکر کے قریب پہنچ کر رک گیا اور ان کے علم بردار طلحہ بن ابی طلحہ نے آگے بڑھ کر مبارزت کے لیے للکارا : حضرت علیؓ اس کے مقابلے میں نکلے اور پہلے ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا ۔ اس کے بعد اس کے بھائی [عثمان بن ابی طلحہ] نے عَلَم سنبھالا ۔ حضرت حمزہؓ نے اسے قتل کیا ۔ پھر زرہ پوش ابو سعد بن ابی طلحہ نے قریشی علم سنبھالا اور اسے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے قتل کر دیا ۔ اس طرح اِس خاندان کے آٹھ افراد عَلَم کے وقار پر مر مٹے ؛ پھر ایک غلام آگے بڑھا ، وہ بھی قتل ہو گیا ۔ اس طرح قریش مکہ کے پے در پے علم برداروں کے قتل سے علم اٹھانے والا کوئی نہ رہا تو ان کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی ۔

مکی سوارہ خالد بن ولید کی کمان میں وادی قناۃ کے راستے اسلامی لشکر کی بائیں جانب سے ہو کر عقبی حملے کی کوشش کر رہا تھا، مگر جبل عینین پر متعین تیراندازوں نے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی تھی۔ جونہیں قریشی پیادے نے پسپائی (Withdrawal) اختیار کی، قریشی سوارہ بھی بھاگ کھڑا ہوا ۔ اسلامی لشکر نے بھاگتے ہوئے قریشی پیادے کے سپاہیوں کو پکڑنا اور ان کے ہتھیار جمع کرنا شروع کر دیے ۔ جبل عینین پر متعین پچاس تیر اندازوں نے جب دیکھا کہ اسلامی فوج مال غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہے ، تو ان میں سے اکثر اپنے مقام سے ہٹ گئے اور مال غنیمت سنبھالنے کے لیے چل پڑے ؛ ان میں سے صرف دس مجاہد اپنے مقام پر قائم رہے ۔ خالد بن ولید [نے جب یہ دیکھا تو اپنے تین سو سوارہ کے ساتھ آگے بڑھا اور] جبل عینین پر موجود چند تیر اندازوں کو روندتے ہوئے اسلامی لشکر پر عقب سے حملہ آور ہونے میں کامیاب ہو گیا ۔ بکھری ہوئی اسلامی فوج جو شکست خوردہ قریشی قیدیوں کو جمع کرنے میں دو دو اور تین تین کی ٹولیوں میں بٹ چکی تھی ، سوارہ کے اس شدید حملے کی طرف سے غافل تھی ۔ ادھر جب بھاگتے ہوئے قریشی پیادے کے سپاہیوں کو معلوم ہوا کہ اسلامی لشکر پر ان کے سوارہ نے عقب سے ہلّہ بول دیا ہے تو وہ بھی پلٹ پڑے ۔ اب اسلامی لشکر دو طرفہ حملے کا شکار ہو گیا [اور چونکہ غیر منظّم ہو چکا تھا، اس لیے اس حملے کی تاب نہ لا سکا ۔ اس حالت میں آپؐ کے ساتھ صرف چودہ جاں نثار باقی رہ گئے (ابن سعد ، ۲ : ۴۲) ۔ دشمنوں نے جب آپؐ کو چند جاں نثاروں کے ساتھ پایا تو آپ پر شدت کے ساتھ حملہ کر دیا : ابن قمیئہ نے آپؐ پر تلوار کا وار کیا، جس سے آپؐ کے سامنے کا نچلا دایاں دندان مبارک شہید ہو گیا ؛ رخسار اور پیشانی بھی سخت زخمی

marfat.com
Marfat.com

ہو گئی ۔ ادھر حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ ، جن کی شکل و شباہت آپؐ سے ملتی جلتی تھی ، شہید ہوگئے تو اسلامی لشکر میں افواہ پھیل گئی کہ (معاذ اللہ) آپؐ کو شہید کر دیا گیا ہے ؛ ایک روایت میں ہے کہ ابن قمیئہ نے جب آپؐ کے چہرے پر تلوار کا وار کیا اور آپ اس سے شدید زخمی ہو گئے ، تو اس نے یہ افواہ مشہور کر دی کہ اس نے معاذ اللہ آپؐ کو قتل کر دیا ہے ۔ اس افواہ سے اہل اسلام میں مزید بد دلی پیدا ہوگئی ؛ آپؐ بار بار آواز دیتے تھے : اللہ کے بندو ! میرے پاس آؤ؛ میں اللہ کا رسول ہوں ۔ سب سے پہلے حضرت کعبؓ بن مالک نے آپؐ کو پہچانا اور بلند آواز سے صحابۂ کرامؓ کو پکارا کہ آپؐ یہاں تشریف فرما ہیں ، یہاں آؤ ۔ [یہ سننا تھا] کہ اکھڑے ہوئے قدم جمنا شروع ہو گئے ۔ جب صحابہؓ کی معتدبہ تعداد جمع ہو گئی تو آپؐ نے پھر اپنا لشکر منظّم کرنا شروع کیا اور اہل اسلام کو لے کر آہستہ آہستہ پیچھے کو ہٹتے گئے تاکہ احد کی بلندی سے فائدہ اٹھایا جا سکے ۔ یہاں دوسری بار شدت کی لڑائی لڑی گئی ۔ یہ مقام کشادہ تھا ، اس لیے قریشی سوارہ بار بار پلٹ کر گھیرے ہوئے اسلامی لشکر پر حملے کر رہا تھا ۔ اس کے باوجود آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم لمحہ بہ لمحہ اپنے لشکر کو احد کے قریب لیے جا رہے تھے ۔ جونہیں جیش اسلام احد کی بلندی پر پہنچا تو قریشی لشکر کا حملہ رک گیا ؛ قریشی لشکر نے بھی دوسری چوٹی تک رسائی حاصل کر لی ، مگر کسی نئے حملہ کرنے میں انھیں کامیابی نہ ہوئی ۔ اس گھمسان کی دست بدست [لڑائی میں صحابۂ کرامؓ کی جان نثاری کا بھرپور اظہار ہوا ؛ ابن سعد کے مطابق آپ کے سامنے تیس نوجوانوں نے یکے بعد دیگر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے؛ ان میں سے ہر ایک آگے بڑھتا اور عرض کرتا : میری جان آپؐ پر نثار ہو۔ پھر پلٹ

کر واپس نہ آتا (ابن سعد ، ۲ : ۴۶)] ۔ احد کی لڑائی میں [بائیس مشرک قتل ہوئے جب کہ دوسری طرف] ستّر صحابہؓ شہید ہوئے [الزرقانی : شرح المواہب ، ۲ : ۱۸ تا ۴۶] ۔ سیدالشہداء حضرت حمزہؓ بھی ان میں شامل تھے ۔ کچھ دیر بعد قریشی لشکر مکے لوٹتا ہوا نظر آیا۔ [آپؐ نیچے تشریف لائے ، شہدا کی لاشوں کو جمع کیا ، ان پر نماز جنازہ پڑھی اور بڑی بڑی قبریں کھود کر ان میں متعدد شہدا کو دفن کر دیا گیا (ابن سعد، ۲ : ۴۳ تا ۴۴) ۔ اس سے فارغ ہوکر آپؐ] نے اپنی سپاہ کو واپس مدینہ منورہ کوچ کرنے کا حکم دیا اور یوں احد کی لڑائی ہار جیت کے بغیر اختتام کو پہنچی ؛ چنانچہ جیش اسلام نے نماز مغرب مدینہ منورہ میں آ کر ادا کی ۔

میدان جنگ سے تو مشرکین لوٹ گئے ، لیکن جب مدینہ منورہ سے آٹھ دس میل حمراء الاسد کے مقام پر پہنچے تو انھوں نے لڑائی کے انجام پر غور کیا تو انھیں پتا چلا کہ وہ جس کو مسلمانوں کی ہزیمت خیال کیے ہوئے تھے وہ خود ان کی اپنی ہزیمت ہے ، کیونکہ عساکر قریش جیش اسلام کو نہ تو میدان جنگ سے باہر نکلنے پر مجبور کر سکا اور نہ ہی کوئی اور نمایاں کامیابی حاصل کر سکا تھا ۔ اس بنا پر بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ پلٹ کر دوبارہ مسلمانوں پر حملہ کر دینا چاہیے [ابن ہشام، ۳ : ۱۰۸] ۔ آپؐ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپؐ نے تعاقب کرنے کا فیصلہ فرمایا ؛ چنانچہ [احد کی لڑائی کے دوسرے دن (ابن ہشام، ۳ : ۱۰۶) شوال [۳ ھجری] کو سرور کونین صلّی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم نے لشکر کو تیاری کا حکم دیا ۔ جب لشکر جمع ہو گیا تو آپؐ نے قریشی لشکر کے تعاقب کے احکم صادر فرمائے ، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ صرف وہی افراد اس لشکر میں شامل ہوں گے جو احد کی لڑائی میں حاضر تھے ۔ حضورؐ اس مہم میں حمراء الاسد

marfat.com
Marfat.com

کے مقام تک تشریف لے گئے۔ وهاں معسکر قائم کرنے کے بعد نظارتی گشتیں روانه کیں، قریشی لشکر چند میل دور [الرّوحاء] کے مقام پر خیمه زن تها - جونهیں ان کو معلوم هوا که حضور ؐ ان کے تعاقب میں مدینه منوره سے [نکل کر حمراء الاسد تک آ پهنچے هیں تو آگے بڑھ کر مقابله کرنے کی همت نه هوئی] - وه تیز رفتاری سے مکے روانه هو گئے ، البّته [بنو عبدالقیس کے ایک تجارتی قافلے کے ذریعے] آئنده سال بدر کے مقام پر دوباره مقابله کرنے کا پیغام بهیج دیا - جب آپ ؐ تک یه پیغام پهنچا تو آپ ؐ نے فرمایا : همارے لیے الله کافی هے - اس طرح آپ مدینه منوره لوٹ آئے (نیز رک به احد] - غزوۂ احد میں جیش اسلام کی برائے نام هزیمت کی خبر جونهیں قبائل عرب میں مشهور هوئی تو بهت سے قبیلے اهل اسلام کے خلاف اٹھ کهڑے هوے ؛ چنانچه اس فتنے کو فرو کرنے میں آپ ؐ کو خاصا وقت لگا .

جیش ابو سلمه ؓ بن عبدالاسد کی قَطن کو روانگی: آپ ؐ کو اطلاع ملی که عرب کے مشهور ڈاکو طلیحه بن خویلد اور سلمه بن خویلد مدینه منوره پر چهاپا مارنے کی تیاریاں کر رهے هیں تو آپ ؐ نے محرم ۴ھ میں حضرت ابو سلمه بن عبدالاسد المخزومی کو ڈیڑھ سو افراد کا دسته دے کر روانه فرمایا؛ چنانچه وه غیر معروف راستوں سے هوتے هوے جبل قطن میں اچانک دشمن کے سر پر جا پهنچے ـ دشمن اس طوفانی یلغار سے حواس باخته هو گیا اور ان کی جمعیت منتشر هو گئی ؛ چنانچه حضرت ابو سلمه سالماً و غانماً واپس تشریف لے آئے (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۵۰ ؛ الواقدی : کتاب المغازی ، ۱ : ۳۴۰ ببعد) .

سریة عبدالله ؓ بن اُنیس : آپ ؐ کو اطلاع ملی که سفیان بن خالد الهذلی اللحیانی ، عُرَنَة کے مقام پر جمعیت اکٹھی کر کے مدینه منوره پر یلغار کرنا چاهتا هے - آپ ؐ نے حضرت عبدالله ؓ بن انیس کو ۵ محرم الحرام [۴ھ] سوموار کو اکیلے هی روانه فرمایا . انهوں نے نهایت هوشیاری سے سفیان کو ختم کر دیا (ابن سعد ، ۲ : ۵۰ تا ۵۲) .

۴ھ میں بئر معونه [رک بآں] اور رجیع [رک بآں] کے واقعات پیش آئے جس سے بعض قبائل کی اسلام دشنی اور اهل اسلام کے خلاف ان کے عناد کا بخوبی اظهار هوتا هے - تفصیل کچھ یوں هے که صفر ۴ھ میں ابو براء عامر بن مالک بن جعفر ملاعب الاسنة الکلابی آپ ؐ کی خدمت میں حاضر هوا اور اپنی قوم کے لیے مبلغین بهیجنے کی درخواست کی - ان کی حفاظت کی ذمه داری خود اس نے اٹھائی۔ آپ ؐ نے ستر تربیت یافته قراء کی ایک جماعت کو ، جس کے امیرالمنذر بن عمرو الساعدی تهے ، روانه فرمایا - جب یه جماعت بئر معونه (جهاں بنو سُلیم اور بنو عامر کی سکونت تهی) پهنچی تو عامر بن الطفیل نے ، بنو سلیم کی جمعیت کے ساتھ ، ان پر هله بول دیا ، چنانچه سوائے ایک فرد کے تمام کو شهید کر دیا گیا .

انهی دنوں عَضَل اور القاره (قبائل) کی ایک جماعت حاضر هوئی اور مبلغین کو بهیجنے کی درخواست کی - آپ ؐ نے ان کے ساتھ دس قراء کی جماعت کو مَرثَد ؓ بن ابی مرثد کی زیر قیادت روانه فرمایا - یه جماعت جب مقام رجیع کے قریب پهنچی تو ان تمام کو بهی بے دردی کے ساتھ شهید کر دیا گیا - یه دو عظیم واقعات تهے ، جن میں تقریباً ۷۹ تربیت یافته افراد شهید هو گئے (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۵۱ تا ۵۶ ؛ الزرقانی : شرح المواهب ، ۲ : ۶۴ تا ۷۸)] .

اسی سال [یعنی ۴ھ میں] مدینه منوره کے مضافات میں رهنے والا دوسرا یهودی قبیله بنو نضیر [رک بآں] بغاوت پر آماده هوا ؛ یه وه یهودی قبیله

marfat.com
Marfat.com

ہے جس کے سردار سلام بن مشکم نے غزوۂ سویق کے موقع پر ابوسفیان کی مہمان نوازی کی تھی اور اسے مدینہ کے حالات سے آگاہ کیا تھا ۔ اس قبیلے نے [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کی ناپاک سازش تیار کی ۔ ان دنوں ان کا سردار حُیی بن اَخطب تھا ، آپؐ نے انھیں پیغام بھیجا کہ دس دن میں اپنے مکان خالی کر دو، ورنہ محاصرہ کر لیا جائے گا ۔ انھوں نے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی شہ پر لڑائی پر آمادگی ظاہر کی ؛ چنانچہ ربیع الاول ۴ھ میں ان کا محاصرہ کر لیا گیا] ۔ یہ لوگ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے ؛ پھر بنو نضیر نے خود ہی مدینہ منورہ سے چلے جانے کی خواہش ظاہر کی ۔ آپؐ نے انھیں معاف کر دیا اور سوائے ہتھیاروں کے باقی تمام سامان انھیں لے جانے کی اجازت دے دی [ابن ہشام ، سیرۃ، ۳ : ۱۹۹ تا ۲۱۲ ؛ الحلبی: سیرۃ حلبیۃ ، ۲ : ۵۵۹ ببعد].

غزوۂ ذات الرقاع : بنو غطفان بدر و احد میں قریش مکہ کی مدد کر چکے تھے ۔ ۴ھ میں ایک بار مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی تیاری بھی کی تھی ؛ جمادی الاولی ۴ھ [ابن ہشام: سیرۃ ، ۳ : ۲۱۴) یا ۱۰ محرم (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۶۱)] میں آپؐ کو اطلاع ملی کہ یہ طاقت ور قبیلہ مدینہ منورہ پر حملے کی دوبارہ تیاریاں کر رہا ہے ۔ حضورؐ نے چار سو [یا سات سو (ابن سعد ، ۱ : ۶۱)] صحابہ کرامؓ کا لشکر تیار کیا اور بنو غطفان کی خیمہ گاہوں کا رخ کیا ۔ جونہیں انھیں حضورؐ کی روانگی کی اطلاع ملی وہ پہاڑوں میں غائب ہو گئے ۔ لڑائی نہیں ہوئی؛ تاہم لڑائی کا شدید خطرہ رہا۔ اسی خطرے کے پیش نظر وہاں صلوٰۃ الخوف [رک بآں] پڑھی گئی۔ اسلامی لشکر چند روز ان کے علاقے میں خیمہ زن رہ کر واپس ہوا ۔ اس مہم کا نام غزوۂ ذات الرقاع ہے [ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۲۱۴ ببعد ؛ الزرقانی ، ۲ : ۸۶ ببعد].

غزوۂ بدرالاخیرہ یا بدر الموعد : ابوسفیان نے [الروحاء] سے واپس جاتے ہوئے آئندہ سال اسی موسم میں بدر کے مقام پر دوبارہ مقابلے کی دعوت دی تھی ؛ اسی لیے حضورؐ شعبان ۴ھ [(ابن ہشام ، ۳ : ۲۲۰)] یا ذوالقعدہ ، یہی قرین قیاس ہے (ابن سعد ، ۲ : ۵۹)] میں ایک ہزار [یا پندرہ سو (حوالۂ مذکور)] پر مشتمل لشکر لے کر بدر کی طرف روانہ ہوئے ؛ اس مرتبہ مدینہ منورہ میر عبداللہؓ بن رواحہ [(حوالۂ مذکور) یا عبداللہؓ بن عبداللہ بن ابی بن سلول الانصاری (ابن ہشام ، ۳ : ۲۲۰)] کو نائب مقرر کیا۔ وعدے کے مطابق ابوسفیان [دو] ہزار کا لشکر (جس میں پانچ سو کا سوارہ بھی تھا) لے کر مکہ سے روانہ ہوا ، مگر دوسرے پڑاؤ [الظہران کے کنارے مقام مَجَنّہ] سے ہی واپس لوٹ گیا اور کہا کہ اس سال جانوروں کے لیے چارے کی کمی ہے ، اس لیے لڑائی کرنا مناسب نہیں ۔ اسلامی لشکر ۸ روز کے قیام کے بعد بدر سے لوٹ گیا [الحلبی: سیرۃ حلبیۃ، ۵۷۹ تا ۵۸۰].

غزوۂ دُومۃ الجَندل : جزیرۃ العرب کے شمالی علاقے کے قبائل نے [دومۃ الجندل کے مقام پر ، جو دمشق سے پانچ منزل دور ہے] جمعیت فراہم کر کے شام کی شاہراہ پر کاروانوں کو تکلیف دینا شروع کر دیا تھا [اور وہ مدینہ منورہ پر یلغار کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے (ابن سعد ، ۱ : ۶۲)]۔ حضورؐ ایک ہزار کا لشکر لے کر [ربیع الاول ۵ھ میں] اس علاقے میں گشت کے لیے تشریف لے گئے۔ [آپ راتوں کو سفر کرتے ہوئے اچانک ان کے سر پر جا پہنچے ؛ وہ حواس باختہ ہو کر منتشر ہو گئے] ۔ آپؐ نے دومۃ الجندل میں کچھ دن قیام فرمایا اور [مدینہ منورہ پر متوقع حملے کے خطرے کا سد باب کرنے کے علاوہ آپؐ نے] شاہراہ کو قافلوں کے لیے

marfat.com
Marfat.com

پر امن بنانے کے بعد مدینہ منورہ مراجعت فرمائی [ابن سعد : طبقات ، ۲ : ۶۲] ۔

غزوۂ بنی المُصْطَلِق : شعبان ۵ھ (شرح المواھب ، ۲ : ۹۵) یا ۶ھ (ابن ہشام ، ۳ : ۳۰۲)] میں بنو خُزاعہ کی ایک طاقت ور شاخ نے حارث بن ابی ضرار کی سربراہی میں مدینہ منورہ پر لشکر کشی کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں ۔ [حضور ایک لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوے ۔ بنو مصطلق] نے معمولی سی جھڑپ کے بعد شکست قبول کر کے معافی مانگ لی ۔ آپ نے انھیں معاف کر دیا ۔ اسی سفر میں واقعہ اِفک [رک بہ عائشہ، ام المؤمنین] پیش آیا [الزرقانی : شرح المواھب ، ۲ : ۹۵ تا ۱۰۲)] ۔

اس دور کے واقعات کسی حد تک پچھلے دور کے واقعات سے ملتے جاتے ہیں ، مگر ایک فرق نمایاں ہے : اس دور میں قریش مکہ خود تو خاموش تماشائی بنے رہے؛ جب کہ ان کے حلیفوں کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف شرارت جاری رہی [غالباً در پردہ وہی انھیں بغاوت اور سرکشی پر آمادہ کر رہے تھے] ۔ اس دور کی سات مہموں میں سے چھے کی کمان حضور نے خود فرمائی؛ صرف ایک مہم کی کمان ایک صحابی کو دی [جس نے ایک قبیلے کی معاندانہ روش کا سدباب کیا] ؛ اس میں باقاعدہ لڑائی کا امکان نہ تھا ۔ جن موقعوں پر لڑائی کا امکان تھا، ان میں حضور نے کمان اپنے ہاتھ میں رکھی ۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صحابہ کرام کی تربیت کا پروگرام مکمل فرمانا چاہتے تھے ؛ نیز یہ کہ کمان داروں ، نائب کمان داروں ، بلکہ صف اول کے سپاہیوں تک کو آپ کے طرز عمل سے ہدایت حاصل ہوتی رہے ۔ اتنی زیادہ مہموں کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ اسلامی سپاہ ہمہ وقت ذہنی اور جسمانی طور پر تربیت کے اعلٰی معیار پر قائم رہتی ۔ اس دور کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قریش کے قافلوں پر تمام شاہراہیں مسدود ہو گئیں ، مگر اسلامی قافلوں کے لیے بہت کم رکاوٹ پیش آتی تھی۔

غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق : [اہل مکہ اور یہودِ خیبر ، جن میں بنو قینقاع اور بنو نضیر کے دو طاقت ور اور زبان آور قبیلے بھی شامل ہو چکے تھے ، اہل اسلام کے لیے ایک بار پھر متحد ہو کر میدان عمل میں کود پڑے ؛ چنانچہ] قریش مکہ کے پاس خیبر کے یہودیوں کی سفارت گئی اور انھیں اپنی پوری امداد کا یقین دلایا اور اس بات پر اکسایا کہ وہ مدینے پر حملہ آور ہوں [ابن ہشام ، ۳ : ۲۲۵ ببعد) ؛ صرف یہی نہیں بلکہ ایک مشترکہ سفارت مختلف بڑے اور افرادی قوت سے مالا مال قبائل ، مثلاً بنو غطفان ، قیس عیلان وغیرہ کے پاس گئی اور انھیں اسلامی حکومت کے خلاف اشتعال دلا کر اپنے ساتھ لڑائی میں شامل ہونے کی دعوت دی (کتاب مذکور، ۲۲۶ ؛ سیرۃ حلبیۃ ، ۳ : ۱۲۹ ببعد)] ۔

شوال ۵ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خفیہ پیغام کے ذریعے اطلاع ملی کہ قریشی فوج اور ان کے حلیف مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہو چکے ہیں ۔ قریشی فوج کی تعداد دس ہزار [ابن سعد ، ۲ : ۶۶) یا بیس ہزار (الیعقوبی : تاریخ ، ۲ بذیل غزوۂ احزاب)] بتائی گئی ہے ۔ اس فوج میں خیبر کے یہودی اور دوسرے قبائل اپنے اپنے لشکر ساتھ لائے تھے ۔ اتنے مختلف قبائل کا ایک ہی روز مدینہ منورہ کے باہر جمع ہونا ایک غیر معمولی بات تھی ۔ کتنا عرصہ منصوبہ تیار ہوتا رہا ہو گا اور کتنی سفارتیں ادھر ادھر سفر کرتی رہی ہوں گی ، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے ۔ جن قبائل کے لشکروں کی تفاصیل مؤرخوں نے تحریر کی ہیں وہ یہ ہیں :

marfat.com
Marfat.com

نام قبیله	فوج کی تعداد	کمان دار کا نام
قریش مکه	۴۰۰۰	ابوسفیان بن حرب
بنو غطفان		[عُیَیْنه بن حصن]
بنو اشجع	۴۰۰	[مِسْعَر بن رُخیله]
بنو مره	۴۰۰	الحارث بن عوف المری
بنو فزاره	۱۰۰۰	[عُیینه بن حصن الفزاری]
بنو اسد	تعداد نامعلوم	[طلیحه بن خویلد الاسدی]
بنو سلیم	۷۰۰	[سفیان بن عبد شمس]

ان کے علاوه کچھ دوسرے قبائل [مثلاً بنو سعد، یہود خیبر] بھی ساتھ تھے؛ بنو بکر، جو قریش کے پڑوسی تھے اور احد میں قریش کے ساتھ آئے تھے، وه بھی ضرور شامل ہوئے ہوں گے۔ ایسا اجتماع جزیرة العرب نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ [اس تمام لشکر کو آسانی کے لیے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ان سب کا سپه سالار ابوسفیان بن حرب تھا (سیرة حلبیة، ۲ : ۶۳۰، ۶۳۱؛ ابن سعد : الطبقات، ۲ : ۶۶)]۔

خندق : حضور اقدس[ؐ] نے اس بار فیصله کیا که مدینه کا دفاع شہر کے اندر ره کر کیا جائے؛ چنانچه اس غرض سے نو ہزار گز لمبی خندق کھودنے کا فیصله کیا گیا [رک به خندق]۔ اس خندق کو آبادی اور باغات کے ساتھ ملا کر نہایت محکم دفاعی خط (Line) تیار کیا گیا۔ لشکر اسلام کی تعداد تین ہزار تھی، مگر ان میں منافق بھی ضرور تھے۔ وقت بھی بہت کم تھا۔ چنانچه ۶ دن کے عرصے میں (ابن سعد : الطبقات؛ ۶ ہزار گز، یعنی ساڑھے تین میل لمبی خندق کھودی گئی۔ ہر شخص کو دو دو ذراع (ہاتھ) خندق کھودنے کا کام سپرد ہوا۔ تنہا حضرت سلمان[رض] نے پانچ ہاتھ خندق کھودی (الواقدی))۔ اس کا دفاع بڑی سوچ بچار اور تدبر سے ہی کیا جا سکتا تھا؛ اس طویل خندق پر اگر کم از کم دو تین ہزار کا لشکر چوکنا ہو کر پہره نه دیتا تو مخالف لشکر جب چاہتا خندق عبور کر سکتا تھا۔ قریش مکه اور ان کے حلیف مدینه منوره پہنچ کر [بئر رومه پر مدینے کے شمال مغرب میں، وادی العقیق میں] خیمه زن ہوئے؛ [جب که بنو غطفان اور ان کے ہمراہی وادی النعمان کے پاس ذَنَب نَقمیٰ سے جبل احد تک پھیل گئے (ابن ہشام، ۳ : ۲۳۰)]۔ قریشی لشکر کے پہنچنے پر آپ[ؐ] نے بھی اپنے لشکر کو خندق کے مختلف حصوں پر متعین فرمایا اور اپنا صدر مقام جبل سلع کی مغربی ڈھلوان پر قائم فرمایا۔ یہاں سے خندق کا بیشتر حصه نگاہوں کے سامنے رکھا جا سکتا تھا؛ محفوظه (Reserve) کو بھی قریب ہی متعین کیا گیا؛ عورتوں اور بچوں کو محفوظ قلعه [آطام] میں اکٹھا کیا گیا، مگر فرادی قلت کی وجه سے ان کی حفاظت کے لیے فوج مہیا نه کی جا سکی۔ خندق جنگ (Trench Warfare) کے لاتعداد مسائل ہوتے ہیں، جو خندق کھودنے اور اس کے تیار ہو جانے کے بعد کماندار کی توجه کے مستحق ہوتے ہیں، خندق کا محل وقوع، زمین کے نشیب و فراز کے پیش نظر سمت کی تبدیلیاں، خندق کی گہرائی، چوڑائی اور کمین گاه کی تفاصیل، مختلف حصوں کی ذمے داری کے باعث کمان داروں کا چناؤ اور محفوظه کے مقام سے مختلف حصوں کے راستے، یه سب اس طرح کے سوالات ہیں، جن کا جواب صرف کمان دار ہی دے سکتا ہے۔ اور وہی ان کے متعلق فیصله کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ صحابه کرام[رض] تربیت میں فن حرب و ضرب کی مشق کر رہے تھے۔

قریشی لشکر کی پیش قدمی : قریشی لشکر نے تین دن تک انتظار کیا اور پھر وه مدینه منوره کی طرف بڑھا۔ جب یه لشکر خندق کے پاس پہنچا تو

marfat.com
Marfat.com

سامنے پانچ گز گہری اور دس گز چوڑی خندق اور اس کے پار کھودی ہوئی مٹی کی فصیل نما کمین گاہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ [قریش مکہ کے لیے خندق ایک نئی چیز تھی ؛ چنانچہ ابوسفیان نے اپنے ایک مکتوب میں، جو اسی موقعے پر لکھا گیا، شدید حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ خندق کھودنا آپ[ص] کو سکھا کس نے دیا ؟ (الوثائق السیاسیہ، شمارہ ۶، ۷)۔ قریش مکہ نے متعدد مرتبہ اس کو پھلانگنے کی کوشش کی، مگر دوسری طرف سے پتھروں اور تیروں کی شدید بارش کی وجہ سے ان کی کوئی پیش نہ جا سکی (الواقدی : کتاب المغازی، ۴۶۵ ببعد)]۔

اسلامی لشکر کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا؛ پورے محاذ کی شب و روز گشت جاری رہتی۔ غزوۂ خندق کے دوران میں حٰم لا ینصرون [ابن ہشام، ۳ : ۳۳۷] کا لفظ باہمی پہچان (code word) کے لیے مقرر کیا گیا تھا تاکہ کہیں دو گشتیں (Patrols) آپس میں الجھ کر اتلاف (casualties) کا باعث نہ بنیں۔ خندق پر پہنچنے کے دوسرے دن کفار کے متحدہ لشکر نے کئی مقامات پر حملہ بولنے کی کوشش کی، مگر دفاعی دستے اس خوبی سے متعین کیے گئے تھے کہ دشمن کو کہیں بھی کامیابی نہ ہو سکی، [مگر دشمن مایوس نہ ہوا۔ بالآخر اسے ایک روز] ایک مقام ایسا مل گیا، جہاں سے خندق کا پاٹ کم تھا اور سرپٹ گھوڑا خندق کے پار کود سکتا تھا ؛ عکرمہ بن ابی جہل ایک چھوٹے سے دستے کے ساتھ [جس میں عمرو بن عبد وَد جیسا نامی پہلوان بھی شامل تھا]، اس مقام سے خندق عبور کر گیا۔ حضور[ص] نے فوراً حضرت علی[رض] کو ایک دستے کی کمان دے کر اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیا ؛ عمرو بن عبد ود نے مسلمانوں کو مبارزت کی دعوت دی۔ حضرت علی[رض] نے یہ دعوت قبول کی اور اسے قتل کر دیا۔ یہ دیکھ کر عکرمہ بن ابی جہل اور اس کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے، مگر نوفل [بن عبداللہ] کا گھوڑا خندق پار نہ کر سکا۔ حضرت زبیر[رض] نے خندق میں اتر کر اس کا سر قلم کر دیا۔ مکی کمان دار نے [عمرو بن عبد ود] کی لاش کی واپسی کے لیے دس ہزار درہم کی پیشکش کی، مگر رحمةٌ للعالمین[ص] نے اس کی لاش بغیر کسی معاوضے کے لوٹا دی [الواقدی، ۲ : ۴۷۰ تا ۴۷۱ ؛ الزرقانی : شرح المواھب، ۲ : ۱۱۴]۔ دوسرے دن پھر پورا متحدہ لشکر جگہ جگہ حملے کرتا رہا، مگر ناکام رہا۔ صرف ایک مقام پر معمولی سا خدشہ پیدا ہوا تھا کہ شاید دفاع کمزور ثابت ہو، [مگر صحابہ کرام[رض] کے بروقت اقدام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خوش تدبیری سے معاملہ رفع دفع ہو گیا (الواقدی، ۲ : ۴۶۸)]۔ خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور عکرمہ بن ابی جہل بار بار حملے کرتے رہے، مگر بے سود۔

ان کمانداروں نے بعد کے زمانے میں اپنی معاصر دنیا کے بہترین سپہ سالاروں کو بار بار شکست دی، مگر ان کے جوہر تو اسی وقت کھلے جب قبول اسلام کے بعد انھوں نے حضور[ص] کی تربیت میں کمانداری اور سپہ سالاری کے کامیاب اصول سیکھ لیے تھے ؛ اس سے قبل اپنی صلاحیتوں کے باوصف وہ ایک ناکام فوج کے ناکام کماندار ثابت ہوئے۔

جس روز قریش کا متحدہ لشکر احد کے قریب پہنچا تھا، اسی رات خیبر کے یہودی سردار حیی بن اخطب [سردار بنو نضیر] نے مدینہ منورہ کے مضافات میں رہنے والے یہودی قبیلے بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد سے ملاقات کی اور اس نے کعب بن اسد کو بغاوت، یعنی متحدہ لشکر کی مدد

marfat.com
Marfat.com

[illegible] ، اسلامی فوج پر اندر سے حملہ کرنے پر آمادہ کر لیا ۔ جب اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ یاد دلایا گیا تو اس نے کہا : ہمارا محمد کے ساتھ کوئی معاہدہ یا سمجھوتہ نہیں ہے [الواقدی ، ۲ : ۴۵۸] ۔ ایسے ماحول میں شہر کا دفاع مزید مشکل ہو گیا تھا ، مگر حضور اقدس کے پاے ثبات میں لغزش آنے کا سوال ھی پیدا نہیں ھو سکتا تھا ۔ بنو قریظہ کے یہودیوں نے اپنے قلعے کی جانب سے اسلامی دفاع کو کمزور کرنے کی کوشش کی ؛ اسی جانب وہ قلعہ تھا جس میں عورتوں اور بچوں کو رکھا گیا تھا ۔ ایک شام حضور کی پھپھی حضرت صفیہ نے دیکھا کہ ایک آدمی مشکوک طریقے سے قلعے کے قریب چل پھر رہا ہے تو وہ تنہا نیچے اتریں اور ڈنڈے سے اس کا کام تمام کر دیا ۔ اس کے بعد کسی یہودی کو ہمت نہ پڑی کہ اس سمت نظر اٹھا سکے ۔ [جب آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے دو سو اور تین سو افراد پر مشتمل دو دستے اس علاقے میں گشت کے لیے مامور فرما دیے تاکہ کسی اچانک صورت حال کا سامنا کر سکیں (الواقدی ، ۲ : ۴۶۰) ۔ ایسی ھی ایک جماعت سے ، جو دو سو افراد پر مشتمل تھی اور جس کی قیادت حضرت سلمہ بن اسلم کر رہے تھے ، یہودیوں کی ایک جماعت سے تصادم ہو گیا ؛ باہمی تیروں کے تبادلے کے بعد یہودی فرار ہو گئے (کتاب مذکور، ص ۴۶۲)] ۔ یہودیوں نے باہمی مشورے سے ابوسفیان کو کہلا بھیجا کہ وہ اس شرط پر مربوط حملے میں حصہ لیں گے] کہ کچھ قریشی رؤسا اس بات کی ضمانت میں ان کے حوالے کر دیے جائیں کہ وہ انھیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے] ۔ اتفاق کی بات کہ یہودیوں کی اس تجویز کی خبر حضور تک پہنچ گئی : آپ نے اپنے ایک جاسوس تک یہ خبر پہنچا دی کہ یہودی اس لیے قریشی رؤسا کا مطالبہ کر رہے ہیں تاکہ انھیں وہ یرغمالی بنالیں ۔ جاسوس نے فوراً یہ خبر ابوسفیان تک پہنچا دی ۔ اسے اس پر یقین آ گیا ؛ خدا کی قدرت کہ اسی رات سخت آندھی آئی اور خیمے الٹنا اور اڑنا شروع ہو گئے ؛ سامان تہ و بالا ہو گیا اور لوگ سردی سے ٹھٹھرنے لگے ۔ بہت سے قبیلے یہ حالت دیکھ کر پہلے ہی کھسک گئے تھے] ۔ ابوسفیان نے یہ حالت دیکھی تو اس نے یہ اعلان کر دیا کہ ہر کوئی اپنے اپنے علاقے کو لوٹ جائے ۔ [اس طرح وہ آندھی ، جو پورے جزیرۂ عرب سے اٹھی تھی خیروخوبی کے ساتھ دب دبا گئی [نیز رک بہ خندق]۔ دوسری صبح متحدہ لشکروں کے معسکر خالی تھے ۔ حضور نے یہ دیکھ کر فرمایا : آئندہ قریش ہم پر حملہ آور نہ ہوں گے ، بلکہ ہم ان پر حملہ کریں گے .

غزوات کا چوتھا دور : غزوۂ خندق کے بعد سے غزوات نبوی کا چوتھا دور شروع ہوتا ہے ۔ اس سے پہلے ، بالخصوص غزوۂ خندق کے دوران میں ، قریشی جارحیت اپنے عروج پر رہی۔ یہ دور جو غزوۂ بنو قریظہ سے شروع ہوا، صلح حدیبیہ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے ۔ چونکہ غزوات نبوی کا مقصد ہی صلح و امن کی فضا پیدا کرنا تھا ؛ [اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس معاہدہ کے بعد سے عالمگیر سطح پر اسلام کی ظاہری اور معنوی فتوحات کا آغاز ہوا ، جو حجة الوداع پر انتہا کو پہنچ گیا] ۔ اسی وقت الہ العلمین کی جانب سے تکمیل دین کی خوشخبری بھی سنائی گئی .

مدینہ منورہ کو بظاہر بیرونی دشمنوں سے نجات حاصل ہو چکی تھی ، مگر امر واقعہ یہ تھا کہ مدینہ منورہ کے اندر ابھی وہ دشمن (بنو قریظہ) موجود تھے ، جنھوں نے نہایت نازک وقت میں

marfat.com
Marfat.com

خطرناک صورت حال پیدا کر دی تھی ۔ اس قبیلے کا ہر فرد [غداری اور بغاوت کے جرم] میں موت کی سزا کا حق دار تھا ۔ [ہر ملک اور ہر قانون میں] جاسوسوں اور باغیوں کے لیے امان اور معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ۔

بنو قریظہ کے قلعے کا محاصرہ : غزوہ خندق سے لوٹنے کے فوراً بعد آپ نے بنو قریظہ کے قلعے کا محاصرہ کرنے کا حکم دے دیا ۔ ان کا قلعہ مضبوط تھا اور ان کے پاس ہتھیار بھی کافی تھے ، مگر محاصرہ برداشت کرنے کی ہمت جلد ہی ختم ہو گئی ۔ بالآخر انھوں نے درخواست کی کہ ان کے پرانے حلیف قبیلۂ بنو اوس کے سردار ، حضرت سعدؓ بن معاذ کو ان کے معاملے کا حکم بنایا جائے اور ان کے فیصلے کے مطابق ان سے سلوک کیا جائے ۔ حضرت سعدؓ غزوۂ خندق کے دوران میں زخمی ہو گئے تھے اور اب مسجد نبوی کے صحن میں نصب شدہ خیمے میں زیر علاج تھے ۔

حضور نے بنوقریظہ کی درخواست قبول کر لی اور حضرت سعدؓ بن معاذ کے لیے خچر روانہ کی ۔ جب وہ آپ کی خدمت میں پہنچے تو ان کے قبیلہ بنو اوس نے ان سے سفارش کی کہ وہ بنو قریظہ کے حق میں فیصلہ دیں ۔ انھوں نے جواب دیا کہ سعدؓ کے لیے وقت آ گیا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں کسی ناراضگی کی پروا نہ کرے ۔ حضرت سعدؓ نے فیصلے کا آغاز کرتے ہوئے فریقین کے مجمع سے پوچھا : کیا تم اللہ کے نام پر وعدہ کرتے ہو کہ سب میرا فیصلہ قبول کرو گے ؟ دونوں فریقوں کی طرف سے اثبات میں جواب آیا تو حضرت سعدؓ بن معاذ نے جو فیصلہ سنایا وہ یہ ہے : جو مرد ہتھیار بند ہونے کے قابل ہیں انھیں قتل کیا جائے ؛ ان کا مال و متاع ضبط کر لیا جائے اور عورتیں اور بچے قیدی بنا لیے جائیں [(ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۲۴۹ تا ۲۵۱)۔ حضرت سعدؓ کا یہ فیصلہ موسوی شریعت کے عین مطابق تھا (دیکھیے استثناء ، ۲۰ : ۱۰)] ۔ اس فیصلے پر عمل کیا گیا ، مگر جنھوں نے اسلام قبول کر لیا ان کی سزا معاف کر دی گئی ۔

غزوۂ بنی لحیان : بنو لحیان نے رجیع کے مقام پر مبلغین اسلام کو دھوکے سے قتل کر دیا تھا [رک بہ الرَّجیع]۔ جمادی الاولی ۶ھ میں اطلاع ملی کہ وہ اس مرتبہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں ۔ حضورؐ نے دو سو سوار ساتھ لیے اور ان کے علاقے [عُسفان] کا رخ کیا ، مگر انھیں بر وقت آپ کی آمد کی اطلاع مل گئی اور وہ تیزی سے پہاڑوں میں غائب ہو گئے ۔ اس غزوے کا نام غزوۂ بنی لحیان ہے [(ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۷۸ تا ۸۰)]۔

غزوۂ غابہ : دوسرے ہی مہینے عُیینہ بن حصن الفزاری نے ، جو پہلے بھی مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا اور غزوہ خندق میں بھی شامل تھا ، مدینے کی ایک چراگاہ پر چھاپہ مارا اور [دو آدمی] قتل کیے اور [بہت سے] اونٹ ہانک کر لے گیا۔[حضرت سَلَمہ بن عَمرو] بن الاکوع نے اس موقع پر بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا اور تن تنہا دشمن کا تعاقب کیا (ابن ہشام) ۔ اطلاع ملنے پر حضورؐ نے لڑاکا گشت حضرت سعدؓ بن زید کی زیر کمان روانہ کی ۔ حضورؐ خود بھی اس کے بعد روانہ ہوئے ۔ حضرت سعدؓ نے دشمن تک پہنچ کر کچھ اونٹ چھین لیے ، مگر دشمن کچھ جانوروں کو لے جانے میں کامیاب ہو گیا ۔ اس مہم کو غزوۂ ذی قَرَد اور غزوہ غابہ کہا گیا ہے [ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ ، ۲۹۳ تا ۳۰۱]۔

چار دیگر سرایا : اسی مہینے آپ نے چار سرایا روانہ فرمائے ۔ پہلا سریہ حضرت عُکّاشہؓ بن مِحصن الاسدی کی کمان میں چالیس مجاہدوں پر

marfat.com
Marfat.com

قبیلہ بنو اسد کے خلاف [مقام الغمر کی طرف] روانہ کیا گیا۔ دشمن یہ خبر سن کر منتشر ہو گیا اور کوئی لڑائی نہیں ہوئی [(ابن سعد، ۲ : ۸۴ تا ۸۵)]۔ دوسرا سریہ حضرت محمد‌رض بن مسلمۃ کی زیر قیادت دس مجاہدوں پر مشتمل [ذُوالقَصَّہ مدینہ منورہ سے ۲۴ میل کے فاصلے پر] روانہ کیا گیا۔ بنو ثعلبہ نے ایک سو افراد کی جمعیت کے ساتھ کمین گاہ میں بیٹھ کر ان میں سے نو مجاہدوں کو شہید کر ڈالا؛ حضرت محمد‌رض بن مسلمہ زخمی حالت میں مدینہ منورہ پہنچائے گئے۔ اس واقعے کی اطلاع ملتے ہی تیسرا سریہ حضرت ابو عبیدہ‌رض بن الجراح کی زیر کمان چالیس مجاہدوں پر مشتمل بنو ثعلبہ کے خلاف روانہ کیا گیا۔ بنو ثعلبہ اپنا مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ گئے، جو ضبط کر کے مدینہ منورہ پہنچا دیا گیا۔ چوتھا سریہ اسی مہینے میں حضرت زید‌رض بن حارثہ کے زیر کمان بنو سُلیم کے علاقے [الجموم] میں روانہ کیا گیا؛ بنو سلیم مسلمانوں کے خلاف ہر بڑی لڑائی میں قریش کے حلیف رہے تھے؛ اس مرتبہ پھر حملے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ سریہ کامیاب رہا۔ حضرت زید‌رض نے ان کے کچھ آدمی قیدی بنا لیے، مگر جب انھوں نے یقین دلایا کہ وہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں نہیں کر رہے تھے تو انھیں معاف کر دے دی گئی اور تمام قصور معاف کر دیے گئے [کتاب مذکور، ۸۶]۔

سریۂ طَرَف: جمادی الآخرۃ ۶ھ میں بنو ثعلبہ کو سزا دینے کے لیے حضرت زید‌رض بن حارثہ کی کمان میں [پندرہ افراد پر مشتمل] ایک لڑاکا گشت روانہ کی گئی؛ اس بار بھی وہ پہاڑوں میں منتشر ہوگئے۔ اس مہم کا نام سریہ [زید بن حارثہ الی] الطرف ہے۔ [طرف مدینہ منورہ سے ۳۶ میل کے فاصلے پر ہے]۔

سریہ وادی القری: رجب ۶ھ میں حضرت زید‌رض بن حارثہ کو بارہ مجاہد دے کر وادی القری کے علاقے میں روانہ کیا گیا۔ اس علاقے کے قبائل نے کچھ عرصہ قبل حضرت زید‌رض بن حارثہ کے نو ساتھیوں کو شہید کر دیا تھا اور وہ خود بھی زخمی ہو گئے تھے۔ [یہ قافلہ، جس پر حملہ کیا گیا تھا ایک تجارتی قافلہ تھا، جو وادی القری کے راستے شام کو جا رہا تھا؛ مقام وادی القری کے قبائل نے اس قافلے پر ہلہ بول دیا تھا (الواقدی، ۲ : ۵۶۴)]۔ جب وہ صحت مند ہو گئے تو خود انھیں کو اس علاقے میں بھیجا گیا کہ قصور وار قبیلے کو سزا دیں۔ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے اور اس دور دراز علاقے میں مجاہدوں کی مدد سے امن و امان قائم کیا۔ بار بار سرایا ان کی کمان میں بھیجے جانے سے ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہو گا کہ جلد ہی حضرت زید‌رض کو کوئی اہم ذمہ داری سونپی جائے گی۔ [جمادی الاخرۃ ۶ھ میں حضرت زید‌رض کی زیر قیادت ایک اور مہم حِسْمٰی کی طرف روانہ کی گئی، جہاں بنو جذام کے کچھ لوگوں نے آپ‌ص کے قاصد حضرت دِحیہ‌رض کلبی پر لوٹ ماری تھی اور انھیں تمام مال و متاع سے محروم کر دیا تھا۔ حضرت زید‌رض نے نہایت سرعت اور دانش مندی سے علاقے پر حملہ کیا اور مجرموں کو سزا دی؛ ان کے اموال ضبط کر لیے، جو معافی مانگنے پر انھیں واپس کر دیے گئے (ابن سعد، ۲ : ۸۸؛ الواقدی : المغازی، ۲ : ۵۵۵ تا ۵۶۰)]۔

دیگر سرایا: اسی مہینے میں حضرت عبدالرحمٰن‌رض بن عوف انصاری کی زیر کمان ایک تبلیغی گشت دُومۃ الجَندل کے علاقے [بنو کلب کی طرف روانہ کی گئی]؛ یہ سریہ کامیاب رہا اور اس کے نتیجے میں بنو کعب کے سردار [الاَصبغ بن عمرو الکلبی] نے اپنے قبیلے کے بہت سے افراد سمیت

marfat.com
Marfat.com

اسلام قبول کر لیا [اور اپنی بیٹی تُماضر بنت اصبغ کو حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف سے بیاہ دیا (ابن سعد ، ۲ : ۸۹)]- اسی مہینے میں حضرت علیؓ کی زیر کمان ایک گشت روانہ کی گئی ؛ اطلاع ملی تھی کہ اس علاقے میں بنو سعد مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے سلسلے میں [یہود خیبر سے ساز باز رکھتے ہیں اور انہیں مدد بہم پہنچاتے ہیں] ؛ اطلاع ملتے ہی بنو سعد اپنے کچھ جانوروں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں غائب ہو گئے - حضرت علیؓ کی اس مہم کا نام سریۂ فَدَک ہے ۔

اگلے مہینے یعنی شوال ۶ھ میں حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کی کمان میں تیس مجاہدین کو اسیر بن [زارم ؛ بقول بعض رازم ؛ نیز رِزام ؛ ابن کثیر نے یسیر بن رِزام یہودی لکھا ہے ، السیرۃ النبویہ ، ۳ : ۳۱۸)] کی طرف روانہ کیا گیا - ابو رافع سلّام بن ابی الحُقیق کے قتل کے بعد اسیر یہودیوں کا امیر بنا تھا - وہ ان دنوں بنو غطفان وغیرہ کے ساتھ مل کر دوبارہ مدینہ منورہ پر حملے کی تدبیریں کر رہا تھا ؛ تصدیق ہو جانے پر آپؐ نے یہ مہم روانہ فرمائی - حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے ان کو بارگاہ نبوی میں حاضر ہونے کے لیے کہا ؛ چنانچہ تیس یہودیوں کے ساتھ وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے پر رضامند ہو گیا - یہ تمام یہودی مسلمانوں کے ساتھ سواریوں پر بیٹھے ہوئے تھے - یہ قافلہ جب قَرقرۃ ثِبار [بقول دیگر نِیار ؛ خیبر سے چھے میل کی مسافت ہے] میں پہنچا تو یہودیوں نے دھوکے سے مسلمانوں کو قتل کرنا چاہا - بروقت مطلع ہونے پر مقابلہ ہوا ، جس میں اسیر اور اس کے ۲۸ ساتھی مارے گئے (ابن سعد ، ۲ : ۹۲)] - اسی مہینے کُرزؓ بن جابر الفِہری کی زیر کمان بنو عرینہ کے تعاقب میں ایک گشت روانہ کی گئی ، جو کامیاب رہی - [انھوں نے مدینہ منورہ کے اونٹوں پر حملہ بول دیا تھا اور ان کے چرواہے حضرت یسارؓ کو انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا تھا اور تمام اونٹ ہانک کر لے گئے تھے ؛ چنانچہ ان کے قصاص میں ان کو قتل کردیا گیا (شرح المواھب، ۲ : ۱۸۱)].

مجموعی طور پر اگر اس دور کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ متحدہ لشکر کی ناکامی کے بعد اب حملوں کا امکان کم ہو گیا تھا ، مگر ابھی تک مکمل طور پر امن و امان قائم نہیں ہوا تھا ؛ چونکہ اب صحابہ کرامؓ تجربہ حاصل کر چکے تھے ، اس لیے اب آپؐ کی زیر کمان مہموں میں کمی آ گئی تھی - [اب آپؐ زیادہ تر وقت مدینہ منورہ میں رہ کر کمان کرنے اور اہل اسلام کی روحانی و فوجی تربیت کرنے میں بسر فرمانے لگے تھے] - اب صحابی کمان داروں کی تربیت اس قدر ہو چکی تھی کہ انہیں زیادہ سے زیادہ ذمہ داری سونپی جا سکتی تھی - ریاست مدینہ کی روز افزوں وسعت کی وجہ سے حضورؐ کو صدر مقام میں رہ کر بین الاقوامی سیاسیات اور انتظامی امور کی طرف زیادہ توجہ دینا ہوتی تھی ۔

صلح حدیبیہ : اس دور کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اہل مکہ کی دونوں اہم تجارتی شاہراہیں مسدود ہو چکی تھیں ، جس کے نتیجے میں انہیں اقتصادی ضرب محسوس ہونا شروع ہو گئی ہو گی - اس دور کے مبصر کی بصیرت یہ بتا رہی ہو گی کہ اب مدینہ پیش قدمی کی طرف توجہ دے گا ، البتہ اگر حضورؐ کے اصل مقصد ، یعنی تبلیغ اسلام کی طرف توجہ دی جائے تو یہ سمجھنا آسان ہے کہ آپؐ کا یہ عظیم مقصد ، صرف زمانۂ امن میں حاصل ہو سکتا ہے - [آپؐ کو اور مہاجرینؓ کو مکہ مکرمہ چھوڑے تقریباً چھ سال ہو چکے تھے ؛ اپنا وطن بھلا کس کو پیارا نہیں ہوتا اور پھر مکہ تو

marfat.com
Marfat.com

محبوب وطن ہی نہیں بلکہ اہل اسلام کا قبلہ و کعبہ بھی تھا۔ اس بنا پر تمام صحابہ کرام‌رض کے دل اس کی زیارت کو مچلتے تھے۔ ۶ھ میں، جب کہ مدینہ منورہ کے آس پاس کے قبائل کے حملہ کرنے کا امکان کم ہو گیا تو آپ‌ص نے مشیت ایزدی (۴۸ [الفتح] : ۲۷) سے موسم حج سے پہلے عمرہ کرنے کا ارادہ فرمایا؛ چونکہ مکہ اصولی طور پر جائے امن تھا اور قریش اپنے کسی دشمن کو بھی وہاں آنے اور عمرہ یا حج ادا کرنے سے روکنے کے مجاز نہ تھے، اس لیے آپ‌ص کا یہ قصد خلاف اصول بھی نہ تھا۔ آپ‌ص کے اس ارادے کی خبر مشہور ہوئی تو چودہ سو صحابہ کرام‌رض تیار ہو گئے۔ آپ‌ص نے اعلان فرمایا کہ اس سفر میں تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ساتھ نہیں لے جایا جائے گا اور قربانی کے جانور آگے آگے ہانکے جائیں گے (ابن ہشام، ۳ : ۳۲۱ ببعد)]؛ چنانچہ ذوالقعدہ ۶ھ میں آپ‌ص مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے؛ روانگی سے قبل آپ‌ص نے ہر ممکن ذریعے سے اس سفر کے پر امن پہلو کو مشتہر کیا۔

قریش کو صلح کا ماحول منظور نہ تھا؛ وہ روز اول ہی سے دین اسلام کے وجود کو تسلیم کرنے سے منکر تھے اور اسے موقع نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح پھلے پھولے؛ اس لیے کہ ان کے خیال میں اگر یہ دین کہیں رائج ہو گیا تو پھر مسلمان طاقت پکڑ لیں گے اور ان پر غالب آ جائیں گے۔ قریش مکہ کی طرف سے اس طویل جنگ کی تہ میں اس انسانیاتی خدا پرستانہ نظام کا خوف تھا جس کو مان لینے سے اس دین کے پیرو چند افراد کو ان پر غلبہ حاصل ہونے کا امکان تھا۔ جب آپ‌ص [مقام عُسفان، جو جُحفہ [رک بہ میقات] اور مکہ کے درمیان ہے، پر پہنچے تو بِشر [بقول دیگر بُسر] بن سفیان الکعبی نے بتایا کہ اہل مکہ [کو آپ‌ص کی تیاری کا حال معلوم ہو گیا ہے اور انھوں نے تہیہ اور عہد کر رکھا ہے کہ وہ کسی صورت میں مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں داخل نہ ہونے دیں گے [ابن ہشام، ۳ : ۳۲۲)]؛ مزید پتا چلا کہ اہل مکہ کا [دو صد افراد پر مشتمل] سوارہ خالد بن ولید [یا عکرمہ ابن ابی جہل] کی زیر کمان [کُراع الغَمیم] کے مقام پر دفاعی محاذ کی اگلی چوکی کے طور پر راستہ روکے کھڑا ہے۔ حضور‌ص کو یہ سن کر سخت صدمہ ہوا اور آپ‌ص نے فرمایا: افسوس! قریش کو جنگ نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ مجھے عربوں سے نمٹنے کے لیے چھوڑ دیتے۔

اہل مکہ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جونہیں حضور‌ص کی مدینہ منورہ سے روانگی کی خبر سنی اپنے حلیف قبائل کو بلا بھیجا اور پورے جوش و خروش سے مرنے مارنے پر آمادہ ہو بیٹھے۔

حدیبیہ: حضور اقدس‌ص نے مکی سوارہ کی [کراع الغمیم] میں موجودگی کی خبر سن کر راستہ بدل دیا اور غیر معروف راستوں سے ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ سے تقریباً ۹ میل [ابن سعد، ۲ :۹۶]، مکہ مکرمہ اور جدہ کے درمیان جنوب کی طرف، حدیبیہ کے مقام پر فروکش ہو گئے۔ حضور‌ص کے اس طرح مکہ کی دہلیز تک پہنچ جانے سے اہل مکہ میں کھلبلی مچ گئی۔ اگرچہ دستور کے مطابق [اہل مکہ مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتے تھے، لیکن اہل اسلام کے مقابلے میں یہ لوگ تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر مرنے مارنے پر تل بیٹھے]؛ چنانچہ انھوں نے اپنی فوج کو حدیبیہ اور مکے کے درمیان متعین کر دیا، مگر فی الحقیقت لڑنے سے خائف بھی تھے، اس لیے گفت و شنید کی کوششیں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے قبیلہ خُزاعہ کا سردار [بُدیل بن وَرقاء الخزاعی]

marfat.com
Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کوشش کی کہ حضور مدینہ واپس چلے جائیں ۔ بدیل پر حضور کی گفتگو اور حسن اخلاق کا اتنا اثر پڑا کہ [اس نے واپس جا کر قریش مکہ کو کہا کہ آپ کے عمرہ ادا کر لینے میں کیا حرج ہے ، کیونکہ آپ کا مقصد قطعی طور پر لڑائی نہیں ہے ، مگر قریش نے بدیل کا مشورہ نہ مانا ، الٹا اسے متہم کرنے لگے (ابن ہشام ، ۳ : ۳۲۵)]۔

قریش نے اس کے بعد علی الترتیب مکرز بن حفص بن الاخیف، الحلیس بن علقمہ یا ابن زبان کو آپ کی خدمت میں بھیجا تاکہ وہ آپ کو واپس جانے پر آمادہ کر سکیں ؛ مؤخرالذکر آپ کے ان اونٹوں کو دیکھ کر بہت متأثر ہوا جو آپ حرم میں ذبح کرنے کے لیے لائے تھے ؛ چنانچہ اس نے قریش مکہ کو آپ کو عمرہ کرنے کی اجازت دینے پر آمادہ کرنا چاہا ، مگر وہ نہ مانے ۔ اس کے بعد] طائف کے سردار عروہ بن مسعود الثقفی کو روانہ کیا گیا ؛ عروہ ابوسفیان کا داماد بھی تھا ۔ وہ بھی ناکام رہا اور واپس جا کر اہل مکہ کو مشورہ دیا کہ جنگ سے احتراز کریں ورنہ مسلمان مکہ پر قبضہ کر لیں گے ۔ اہل مکہ نے پچاس آدمی روانہ کیے کہ مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہوکر (معاذ اللہ) حضور کو قتل کر دیں ۔ ان سب کو پکڑ لیا گیا، ان کے ہتیار لے لیے گئے، مگر خود انھیں معاف کر دیا گیا ۔ [عروہ کے بعد قریش کی سفارت کا سلسلہ منقطع ہوا تو آپ نے معاهدۂ صلح کی سلسلہ جنبانی کرتے ہوے پہلے خراش بن امیہ الخزاعی کو اپنے اونٹ پر مکہ مکرمہ بھیجا ؛ قریش نے ان کے اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور خراش کو بھی قتل کرنا چاہتے تھے مگر احابیش [رک بآں] نے انھیں قتل ہونے سے بچا لیا ۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت عثمانؓ کو روانہ فرمایا ۔ حضرت عثمانؓ تین دن تک نہ لوٹے اور مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ انھیں قتل کر دیا گیا ہے ۔ سفیر کا قتل ریاست کی آزادی و خود مختاری کے خلاف جارحانہ عمل کے مترادف ہوتا ہے ؛ حضور نے تمام صحابہؓ کو جمع کیا (اور تمام صحابہ کرامؓ سے خون عثمانؓ کے لیے عزم شہادت پر بیعت (رک بآں) لی ۔ اس بیعت کو بیعت رضوان بھی کہا گیا ہے اور قرآن کریم (۴۸ [الفتح] : ۱۸ ببعد) میں اس کی مدح و ستائش کی گئی ہے [(رک بہ حدیبیہ)] ۔ تمام صحابہ کرامؓ نے بیعت رضوان میں شرکت کی ۔ مکہ کے جاسوسوں نے جب یہ اطلاع مکہ مکرمہ پہنچائی تو قریش کو صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوا ، وہ عزم شہادت کی اس بیعت کا مفہوم بخوبی سمجھتے تھے ؛ چنانچہ انھوں نے نہ صرف حضرت عثمانؓ کو رہا کر دیا بلکہ سہیل بن عمرو کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاهدے کے لیے بات چیت کرنے اور شرائط صلح طے کرنے کے لیے بھیجا ۔ سہیل بدر کے قیدیوں میں شامل تھا اور اس نے فدیہ دے کر رہائی حاصل کی تھی ۔ [معاهدے کی شرائط طے ہونے میں کافی ردو قدح پیش آئی (ابن ہشام ، ۳ : ۳۳۱)]۔ پھر جب شرائط طے ہو گئیں تو قریش کی طرف سے معمولی معمولی باتوں ، مثلاً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے شروع میں لکھنے اور آپ کا نام محمد رسول اللہ کے لکھنے پر اعتراض کیا گیا ۔ آپ قریش کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتے تھے ، اس لیے آپ نے ان کی آرا کو ملحوظ رکھا ۔

صلح حدیبیہ کی شرائط : صلح حدیبیہ کی شرائط یہ تھیں : (۱) دس سال کے لیے باہمی جنگ بند کی جائے گی ؛ [اس دوران میں دونوں فریق ایک دوسرے سے پوری طرح امن و آشتی سے رہیں گے] ؛ (۲) جو کوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و

marfat.com
Marfat.com

وسلم کی طرف سے اس معاہدے میں شریک ہونا چاہے وہ ایسا کر سکتا ہے اور جو قریش مکہ کی طرف سے اس معاہدے میں شامل ہونا چاہے تو وہ بھی شامل ہو سکتا ہے] ؛ (۳) اگر کوئی شخص اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر حضرت محمد[ص] کے پاس مدینہ منورہ میں جائے گا تو اسے اس کے والی کے پاس واپس بھیج دیا جائے گا ؛ اگر کوئی مسلمان قریش کے ساتھ مل جائے گا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا ؛ (۴) حضرت محمد[ص] اس سال شہر میں داخل ہوئے بغیر لوٹ جائیں گے ، البتہ آئندہ سال مکہ مکرمہ آنے کی اجازت ہو گی ۔ وہ اور ان کے اصحاب مکہ مکرمہ میں صرف تین دن ٹھیر سکیں گے ۔ اس دوران میں اہل مکہ شہر چھوڑ جائیں گے ۔ مسلمان ہتھیاروں کے ساتھ شہر (مکہ) میں داخل نہیں ہوں گے ، ماسوا تلوار کے ، جو نیام میں ہو گی ۔

[اہل مکہ اور بعض مسلمان بھی یہ سمجھتے تھے کہ یہ معاہدہ اہل مکہ کے حق میں ہے ؛ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ] اگر فریقین کے مقاصد حیات کو مد نظر رکھا جائے تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ [یہ معاہدہ نہ صرف آپ[ص] کے حق میں تھا ، بلکہ] اس سے حضور[ص] اقدس کا مقصد بھی احسن طور پر پورا ہو گیا تھا ۔ اب آپ[ص] تبلیغ اسلام کی جانب یکسوئی سے متوجہ ہو سکتے تھے ۔ نیز آپ[ص] اس عرصے میں اطمینان کے ساتھ دوسرے دشمنوں (مثلاً یہود خیبر) سے نمٹ سکتے تھے ، جو نِت نئے فتنے اٹھاتے رہتے تھے ۔ قریش مکہ کو بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی تجارت جنگ کی وجہ سے معطّل ہو چکی تھی اور اس طرح انھیں اپنی اقتصادی تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا ۔ اس معاہدے کے نتیجے میں وہ تجارت کی از سرنو بحالی کر سکتے تھے ، مگر انھیں اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی ۔ صلح کی وجہ سے مسلمان پہلے سے بھی زیادہ طاقتور ہو گئے ۔ [اسی بنا پر اس صلح کو قرآن کریم (۴۸ [الفتح] : ۱ ببعد) میں فتح مبین کہا گیا ہے ، کیونکہ اس صلح نے اسلام کے سامنے سے اس دیوار کو ہٹا دیا ، جو اس کا ایک عرصے سے راستہ روکے ہوئے تھی ۔ اس طرح اسلام کے لیے وہ سازگار ماحول میسر آ سکا جس کے نتیجے میں لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے ۔ ابن ہشام اپنی کتاب (سیرة ، ۳ : ۳۲۶) میں امام الزّہری کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ] اس سے بڑی فتح اسلام کے لیے کبھی نہ ہوئی تھی ۔ جب جنگ ممنوع قرار دی گئی اور صلح ہو گئی اور لوگ بے خوف و خطر آپس میں ملنے لگے تو مسائل پر بحثیں ہونے لگیں ، جس کے نتیجے میں لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے ۔ ان دو سالوں میں پہلے سے دگنی تعداد میں لوگ اسلام لائے ۔ جونہیں یہ معاہدہ مکمل ہوا ، بنو خُزاعہ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی طرف سے اور بنو بکر نے قریش مکہ کی طرف سے اس معاہدے میں شمولیت کا اعلان کیا ۔

غزوۂ خیبر ؛ صلح کے نتائج : [خیبر بنو قینقاع اور بنو نَضیر کے آباد ہونے سے اسلام کے خلاف دوسرے بڑے مرکز میں تبدیل ہو چکا تھا ۔ غزوۂ احزاب میں قریش سے زیادہ یہود خیبر کا ہاتھ تھا ۔ انھوں نے بہت سے قبائل (مثلاً بنو غطفان) کو ایک سال کی رسد کی رشوت دے کر آپ[ص] کے خلاف بھڑکایا تھا [رک بہ خندق] ۔ یہودی بنو غطفان جیسے طاقتور قبیلے کو اپنے ساتھ ملا کر ایک مؤثر طاقت پیدا کر رہے تھے] ۔ ان حالات میں یہود خیبر اور بنو غطفان کی جانب سے ایک بار پھر بھرپور جارحیت کا ارتکاب غیر متوقع نہیں تھا ۔

حدیبیہ سے لوٹ کر حضور[ص] نے [ذوالحجّہ اور مُحرم کے کچھ ایام تک مدینہ منورہ میں قیام فرمایا] اور جب خیبر اور بنو غطفان کی [پر اسرار

marfat.com
Marfat.com

سرگرمیوں کی ، جو صلح حدیبیہ کے بعد عروج پکڑ گئی تھیں]، اطلاع ملی تو آپؐ نے اس مہم کی تیاری شروع کر دی ۔ [الواقدی (۲ : ۶۳۷) کے مطابق ان کی جنگی تیاریوں کا یہ عالم تھا کہ یہ لوگ ہر روز دس ہزار کی تعداد میں باہر نکل کر صف بندی (غالباً پریڈ) کرتے اور کہتے کہ ہم دیکھیں گے کہ محمدؐ ہم پر کس طرح فتح حاصل کرتا ہے] ۔

آپؐ نے ہمیشہ کی طرح اپنی مہم کا ہدف خفیہ رکھا ۔ یہودی اپنے گزشتہ کردار سے واقف تھے ۔ ان کے پاس تقریباً دس ہزار ہتھیار بند افراد موجود ہونے کے باوجود انھوں نے بنو غطفان سے بھی ایک ہزار جوان منگوائے اور انھیں اپنے مضبوط ترین قلعے میں داخل کر لیا ۔ علاوہ ازیں ، دونوں کے درمیان طے پایا کہ اگر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خیبر پر حملہ کیا تو بنو غطفان چار ہزار مزید لشکر سے اسلامی لشکر پر عقب سے حملہ آور ہو جائیں گے اور یوں مسلمانوں کے نسبتاً کم تعداد لشکر کو دو طرفہ حملے سے مکمل طور پر ختم کر دیا جائے گا ۔

روانگی : محرّم ۷ھ [(ابن ہشام ، ۳:۳۴۳) میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اس اہم اور نہایت نازک مہم پر روانہ ہوئے ۔ کوچ کی سمت مدینہ سے شمال کی جانب تھی ۔ حضورؐ نے خیبر جانے کے لیے جو راستہ اختیار کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ ان دو دشمنوں [یہود و بنو غطفان] میں سے آپؐ کس پر حملہ کریں گے ۔ جونہیں بنو غطفان کو اطلاع ملی کہ اسلامی لشکر مدینہ سے روانہ ہوگیا ہے انھوں نے اپنے چار ہزار کے لشکر کو خیبر کی جانب حرکت دی ۔ وہ ایک ہی منزل چلے تھے کہ انھیں اطلاع ملی کہ حضور اقدسؐ الرّجیع کی وادی میں رک گئے ہیں ۔ یہ مقام ایسا تھا [جو خیبر اور بنو غطفان کے مابین واقع تھا اور] جہاں سے بنو غطفان پر بھی حملہ کیا جا سکتا تھا ۔ بنو غطفان کو اپنی خیمہ گاہوں کی فکر پیدا ہو گئی ۔ وہ فوراً پلٹ کر اپنے علاقے کی خبر گیری کی طرف متوجّہ ہو گئے ۔

آپؐ نے [الرّجیع] میں اپنا معسکر قائم کیا ، جہاں سے مسلسل رات دن خیبر پر یلغار جاری رکھی۔ خیبر کی وادی میں یہودیوں کے بارہ قلعے تھے، جو وادی کی دونوں سمت تزویراتی (Strategic) نقطۂ نظر سے تعمیر کیے گئے تھے ۔ ان کی دوسری بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو تدبیراتی (tactical) طور پر بھی کمک پہنچا سکتے تھے ۔ یہودیوں کو بنو غطفان کے علاوہ شمال میں شام کی رومی حکومت سے بھی مدد کی توقع تھی ۔ ان تمام باتوں کا علاج آپؐ نے اس طرح فرمایا کہ خیبر پر حملہ جنوب کی طرف سے نہ کیا جائے ، بلکہ شمال کی جانب سے کیا جائے ؛ اس طرح اگر یہودی خیبر کے قلعے خالی کرکے شام کی طرف جانا چاہتے تو ان کو روکا جا سکتا تھا ۔

ایک صبح جب خیبر کے یہودی اپنے اہل اور دیگر زرعی اوزار اٹھائے کھیتوں کو جانے کے لیے نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ اسلامی فوج نے ان کا شمالی جانب سے محاصرہ کیا ہوا ہے ۔ آپؐ رات ہی رات میں وہاں پہنچ گئے تھے، مگر آپؐ نے ہمیشہ کی طرح حملے کے لیے صبح کا انتظار کیا ؛ چنانچہ یہودی اپنے قلعوں کی جانب یہ پکارتے ہوئے دوڑے کہ محمدؐ اور اس کی فوج آ گئی ہے ۔ [آپؐ نے یہ سن کر مسلمانوں کو فتح خیبر کی بشارت دی] ۔

سب سے پہلے ناعِم نامی قلعہ فتح کیا گیا ، جس میں افرادی قوت کم اور مال و متاع زیادہ تھا ۔ [اس کے فتح ہونے پر عسکر اسلام کو بہت فائدہ پہنچا] ۔ یہ یہودی سردار مرحب کا قلعہ تھا ، مگر مرحب اس قلعہ میں نہ تھا ۔ اسے جنوب کے سب سے

marfat.com
Marfat.com

مضبوط قلعے خصوص میں متمکن کیا گیا تھا۔ ناعم کے بعد القموص نامی قلعہ فتح ہوا [جو خاندان ابو الحقیق اور ام المؤمنین حضرت صفیہ کا مسکن تھا؛ یہ قلعہ دوسرے تمام قلعوں سے زیادہ مضبوط اور محفوظ تھا۔ یہاں حضرت علیؓ نے خصوصی شجاعت کا مظاہرہ کیا اور اس کے بعد [دوسرے قلعے فتح ہوتے رہے] ۔

پہلے روز کے بعد قلعوں کے فتح ہونے کی رفتار قدرے سست ہو گئی۔ وادی خیبر کے محاصروں نے دو ماہ کا طول کھینچا۔ جوں جوں مفتوح قلعوں کی تعداد بڑھتی گئی، انتظامی ذمہ داریوں اور قیدیوں کی دیکھ بھال کی مصروفیتوں میں اضافہ ہوتا گیا، جبکہ اسلامی لشکر کی تعداد صرف ۱۶ سو تھی ۔

یہودیوں کی مقاومت: جنگی اقدامات کے ساتھ ساتھ حضور اکرمؐ نے صلح کی کوششیں بھی جاری رکھیں؛ قلعہ النطاۃ، جس کا کمان دار مرحب تھا اور جس میں بنو غطفان کے چار ہزار ہتیار بند بھی تتعین تھے، عسکر اسلامی کے لیے سب سے زیادہ پریشانی کا موجب بنا۔ آپؐ نے پہلے حضرت سعدؓ بن عبادہ کو عیینہ بن حصن [سردار بنو فزارہ (=غطفان)] کے پاس روانہ کیا کہ اسے صلح پر رضامند کرے۔ مرحب نے یہ ملاقات قلعے کے اندر نہ ہونے دی تاکہ مسلم سفیر قلعے کی تفاصیل سے آگاہ نہ ہو جائے۔ دونوں کی ملاقات قلعے سے باہر ہوئی، [لیکن قدرت کی طرف سے ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ عیینہ کو اپنے مقام سکونت الروحاء کی طرف لوٹنا پڑا] اور اس طرح سمجھوتا نہ ہو سکا۔ مرحب کے قلعے کا محاصرہ دس روز تک کیا گیا۔ گیارھویں روز مرحب رجز پڑھتا ہوا قلعے سے باہر نکل آیا اور مبارزت طلب کی۔ حضورؐ سے محمدؓ بن مسلمہ نے اجازت مانگی تاکہ اپنے بھائی محمودؓ کا بدلہ لیں [جسے چکی کا پاٹ پھینک کر شہید کر دیا گیا تھا]۔ آپؐ نے اجازت دے دی۔ دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے پر پینترے بدل بدل کر وار کرتے رہے۔ مرحب نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کے سر پر وار کیا، انہوں نے نہایت تیزی سے یہ وار اپنی ڈھال پر لیا، تلوار ڈھال پر پڑی اور الجھ گئی اسی لمحے حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے مرحب پر بھرپور وار کیا، تلوار اس کا سر چیرتی ہوئی گردن تک جا پہنچی [الواقدی: کتاب المغازی، ۲: ۶۵۴ تا ۶۵۶؛ ابن ہشام، ۳: ۳۴۸) - وہ زخمی حالت میں گر پڑا، حضرت علیؓ نے اس کا سر قلم کیا (حوالۂ مذکور)۔ دوسری روایت میں، جو عام طور پر کتب سیرت میں متداول ہے، مذکور ہے کہ حضرت علیؓ اس کے مقابلے میں نکلے تھے (ابن سعد: الطبقات، ۲: ۱۱۲)]۔ مرحب کے بعد اس کا بھائی یاسر آگے بڑھا، اسے حضرت زبیرؓ نے قتل کیا۔ اس روز حضرت علیؓ عسکر اسلامی کے علمبردار تھے۔ اسی طرح حصن الشق، حصن النطاۃ اور حصن الکتیبۃ، پھر حصن الوطیح اور السلالم فتح ہوئے؛ مؤخر الذکر دو قلعے دو ہفتوں کی تگ و دو کے بعد فتح ہوئے] ۔ خیبر کی پوری وادی مسخر ہو جانے پر یہودیوں نے استدعا کی کہ انہیں آدھی پیداوار کی بٹائی کی شرط پر بطور کاشت کار رہنے دیا جائے۔ حضورؐ نے ان کی یہ درخواست قبول فرما لی۔ ایک شرط یہ رکھی کہ حکومت مدینہ جب چاہے گی خیبر کی وادی یہودیوں سے خالی کروا لے گی۔ اس مہم میں انیس بیس مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ دشمن کے ترانوے آدمی مارے گئے۔ [اگر آپؐ یہودیوں سے ان کی شریعت (استثنا، ۲۰: ۱۰) کے مطابق سلوک فرماتے تو ان تمام کو قتل کر دیا جاتا اور ان کے بال بچوں کو غلام بنا لیا جاتا، مگر رحمت دو عالمؐ نے فراخ دلی اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہودیوں کو نہ صرف معاف کیا، بلکہ نصف پیداوار کی بٹائی پر انہیں ان کی زمینوں پر بحال رہنے دیا] ۔

marfat.com
Marfat.com

یہودیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا اس کی شرائط یہ تھیں : (۱) یہودی آئندہ قلعوں میں سکونت اختیار نہیں کریں گے ؛ (۲) یہودی اپنے تمام ہتیار اور جنگی ساز و سامان مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے ؛ [حکومت مدینہ جب چاہے گی انھیں خیبر سے نکال سکے گی]؛ (۳) تمام دفینے حکومت مدینہ کے حوالے کر دیں گے ؛ (۴) اگر یہودی ان شرائط کی خلاف ورزی کریں گے تو جو سامان انھیں بخشا گیا ہے وہ واپس لے لیا جائے گا .

اس معاہدے پر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ، حضرت عمر فاروق رضؓ، حضرت علی رضؓ اور حضرت زبیر رضؓ نے بطور گواہ دستخط کیے .

فَدک اور تَیماء : فدک اور تیماء کے یہودیوں نے لڑائی کے بغیر ہی شکست تسلیم کر لی ۔ ان سے بھی تقریباً انھیں شرائط پر معاہدہ طے ہوا جن پر اہل خیبر سے ہوا تھا ۔ وادی القُریٰ کے یہودی بھی مدینہ کے مخالفین میں شامل رہ چکے تھے ۔ ان کی درخواست پر انھیں بھی معاف کر دیا گیا اور انھیں شرائط پر آباد رہنے کی اجازت دی گئی جو اہل خیبر کے ساتھ طے ہوئی تھیں ۔ بنو غَطفان، جو شروع سے ہی مدینہ کے خلاف لشکر کشی کرتے رہے تھے ، وہ ابھی تک دوستانہ تعلقات کی طرف مائل نہ ہوے تھے ۔ نجد میں ان کے علاوہ اور کوئی ایسا اہم قبیلہ نہ رہا تھا جس نے مدینہ کی حاکمیت قبول نہ کی ہو .

سریۂ بنو غطفان : بنو غطفان کی شاخ بنو فزارہ نے ایک بار پھر پہل کی کوشش کی اور بنو محارب اور دوسرے قبائل کو جمع کرنا شروع کر دیا ۔ حضورؐ نے مجاہدین کا ایک دستہ [حضرت ابوبکر رضؓ کی قیادت میں روانہ کیا ، معمولی قتال کی نوبت آئی اور جیش اسلام کامیاب و کامران لوٹا ؛ یہ واقعہ شعبان ۷ھ کا ہے (ابن سعد ۲ : ۱۱۷ تا ۱۱۸ ؛ الواقدی ، ۲ : ۷۲۲)] .

عرب سے باہر تبلیغ : فتح کے بعد سے جزیرۃ العرب کو متحد کرنے اور مختلف قبائل کو ایک ہی ریاست میں مدغم کرنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ۔ یہ دور تبلیغ اسلام کا بھی نمایاں دور ہے ۔ اس دور میں اسلام کی آواز صحرائے عرب سے نکل کر آس پاس کی طاقت ور مملکتوں کے درباروں تک جا پہنچی ؛ بعض نے اس آواز کو سمجھا ، مگر قلب و ذہن زنگ آلود ہی رہے ؛ کسی نے اس پیغام کی تضحیک کی، مگر امن و سلامتی، ایمان اور دولت دنیا صرف انھیں کو نصیب ہوئی جنھوں نے اس آواز کی دل سے تصدیق کی۔ [تبلیغ و اشاعت اسلام کے دور میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جنھوں نے اسلامی دنیا کا محاذ جنگ جزیرۂ عرب سے روم و فارس کے ممالک تک وسیع کر دیا] .

سریہ عمرؓ بن الخطاب : بنو ہوازن کی ایک شاخ مدینہ منورہ کے قریب [مقام تُربہ میں ، جو مکہ مکرمہ سے صنعاء و نجران کے راستے پر چار منزل کے فاصلے پر واقع ہے ، آباد تھی ، آپؐ کو پتا چلا کہ انھوں نے مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تیاری شروع کر رکھی ہے ؛ حضرت عمر فاروق رضؓ کی کمان میں تیس مجاہدوں کا دستہ روانہ کیا گیا ۔ اسلامی سپاہ کی آمد کی خبر سن کر یہ لوگ پہاڑوں میں منتشر ہو گئے ۔ [حضرت عمر رضؓ بغیر کسی تصادم کے مدینہ منورہ لوٹ آئے] .

سریۂ غالب بن عبداللہ : [نجد کے ایک کنارے المَیْفَعَہ میں آباد بنو عُوال اور بنو عبد بن ثعلبہ نے] ایک بار پھر بغاوت پر آمادگی ظاہر کی ۔ [ان کی سرکوبی کے لیے حضرت غالب رضؓ بن عبداللہ اللَّیثی کو ایک سو تیس مجاہدین کے ایک دستے کے ساتھ رمضان ۷ھ میں روانہ کیا گیا] ۔ انھوں نے معمولی سی جھڑپ کے بعد شکست قبول کر لی اور معاف کر دیے گئے (ابن سعد ، ۲ : ۱۱۹) .

marfat.com
Marfat.com

[سریۂ بشیرؓ بن سعد : انھی دنوں آپؐ کو خبر ملی کہ عیینہ بن حصن الفزاری بنو غطفان کے بعض دوسرے قبائل کے ساتھ الحاق کرکے مدینہ منورہ پر زبردست چھاپہ مارنا چاھتا ہے ۔ یہ اطلاع لانے والے بشیرؓ بن سعد انصاری تھے ۔ آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کے مشورے سے انھیں کی قیادت میں تین سو مجاھدین کا ایک جیش شعبان یا شوّال ۷ھ میں یُمن کے مقام الجناب کی طرف روانہ کیا ۔ ان کی خیمہ گاھیں ویران تھیں ، لیکن جیش اسلامی کی مدینہ منورہ مراجعت کے دوران میں عقب سے انھوں نے ھلّہ بول دیا] ۔ سخت لڑائی کے بعد انھیں شکست ھوئی ؛ ان کے دو آدمی ھلاک اور کچھ قید ھوے ، جب کہ باقی ماندہ بچ نکلنے میں کامیاب ھو گئے ؛ ان کی تیر اندازی اتنی ماھرانہ تھی کہ مدنی جماعت کے کئی افراد زخمی ھو گئے تھے [الواقدی ، ۲ : ۲۷ے تا ۲۹ے] .

[قبائل عرب کے خلاف مندرجہ ذیل مہمیں بھی اسی دوران میں روانہ کی گئیں] :

سریہ ابن ابی العَوجاء السُلَمیؓ : بنو سُلیم کا شمار بھی ان اسلام دشمن قبائل میں ھوتا ہے جنھوں نے بار بار اسلامی حکومت کے خلاف خروج کی کوشش کی ۔ اس مرتبہ بھی یہ لوگ تیاریوں میں مصروف تھے کہ آپؐ کو ان کی تیاریوں کا حال معلوم ھو گیا ۔ آپؐ نے ابن ابی العَوجاء کی قیادت میں پچاس افراد کا ایک دستہ ارسال کیا ۔ بنو سلیم کی طرف سے سخت مزاحمت ھوئی ، مگر جیش اسلامی نے تیروں کی بارش میں بھی پہلے دعوت اسلام کے فریضے کو پورا کرنا ضروری خیال کیا ، لیکن جب ان پر اثر نہ ھوا تو پھر سخت لڑائی ھوئی، جس میں جیش اسلامی کا بھی خاصا نقصان ھوا ، مگر بنو سلیم کو بہت نقصان اٹھانا پڑا (ابن سعد ، ۲ : ۱۲۳).

سریہ غالبؓ بن عبداللہ اللیثی : آپؐ کو اطلاع ملی کہ بنو لیث کی ایک شاخ بنو المُلَوَّح ، جو مقلم الکَدِید میں سکونت پذیر ہے ، اسلام دشمن سرگرمیوں میں شریک ہے ؛ آپؐ نے صفر ۸ھ میں حضرت غالبؓ بن عبداللہ اللَّیثی کی کمان میں ۱۲ افراد پر مشتمل ایک دستہ ارسال کیا ۔ جنھوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ بنو المُلَوّح کو ان کی بغاوت کی سزا دی ؛ کئی افراد کو قید کرکے مدینہ منورہ لایا گیا (الواقدی، ۲ : ۵۱ے تا ۵۳ے).

اسی مہینے میں حضرت غالبؓ بن عبداللہ کی قیادت میں دو سو افراد پر مشتمل ایک دستہ فَدک کے ان قبائل کی سر کوبی کے لیے روانہ کیا گیا جنھوں نے بشیرؓ بن سعد انصاری کے لشکر پر عقب سے حملہ کرکے اسے سخت نقصان پہنچایا تھا ؛ چنانچہ یہ مہم کامیاب ھوئی ، باغی قبائل کو قرار واقعی سزا ملی (ابن سعد ، ۲ : ۱۲۶).

سَریہ کَعب بن عُمیر الغِفاری : آپؐ کو شام کے ایک مقام ذات اطلاح میں خلاف اسلام سرگرمیوں کی اطلاع ملی تو آپؐ نے پندرہ افراد پر مشتمل ایک دستہ ربیع الاول ۸ھ میں حضرت کعبؓ بن عمیرؓ کی قیادت میں روانہ کیا ۔ جب یہ دستہ مذکورہ مقام پر پہنچا تو وھاں قبائل کا بہت بڑا اجتماع پایا ۔ انھوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی ، مگر انھوں نے تیروں سے جواب دیا ؛ چنانچہ جنگ ھوئی ، جس میں اسلامی لشکر کے تمام مجاھدین ، سوائے ایک زخمی کے ، شہادت سے ھم کنار ھو گئے ۔ آپؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ ان کی سرکوبی کے لیے ایک اور لشکر بھیجنے کا خیال فرما رہے تھے کہ پتا چلا کہ وہ قبائل دور دراز علاقوں میں منتشر ھو گئے ھیں ، یہ سن کر آپؐ نے ان کو معاف فرما دیا (الواقدی، ۲ : ۵۲ے تا ۵۳ے) .

سریہ شُجاعؓ بن وَھب الاسدی : مقام اِلسّیّ

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

میں بھی بنو ہوازن کی ایک شاخ بنو عامر آباد تھی۔ انھوں نے بھی مملکت مدینہ کے خلاف بغاوت پر آمادگی ظاہر کی؛ ان کے خلاف شجاع رض بن وهب کو چوبیس مجاهدوں کی کمان دے کر ربیع الاول ۸ھ میں روانہ کیا گیا، مگر وہ پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔ قبائل بار بار سرکشی کرتے رہے، مگر جوں جوں انھیں مدینہ کے مقابلے میں اپنی کمزوری کا احساس ہوتا گیا وہ حوصلہ ہارتے گئے۔ [وہ رحمۃ للعٰلمین کے حضور پہنچ کر معافی مانگ لیتے اور معاف کر دیے جاتے]؛ اس پر وہ قبائلی زندگی کی محدود آزادی کے بدلے مدینہ کی وسیع اور طاقتور حاکمیت (Sovereignty) میں شامل کر لیے جاتے۔

بیرونی فرمانرواؤں کے نام دعوت نامے: تبلیغ اسلام کے لیے امن و سکون کے جس ماحول کی ضرورت تھی وہ اب حاصل ہو چکا تھا۔ قرآن کا پیغام پوری انسانیت کے لیے تھا؛ چنانچہ ضروری تھا کہ جزیرۃ العرب کی سرحدوں سے ماوراء بھی یہ پیغام پہنچایا جاتا۔ سلامتی و امن کی آواز، بہ طریق صلح ھی پہنچائی جا سکتی تھی۔ حضور ص نے مختلف فرمانرواؤں کی طرف دعوت نامے روانہ فرمائے تاکہ وہ اسلام لے آئیں اور اس طرح اپنی ذمے داریوں کو پورا کریں کہ ان کے زیر تسلط سر زمین پر عدل و انصاف قائم ہو جائے۔ ان فرمانرواؤں میں قیصر بوزنطیہ ہرقل اور کسرائے ایران بھی شامل تھے۔ بوزنطی شہنشاہ دربار رسالت کے سفیر کے ساتھ احترام سے پیش آیا، مگر کسرائے ایران [خسرو پرویز] نے حضور ص کے خط کو پھاڑ ڈالا؛ گورنر مصر نے سفیر کے احترام و اکرام کے علاوہ کچھ تحائف بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے لیے بھیجے۔

اس صلح پرور دور میں حضور ص ذوالقعدہ ۷ھ میں بیت اللہ شریف کے عمرہ کے لیے تشریف لے گئے [رک بہ عمرہ]۔ سفر کے دوران میں عسکری ترتیب قائم رکھی گئی، جیسا کہ حضور ص کو توقع تھی۔ اس سفر کے نتیجے میں مکّی نوجوانوں نے برملا اسلام کی جانب اپنا میلان ظاہر کرنا شروع کر دیا؛ ان نوجوانوں میں حضرت خالد رض بن ولید اور عمرو رض بن العاص جیسے نامور سپاہی شامل تھے۔

جنگ مؤتہ: دین اسلام کی وسعت پذیری پڑوسی حکومتوں کو ہرگز گوارا نہ ہو سکتی تھی۔ بوزنطی حکومت نے بھی ریاست مدینہ کو دلچسپی سے دیکھنا شروع کیا۔ یہودی قبائل کے تعلقات شام کے ساتھ پہلے بھی تھے؛ ان کی شکست نے انھیں رومی حکومت کی طرف مزید مائل کر دیا۔ عرب کے شمالی علاقے میں جو عیسائی اور نیم عیسائی قبائل آباد تھے سب سے زیادہ انھوں نے رومی حکومت کو مدینہ کی طرف متوجّہ ہونے کا مشورہ دیا؛ چنانچہ شہنشاہ ہرقل نے بہت بڑا لشکر تیار کرنا شروع کیا۔

ریاست کی شمالی سرحد پر سرحدی قبائل کے ایما پر پڑوسی طاقتور سلطنت کے لشکر کا جمع ہونا کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

[تصادم کی ایک فوری وجہ یہ ہوئی تھی کہ ایک قاصد نبوی حضرت حارث رض بن عُمیر الأزدی کو، جو شاہ بُصریٰ کے نام آپ ص کا نامۂ اقدس لے کر جا رہے تھے، رئیس علاقہ بلقاء شرحبیل بن عمرو الغسّانی نے مؤتہ کے مقام پر گلا گھونٹ کر شہید کر دیا تھا (الواقدی، ۲: ۷۵۵)۔ یہ صریحًا سفارتی قوانین کی خلاف ورزی تھی۔ اس بنا پر آپ ص نے فوری طور پر ظالم کی سزا دھی کا بندوبست کیا]۔ ان حالات کو دیکھ کر حضور ص نے اپنے لشکر کی تربیت و تنظیم کا حکم دیا۔ تین ہزار کا لشکر تیار کیا گیا۔ مقابلے پر ۲ $\frac{1}{2}$ لاکھ کی تعداد تھی۔ تین ہزار کا لشکر ادھر اور مقابلے پر کتنا بڑا لشکر، مگر اصول (مشن) پر مبنی جنگ میں تعداد کا انتظار نہیں کیا جاتا؛ نہ اس پر انحصار کیا جاتا ہے۔ مشن میں معاملہ جذبے

marfat.com
Marfat.com

[illegible] کا سوال ہے تعداد کا نہیں ۔

رومی لشکر سے مقابلہ : لشکر کی روانگی کے بوقت رسالت مآبؐ نے بہ نفس نفیس معسکر جا کر کمانڈروں کو دعائے خیر و برکت سے نوازا ۔ [یہ پہلا موقع تھا کہ اسلامی فوج بیرون عرب کی اسلام دشمن طاقت کے خلاف نبرد آزما ہونے جا رہی تھی] ۔ حضورؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ کو سالار لشکر مقرر کیا اور فرمایا کہ اگر حضرت زیدؓ شہید ہو جائیں تو حضرت جعفرؓ بن ابی طالب لشکر کی کمان سنبھالیں اور اگر وہ بھی شہادت کا مقام حاصل کر لیں تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اس گراںقدر ذمے داری کو سنبھالیں اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو پھر لشکر خود اپنا کماندار چن لے اور اس کے احکام پر عمل کرے ۔

[جمادی الاولیٰ ۸ھ میں روانہ ہو کر] جب یہ لشکر وادی القریٰ میں پہنچا تو حضرت زیدؓ نے چند روز آرام کرنے کا فیصلہ کیا ۔ اس دوران میں دشمن کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ۔ جب یہ جیش معاؔن پہنچا تو معلوم ہوا کہ شہنشاہ ہرقل دو لاکھ کے لشکر کے ساتھ [سر زمین بلقاء میں مقام مآب پر پہنچ چکا ہے] ۔ عیسائی مؤرخین نے ہرقل کے بجائے اس کے بھائی کی موجودگی لکھی ہے ، تاہم لشکر کی تعداد دو لاکھ ہی بتائی ہے ؛ اس خبر بر حضرت زیدؓ نے جنگی مشاورتی مجلس (War council) کے انعقاد کا حکم دیا ۔ کسی نے رائے دی کہ لشکر آگے نہ بڑھے اور مدینہ سے مزید احکام منگوائے جائیں ؛ حضرت عبداللہ ابنؓ رواحہ نے زور دار طریقے سے کہا : حضورؐ اپنا حکم صادر کر چکے ہیں ۔ کیا ہم تعداد (اعداد و شمار) پر بھروسا کرتے ہیں یا اپنے خدا پر ؟ حصول شہادت یا مقام مجاھد ، دونوں میں سے ایک نہ ایک یقینی ہے ۔ ہمیں آگے بڑھنا چاہیے ؛ چنانچہ دو یوم کے مذاکرات کے بعد اسلامی لشکر آگے بڑھ گیا ۔

دونوں لشکروں کا آمنا سامنا بحیرہ مردار کے ساحل [سر زمین بلقاء] پر مشارف کے مقام پر ہوا ۔ حضرت زیدؓ چھے دن رومی لشکروں کے ارد گرد تدبیرات ضرب و فرار (Hit and Run Tactics) کے اصول کے مطابق کبھی اس مقام پر حملہ آور ہوتے اور کبھی دوسرے مقام پر ؛ کبھی رومی لشکر کے سامنے سے نمودار ہوتے اور کبھی پہلو سے اور ہر بار دشمن کے بے ھنگم فوج کے پرے (Phalanxes) کو وار کرنے کا موقع ھی نہ دیتے اور صحرا میں غائب ہو جاتے ۔ ساتویں دن حضرت زیدؓ سامنے سے کچھ اس طرح نمودار ہوے کہ گویا جم کر مقابلہ کریں گے ، مگر جونہی رومی فوجی پرے بڑھنے لگے انھوں نے پسپائی (Withdrawal) اختیار کرلی ۔ اسلامی لشکر کچھ اس انداز سے پیچھے ھٹا کہ رومی لشکر کے کمانداروں نے سمجھا کہ مسلمان بھاگنے لگے ھیں؛ رومی پرے آگے بڑھے ، مگر دو لاکھ کی فوج اور پہلوؤں پر چالیس پچاس ھزار قبائلی لشکر کے لیے اس عجلت میں اپنی ترتیب قائم رکھنا ممکن نہ رہا ۔ مؤتہ کے مقام بر حضرت زیدؓ اپنے لشکر کے ساتھ رومیوں کے انتظار میں تھے ۔ جونہیں رومی فوج کا اگلا حصّہ بے ترتیبی سے سامنے آیا، حضرت زیدؓ نے بھرپور حملے کا حکم دے دیا ۔ رومی فوج کا بہت تھوڑا سا حصّہ اس حملے کا ھدف بنا تھا، مگر رومی فوج کے جس حصے پر یہ زد پڑی وہ اسے برداشت نہ کر سکا ؛ چنانچہ رومیوں نے راہ فرار اختیار کی ۔ اصولاً فوجی پرے کے لیے بھاگنا مشکل ہوتا ھے ؛ سو صفیں اور وہ بھی بے ترتیبی کی حالت میں ، نہ آگے بڑھ سکتی ھیں اور نہ پسپائی اختیار کر سکتی ھیں ۔

رومی فوج اب اپنے ھی ساتھیوں کو روندتی ہوئی چاروں طرف کھلا میدان حاصل کرنے کی کوشش

marfat.com
Marfat.com

کر رہی تھی - ان کی ترتیب (Formation) الٹی گنجان تھی کہ کسی کو ہتیار بلند کرنے کی مہلت نہ مل رہی تھی- ادھر اسلامی لشکر، انسانی اجسام کے اس گھنے جنگل کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا - حضرت زیدؓ پر چاروں طرف سے وار ہو رہے تھے - بالآخر خون زیادہ بہ جانے کی وجہ سے وہ گھوڑے سے گر پڑے - حضرت جعفرؓ بن ابی طالب، حکم نبوی کے مطاق فوراً آگے بڑھے اور عَلم تھامتے ہی پیادہ ہو کر لڑنا شروع کر دیا - حضرت جعفرؓ نے لشکر میں نئی روح پھونک دی ، مگر وہ بھی ستّر سے زائد زخم کھانے کے بعد شہید ہو گئے - اب حضرت عبداللہؓ بن رواحہ آگے بڑھے اور عَلم انھوں نے سنبھالا - حضرت عبداللہؓ رجز پڑھتے ہوے آگے بڑھ رہے تھے - اب رومی لشکر میں فوج والی کوئی بات نہ رہ گئی تھی - اسلامی لشکر ہزاروں آدمیوں کو دھکیلے جا رہا تھا اور باقی ماندہ کو پتا بھی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے - جہاں کہیں کسی رومی کو موقع ملتا وہ پلٹ کر قریب والے مسلمان پر حملہ کرتا اور پھر بھاگ کھڑا ہوتا - حضرت عبداللہؓ کے رجز نے فوج کو نیا عزم عطا کیا - بالآخر حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کی آرزوے شہادت بھی پوری ہو گئی اور وہ بھی شہید ہو گئے - جب وہ گرے تو ثابتؓ بن اَقرم نے بڑھ کر علم اسلامی کو تھاما - اب آنحضرتؐ کے حکم کے مطابق فوج نے میدان جنگ ہی میں اپنا کماندار چننے کا فرض ادا کیا - فوج نے یہ قرۂ فال حضرت خالدؓ بن ولید کے نام ڈالا - حضرت خالدؓ بن ولید نے قیادت سنبھالتے ہی فیصلہ کیا کہ اب منظم پسپائی کے ذریعے میدان جنگ سے علٰیحدگی اختیار کی جائے اور پھر مدینہ کی طرف مراجعت اختیار کر لی جائے- واپسی کے دوران میں اسلامی لشکر نے رومی فوج کے میسرہ کے عرب کماندار مالک بن زافلَہ [نیز راقلہ] کو قتل کیا - جب حضرت خالدؓ کی کمان میں یہ لشکر مدینہ منورہ پہنچا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ راہ حق کی لڑائی سے الٹیں واپس نہیں آنا چاہیے تھا، مگر حضور اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے فرمایا: یہ بھاگے ہوے نہیں ہیں (اللہ کو منظور ہوگا تو) یہ پھر لڑیں گے [ابن ہشام : ۴ : ۱۵ تا ۳۰] اور تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا .

رومی لشکر کو زبردست نقصان پہنچانے کے باوجود اس مہم کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی ، یعنی سرحد پر امن و سکون قائم نہیں کیا جا سکا تھا . اس لیے حضورؐ نے جمادی الآخرہ ۸ھ میں حضرت عمروؓ بن العاص کی کمان میں تین سو مجاھدوں کا لشکر شمالی سرحد کے علاقے [ذات السّلاسل کی طرف جو وادی القُری سے پرے واقع ہے] میں امن و امان قائم کرنے کے لیے روانہ کیا ؛ یہاں بنو قضاعہ جمع ہو کر مدینہ منورہ پر لشکر کشی کی تدبیریں کر رہے تھے - اس لشکر میں تیس سواروں کا دستہ بھی شامل تھا - حضرت عمروؓ بن العاص نے وہاں جا کر محسوس کیا کہ باغی قبائل کی تعداد کے پیش نظر ان کے لشکر کی تعداد کم ہے ؛ چنانچہ انھوں نے آنحضرتؐ سے کمک کی درخواست کی . آپؐ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو مزید دو سو مجاھدین دے کر روانہ کیا ، جس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے صحابۂ کرامؓ بھی شامل تھے - یہ متحدہ لشکر شمال کے سرحدی علاقوں میں [موجود قبائل بَلِّی ، عُذرہ ، بَلقَین کو سزا دینے اور ان کو منتشر کرنے میں کامیاب رہا (ابنؔ سعد ، ۲ : ۱۳۱)] .

سریۃ الخَبط : رجب ۸ھ میں حضرت ابوعبیدۃؓ الجرّاح کی کمان میں تین سو مجاھدوں کا لشکر ساحل سمندر کے ساتھ شاھراہ پر امن و امان قائم کرنے کے لیے روانہ کیا گیا - [یہاں بنو جُہینہ کی ایک شاخ مصروفِ فساد تھی -] یہ بھی سرحدی علاقہ

marfat.com
Marfat.com

[illegible]اور یہ قبائل تجارتی قافلوں کی آمد و رفت میں مزاحم ہو رہے تھے۔ [مذکورہ قبائل منتشر ہو گئے، اس طرح] یہ مہم بھی کامیاب رہی۔ نجد کے صوبے میں بنو غطفان کی شاخ فزارہ کے لوگ کئی بار مدینہ منورہ پر حملہ کر چکے تھے۔ [اس سال پھر ایک مہم حضرت ابو قتادہؓ [حارثؓ] بن ربعیِ انصاری کی زیرقیادت کی سرکوبی کے لیے روانہ کی گئی؛ یہ مہم کامیاب رہی اور مال غنیمت کے ساتھ مدینہ منورہ لوٹی]۔

فتح مکہ کے اسباب: صلح حدیبیہ کے وقت بنو خُزاعہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے حلیف ہونے کی حیثیت میں اس دس سالہ معاہدے میں شامل ہیں، جو حدیبیہ کے مقام پر ہوا تھا؛ جب کہ بنو بکر نے قریش مکہ کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا تھا۔ [بنو بکر اور بنو خُزاعہ دو متحارب فریق تھے، جن میں عرصۂ دراز سے چپقلش چلی آ رہی تھی؛ چنانچہ] بنو بکر ماضی میں بنو خزاعہ کے ہاتھوں زک اٹھا چکے تھے اور وہ خلش ان کے دل میں باقی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ خلش اور قریش کا صلح حدیبیہ کو اپنے مقصد میں حائل سمجھنا [ایک ہی مربوط سلسلے کی کڑیاں ہیں]۔ بنو خزاعہ نہ صرف مسلمانوں کے حلیف تھے، بلکہ ابتدا سے ہی وہ اسلامی حکومت کے ساتھ گہری ہمدردی رکھتے تھے؛ غزوۂ خندق کے موقعہ پر انہیں نے تیز رفتار اونٹوں پر سوار ہو کر قریش مکہ اور ان کے حلیفوں کے متحدہ لشکروں کی مدینہ منورہ پر چڑھائی سے آپؐ کو آگاہ کیا تھا۔ اس بنا پر بنو بکر ہی نہیں، بلکہ خود قریش مکہ بھی ان سے خار رکھتے تھے۔ قریش مکہ نے ایک مربوط منصوبے کے تحت ریاست مدینہ کے خلاف راست اقدام کا فیصلہ کیا، یعنی یہ کہ پہلے مسلمانوں کے ان حلیف اور ہمدرد قبیلے والوں سے نمٹا جائے، جو ان کی ہر حرکت پر کڑی نظر رکھتے تھے؛ بعد ازاں تیاری کرکے دوبارہ مدینہ منورہ پر یلغار کر دی جائے؛ [چنانچہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت] بنو بکر نے شعبان ۸ھ میں بنو خزاعہ پر شب خون مار کر ان کا بہت سا نقصان کیا۔ [قریش مکہ نے ہتھیاروں کے علاوہ ان کی فوجی و عملی مدد بھی کی۔ کئی قریشی نوجوان (مثلاً عکرمہ بن ابی جہل، وغیرہ) رات کے اس حملے میں بنو بکر کے ساتھ شریک تھے (ابن ہشام، ۴: ۲۳۲)، حتّٰی کہ عین حرم کعبہ میں بھی ان کا بے دریغ قتل عام کیا گیا۔ یہ قریش مکہ اور بنوبکر کی طرف سے واضح طور پر معاہدے کی خلاف ورزی تھی؛ چنانچہ] بنو خزاعہ نے مدینہ پہنچ کر دربار رسالت مآبؐ میں شکایت پیش کی۔ آپؐ نے ان کو تسلی دی اور واپس بھیج دیا۔ چونکہ حضورؐ معاہدہ توڑنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے آپؐ نے قریش مکہ کو کہلا بھیجا کہ یا تو بنو خزاعہ کے مقتولین کا خون‌بہا ادا کیا جائے [یا بنو بکر سے لا تعلقی کا اعلان کیا جائے اور اگر یہ منظور نہ ہو] تو پھر معاہدہ حدیبیہ کے توڑنے کا اعلان کر دیا جائے۔ قریش مکہ نے آخری دفعہ قبول کرنے کا اعلان کیا، مگر جلد ہی ان کو ندامت ہوئی اور ابو سفیان کو مدینہ منورہ روانہ کیا کہ دوبارہ صلح کے لیے سلسلہ‌جنبانی کرے۔ حضور اقدسؐ نے ابو سفیان کی کسی بات کا جواب نہ دیا، اس طرح ابو سفیان ناکام ہو کر مکہ مکرّمہ لوٹ گیا۔

فتح مکّہ: ۱۰ رمضان المبارک ۸ھ یکم جنوری ۶۳۰ء کو سرور دو عالمؐ دس ہزار مجاہدوں کا لشکر لے کر مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ اس میں آپؐ کے اتحادیوں، مثلاً بنو سُلیم اور بنو مُزینہ کے ایک ایک ہزار کے لشکر بھی شامل تھے؛ حضرت زبیرؓ کی کمان میں دو سو مجاہدوں کا سوارہ طلایہ (Advance Guard) کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر ساتویں

marfat.com

Marfat.com

دن لشکر نے مَرّالظّہران کے مقام پر پڑاؤ کیا ۔ یہ مقام مکہ سے صرف ایک دن یا اس سے بھی کم فاصلے پر واقع ہے ۔ [یہاں آپ نے رات کو تمام لشکر والوں کو الاؤ روشن کرنے کا حکم دیا ۔ آپؐ اہل مکہ کو اچانک اپنی نمود دکھلا کر مرعوب کرنا چاہتے تھے ؛ چنانچہ اہل مکہ نے پورے علاقے میں آگ اور روشنی دیکھی تو وہ گھبرا گئے ؛ تحقیق احوال کے لیے ابو سفیان، حکیم بن حِزام ، بدیل بن ورقاء کو بھیجا گیا ؛ حضرت عباسؓ نے ابو سفیان کو پناہ دی ۔ جس سے اس کی جان بخشی ہو گئی] ۔ حضورؐ نے دوسری صبح اسے شرف باریابی بخشا اور فرمایا کہ جا کر اعلان کر دو کہ جو شخص مکان بند رکھے گا یا حرم کعبہ میں پناہ لے گا یا ابو سفیان کے گھر پناہ لے گا اسے ہماری طرف سے امان ہے ۔

اسلامی لشکر چار بریگیڈوں میں تقسیم ہو کر مختلف سمتوں سے مکہ مکرمہ پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھا ، مگر حضورؐ کا سخت تاکیدی حکم تھا کہ جب تک مزاحمت نہ ہو تلواریں نیاموں سے نہ نکالی جائیں ۔ حضرت زبیرؓ کو شمال سے داخل ہونے کا حکم تھا ؛ حضرت خالدؓ جنوب سے داخل ہو رہے تھے ، [قیس] بن سعدؓ بن عبادہ انصاری مغرب کی سمت سے بڑھ رہے تھے اور حضرت ابو عبیدہؓ مہاجرین کے ساتھ مشرق سے مکہ مکرّمہ میں داخل ہو رہے تھے ؛ لشکر کا صدر مقام اسی بریگیڈ کے ساتھ تھا۔ [خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم مکہ مکرمہ کے بالائی حصے، مقام اذاخر میں فروکش تھے ، جہاں سے آپؐ تمام فوجوں کی کمان فرما رہے تھے] ۔ داخلہ کی ترتیب ایسی تھی کہ چاروں بریگیڈ ایک دوسرے کی مدد کر سکتے تھے ۔ صرف شہر کے جنوبی حصے میں حضرت خالدؓ کے جیش کی مزاحمت ہوئی ، مگر خالدؓ بن ولید نے جلد ہی دشمن پر قابو پا لیا ۔ حضورؐ نے دور سے تلواروں کی چمک دیکھی تو فرمایا : کیا میں نے حکم نہیں دیا تھا کہ لڑائی نہ کی جائے ؟ مگر جب صورتِ حال بیان کی گئی تو آپؐ نے فرمایا : مشیّتِ الٰہی میں یقیناً بہتری ہے ۔ جب اہل مکّہ حرم کعبہ میں جمع ہوے تو ندامت سے سر جھکائے ہوے تھے ۔ حضور اقدسؐ نے پہلے خطبہ ارشاد فرمایا اور پھر پوچھا : تمھیں مجھ سے کس طرح کے سلوک کی توقع ہے ؟ اجتماع نے کہا : ہمیں ایک کریم بھائی کے کریم فرزند سے اچھے سلوک کی توقع ہے ۔ حضورؐ نے فرمایا : آج کے دن تم سے کوئی باز پرس نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو ۔

غزوات کا آخری دور : فتح مکہ کے بعد سے غزوات نبوی کا آخری دور شروع ہوتا ہے ۔ ابھی مکہ اور گرد و نواح کا نظم و نسق مکمل نہیں ہوا تھا کہ اطلاع ملی کہ بنو ہوازن مکہ مکرمہ پر حملے کی تیاریوں میں مصروف ہیں ۔ حضور اکرمؐ نے [۶ شوّال ۸ھ] میں لشکر کو کوچ کا حکم دیا ۔ اب لشکر میں دو ہزار مکی نو مسلموں کا اضافہ ہو گیا تھا ۔ آپؐ نے بنوِ ہوازن کے پہاڑوں کا رخ کیا ۔ بروز بدھ ، بوقت صبح حُنین کی وادی میں داخل ہوے ۔ وادی زیادہ چوڑی نہ تھی اور دائیں بائیں تنگ سی گھاٹیاں تھیں ۔ بنو ہوازن کے کمان دار نے ان گھاٹیوں میں آدمی چھپا رکھے تھے ۔ جونہیں حضرت خالدؓ کی زیر کمان بنو سُلیم کے جوانوں پر مشتمل طلایہ ان کے پاس سے گزرا تو انھوں نے اچانک حملہ کر دیا ۔ بنو سلیم کے جوان پوری طرح تربیت یافتہ نہ تھے ۔ ناگہانی حملے سے حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوے ۔ [ان کی دیکھا دیکھی نو مسلم بھی بھاگ نکلے ۔ اس طرح بہت سے مسلمان تتّر بتّر ہو گئے ۔ اب میدان میں رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اور آپؐ کے چند جاں نثار باقی رہ گئے ۔ آپؐ نے یہ صورت حال دیکھی تو خچّر سے نیچے چھلانگ لگائی اور فرمایا : اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب انا ابنُ عبدالمُطّلب ،

marfat.com
Marfat.com

میں خدا کا سچا نبی اور عبدالمطلب کا بیٹا ہوں؛ اتنے میں میدان میں تیروں کی بارش کا رخ آپؐ اور آپؐ کے چند جاں نثاروں کی طرف تھا۔ آپؐ نے حضرت عباسؓ کو، جو جہیر الصوت تھے، حکم دیا کہ انصار، اور بیعت رضوان کرنے والوں اصحاب کو پکاریں؛ چنانچہ اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ صحابہؓ اس طرح پلٹے جس طرح اونٹنی اپنی اولاد پر پلٹتی ہے۔ جب کچھ تعداد جمع ہو گئی تو آپؐ نے دوبارہ صف بندی کی اور منظّم طریقے سے بنو ہوازن پر حملہ کیا]۔ اب گھمسان کی جنگ ہوئی اور بنو ہوازن پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے اور پھر جلد ہی بھاگ کھڑے ہوے۔ ان کا دور دور تک تعاقب کیا گیا۔ بہت سے قید ہوے؛ جو بچ گئے وہ طائف کے قلعے میں محصور ہو گئے۔ آپؐ نے قلعۂ طائف کا محاصرہ کر لیا، مگر جلد ہی طائف کا محاصرہ اٹھا لیا اور فرمایا کہ اہل طائف خود ہی مدینہ منورہ آ کر اسلام قبول کر لیں گے۔ [ان کے تمام اموال و املاک، جس میں، چھے ہزار کے قریب ان کی عورتیں اور بچے بھی تھے، گرفتار کر لیے گئے؛ آپؐ نے کئی دنوں تک ان کے وفد کی آمد کا انتظار کیا، جب کوئی شخص مصالحت کی بات چیت کرنے نہ آیا تو آپؐ نے تمام اموال مسلمانوں میں تقسیم فرما دیے۔ تاہم جب ان کا وفد باریاب ہوا تو آپؐ نے ان کے چھے ہزار قیدی فوراً آزاد فرما دیے (ابن سعد، ٢: ١٣٩ تا ١٥٧)]۔

سفارتوں کا سال: فتح مکہ اور حنین سے واپسی پر اہل عرب کی سفارتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی بنا پر ۹ ہجری کو سفارتوں کا سال (عام الوفود) کہا گیا ہے۔ بعض قبائل اسلام کے نظام زندگی میں برابر کے شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ انھیں جزیہ دینا پڑا، مگر ایسے قبائل سے حق دفاع لے لیا جاتا تھا۔ غزوۂ حنین کے بعد چند چھوٹے چھوٹے لشکر روانہ کیے گئے۔ جدہ کے سامنے بحرالاحمر کے ایک جزیرے پر بحری قزّاقوں نے قبضہ کر لیا تھا؛ [چنانچہ ربیع الاول ۹ھ میں حضرت عَلقمہ بن مُجزّز المُدلِجی کو تین سو افراد دے کر] ان کے خلاف روانہ کیا کیا گیا۔ [انھوں نے جزیرے پہنچ کر] ان قزّاقوں کا قلع قمع کیا [ابن سعد، ٢: ١٦٣]؛ حضرت علیؓ کی کمان میں ایک مہم [بنو طی کے خلاف] ربیع الاول ۹ھ میں روانہ کی گئی [جو ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل تھی]۔ یہ مہم کامیاب رہی۔ عدی بن حاتم طائی بھاگ جانے میں کامیاب رہا، مگر اس کی بہن قید کر لی گئی۔ جب دربار رسالت میں پیش ہوئی تو آپؐ نے نہایت احترام سے جگہ دی اور سفر خرچ اور تحائف دے کر واپس کیا۔ بہن نے عدی کو خط لکھا اور مشورہ دیا کہ ایسے دربار سے دور رہنا بڑی کوتاہ اندیشی ہے؛ چنانچہ وہ دربار رسالت میں حاضر ہوا اور قبیلے کی سرداری پر فائز کیا گیا اور بعد کی مہموں میں دلیری سے لڑا [کتاب مذکور، ١٦٤]۔

غزوۂ تبوک: اسی دوران میں اطلاع ملی کہ بوزنطی حکومت دوبارہ مدینۂ منورہ پر حملے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ [آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کو ہنگامی طور پر تیار ہونے کا حکم دیا، کیونکہ آپؐ نہیں چاہتے تھے کہ بوزنطی حکومت کے خلاف جنگ میں سر زمین عرب میدان جنگ بنے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آپؐ نے اپنی اس تیاری اور مہم کا مقصد پوشیدہ نہیں رکھا؛ چنانچہ] شعبان ۹ھ (اکتوبر ۶۳۰ء) میں تیس ہزار کا لشکر مدینہ منورہ سے آپؐ کی قیادت میں روانہ ہوا۔ مقام تبوک میں، جو سرحد پر واقع ہے، جا کر معلوم ہوا کہ شہنشاہ ہرقل نے مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے؛ اب کسی بیرونی خطرے کا امکان نہ تھا۔ حضورؐ نے سرحدی قبائل کے ساتھ معاہدے کیے۔ اس مہم کو غزوۂ تبوک کا نام دیا گیا ہے۔ تبوک میں دس روز

marfat.com
Marfat.com

قیام کیا اور پھر آپؐ واپس مدینہ لوٹ آئے .

غزوات نبوی کے عمیق مطالعے کے بغیر سیرت نبوی کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہے ۔ حضورؐ کے مدنی دور کی مدت دس سال ہے۔ اس میں سے نو سال حرب و ضرب اور اس کی تیاریوں میں صرف ہوے ۔ غزوات کے سلسلے میں مدنی زندگی کا تقریبًا پانچواں حصہ میدان جنگ میں گزرا ۔ جو وقت سرایا کی تیاری ، ان کی روانگی، ان کی کارکردگی پر غور ، ان کے متعلق خبروں کے حاصل کرتے رہنے اور عسکری استخبارات کرنے پر صرف ہوا ہوگا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ۔ بتایا گیا ہے کہ اولین سالوں میں حضورؐ راتوں کو پہرا بھی دیا کرتے تھے ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ان نو سالوں کے دوران میں مدینہ منورہ کی فضا پر ہمہ وقت جنگ منڈلاتی رہتی تھی ۔ عجیب اتفاق ہے کہ سیرت نگاری کا آغاز غزوات نگاری سے ہوا اور وہی موضوع ایسا ہے جسے تبع تابعین کے بعد سے نظر انداز کیا گیا ہے ۔ یہ موضوع اہم ہونے کے علاوہ اس قدر بسیط بھی ہے کہ اس کے لیے محکم بنیادوں پر قائم اداروں کی ضرورت ہے ۔ یہ کام افراد کے بس کا نہیں اور شاید اسی لیے اب تک تشنۂ تحقیق ہے ۔ [ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ حضورؐ کے طریق کار اور اسوۂ حسنہ کا مطالعہ کیا جائے۔ اعلاے حق کے لیے بلاخوف فوری پیش قدمی، مگر معاف کرنے ، شفقت کا طریقہ اختیار کرنے ، انتقام کے شائبے تک سے پاک ہونے کے جو نمونے غزوات سے ظاہر ہوتے ہیں ان کی مثال ملنی محال ہے] .

مآخذ : کتب احادیث : (۱) محمد بن اسمٰعیل البخاری : الصحیح ، ج ۲ ، کتاب الجہاد ، ج ۳ ، کتاب المغازی ، مطبوعہ لائیڈن ، بدون تاریخ ؛ (۲) مسلم النیساپوری : الصحیح، ۵ : ۱۳۹ - ۲۰۰ ، کتاب الجہاد و السیر، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۳۲ھ؛ (۳) احمد بن حنبل : مسند، حیدر آباد دکن؛ بمواضع کثیرہ : تفاسیر بسلسلۂ آیات ذیل : ۲ [البقرۃ] : ۱۹۰ تا ۱۹۵ : ۳ [آل عمران]: ۱۲ تا ۱۳ ، ۱۲۱ تا ۱۷۵؛ ۸ [الانفال] : ۱ تا ۷۵ ؛ ۹ [التوبۃ] : ۱ تا ۱۵ ، ۲۵ تا ۲۹ ، ۸۰ تا ۱۲۳ : (۴) البیضاوی : انوار التنزیل و اسرار التاویل ، مطبوعۂ قاہرہ ، ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء ؛ (۵) القرطبی : الجامع لاحکام القرآن ، مطبوعہ مصر؛ (۶) الطبری : جامع البیان فی تفسیر القرآن ، بولاق ، ۱۳۲۲ تا ۱۳۳۰ھ ؛ (۷) ابن کثیر : تفسیر ، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۲ھ؛ (۸) الزمخشری : الکشاف عن حقائق التنزیل ، بولاق ۱۱۸۱ھ ؛ (۹) فخر الدین الرّازی : مفاتیح الغیب المعروف بہ تفسیر الکبیر ، بولاق ۱۲۷۹ ؛ کتب تاریخ : (۱۰) الطبری : تاریخ الرسل و الملوک ، ج ۱ ، مطبوعہ لائیڈن ؛ (۱۱) ابن کثیر : البدایۃ و النہایۃ، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۱۲) امین سعید : حروب الاسلام؛ (۱۳) ابن الاثیر : الکامل فی التاریخ ؛ (۱۴) ابن خلدون : تاریخ ؛ (۱۵) الیعقوبی : تاریخ ، ۱ و ۲ مطبوعۂ بیروت ۱۹۶۰ء ؛ کتب سیر و مغازی : (۱۶) الواقدی : کتاب المغازی ، ۳ جلدیں ، طبع Marsden Jones ، آکسفرڈ ۱۹۶۶ء؛ (۱۷) ابن سعد : کتاب الطبقات الکبیر ، ج ۱ تا ۸ ، مطبوعۂ بیروت ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۰ء ؛ (۱۸) علی بن برہان الدّین الحلبی : انسان العیون فی سیرۃ الامین و المامون المعروف بالسیرۃ الحلبیہ ، ج ۱ تا ۲ ، قاہرہ ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء ؛ (۱۹) ابن الجوزی : الوفا باحوال المصطفٰی ، مطبوعۂ لاہور ، بار دوم ، ۱۳۹۷ھ / ۱۹۷۷ء، ۲ جلدیں ؛ (۲۰) ابن ہشام : السیرۃ النبویۃ ، طبع مصطفٰی السّقا وغیرہ ، قاہرہ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۲۶ء ، ج ۱ تا ۴ ؛ (۲۱) القسطلانی : المواہب اللدنیہ، مع محمد بن عبدالباقی الزّرقانی : شرح المواہب اللّدنیہ ، ۸ جلدیں مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۵ھ؛ (۲۲) ابن القیّم : زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۳۵ھ ؛ (۲۳) محمد شیث خطاب : الرسول القائد ، اردو ترجمہ از رئیس احمد جعفری : آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بہ‌حیثیت سپہ سالار ، کراچی :

marfat.com
Marfat.com

[illegible] محمد حمید اللہ : عہد نبوی کے میدان جنگ ، مطبوعۂ حیدر آباد دکن (بدون تاریخ) ؛ (۲۵) شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی : سیرة النبی ، ج ۱ و ۲ ، مطبوعۂ اعظم گڑھ ، بار ششم ؛ (۲۶) سلیمان منصور پوری : رحمة للعالمین ، ج ۱ تا ۳ ، مطبوعۂ کراچی ؛ (۲۷) محمد حسین ہیکل : حیاة محمد ، مطبوعۂ قاہرہ ، ۱۹۴۷ء .

(گلزار احمد [و ادارہ])

عہد نبوی میں نظم و نسق مملکت : آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم جس دین کو لے کر آئے تھے ، حکمت ایزدی کا تقاضا تھا کہ اسے باقاعدہ عملی شکل میں نافذ کر کے دنیا کے سامنے ایک جامع اسوہ پیش کیا جائے ؛ چنانچہ ارشاد باری ہے : ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ (۴۸ [الفتح] : ۲۸) ، یعنی وہی ذات ہے کہ جس نے اپنا رسول بھیجا پیغام ہدایت اور دین حق دے کر ، تاکہ سچے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے] .

رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم مکہ مکرّمہ میں پیدا ہوے - زندگی کے ترپن سال وہیں گزاوے [ابن العماد : شذرات ، ۱ : ۱۳] - پھر مدینہ منورہ جا بسے اور دس سال بعد رفیق اعلٰی سے جا ملے (ربیع الاول ۱۱ھ/۶۳۲ء) - اسلام سے پہلے مکہ مکرمہ میں ایک سادہ شہری ریاست نما نظام قائم تھا - وہاں کوئی بادشاہ تو نہ تھا ، لیکن شہر کے دس ممتاز تر قبیلوں کے سردار وہاں کی مجلس حکومت کے رکن ہوتے تھے ، جن کے عہدے غیر متغیر بلکہ موروثی ہوتے - اس کی تاریخ اور تفصیل میں گئے بغیر (جس کے لیے دیکھیے محمّد حمید اللہ : عہد نبوی میں نظام حکمرانی ، باب شہری مملکت مکہ) اس قدر ذہن میں رکھنا کافی ہوگا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے اپنے قبیلے بنو ہاشم کو جو خدمت [منصب ، ذمے داری] ملی تھی اس میں ایک تو چاہ زمزم کی تولیت ، یعنی حاجیوں کے آب نوشیدنی کا انتظام اور دوسرے حرم کعبہ میں ادب ملحوظ رکھوانا اور شور و غل نہ ہونے دینا داخل تھا - [نیز افادہ ، یعنی تجارت کے لیے سہولتیں حاصل کرنے اور اسی مقصد کے لیے دوسری اقوام سے رابطہ رکھنا بھی بنو ہاشم کے پاس تھا (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۷۷)] - اس کے علاوہ خارجہ معاملات کی ذمے داری بنو عدی میں (حضرت عمرؓ کے پاس) تھی ؛ دیوانی عدلیہ بنو تیم میں (حضرت ابو بکرؓ کے پاس) ؛ علمبرداری (لواء) اور الحجابة [بیت اللہ شریف کی کنجی برداری اور دارالندوہ میں اجلاس کی طلبی اور انتظام (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۷۷)] بنو عبدالدّار میں ؛ فوج کی کمان بنو امیّہ میں (حضرت ابو سفیان کے پاس) ؛ سوار فوج کی قیادت بنو مخزوم میں (حضرت خالدؓ بن الولید کے پاس) تھی ، لیکن یہ واضح نہیں کہ متعلّقہ فرائض سے خارج [یا متعلّق] اس مجلس مناصب کا کبھی عام اجتماع بھی ہوتا تھا یا نہیں ، مگر (کسی اہم معاملے کے در پیش ہونے پر) شہر کے دارالندوہ (سہولت کے لیے پارلیمان کہ لیجیے) کا البتہ وقتاً فوقتاً اجلاس طلب کیا جاتا ، جس میں شہر کے چالیس سالہ یا زیادہ عمر کے سب باشندے شریک ہو سکتے تھے .

بنو ہاشم کا عہدہ ایک زمانے میں جناب عبدالمُطّلب کے پاس تھا ؛ پھر ان کے بیٹے ابو طالب کو وراثت میں ملا - قبیلے کی سرداری ابو طالب کے بھائی ابو لہب کو ملی - ابو طالب نے تنگ دستی کے باعث اپنا عہدہ سِقایہ اپنے بھائی حضرت عباسؓ کو دے دیا - ابو لہب کو اس میں کوئی دخل نہ رہا ، بلکہ وہ حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد میں متوارث ہو گیا .

جب بعثت[۳] [۱۳ ق ھ] سے اسلام کی تبلیغ کا آغاز ہوا تو اگرچہ قریشی بت پرستوں نے شدید

marfat.com
Marfat.com

مخالفت اور اہل اسلام کی ایذا رسانی سے اس کا استقبال کیا، لیکن اس صورت حال نے مسلمانوں میں یکجہتی [پیدا کر دی۔ مسلمانوں کے باہمی نظم و نسق نے آئے دن ترقی کی اور اس طرح] نظم و نسق بجز اراضی کے، جملہ عناصر مملکت اس جماعت میں پیدا ہو گئے۔ [مملکت اصولاً ہے ہی یہی کہ] ایک امیر جس کی سب اطاعت کریں، اسے عدل گستری کے لیے قانون سازی کا حق بھی حاصل ہو؛ ان چیزوں کا مکے میں موجود ہونا مملکت کے وجود کا کافی ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ کسی حد تک زرعی پیداوار سے کچھ حصہ راہ خدا میں صرف کرنے کا جب کہ وہ گھر آ جائے (۶ [الانعام]: ۱۴۱) اور اپنا دفاع آپ کرنے کے ارشاد خداوندی (۴۲ [الشوریٰ]: ۳۹ تا ۴۱) سے اس کی تنظیم اساسی میں مزید شدت آ گئی۔ زکوٰۃ ابھی سرکاری طور سے واجب الادا تو نہیں تھی، لیکن تجارت وغیرہ کی آمدنی سے غالباً قبل اسلام اہل مکہ جو رقم بتوں کے چڑھاوے میں خرچ کرتے تھے وہ اب مکی مسلمان قیاساً آنحضرتؐ کی خدمت میں، یا حاجت مندوں کو براہ راست دے دیتے ہوں گے، تاکہ ان کی مدد مرکزی طور پر کی جا سکے؛ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مکی دور میں مسلمان مملکت در مملکت کی حالت میں تھے [نیز دیکھیے آنحضرتؐ بہ حیثیت مقنن]؛ بلکہ قرآن کی ایک آیت (۴۲ [الشوریٰ]: ۳۸) سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں اہل اسلام کی ایک شورائی مجلس معرض وجود میں آ چکی تھی۔ تمام صحابۂ کرامؓ اس مجلس مشاورت کے رکن تھے۔ کسی بھی ضرورت کے پیش آنے پر وہیں مشورے سے فیصلہ کیا جاتا ہوگا۔ اس کا اجتماع دار ارقمؓ بن ابی ارقم میں ہونا قرین قیاس ہے کہ وہی آپؐ کے لیے اور اہل اسلام کے لیے مکی مرکز کا کام دیتا تھا۔

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ ایسا مقام تھا جہاں گاؤں اور قبائلی بستیاں تو تھیں؛ لیکن کوئی بڑی یا چھوٹی مملکت نما قسم کی کوئی چیز بالکل نہ تھی اور شاید جلد قائم بھی نہ ہو سکتی، کیونکہ اوس اور خزرج کے خونریز جھگڑے ان کو آسانی سے متحد نہ ہونے دیتے تھے؛ لیکن ہجرت نبویؐ پر مشرکین مکہ نے انصار مدینہ کو دھمکی دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو قتل یا شہر بدر کر دیں، ورنہ اہل مکہ مناسب تدبیر خود اختیار کریں گے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دفاعی ضرورتوں کے بارے میں شہر کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے مشورہ کیا کہ کیوں نہ ایک شہری نظام قائم کیا جائے جس سے شہر کے تمام لوگوں کی حفاظت کا اہتمام ہو سکے؛ شہر کے اکثر لوگوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ (اوس کے چار خاندانوں کے خارج رہنے کا ذکر آتا ہے جو غالباً ابو عامر راہب کے رشتہ دار اور عیسائی تھے)۔ باقی سب، یعنی مہاجرین مکہ و انصار مدینہ نیز مدینہ منورہ کے غیر مسلم عرب اور یہودی سب، اس میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر متفقہ طور پر [غیر مسلموں کی طرف سے آپؐ کو اپنا سردار مان لینے سے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیاسی فتح پر روشنی پڑتی ہے وہاں اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بے پناہ سیاسی و عسکری تدبر کی بھی بھرپور عکاسی ہوتی ہے]۔

اس مملکت (= ریاست) کا ایک تحریری دستور مرتب ہوا، جسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے (دیکھیے محمد حمید اللہ: *The first written-consitution in the world*، مطبوعۂ لاہور؛ [نیز رک بہ میثاق مدینہ]) اور اس میں حکومت کے ذمے داروں اور حکومت کے اطاعت گزاروں، الغرض دونوں اطراف، کے حقوق و فرائض کافی وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں اور

marfat.com

Marfat.com

... مسلموں کے حقوق کو بھی نہیں بھلایا گیا۔ اس میں انھیں دینی و عدالتی معاملات میں داخلی خود اختیاری ہی نہیں، بلکہ معاقل (سماجی مالی تحفظ) وغیرہ میں مسلمانوں کے ساتھ مساوات عطا کی گئی ہے۔ اس دستور کو اصل میں بیعت عقبۂ ثانیہ کا تتمہ سمجھنا چاہیے، جس میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے انصار کے لیے اپنی طرف سے مختلف قبائل پر بارہ نقیب مامور فرمائے تھے اور ایک کو نقیب النقباء نامزد کرکے گویا مرکزیت پیدا کر دی تھی [نیز رک بہ مدینہ]۔ مدینہ منورہ میں اسلام سے قبل کسی مملکت کا ڈھانچا موجود نہ تھا؛ صرف قبیلے بستے تھے اور ان میں سے ہر ایک میں اپنا اپنا غیر منظّم "نظم و نسق" پایا جاتا تھا، جو قبیلے کے سردار کی ذات سے مربوط ہوتا تھا۔ جب وہاں پہلی دفعہ نظم و نسق کا ایک شہری نظام قائم کیا گیا تو ظاہر ہے ہر چیز کو از سرنو قائم کرنا اور بتدریج ترقی دینا تھا۔ [حالت یہ تھی کہ] مرکزی انتظامیہ کے ملازمین نہ تھے، خزانہ نہ تھا، فوج نہ تھی، عدالت نہ تھی؛ شروع میں ہر مشکل مسئلے میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے رجوع کیا جاتا اور ہر کام رضاکارانہ ہوتا تھا اور چونکہ پرانا نظام فوری ضرورتوں کے لیے کافی تھا، اس لیے بغیر کسی معقول وجہ کے قبائل کی خود اختیاری میں دخل نہیں دیا گیا۔

اصول کے طور پر ہوا ہو، یا سہولت کی خاطر، بہرحال غیر مسلموں کو نظم و نسق میں ہی نہیں، قانون اور عدل گستری میں بھی کامل خود مختاری رہی۔ ان پر اسلامی قانون نافذ نہ کیا گیا اور یوں بھی بجز دو ایک مرکزی امور کے (مثلاً دفاع اور بین القبائل نزاعات میں آخری فیصلہ) ہر قبیلے کو اندرونی خود مختاری رہی۔ اس تنظیم کا ناگزیر نتیجہ یہ نکلا کہ غیر مسلم مدنی قبیلوں میں قبیلہ وار پنچائتیں برقرار رہیں۔ مزید برآں مسلمان قبائل میں ایک مرکزی "پارلیمان" کی ضرورت تھی اور وہ فوراً وجود میں بھی آ گئی اور یہ مسجد نبوی تھی۔ سارے مسلمان، مرد ہوں کہ عورتیں، گویا اس کے رکن تھے۔ اس پارلیمان کا ہر روز پانچ بار اجلاس ہوتا اور رائے عامہ سے مسلسل رابطہ رہتا، کیونکہ وہاں نئی ریاست کا سربراہ روز مرّہ کے سیاسی اور اجتماعی مسائل سے بھی بحث کرتا؛ ضرورت پڑنے پر غیر معمولی اجلاس بھی ہوتے۔ نمازوں سے باہر بے وقت لوگوں کو جمع ہونے کا اعلان کیا جاتا تو تمام لوگ بھاگے چلے آتے۔ تحیّۃ المسجد سے فارغ ہونے کے بعد آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم منبر پر چڑھ کر واقعات بیان کرتے اور مشورہ طلب فرماتے اور خاص کر ہر قبیلے کے نمائندے یعنی سردار سے توقع کی جاتی کہ وہ تائید یا اختلاف کے لیے ضرور رائے دے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض افراد سے انفرادی مشورے بھی ہمیشہ ہوتے رہے؛ غالباً اسی لیے حضرت عبداللہؓ بن عبّاسؓ کا قول ہے کہ حضرت "ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ رسول اللہؐ کے دو وزیر تھے" (الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۱: ۲ ببعد، ۶ تا ۸)۔ امام احمد ابن حنبل (مسند، حدیث ۶۵، ۱۲۰۵ وغیرہ) نے خود رسولؐ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ گزشتہ پیغمبروں کے سات وزرا ہوتے تھے؛ اللہ تعالی نے مجھے چودہ وزیر عطا کیے ہیں"۔ ممکن ہے اس سے مراد اوس اور خزرج کے بارہ نقیب اور مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم اجمعین ہوں۔ ہجرت مدینہ سے قبل ہی قرآن مجید کی سورۃ الشوریٰ نازل [عدد تلاوت ۴۲]ہو چکی تھی اور اس میں مشاورت لازم قرار دی گئی تھی۔ بیعت عقبہ کے بعد، لیکن ہجرت سے قبل، مدینہ منورہ میں مسجدیں بن گئی تھیں اور وہ بھی مسلمانوں کی گویا مشاورت گاہ تھیں۔ ہجرت کے بعد اور قبا سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی مدینہ منورہ منتقلی پر آپؐ نے

marfat.com
Marfat.com

بنو النجار کی زمین قیمتاً حاصل کر کے اس پر مسجد نبوی کی بنیاد رکھی - یہ مسجد مقام عبادت ہونے کے علاوہ مرکزی پارلیمان کا کام بھی دیتی - اس کے ساتھ ازواج مطہرات کے کمروں کے علاوہ ایک کمرہ زور (یعنی ملاقاتوں کا مقام) اور ایک عُلیّہ (یعنی بالا خانہ) بھی بنایا گیا ، جو سرکاری خزانے اور سٹور کا کام دیتا تھا - حضرت بلال ؓ ، جو مؤذن بھی تھے ، اس خزانے کے نگران تھے - صدقہ ، خیرات، مال غنیمت اور دیگر ساری سرکاری چیزیں وہاں رکھی جاتی تھیں اور آنحضرت ؐ کے ارشاد کے مطابق ان کو خرچ کیا جاتا تھا .

شروع میں تو حضرت بلال ؓ اور دیگر مستقل یا جز وقتی کاتبوں کو کوئی معاوضہ دینے کا سوال نہ تھا ، بعد میں عین ممکن ہے آپ ؐ [بغیر تعین کے کچھ نہ کچھ ان کی مالی امداد فرماتے ہوں]؛ کیونکہ البخاری (کتاب الزکوٰۃ ، باب ۵۱ : من اعطاہ اللہ شیئًا من غیر مسئلہ") کے مطابق آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے ایک بار حضرت عمر ؓ کو کچھ عطیہ دیا تو انھوں نے لینے سے یہ کہ کر انکار کیا کہ کسی محتاج کو وہ رقم دے دی جائے ، مگر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے فرمایا کہ جو عطیہ بغیر مانگنے اور بغیر ذلّت اٹھانے کے ملے اسے لے لینا چاہیے - بہرحال ، مدینہ منوّرہ میں شروع ہی سے متعدد کاتب موجود تھے ، کچھ آپ ؐ کے خطوط اور پروانے لکھتے، کچھ قرآن کے نازل ہونے والے اجزا کو قلمبند کرتے اور غالباً ان کی چند نقلیں بھی تیار کر کے مسجد میں اور امّت میں پھیلاتے ؛ کچھ مال غنیمت کی تفاصیل قلمبند کرتے - پھر توسیع مملکت پر صوبہ‌جات میں انتظامی افسر مامور ہونے ناگزیر تھے - [آپ ؐ صرف ایک عظیم منتظم ہی نہ تھے، بلکہ منتظم شناس بھی تھے؛ چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم دور جاہلی کے خصوصی خاندانی امتیازات کا لازمی لحاظ فرماتے تھے - اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ پہلے سے تربیت یافتہ ہوتے تھے ؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ؐ نے غزوۂ بدر میں جنگ کا لواء (جھنڈا) اس کو دیا] جو موروثی طور پر لوا بردار تھا اور فرمایا کہ اسلام حق رسانی کا حکم دیتا ہے .

کسی گفت و شنید کے لیے ایک سفیر کو بھیجنے کی ضرورت ہوتی تو مکّے کے موروثی سفیر حضرت عمر ؓ کا انتخاب فرماتے اور اگر کسی وجہ سے وہ خود اس کی معذرت کرتے ، تو پھر کسی اور کو بھیجا جاتا ، جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمان ؓ کو مکّے جا کر گفت و شنید کرنے کا حکم دیا گیا - حضرت خالد ؓ بن ولید مسلمان ہوئے تو انھیں سوار فوج کی کمان سپرد کی گئی جو مکّہ مکرمہ میں ان کی موروثی خدمت تھی ؛ فتح مکہ پر کعبے کی چابی اور چاہ زمزم کی نگرانی قدیم موروثی ذمے داروں کے لیے برقرار رکھی گئی اور تبدیلی قبول نہ فرمائی - (آپ ؐ نے عرفات اور مزدلفہ کے انتظامات حج بھی سابقہ لوگوں ہی کو دینا چاہے ، مگر وہ لاوارث مر چکے تھے) .

دفاعی انتظامات میں کئی باتیں قابل ذکر ہیں: شروع میں سرکاری خزانہ خالی تھا - اس لیے تنخواہ دار فوج رکھنے کا سوال ہی نہ تھا - اس کا حل یوں کیا گیا کہ جہاد ہر عاقل بالغ مسلمان (مرد) کا فریضہ قرار دیا گیا [اور فوجی خدمت کے صلے میں مال‌غنیمت (رکّ بہ انفال) کے پانچ حصوں میں سے چار حصے مصروف جہاد فوج میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا] - فوجی خدمت لازمی تو ہو گئی لیکن ہر وقت سارے لوگوں کی ضرورت نہ ہوتی تھی اور محض مطلوبہ مقدار میں لوگ لیے جاتے - ان کا ایک افسر نامزد کیا جاتا ، یا آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم خود مرکز میں تشریف فرما رہ کر اور بعض اوقات موقع پر جا کر کمان کرتے - رضا کاروں کی مسجد

marfat.com

Marfat.com

[illegible] طلبی ہوتی تو ایک رجسٹر [illegible] ، جس میں لوگ اپنے نام درج کراتے ۔ [illegible] ہر شخص اپنے مصارفِ حمل و نقل ، اسلحہ اور غذا خود برداشت کرتا ، لیکن حکومت بھی حسب ضرورت اور حسب امکان مدد کرتی ۔ نظم و ضبط بڑھانے کے لیے مال غنیمت ، کسی فرد خاص کا نہیں بلکہ تمام فوج کا مساوی حق قرار دیا گیا ۔ تشویق کے لیے یہ حکم دیا گیا کہ اموال غنیمت مرکزی حکومت کو خُمس ($\frac{1}{5}$) اور فوج کے سپاہیوں کو $\frac{4}{5}$ تقسیم کیے جائیں گے : چنانچہ سپہ سالار اور معمولی سپاہی کو مساوی حصہ ملتا ، البتہ سوار کو پیادے سے دوگنا حصہ دیا جاتا کہ اس پر گھوڑے کی غذا کا بھی بار رہتا تھا ۔ اگر مدینہ منورہ پر حملہ ہوتا تو مسلم اور غیر مسلم سبھی آنحضرت[ؐ] کی کمان میں مدافعت میں حصہ لیتے؛ [اگر کبھی اس مقصد کے لیے مدینہ منورہ سے باہر جانا پڑتا] تو دستور نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ جس کو چاہیں غداری کے احتمال پر فوج میں شریک ہونے سے روک دیں ۔

حقیقی اطمینان اسی وقت ہو سکتا تھا کہ اس شہری مملکت میں مسلمان اکثریت حاصل کر لیں ۔ اس کے لیے سنہ ۱ ھ جیسے ابتدائی زمانے میں مدینہ منورہ کے محلہ بین (= ی ی ن) میں قبیلہ اسلم کی نو آبادی بس گئی تھی ۔ پھر رفتہ رفتہ بے شمار قبیلہ‌وار محلے مدینے میں نظر آنے لگے ، جو دور دراز کے قبائل کے افراد سے مختص تھے ، مثلاً جہینہ ، مزینہ ، بنو اشجع وغیرہ ۔

فوج کے معنی صرف سپاہیوں اور اسلحہ کے نہیں، بلکہ افراد میں حربیاتی مہارت ، مقصد کے لیے جان دینے کی امنگ، غذا اور پانی جیسی اساسی چیزوں سے محرومی کو برداشت کرنے کی عادت اور دیگر ایسی ہی چیزیں ہیں؛ اسی لیے پورے سال مدینہ منورہ میں تیر اندازی ، دوڑ وغیرہ کی مشق کرائی جاتی : تشویق کے لیے اس میں اور گھڑ دوڑ میں انعام دیے جاتے : شہید کے لیے جنّت کی لازوال نعمتوں کا مژدۂ جانفزا سنایا جاتا ۔ پھر رمضان المبارک کے روزے فرض قرار دیے گئے اور جہاد کو جزو اسلام قرار دیا گیا ۔ پنجوقتہ نماز کا وجوب اور نماز تہجّد کی تشویق فوجی ضرورتوں کے لیے بھی بڑی مفید چیزیں تھیں ۔ جنگ کا مقصد دشمن کو جان و مال کا نقصان پہنچانا نہیں ، بلکہ اعلاے کلمۃ اللہ تھا؛ اس لیے ممکنہ حد تک خونریزی کم کی جاتی ۔ نفسیاتی لمحے میں دشمن سے نرمی بھی کی جاتی کہ صرف ماتحت ہی نہیں ، دل سے مسلمان بھی ہو جائے اور تن من دھن سے ساتھی بن جائے ۔ جب حکومت کے وسائل بڑھے تو عہد نبوی ہی میں وہ نظام شروع ہوا جو بعد میں دیوان کے نام سے حضرت عمر[رض] کی شہرت کا باعث ہوا ہے : چنانچہ السَّرَخْسی نے شرح السیر الکبیر (۲ : ۲۵۶) میں امام محمد الشیبانی سے یہ روایت کی ہے کہ "فکانت تجمع الاخماس و کانت الصدقات علٰحدۃ لها اهل ، و للفیء اهل و کان یعطی من الصدقة الیتیم و الضعیف و المسکین فاذا احتلم الیتیم و جب علیه الجهاد نُقل الی الفیء و ان کره الجهاد لم یعط من الصدقة شیئاً و امر بان یکتسب لنفسه" یعنی عہد نبوی ہی میں غنیمتوں کا پانچواں حصہ اور صدقات یعنی زکوٰۃ کی رقمیں الگ الگ جمع کی جاتی تھیں اور اس (زکوٰۃ) کے مصارف الگ تھے ، جبکہ فیء (مال غنیمت) کے مستحق الگ ہوتے؛ آپ[ؐ] زکوٰۃ سے یتیم ، ضعیف اور مسکین کی مدد فرماتے ؛ یتیم جب بالغ ہو جاتا اور اس پر جہاد فرض ہو جاتا تو اسے فیء کے مستحقین میں منتقل کر دیا جاتا ، لیکن اگر وہ جہاد سے کتراتا تو اسے زکوٰۃ سے کچھ نہ دیا جاتا اور اسے حکم دیا جاتا کہ وہ خود کما کر کھائے ۔ ان امدادی وظائف کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان چوبیس

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

گھٹتے فوجی خدمت کے لیے تیار رہتے ، اور خاندان ، وسائل کسب معیشت سب کچھ چھوڑ کر فوراً سفر پر جانے کے لیے حاضر رہتے - غزوۂ بدر میں عورتیں ساتھ نہ لی گئیں ، بعد میں وہ نرس ، باورچی وغیرہ کی صورت میں معقول تعداد میں نظر آتی ہیں ؛ [یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ مسلمان مال غنیمت کے حصول کے لیے جہاد نہیں کرتے تھے ، بلکہ ان کا اصل مقصد جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ سربکف رہتے ، رضاے خداوندی کا حصول ، اور دین اسلام کی عمومی نشر و اشاعت تھا - مال غنیمت کا حصول ایک ثانوی چیز ہے، جس پر کبھی مجاہدین کی نگاہ نہیں رہی]۔

جب قبول اسلام یا فتح کے باعث مختلف علاقوں کا اسلامی مملکت سے الحاق عمل میں آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انتظامی امور کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ اختیار فرمایا : یا تو وہاں پرانے سردار کو مسلمان ہو جانے کے بعد برقرار رکھا جاتا؛ (معاہدہ ہونے کی صورت میں بھی اس علاقے کے انتظامی ڈھانچے کو تبدیل نہ کیا جاتا) ، ورنہ کسی نئے نو مسلم شخص کو نامزد کیا جاتا ، اور اس سلسلے میں عموماً دیکھا یہ جاتا کہ اسے قرآن کتنا یاد ہے - [وجہ یہ تھی کہ ایسے شخص کی وفاداری پر اعتماد کیا جا سکتا تھا] ؛ عمر کی قید نہ ہوتی - بڑے علاقوں میں قبائلی سرداروں کے علاوہ عامل (گورنر) ، قاضی (حاکم عدالت) ، معلّم ، مُحصّلِ زکوٰۃ مامور کیے جاتے اور بعض اوقات ایک ہی فرد کو بوقت ضرورت متعدد فرائض انجام دینے پڑتے - کوئی حکمران اپنی پوری حکومت کے ساتھ مسلمان ہو جاتا تو اسے اس کی حکومت پر باقی رکھا جاتا اور وہاں مرکز کے ایک نمائندے کو بطور مندوب مامور کرکے انتظامی کام بانٹ دیا جاتا ، مثلاً عُمان میں جلندی کے دو بیٹے جیفر اور عبد مشترکہ حکمران تھے ، دونوں مسلمان ہوگئے تو ان کے ہاں حضرت عمروؓ بن العاص کو بطور نمائندہ مرکز مامور کیا گیا - غیر مسلموں کے معاملات حسب سابق کُلِّیۃً مقامی حکمرانوں سے متعلق رہے ، جبکہ اسلامی معاملات ، مثلاً مسلمانوں کی تعلیم ، عدلیہ ، زکوٰۃ وغیرہ مرکز کے نمائندے سے متعلق ہوے - ممکن ہے کہ تعلیم کے لیے مددگار بھی مامور ہوے ہوں- نجاشی حکمران حبشہ غالباً مسلمان ہو گیا تھا ، کیونکہ اس کی وفات پر رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی ، لیکن وہاں کسی نمائندے کے بھیجے جانے کا پتا نہیں چلتا، جس کی وجہ یہ ہے کہ نجاشی اصحمہ کا جانشین غیر مسلم تھا اور اس نے کبھی اسلام قبول نہ کیا ، گویا اصحمہ شخصی حیثیت میں رسول اکرمؐ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ماتحت تھا، حکمران کی حیثیت سے نہیں، اسی لیے حبشہ کے اسلامی مملکت سے کوئی سیاسی روابط نظر نہیں آتے .

رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا انتظامی امور میں ایک معمول یہ بھی تھا کہ اگر کسی عہدے پر کسی مہاجر کو مامور فرماتے تو کسی انصاری کو بھی کسی مماثل خدمت پر نامزد کرتے [تاکہ کسی کو اپنی حق تلفی کا احساس نہ ہو-] ذمہ داری تفویض کرنے میں اخلاق تربیت ہمیشہ پیش نظر رہتی؛ چنانچہ البخاری نے متعدد دفعہ یہ حدیث نبوی نقل کی ہے کہ "ہم کسی عہدے کے خواہشمند کو اس خدمت پر مامور نہیں کرتے"- اسی طرح ایک مرتبہ محصّل زکوٰۃ نے جب واپسی پر آ کر کہا کہ "یہ سرکاری مال ہے اور یہ مجھے تحفۃً دیا گیا ہے" تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سخت خفا ہوے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا : ایسے لوگ کیوں نہ اپنے گھر بیٹھے رہیں اور دیکھیں کہ انھیں کتنے تحفے آتے ہیں".

مال کو قرآن (۴ [النساء] : ۵) میں اجتماعی قیام کے لیے اساس قرار دیا گیا ہے [جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰماً]-

marfat.com
Marfat.com

[illegible] کو بھی اس کی ضرورت رہتی ہے اور بدرجۂ اولیٰ۔ ظاہر ہے کہ حکومت یہ مال اپنی رعایا سے ہی حاصل کر سکتی ہے ، مگر لوگوں کو جبر کے تحت اپنے مال کا کچھ حصہ کسی کو دینا ناگوار گزرتا ہے۔ اس گتھی کا حل ضروری تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب کے بڑے شہروں ، مثلاً مکّہ مکرّمہ میں رفادہ کے نام سے ایک جبری خیرات موجود تھی اور خوش حال لوگ خواہی نہ خواہی اس کے عادی ہوگئے تھے۔ عام قبائل میں لوگ اپنی زرعی پیداوار اور جانوروں کے ریوڑوں کا کچھ حصّہ ہر سال خدا کے لیے اور کچھ حصّہ بتوں کے لیے دینے کے عادی تھے (دیکھیے ٦ [الانعام] : ١٣٦ تا ١٤١) اور اس خیرات کو "حق" تسلیم کیا جاتا تھا۔ اسلام نے بتوں سے چھڑا کر اسے خدا کا حق بتایا اور مرکزیت کی ترغیب دی اور اسے زکوٰۃ ، صدقات، حق، انفاق فی سبیل اللہ کے مختلف معنی خیز ناموں سے یاد کیا۔ شروع میں یہ کام رضاکارانہ ہوتا تھا اور مقدار اور وقت کا تعیّن بھی نہ تھا۔ بتدریج یہ عناصر بڑھائے گئے۔ وہی چیز جو پہلے خیرات تھی اب زکوٰۃ کی صورت میں ایک مربوط اور مستحکم شکل میں نافذ کی گئی، جس میں وقت، فی صد مقدار اور نظم بھی آ گئے ، اور زکوٰۃ کے علاوہ بھی لوگوں کو عام رضاکارانہ خیرات اور غریبوں کی مدد کی ترغیب دی گئی کہ اس کی جزا خدا دے گا۔

زکوٰۃ کے مداخل کی قرآن میں تفصیل کم ہے ، لیکن مصارف کو .(٩ [التوبۃ]: ٦٠) متعین کر دیا، با آج کی زبان میں، بجٹ کے اصول بتا دیے گئے۔ مسلمانوں سے ہرمدّ پر لی جانے والی رقم زکوٰۃ ہی کہلاتی ہے : زکوٰۃ الأرض، زکوٰۃ التجارۃ ، زکوٰۃ المعادن، زکوٰۃ المواشی وغیرہ [نیز رک بہ عشر ، مالیات ، علم (معاشیات) وغیرہ]۔ غیرمسلم رعیّت سے جزیہ اور خراج کے نام سے ٹیکس لیا جاتا اور اس میں کچھ عملی نوعیت کا فرق تھا ، یعنی بعض اسلامی صدقات غیر مسلموں پر معاف تھے (یا کم از کم ان کی اپنی مذہبی تنظیم کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے) اور بعض مدّوں میں فی صد بڑھا دیا گیا اور بعض حرمتوں سے بھی غیر مسلموں کو مستثنٰی کر دیا گیا (مثلاً سود ، شراب کی تجارت وغیرہ میں ، جس سے ان کو خاصی ، فوری اور جلد جلد آمدنی ہوتی تھی، لہذا ٹیکس بھی زیادہ دینا چاہیے تھا)۔ مسلمانوں کی آمدنی سے مؤلّفۃ القلوب کی حد تک تو غیر مسلم بھی مستفید ہوتے تھے۔ ابو یوسف نے اپنی کتاب [کتاب الخراج] میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مدینہ منورہ کے ایک یہودی کا روزینہ مقرر کرتے ہوے زکوٰۃ سے متعلقہ آیت سے استدلال کیا اور کہا "هذا من مساکین اهل الکتاب" گویا ان کی رائے میں "فقرا" اور "مساکین" سے مسلمان اور غیر مسلم دونوں مراد ہیں۔ البلاذری نے شام کے عیسائیوں کے متعلق بھی حضرت عمرؓ کے مماثل طرز عمل کا ذکر کیا ہے۔ ابو عبید نے تو اپنی کتاب الاموال میں صدقۂ فطر کے متعلق بھی صراحت کی ہے کہ مسلمان ان کے زمانے میں غریب راہبوں اور پادریوں کو بھی دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ غیر مسلم رعایا سے آنے والے ٹیکس سے مسلمان بھی مستفید ہوتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ساری رعایا خوش حال رہے اور اسلامی عملداری میں خدا ہی کا بول بالا ہو۔ اسی لیے قرآن (٥ [المائدۃ] : ٢) غیر مسلم دشمنوں سے بھی ، وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ، یعنی ایک دوسرے سے نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو کا حکم دیتا ہے .

عوام کے ، یعنی سرکاری، مال میں غبن اور بیجا تصرف کو روکنا حکمران کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا طریقہ کتنا مؤثر تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ زکوٰۃ میرے ، میرے

marfat.com
Marfat.com

اہل خاندان ، میرے اہل قبیلہ حتّٰی کہ میرے حلیف قبیلہ بنو عبدالمطّلب کے لیے بھی ہمیشہ کے لیے حرام ہے ۔ جب حکمران کے یہ اعزہ و اقارب اس میں تصرف بیجا نہیں کر سکتے تو ظاہر ہے کہ حکمران اپنے ماتحت سرکاری ملازمین ، وزرا وغیرہ کی زیادہ آسانی سے نگرانی کر سکتے ہیں ۔ رشوت ستانی اور دیگر ممنوعات و محرمات کی طرح بیک وقت مادی اور روحانی تعزیرات مقرر کی ہیں کہ ان جرائم کی صورت میں حکومت بھی سزا دے گی اور آخرت میں بھی خدا کے ہاں جوابدہی ہوگی ۔

حکومتوں کے لیے عدل گستری بھی لازم و ملزوم قرار دی گئی حتی کہ عربی لفظ "حکومت" کے معنی ہی تحکیم اور عدل گستری کے ہیں ۔ مدینے میں عہد نبوی ہی میں مفتی (شرعی مشیر) بھی پائے جاتے تھے اور وقت بوقت پنچ بھی مامور ہوا کرتے تھے ۔ مرکز سے دور قاضی مامور ہوتے رہتے اور قلت کار کے باعث متعدد فرائض ایک ہی شخص کے سپرد بھی کر دیے جاتے ، مثلاً حضرت معاذ بن جبل یمن میں بھیجے گئے تو وہ قاضی بھی تھے ، مدرّس بھی ، عامل بھی ، محصّل زکوٰة بھی اور ناظر تعلیمات بھی کہ گاؤں گاؤں دورہ کریں (جیسا کہ الطبری نے صراحت کی ہے) ؛ ان کو احکام قرآن ، حدیث اور اجتہاد سے حاصل ہوتے تھے ۔

تعلیم پر شروع ہی سے بڑی توجہ مبذول کی جاتی رہی ۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ہجرت سے قبل مکّے میں جیسے ہی کوئی وحی نازل ہوتی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اسے فوراً مردوں کے اجتماع میں ، پھر عورتوں کے جلسے میں تلاوت اور تبلیغ فرماتے ؛ مدینہ منورہ آتے ہی مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی تو اس میں ایک حصہ بطور صُفّہ مختص کیا گیا ، جہاں دن میں معمولی ابتدائی تعلیم سے لے کر ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست تھا ، تو رات میں وہی مقام غریب اور بے گھر طلبہ کے لیے دارالاقامہ کا کام دیتا ۔ ان کے کھانے کا بھی انتظام تھا اور وہ خود بھی کچھ نہ کچھ محنت مزدوری کرکے کمالیتے تھے ۔ ان پر ایک عریف (مانیٹر) بھی مامور ہوتا تھا ۔ مدینے میں عہد نبوی میں کم از کم نو اور مسجدیں تھیں ۔ وہاں بھی اہل محلہ مبتدیوں اور بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی ۔ اساتذہ کو غالباً کچھ مدد معاش دلائی جاتی ، لیکن انہیں شاگردوں سے کچھ لینے کی سختی سے ممانعت تھی ؛ اسے جہنم کی آگ قرار دیا گیا تھا [نیز رک بہ المتعلم و المعلم] ۔

عام انتظامات میں تجارت اور بازار کی نگرانی ہوتی تھی ۔ یہ انتظام غبن اور دھوکا نہ ہونے دیتا ۔ باہر سے آنے والے کاروانوں سے چنگی وغیرہ کی وصولی کا سلسلہ غالباً قبل از ہجرت کے زمانے سے مدینہ میں موجود تھا ؛ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے اس کی اصلاح فرمائی اور اس کو ترقی بھی دی ۔ بظاہر ، سابق میں وہاں تاجروں اور بیوپاریوں سے ہر روز کچھ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا ، جو اس سردار کو ملتا جس کے قبیلے میں بازار لگتا (جیسا کہ بازار بنی قینقاع کے متعلق نظر آتا ہے) ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ ٹیکس اسلامی بازار میں منسوخ کر دیا ۔ بازار کی نگرانی کے افسروں میں مسلمان عورتیں بھی نظر آتی ہیں ۔ ہمارے مآخذ ابن حجر نے ان کے فرائض نہیں بتائے ، [ممکن ہے] کہ یہ گھروں کے اندر خرید و فروخت کی نگرانی کرتی ہوں ؛ ایک ایسی نگران خاتون لکھنا پڑھنا بھی جانتی تھی ۔ شاید انہیں بیرونی کاروانوں کی چنگی سے کوئی تعلق رہا ہو ؛ شہری تعمیرات میں گلیوں کی چوڑائی کا لحاظ رکھا جانے لگا کہ کم از کم دو لدے ہوئے اونٹ بیک وقت آ اور جا سکیں ۔ گلیوں کی صفائی کا بھی انتظام ہونے لگا ۔ ڈاک کا انتظام البتہ غیر سرکاری اور غیر معیّن سا تھا ۔ کوئی شخص ، عورت ہو کہ مرد ،

marfat.com
Marfat.com

کسی شہر پر جاتا تو لوگ اس کو اس مقام کے لیے خطوط دیتے جہاں وہ جاتا ، یا جہاں سے وہ گزرتا - حوالہ ، یعنی ایک مقام سے دوسرے مقام کو رقم بھیجنے ، کا کام ایسے مالدار تاجر کرتے ہوں گے ، جن کے دوست یا رشتہ دار دوسرے مقام پر رہتے ہوں - خاص کر یہودیوں میں ، لیکن ایسی کوئی معیّن مثالیں مقالہ نگار کو نہیں ملیں -

مساجد کی امامت، مؤذنی ، صفائی ، روشنی وغیرہ کی کافی تفصیلیں ملتی ہیں - عام طور پر امامت امیر عسکر کے سپرد ہوتی ؛ اس طرح امامت امارت کے لوازم میں سے تھی [رک بہ مسجد] - چونکہ اسلامی حکومت کا مقصدِ وحید ہی تبلیغ دین اور اعلاے کلمۃ اللہ تھا ، اس لیے اس کے لیے رات دن ہر ممکن تدبیر اختیار کی جاتی ، لیکن جبر و اکراہ کو قرآن نے ممنوع قرار دیا - عہد نبوی میں عرب کے مختلف علاقوں کے قبیلوں اور عرب و بیرونِ عرب کے حکمرانوں کو تبلیغ کے لیے خطوط لکھے جاتے رہے اور ظاہر ہے کہ نامہ بر ایک عالم ہوتا ، جو دریافت پر تشریح اور توضیح بھی کر سکتا تھا - تبلیغ ہر فرد مسلم کا فریضہ قرار دیا گیا ، اس لیے نو مسلم بھی مبلّغ بن جاتے اور اپنے ماحول میں تبلیغ کرتے اور کارکردگی اس طرح روز افزوں ہوتی چاتی - اس کے نتائج کا اندازہ عہد نبوی کے مسلمانوں کی تعداد سے کیا جا سکتا ہے ، اگرچہ صحیح تعداد بیان کرنی ممکن نہیں - بخاری شریف میں ایک مردم شماری کا ذکر بھی ہے ، جس میں پندرہ سو مردوں اور عورتوں کا اندراج ہوا تھا اور بظاہر یہ ہجرت کے عین بعد مدینے سے متعلق ہے - حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چالیس ہزار مرد اور عورتیں بیان کی گئی ہیں ؛ یہ حضور[ؐ] کی وفات سے تین مہینے پہلے کا واقعہ ہے ، ظاہر ہے کہ تمام مسلمان اس وقت حج کو نہ آئے ہوں گے ؛ اگر ان کو جملہ مسلمانوں کی چوتھائی تعداد بھی فرض کر لیا جائے تو اس وقت کے جملہ مسلمان کم از کم پانچ لاکھ متصوّر ہوتے ہیں - عہد نبوی کے آخر میں سارا عرب اور جنوبی عراق اور جنوبی فلسطین کے علاقے اسلامی مملکت میں داخل ہو چکے تھے - ان کا رقبہ تیس لاکھ مربع کیلومیٹر (تقریباً بیس لاکھ مربّع میل) ہوتا ہے - ان فتوحات میں میدان جنگ میں دشمن کے ماہانہ دو آدمی بھی قتل نہ ہوے ؛ اس سے انسانی خون کے احترام کا اندازہ ہو سکتا ہے -

بیرونی تعلقات کے لیے سفارت کا طریقہ قدیم زمانے سے پایا جاتا تھا - اسلام نے بھی اسے نہ صرف برقرار رکھا، بلکہ ترقی دی - اہل اسلام کی ہجرت مدینہ اور غزوۂ بدر میں اہل مکّہ کی ہزیمت پر مشرکینِ مکہ نے اس غرض سے سفیر حبشہ بھیجے تھے کہ وہاں جو مسلمان پناہ گزیں تھے ان کی تحویل کی کوشش کریں - اس سازش اور شرارت کی اطلاع آپ[ؐ] کو ملی تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی ایک سفیر حبشہ بھیجا (جو اپنے مشن میں کامیاب رہا) - یہ سفیر عمرو[رض] بن امیہ الضّمری تھے - تبلیغ اسلام کے لیے بھی سفیر بھیجے جاتے رہے اور دیگر ضرورتوں کے لیے بھی اور خود آپ[ؐ] کے پاس بھی سفیر آتے رہے - ان سے ملاقات کے لیے مسجد نبوی میں ایک مقام معین تھا جہاں آج تک اسطوانۃ الوفود ، اس کی یادگار ہے - ایک ایسے موقع پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا قانونی قول مشہور ہے کہ آپ[ؐ] نے فرمایا "لَوْ لَا اَنَّ الرُّسُلَ لَا یُقْتَلُ لَضَرَبْتُ اعناقَکُما" یعنی اگر سفیروں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردن اڑا دیتا ؛ یہ مسیلمہ کذّاب کے بھیجے ہوے مرتد سفیروں سے متعلق ہے - اسی طرح نصاراے نجران کے سفیر تبلیغ عیسائیت کے

marfat.com
Marfat.com

لیے آئے تھے ، بحث اور گفت و شنید کے دوران میں ایک روز وہ جلسہ ملتوی کرکے باہر جانے لگے اور وجہ یہ بتائی کہ یہ ان کی عبادت کے اوقات ھیں ، اس پر آپ ؐ نے فرمایا : مسجد نبوی کے اندر بھی وہ اپنی عبادت کر سکتے ھیں ۔ مؤرخ ابن ھشام نے بیان کیا ہے کہ وہ لوگ مشرق کی طرف منہ کرکے اپنی عبادت کرتے رہے ۔ صلح حدیبیہ کے وقت مسلمانوں کے سفیر حضرت عثمان ؓ کو مکے میں نظر بند کر دیا گیا اور ان کے قتل کی خبر اڑی تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے بیعت تحت الشّجرہ لی تاکہ اس کا بدلہ لیں ۔ پھر اھل مکہ سے صلح ھوئی تو دشمن کے سفیروں کو اس وقت تک روک رکھا گیا جب تک حضرت عثمان ؓ صحیح و سالم واپس نہ آ گئے ۔ رومی (بوزنطی) علاقے میں مسلمانوں کے ایک سفیر کو جان سے مار ڈالا گیا اور قیصر روم نے مجرموں کو سزا دینے سے انکار کیا اور نہ صرف ایک لاکھ کی فوج بھیج کر مؤتہ میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کی ، بلکہ معان کے بوزنطی گورنر کے مسلمان ھونے پر اس کو سولی کی سزا دی ۔ مؤتہ ، پھر تبوک کی مہمیں اسی سلسلے میں پیش آئیں ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے بستر مرگ پر حضرت اُسامہ ؓ بن زید کو اسی سلسلے میں [اھل اُبنٰی (ایک شامی قصبہ، جسے آجکل الزیت کہتے ھیں) کے خلاف] بھیجنے کی وصیت فرمائی ۔ زندگی کی آخری وصیتوں میں رسول اکرم ؐ نے یہ بھی فرمایا تھا: "اَجِیزُوا الوفود کما کُنت اجیزھم" یعنی سفیروں، وفدوں کو اسی طرح تحفے تحائف دیتے رھو جیسے میں دیتا رھا ھوں ۔ مستقل سفیروں کی ابھی ضرورت محسوس نہیں ھوئی تھی ، لیکن حضرت عمرو ؓ بن العاص کا عمان کے حکمرانوں کے ھاں متعین رھنا شاید اس چیز کے مماثل سمجھا جا سکتا ہے جو برطانوی ھند میں دیسی ریاستوں میں ریزیڈنٹ (مندوب) سے موسوم تھا اور جو ٹونس اور مراکش میں فرانسیسی مندوب کہلاتا تھا ۔ عہد نبوی میں، آپ ؐ کی ھدایات کے تحت اور آپ ؐ کی نگرانی میں مملکت مدینہ کے نظم و نسق کی یہی صورت رھی ۔ مزید تفصیلات کے لیے مآخذ کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے ۔

مآخذ : اس باب کے مآخذ بھی وھی ھیں جو رسول اکرم ؐ کی حیات مبارکہ کے سلسلے میں درج ھو چکے ھیں، بطور خاص ملاحظہ ھوں : (۱) محمد حمید اللہ: عہد نبوی میں نظام حکمرانی ، دھلی ۱۹۲۶ء ؛ (۲) وھی مصنف : عہد نبوی کے میدان جنگ ؛ [(۳) وھی مصنف : رسول اکرم کی سیاسی زندگی ، لاھور ۱۹۵۴ء ؛] (۴) وھی مصنّف : مقالہ "Budgeting and Taxation in the Time of the Holy Prophet" ، در *Pakistan Historical Society Journal* ، کراچی ، ۳ جنوری ۱۹۶۵ء [نیز دیکھیے (۵) ابن تیمیّہ: السّیاسة الشّرعیه فی اصلاح الرّاعی و الرّعیة ؛ (۶) ابو الفرج قدامه بن جعفر : کتاب الخراج ، حیدر آباد دکن ، ۱۳۲۱ھ ؛ (۷) ابو الکلام آزاد : مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب ، کلکتہ ۱۹۲۰ء ؛ (۸) ابوالاعلیٰ مودودی : اسلامی حکومت کس طرح قائم ھوتی ، علی گڑھ ، ۱۹۴۰ء ؛ (۹) وھی مصنّف : ذمیوں کے حقوق ، مطبوعۂ لاھور ؛ (۱۰) وھی مصنف : اسلام کا نظریۂ سیاسی ، مطبوعۂ لاھور ؛ (۱۱) ابو یوسف : کتاب الخراج ؛ (۱۲) الماوردی : الاحکام السلطانیه ؛ (۱۳) ابو عبید القاسم بن سلاّم : کتاب الاموال ، مطبوعۂ اسلام آباد وغیرہ] ۔

(محمّد حمید اللہ [و ادارہ])

⊕ رسول اکرم ؐ بطور مقنّن : [یہ اسلام کا خاص امتیاز ہے کہ اس میں قانون اور اخلاق دست بدست چلتے ھیں ، قانون اخلاق کا پاسدار ہے اور اخلاق قانون کا محافظ ؛ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم بیک وقت معلّم اخلاق بھی تھے اور مقنّن بھی ۔ بالعموم] نبی کا

marfat.com
Marfat.com

صلی اولاً عقائد و عبادات کی تعلیم یا تزکیۂ اخلاق اور تصفیۂ قلوب پیش ہوتا ہے، ثانیاً کسی اور شے ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق بیک وقت دونوں سے ہے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ اکثر انبیا کسی ایسے مقام پر مبعوث ہوتے رہے ہیں، جہاں پہلے ہی کوئی منظّم حکومتی معاشرہ، کوئی مملکت اور کوئی حکمران بھی موجود تھا؛ [اس لیے وہاں صرف تزکیۂ نفس کی ضرورت تھی] ، لیکن مدینہ منوّرہ ایک ایسا مقام تھا جہاں ہجرت نبوی کے وقت کوئی منظّم سیاسی حکمران تنظیم موجود نہ تھی، نہ شہری ریاست اور نہ کوئی بین القبائل مشترکہ فرمانروائی۔ عبداللہ بن اُبَی بن ابی سلول کو اوس اور خزرج کے مشترکہ بادشاہ بنانے پر اتفاق ضرور ہو گیا تھا اور تاج شہرباری کی فرمائش شہر کے یہودی سناروں سے کی جانے کی بھی امام البخاری نے روایت کی ہے، لیکن اس تجویز کے عملی شکل اختیار کرنے سے قبل رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ بنو اوس و بنو خزرج کے لوگوں نے بکثرت اسلام قبول کر لیا اور رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی اولیں انتظامی تدبیروں کے بعد صرف اوس و خزرج کا بادشاہ بننا ایک بے معنی اور بعد از وقت چیز ہو گئی تھی۔ مہاجرین کی آمد کے بعد، آبادی میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہو گیا تھا؛ ان وجوہ سے ایک شہری ریاست مدینہ کا قیام اور اس کا تحریری دستور ضروری ہو گیا تھا؛ تحریری دستور میں مہاجرین، انصار، اوس و خزرج اور یہود اور ان کے حقوق و فرائض کا صراحت سے ذکر ہے، نیز یہ بعض غیر مسلموں کا بھی ذکر کرتا ہے، جو غالباً مدینے کے مشرک عرب تھے، ان سے عیسائی عرب مراد نہیں، جو قبیلہ اوس کے ابو عامر راہب کے حلقہ بگوش تھے (اور مدینے کی اس وفاقی شہری ریاست Confederal City State سے

خارج رہے)۔ اس کے ذریعے مقامی غیر مسلموں نے رسول کریم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو شخصی حیثیت میں، نہ کہ بطور نبی کے، اپنا حکمران مان لیا تھا۔ اس کے فوراً بعد آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم مدینہ منورہ کے شمال، جنوب، مشرق و مغرب کے مشرک عرب قبائل سے عسکری اور دفاعی معاہدے بھی کرتے رہے، پھر قریش سے جنگیں چھڑ گئیں۔ ان حالات میں اہل مدینہ کو عملاً اتنی مصروفیت رہنے لگی کہ وہ کسی اور چیز کو سوچ بھی نہیں سکتے تھے، اور رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی سیاسی قیادت روز بروز وسیع تر اور اقتدار مستحکم تر ہی ہوتا [گیا اور ظاہر ہے کہ یہ اقتدار] حکیمانہ، منصفانہ اور عوام النّاس کے لیے بہی خواہانہ تھا؛ اس میں ذاتی جاہ طلبی بالکل نہ تھی۔

جب ایک مملکت قائم ہو گئی تو مسائل دفاع اور کم از کم مُرافعہ (اپیل) کی حد تک عدل گستری بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے لیے ناگزیر ہو گئی؛ اس کے لیے حسب ضرورت [آئے دن قرآن کریم میں] نئے احکام [اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی طرف سے ارشادات] صادر ہوتے رہے، جو کم و بیش سارے ہی مسائل کے متعلق ہوتے تھے، کیونکہ آپ کے سامنے تجارتی جھگڑے بھی آتے، نکاح و طلاق جیسے مسائل بھی، [اخلاقی جرائم بھی اور دیوانی تنازعات بھی]، آپ ان سب کے بارے میں احکام صادر فرماتے۔ اصول کار یہ رہا کہ آپ اپنے قوانین کی اساس اولاً قرآن مجید پر رکھتے، یا قرآنی احکام کی روشنی میں نئی ہدایات وضع فرماتے؛ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ جن پرانے عرف و عادات کو روح قرآنی کے مطابق پاتے ان کو اختیار کر لیتے۔ [بعض جدید محققین کا یہ استنباط صحیح معلوم

marfat.com
Marfat.com

نہیں ہوتا کہ آپؑ نے جملہ عرف و عادت کو ایک قانونی اساس قرار دیا ؛ آپ نے تو صرف ان عرف و عادت کو اختیار کیا تھا ، جو روح قرآنی کے مطابق تھے ۔ نامناسب اور بےآہنگ عرف و عادت کو رد کرکے] رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم مسلمانوں کے لیے نئے احکام صادر [کیا کرتے تھے ؛ لہذا عرف و عادت کو ایک مستقل قانونی اساس سمجھنا درست نہیں ہے ۔ بہر حال یہ] سلسلہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی وفات تک جاری رہا ۔ یہ قانون سازی اتنی مفصل اور جامع تھی کہ بعد میں تین تین بّراعظموں پر حکومت کرنے والی اسلامی حکومتیں اپنی عام ضرورتوں کے لیے صراحت سے احکام اس میں پاتی رہیں اور یہ اس قدر واضح تھا کہ فقہا ان سے بآسانی مطلوبہ احکام استنباط کر سکے ۔

مکی دور تشریع : نبوت کے ابتدائی تیرہ سال مکے میں گزرے اور وحی (قرآن) کے نزول کا سلسلہ وہیں شروع ہوا ۔ مکی دور میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے مسلمانوں کے لیے [تدریج کے اصول کو اپنایا ۔ بعض نامناسب پختہ عادتوں کے بارے میں ڈھیل اور لچک کا انداز اختیار کیا] ۔ کچھ نئے قوانین بھی نافذ ہوتے رہے اور کچھ پرانی جائز چیزیں حرام یا مکروہ بھی قرار دی جاتی رہیں ۔ اس کی مکمل تفصیل تو یہاں نہیں دی جا سکتی، لیکن اس کا معلوم کرنا آسان ہے ۔ اس کے لیے قرآن کریم کی مکی سورتوں کو تاریخ نزول کے حساب سے مرتب کر کے پڑھنے اور ان میں بیان کردہ احکام پر [غور کرنے سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے کہ مکی اور مدنی احکام میں فرق یہ ہے کہ مکی زندگی میں اتباع شخصیت رسولؑ کا ہوتا رہا اور مدنی زندگی میں ایک شہری ریاست کے قائد و رہنما کی حیثیت سے احکام کا نفاذ اور اتباع ہوتا رہا ، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مکی احکام بھی مکمل ضابطۂ قوانین میں داخل ہیں ، ماسوا ان کے جن کی بعد میں ترمیم یا تنسیخ ہو گئی ۔ اس معاملے میں ہمارے محققین اور بعض فقہا کو التباس سا ہو جاتا ہے، حالانکہ آنحضورؑ کے دیے ہوئے قوانین میں مکی زمانے کے احکام کو بھی (بعد کی ترمیم و تنسیخ کے اصول کے تابع) شامل سمجھنا چاہیے ، مثلاً درج ذیل احکام کو دیکھیے] :

مکّی دور میں عبادات کے ابواب میں نماز ہی نہیں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا بھی کئی بار ذکر آتا ہے ، مثلاً (٦ [الانعام] : ۱۴۲ : [و اٰتوا حقه یوم حصاده] [یعنی پھلوں کے توڑنے اور فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کر دیا کرو ؛ دوسری جگہ ارشاد ہے ؛ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۙ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۷۰ [المعارج] : ۲۴ تا ۲۵) ، یعنی اور وہ لوگ جن کے مالوں میں سائل اور مفلوک الحال کا حق متعین ہے] ۔ مسلمان وہاں حج میں بھی حصہ لیتے تھے ۔ بیعت ہائے عقبہ حج کے زمانے ہی میں واقع ہوئیں ۔ البخاری [الصّحیح : کتاب الصّیام] نے صراحت کی ہے کہ ہجرت سے قبل آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم عاشورا کا روزہ رکھتے تھے ؛ لازماً دوسرے مسلمان بھی رکھتے ہوں گے ۔ دفاع کے فطری حق اور چھوٹے پیمانے پر مدافعت کرنے کا بھی ذکر ہے : وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (۴۲ [الشورای] : ۳۸) ، [یعنی اور وہ لوگ جب ان پر زیادتی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں] ؛ تجارت کی خرابیوں کا بھی ذکر ہے (۸۳ [المطفّفین] : ۱ تا ۳)؛ نیز انبیاے سلف کے ذکر میں قوموں کی تجارتی بدمعاملگی پر ان کی سرزنش کا بھی ؛ یہ اخلاق امور بھی مدنظر رہے : فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّاۗىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳ [الضحیٰ] : ۹، ۱۰)، [یعنی پس آپ بھی یتیم پر سختی نہ کیجیے اور سائل کو مت جھڑکیے] ۔ کتب سیرت کی مدد سے احادیث میں بھی ایک حد تک مکّی

marfat.com

Marfat.com

[illegible] کی [illegible] قائم کی جا سکتی ہے۔ [اس کے معنی یہ ہوے کہ قانون (تشریع) کا سلسلہ نزول قرآن کے آغاز ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ مکی زندگی میں نئے معاشرے کی تشکیل شروع ہوگئی: اعلان ایک نبی کی طرف سے ہوتا رہا۔ اسی معاشرے کی جب مدینہ منورہ میں تشکیل ہوکر ایک منظم ریاست کی صورت میں تکمیل ہوئی تو نبی نے بطور قائد اپنا مثالی کردار اور (مکی مدنی سورتوں کو ملا کر) قوانین کا اعلان و نفاذ کیا]۔ اس قانون سازی کا طریقہ سادہ تھا: رسول اکرم فرماتے: یہ کرو؛ یہ نہ کرو؛ اہل ایمان اس پر آمنّا و صدّقنا کہتے۔ یہ تشریع کبھی قرآن کی آیات پر مبنی ہوتی، کبھی حدیث و سنت کا جزو ہوتی، جن کے متعلق بھی قرآن نے مکی دور ہی میں کہہ دیا تھا کہ: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۵۳ [النجم]: ۳)، [یعنی آپ اپنی مرضی سے نہیں بولتے، بلکہ یہ تو وحی ربانی ہے جو آپ کی زبان سے صادر ہوتی ہے]۔

ان واقعات سے ذیل کے نتیجے نکالے جا سکتے ہیں:

(۱) خدا ہی سرچشمۂ قانون اور شارع اصلی ہے، رسول اس کے احکام امت تک پہنچاتا ہے؛ (۲) قرآن کے اجمال یا سکوت کی صورت میں نبی سرچشمۂ قانون ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا (اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۵۳ [النجم]: ۳)؛ (۳) قرآن و حدیث کے سکوت کی صورت میں رسم و رواج اور عرف و عادت برقرار رہتے ہیں [بشرطیکہ ان میں کوئی بات روح قرآنی کے منافی نہ ہو اور مقاصد شرع اسلامی پر زد نہ پڑتی ہو]؛ یہ شریعت ابراہیم و موسیٰ کے باقیات الصالحات بھی ہو سکتے ہیں اور خالص انسانی عقل اور تجربے کے [انسانیت پرور] نتائج بھی؛ (۴) لہٰذا عرف و عادت مستقل اساس شرع نہیں، یہی وجہ ہے کہ عرف و عادت سے صرف وہی امور ماخوذ ہوے جو مزاج قرآنی سے ہم آہنگ تھے۔ قرآن و حدیث کے تابع عرف و عادت کی تبدیلی بھی ہوتی رہی ہے؛ (۵) آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جو قانون سازی کی اس میں فطری تقاضوں کا پورا لحاظ رکھا گیا، مثلاً حکم ہوا کہ نکاح کریں۔ انسانی جبلّتوں کی تسکین بطریق اعتدال تابع مقاصد شرع ہو، مثلاً خوش حال رہنے کی خواہش، عز و وقار کی خواہش کی تسکین، جھوٹے توکّل کی جگہ خواہش تعمیر و ترقی کے زیر اثر کائنات سے استفادہ کیا جائے: وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (۲۸ [القصص]: ۷۷)، نیز، وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳ [النجم]: ۳۹)؛ (۶) تشریع میں تدریج ملحوظ رہی، شاید اس لیے کہ پرانی بری عادتیں آسانی سے نہیں چھٹتیں، مثلاً شراب کی ممانعت، کہ مکی دور میں کہا گیا: وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا (۱۶ [النحل]: ۶۷)؛ یہاں نشہ اور رزق حسن کو دو الگ چیزیں بتایا گیا ہے، یعنی نشہ رزق حسن نہیں ہے اور غیر مستحسن رزق ہے اور لطیف انداز میں اسلامی سیاست سمجھنے والوں کو بات سمجھا دی گئی [کہ اصل شے رزق حسن ہے، دوسری شے پُرکشش ضرور ہے، مگر رزق حسن نہیں]؛ اگرچہ اس وقت صراحت مناسب نہیں سمجھی گئی، یہ بتقاضاے تدریج ایسا کیا گیا ہے؛ (۷) ایک بنیادی اصول یہ رہا کہ سہولت [تیسیر] رہے تاکہ دین کے احکام عوام اور ہر قسم کے کم سمجھ رکھنے والے انسانوں کے لیے بھی قابل عمل رہیں اور دین مٹھی بھر فرشتہ صفات انسانوں سے مختص ہو کر نہ رہ جائے: "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" (۹۴ [الانشراح]: ۶)۔ پھر مدنی دور میں مزید صراحت کی گئی: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۲ [البقرۃ]: ۱۸۵)۔ احادیث میں بھی اس اصول کا بکثرت ذکر ہے؛ (۸) برائیوں سے روکنے اور نیکیوں کی ترغیب کے

marfat.com

Marfat.com

سلسلے میں بھی طبع انسانی کے محرکات کا خیال رکھا گیا ؛ محض سزائے دنیوی اور تہدید ظاہری کافی نہیں سمجھی گئی ۔ اس کے لیے گہرے روحانی مؤثرات کو بھی کام میں لایا گیا ہے ؛ چنانچہ روز آخرت کی جزا و سزا کو بھی اس میں شامل رکھا گیا ہے ؛ [مطلب یہ کہ دنیا میں کوئی شخص برے عمل کی سزا سے بچ بھی نکلا تو کیا ہوا ؛ ایک یوم الحساب اور بھی ہے] ۔ چنانچہ ممنوعات کے لیے دوزخ کی صورت میں تہدید و ترهیب اور اوامر ترغیب و تشویق کے لیے جنّت [کے تصور کو معاون مؤثر بنا دیا ، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ محض دنیوی قانون انسداد ممنوعات کے لیے کافی نہیں] ۔ اگرچہ خدا کے بندے ہونے کی حیثیت میں اوامر کی تعمیل پر کسی جزا و انعام کی ضرورت نہ تھی ، لیکن خدا نے اپنے فضل و کرم سے اُخروی انعام کا بھی پختہ وعدہ کیا ۔ مکّی زندگی میں امکان نہ تھا کہ مادی تہدید، یعنی تعزیرات اور عقوبات نافذ کی جائیں؛ ان کا نفاذ مدنی دور میں ہوا ، [مگر روحانی تہدید وہاں بھی ساتھ رہی ؛ کیونکہ روحانی داخلی مؤثرات ہی برائی کا صحیح قلع قمع کر سکتے ہیں] ؛ (۹) [اصولاً انبیائے سلف کی شریعتیں] سُنن مَن کان قبلکم ، بعض احکام کے سلسلے میں جن کا قرآن میں بالصراحت ذکر ہے برقرار رکھی گئیں ، بجز ان کے جن کی قرآن و حدیث کے ذریعے ترمیم و تنسیخ کی گئی ہو: اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللہُ فَبِھُدٰىھُمُ اقْتَدِہْ (۶ [الانعام] : ۹۱) ؛ وجہ ظاہر ہے کہ پرانا قانون بھی خدا کا ہے اور نیا بھی اور جب قانون ساز ایک ہی مسئلے پر یکے بعد دیگرے متعدد احکام دے تو تازہ ترین حکم ہی قابل عمل رہتا ہے ، [لیکن قانون ساز سابقہ کی تنسیخ نہ کرے، بلکہ اس کو جاری رکھنے کا حکم دے تو] سابقہ منسوخہ احکام بھی برقرار رہتے ہیں ؛ (۱۰) [آنحضرت ؐ نے جو قانون دیا اس میں دارین

(دنیا اور عقبیٰ) کے حسنات کو] مطمح نظر بنایا ، اس لیے نماز کے ساتھ زراعت ، حرفت اور تجارت کو بار بار خدا کا انسانوں پر فضل بتایا گیا ہے اور دینی احکام میں دنیوی اور دنیوی احکام میں دینی پہلو ملحوظ رہا ؛ (۱۱) قانون اور اخلاق کو باہم پیوست کر دیا گیا ، مگر لچک بھی رکھی گئی تاکہ ادنیٰ ، اوسط اور اعلیٰ ، ہر قسم کے لوگوں کے لیے دین کے روحانی اور مادی احکام قابل عمل رہیں ، مثلاً یہ نہیں کہا جائے گا کہ اگر کسی کو تمانچہ لگے تو وہ شخص اپنا دوسرا گال بھی ظالم کے سامنے رکھ دے اور یہ بھی نہیں کیا گیا کہ ایک کا دس گنا بدلہ لے ، بلکہ فرمایا : وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللہِ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (۴۲ [الشّورٰی] : ۴۰) ، [یعنی برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے ، ہاں جو شخص معاف کر دے اور معاملے کی اصلاح کر دے، پس اس کا اجر اس کے خدا کے ذمے ہے ۔ بیشک اللہ تعالٰی ظالموں سے محبت نہیں کرتا] ؛ (۱۲) ایک اعلیٰ قانون جامع اور انسان کی ساری ضرورتوں کا کفیل ہوتا ہے : دینی اور روحانی ، دنیوی اور مادی ، انفرادی اور اجتماعی [سب ضرورتیں اس سے پوری ہونی چاہییں] ، یہ نہیں کہ مسجد اور قصر شاہی میں تفریق و تباین رہے ۔ پھر ان احکام میں درجہ بندی بھی ہونی چاہیے : [واجب ، مستحب اور مباح ایک طرف اور حرام و مکروہ دوسری طرف ۔ یہ درجہ بندی عمل کی نوعیت اور تعداد کے مطابق لازمی ہے ۔ قرآنی قوانین میں اس کا پورا پورا لحاظ موجود ہے] ؛ (۱۳) قانون اور مملکت لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں ۔ غالباً اس لیے کہ حق کا اعلان کافی نہیں ؛ اس کا نفاذ بھی لازم ہے اور یہ ملّت کی اجتماعی قوّت یعنی حکومت کے بغیر ممکن نہیں ۔ مکّی دور میں اس کا اطلاق نہ ہو سکا ، کیونکہ مملکت کے عناصر میں سے اگرچہ

marfat.com
Marfat.com

تنظیم بھی تھی اور حاکم بھی موجود تھا ، لیکن مملکت موجود نہ تھی ؛ اسے مملکت در مملکت کہنا بھی مشکل ہے ۔ اسے مستقبل کی ایک مملکت کی تیاری کہا جا سکتا ہے ۔ یہ واقعی (De facto) مملکت نہ تھی؛ البتہ اسے استحقاق (De Jure) مملکت کا نام دینا ممکن ہے ۔ بہرحال مکّی دور میں بھی اس اسلامی "مملکت" کا قانون بتدریج وجود میں آنے لگا تھا اور روز بروز جامع تر ہوتا جا رہا تھا ۔ اس کا نصب العین یہ تھا کہ وہ انسان کی ساری ضرورتوں کو ایک ہی قانون ساز اور ایک ہی شریعت کے تابع بنانے میں مصروف عمل تھا ، تاکہ ایک پہلو پر اکتفا کر کے دوسرے پہلو کو تشنہ نہ چھوڑا جائے اور انسان کی اس طرح ادھوری یا نامکمل پرورش نہ ہو : اور نہ یہ کہ ایک قانون کو تو خدائی کہ کر اس کی زیادہ تکریم و تعمیل ہو اور دوسرے کو انسانی سمجھ کر اس سے بے پروائی برتی جائے ۔ غرض حقیقت پسندانہ انداز میں ارتقا تدریجی طور سے ہو رہا تھا؛ [چنانچہ ابتدائی مکّی دور میں اپنے ریوڑ اور اپنی زراعت میں سے راہِ خدا میں خرچ کرنے کا عمومی انداز میں ذکر ہوا (۶ [الانعام] : ۱۴۲) ، مگر اس کی مقدار ، اس کا نصاب اور طریقۂ تحصیل کا ذکر نہیں کیا گیا] ۔ تحصیل و تقسیم کی تنظیم ابھی قبل از وقت تھی ؛ غالباً نصاب بھی معین نہ تھا ۔ ممکن ہے کہ رواجی مقدار لوگ براہ راست غربا کو دے دیتے ہوں ۔ تمثیل میں مصر و سبا کے حکمرانوں کا اور ان کے طرز حکومت کا بھی ذکر ہے اور حضرت داودؑ و سلیمانؑ جیسے بادشاہت والے نبیوں کا بھی ذکر ہے اور ان کے عدل و انصاف کا بھی ۔ یقیناً مسلمان اپنے اندرونی مقدمے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم ہی کے پاس لایا کرتے تھے ۔ توریت کے احکام عشرہ [جو کتاب خروج ، باب ۲۰ ، اور کتاب تثنیہ ، باب ۵ میں مذکور ہیں] زیادہ مشہور ہیں ، لیکن سورہ ۱۷ [بنی اسرائیل] : ۲۳ تا ۳۹) میں رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو معراج کے وقت بارہ جامع تر احکام دیے گئے اور کچھ عرصے بعد احکام لقمانی (۳۱ [لقمٰن] : ۱۳ تا ۱۹) بھی یاد دلائے گئے ۔ [قصہ مختصر ، مکّی دور میں قانون سازی کی حد اور شکل بھی نظر آتی ہے]۔

مدنی دور: ہجرت سے قبل ہی بیعت عقبۂ ثانیہ کے موقعہ پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے انصار مدینہ (اوس اور خزرج قبائل) کی بارہ شاخوں پر ، متعلقہ لوگوں کے مشورے سے ، بارہ نقیب ، اور ایک نقیب النقباء یا نائب السلطنت نامزد فرما کر گویا شہری ریاست مدینہ کا آغاز فرما دیا تھا ۔ مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے چند ہفتے بعد ایک سیاسی ہیئت وجود میں آ گئی اور اس شہر کے ایک بڑے حصے میں ایک شہری ریاست قائم ہوگئی ، جس میں مہاجرین اور انصار ہی نہیں غیر مسلم عرب اور یہودی باشندے بھی ، اقتدار اعلٰی ایک فرد ، یعنی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ، کے سپرد کر دیتے ہیں اور ایک "معاہدہ عُمرانی" حکمران اور حکمرانی کو تسلیم کرنے والوں میں عمل آتا ہے ۔ اس ریاست کا دستور تحریری طور پر مدوّن ہوا ، جو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے ۔ اس چھوٹی سی ریاست کی روز افزوں توسیع (کہ دس سال کے عرصے میں وہ صفر سے تیس لاکھ مربع کیلو میٹر رقبے پر پھیل گئی)، قانون سازی کی توسیع کا بھی لازماً باعث بنی .

اس دس سالہ دور میں نازل شدہ قرآنی سورتوں میں تمام ہی مسائل پر احکام ملتے ہیں ؛ یہی حال احادیث کا بھی ہے .

اس دور میں جنگیں بھی ہوئیں ؛ معاہدے بھی عمل میں آتے رہے ؛ بیرونی حکمرانوں سے خط و کتابت بھی ہوتی رہی ۔ نظم و نسق کے لیے بتدریج شعبے قائم کیے جاتے اور تجربے سے ترقی کرتے رہے ۔

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

حکومت کے لیے مستقل آمدنی کے وسائل بھی مہیا کیے گئے۔

قانون سازی کے سلسلے میں چند نہایت اہم چیزیں اس دور سے تعلق رکھتی ہیں: اول یہ کہ قانون کے ماخذوں (اساسیات) میں ایک نئی چیز کا اضافہ کیا گیا جس سے اس کے حال اور مستقبل کی ضمانت مہیا ہو جاتی ہے۔ الترمذی وغیرہ میں حدیث معاذؓ بن جبل کے مطابق، اگر کسی مسئلے کے متعلق قرآن اور حدیث و سنت میں بھی کوئی حکم نہ ملے تو [قیاس سے کام لیا جا سکتا ہے؛ اسی کو] اجتہاد بالرّای، بعد میں اصطلاحاً استنباط، استصلاح اور استحسان کا نام دیا گیا، رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے اصول فقہ (یعنی استنباط احکام اور وضع احکام) کی بنیاد رکھ دی۔ دوسری اہم چیز یہ ہوئی کہ غیر مسلم افراد مملکت کے لیے کامل داخلی خود مختاری تسلیم کی گئی۔ دین و ایمان اور عبادت ہی کے لیے نہیں، قانون ان کے داخلی معاملات (یعنی خصومات باھمی اور حقوق شخصی) میں دخل نہ دیتا۔ یہ معاملات دیوانی کے ہوں یا فوجداری کے، غیر مسلم فریقین کو اجازت دی گئی کہ اگر وہ اپنی عدالت کی جگہ اسلامی عدالت سے رجوع کریں تو ان میں انصاف سے دریغ نہ کیا جائے گا۔ اس پیشکش کی بنیادی وجہ غالباً یہ تھی کہ جب مقدمے کے فریقین میں سے ایک یہودی اور ایک عیسائی ہو تو [اس صورت میں اختیار دیا گیا کہ وہ اگر چاہیں تو ان کے مابین اسلامی قانون فیصلے کے لیے موجود ہے]۔ تیسری قابل ذکر چیز یہ نظر آتی ہے کہ خاص کر بیرونی تعلقات کے سلسلے میں معاہدات میں شرائط طے ہوتی تھیں، یعنی معاہدے کو بھی ایک ضمنی و وقتی قانون کی اساس تسلیم کر لیا گیا: صلح حدیبیہ اس کی ایک نظیر ہے، (مگر اس اساس کو مستقل حیثیت نہیں دی جا سکتی)۔

چوتھی اہم چیز یہ ہوئی کہ جرائم کی مسئولیت عاقل و بالغ، اور جان بوجھ کر کرنے والے انسانوں تک محدود کر دی گئی، ورنہ زمانۂ جاہلیت میں جانور، کنواں یا کوئی مماثل غیر ذوی العقول کسی انسان کی موت کا باعث بنتے تو وہ جانور کنواں مقتول کے ورثا کو بطور خون بہا دے دیا جاتا تھا۔ اَلبئرُ جُبار، المعدن جُبار، العَجْماء جُبار [یعنی جانوروں، کانوں اور کنووں کا جرم ناقابل اعتبار ہے] کی حدیث سے (البخاری: الصحیح، کتاب الدیات، باب ۲۸ و ۲۹؛ ابوداؤد: السنن، کتاب الدیات، باب ۲۷؛ ابو یوسف: کتاب الخراج) ایسی ذمہ داری برخاست کر دی گئی۔ یہ بھی یاد دلایا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک، مثلاً انگلستان میں کسی درخت، دیوار، گاڑی، جہاز وغیرہ کو بھی کسی انسان کی موت کا باعث بننے پر قانوناً سزائے موت دی جاتی اور اسے نیست و نابود کر دیا جاتا تھا (دیکھیے Hobhouse: *Morals in Evolution*، باب Law and Justice)۔ ذیلی قانون سازی کی ضرورت سب سے زیادہ قاضیوں اور مفتیوں کو پیش آتی ہے۔ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے دور دراز مقاموں کے لیے ناگزیر قاضی مامور فرمائے؛ مفتیوں کی نامزدگی کا بھی پتا چلتا ہے اور سوالات اور استفسارات پر خود جواب دینے کے بجائے بعض اوقات فرما دیتے کہ فلاں (مثلاً ابوبکرؓ) سے پوچھ لو۔ قاضیوں کو ادب القاضی کے متعلق ہدایتیں بھی دی جاتی رہیں؛ حضرت علیؓ حضرت عمروؓ بن العاص وغیرہ کو متعلقہ ہدایتیں تاریخ میں محفوظ ہیں۔ انصاف طلبی کو فرد کا نجی معاملہ سمجھنے کے بجائے اسے مرکز یعنی عدالت کے سپرد کرنا دنیا کی تاریخ میں ایک انقلابی اصلاح تھی۔ ایک کی جگہ کم از کم دو اور بعض قسم کے مقدموں میں چار گواہوں کی ضرورت بھی ایک اہم اصلاح تھی۔ شبہے کا فائدہ

marfat.com
Marfat.com

[illegible] کو دیا جانے لگا ۔ قتل میں خطا اور عمد هی نهیں، مشابہ عمد بھی تسلیم کیا گیا ۔ مقتول کے وارثوں کو قصاص کی جگہ خون بہا قبول کرنے کی اجازت دی گئی ۔ نیت کو اساسی اهمیت دی گئی [إنّما الأعمالُ بالنیّاتِ ؛ تیروں اور جانوروں کی بولیوں سے فال لینے اور کاهنوں اور عرافوں سے استفسار کرنے وغیرہ] جیسے توهمات اور خرافات کو عدل گستری سے خارج کر دیا گیا ۔ فنی خصوصی مسائل میں ماهرین سے خود رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم مشورہ لیتے اور یہ بعد کے لیے نظیر بن گیا ۔ خصوصی حالات میں سخت فیصلے کی جگہ استحسان [رک بآن] ، یعنی قیاس کو چھوڑ کر عوام کے لیے سہولت کے فیصلے کو اپنانے (المبسوط ، ۱۰ : ۱۴۵) کو روا رکھا گیا ۔ قوانین کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا : خاصہ [Private Law] اور عامّہ [Public Law]؛ قوانین خاصّہ میں مسلم فقہا معاملات، عقوبات اور وراثت و وصیّت هی کو نہیں ، بلکہ عبادات کو بھی شامل کرتے هیں۔ اس میں ایک نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ سرکاری واجبات کو بھی عبادات میں شامل کیا گیا ہے ؛ زکوٰۃ کے مصارف قرآن (۹ [التوبة] : ۶۰) میں بیان هوے هیں؛ ان سے صاف نظر آ جاتا ہے کہ زکوٰۃ صرف فقرا و مساکین کے لیے هی نہیں، بلکہ حکومت کی کشوری و عسکری ضرورتوں کے لیے بھی ہے اور صرف نقد اندوختے هی پر نہیں ، بلکہ تجارت ، معدنیات ، زراعت وغیرہ کے سارے هی محاصل کا نام ہے ۔ مسلمانوں سے لیے هوے محاصل زکوٰۃ کہلاتے هیں ، ذمّی اور اجنبی غیر مسلموں سے جنگ و صلح سے آنے والی آمدنی کو خراج، جزیہ، غنیمت وغیرہ مختلف زمروں میں تقسیم کیا جاتا تھا ۔ زکوٰۃ کی ادائی کو ارکان اسلام اور عبادات میں شامل کرنا بڑا معنی خیز امر ہے؛ [ایک معنی اس میں منجملہ دیگر کے یہ ہے کہ اس میں مقاصد انسانی کے لیے دولت کو صرف کرنا عبادت (مثلاً صلوٰۃ) کے مانند قلبی تسکین اور روحانی خوشی کا موجب بن جاتا ہے ۔ برعکس عام (غیر عبادتی) ٹیکس کے کہ اس کے ادا کرتے وقت تکدّر سا هوتا ہے ، اس کے علاوہ دنیوی امور اور روحانی امور کے مابین کوئی فصل بھی نہیں رهتا] ۔ قوانین عامہ میں نظم و نسق، یعنی دستور اور خارجہ پر امن اور جنگی تعلقات یعنی قانون بین الممالک [International Law] خاص طور پر قابل ذکر هیں ۔ قوانین عامہ میں سے دستور کا مختصر ذکر کم از کم امام شافعیؒ نے کتاب الأمّ میں نماز کے ضمن میں امام کی بحث میں کیا ہے کہ نماز کی امامت حکمران کے امتیازات میں داخل ہے اور خلیفہ کو امام بھی کہتے رہے هیں ۔ قانون بین الممالک کا ذکر فقہ کی بلا استثنا ساری کتابوں میں آتا ہے اور اسے وهاں کتاب السِیَر کے عنوان سے ایک مستقل باب میں رکھا جاتا ہے ۔ ان دونوں قوانین عامہ کا مختصر سا بیان یہاں بے محل نہ هوگا :

دستور اور نظم و نسق : رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے نہ صرف ایک ایسے علاقے میں جو سیاسی تنظیم سے قطعاً عاری تھا ایک شہری مملکت قائم فرمائی (جو روز افزوں وسعت حاصل کرتی رهی) ، بلکہ اُمّی هونے کے باوجود اس مملکت کے لیے ایک تحریری دستور بھی مدوّن اور نافذ فرمایا ۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تاریخ عالم میں پہلا دستور ہے جو تحریری طور پر مدوّن هوا اور کسی حکمران کی طرف سے نافذ کیا گیا اور حاکم اور عوام دونوں کے حقوق اور فرائض کی اس میں تصریح کی گئی ۔ هندوستان میں کاوٹیلیا [تقریباً ۳۲۱ تا ۳۰۰ ق م کے درمیان (دیکھیے J.F. Fleet : مقدمہ *Kautilyas Arthasastra*، بار سوم ۱۹۲۹ء؛ ص vii)] کی ارتھا شاسترا نامی ایک سنسکرت کتاب ضرور ہے ، جو نصیحة الملوک صنف کی تالیف ہے نہ کہ کسی

marfat.com

Marfat.com

حکمران کا نافذ کردہ حکمنامہ۔ راجا آزاد تھا کہ ارتھا شاسترا پر عمل کرے یا نہ کرے۔ یونان میں دو نام ملتے ہیں: ایک تو سولن (Solon) تھا، جسے کہتے ہیں کہ ایتھنز کی شہری ریاست کے دستور میں ترمیمات پیش کرنے پر مامور کیا گیا تھا، مگر اول تو یہ مکمل دستور نہ تھا، بلکہ چند ترمیمی دفعات تھیں؛ دوسرے ایتھنز کا اصل دستور غیرتحریری ہی تھا۔ اگر سولن کی تجویزوں کو وہاں کی مجلس حکومت نے منظور بھی کیا تو اس سے سابقہ غیرتحریری قواعد کی حیثیت تحریری دستور کی نہیں ہو جاتی۔ اسلام سے قبل دوسری کوشش ارسطو کی کتاب "ایتھنز کا دستور" ہے، مگر یہ دستور نہیں۔ اسے زیادہ سے زیادہ تاریخ دستور کہا جا سکتا ہے، کیونکہ ارسطو کے زمانے میں ایتھنز کوئی شہری مملکت نہ تھا، بلکہ سکندر اعظم کی شہنشاہی کا پایۂ تخت تھا اور ارسطو کی کتاب اس شہنشاہی کا دستور نہیں، بلکہ سابق شہری مملکت ایتھنز کے دستوری ارتقا کی تاریخ تھی۔ مزید برآں ارسطو کوئی بادشاہ نہ تھا، بلکہ محض وزیر تھا۔ بادشاہ پر اس کے مشوروں کو قبول کرنے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ بائیبل میں یہودیوں کے ہاں کے ایک "تحریری دستور" کا ذکر آتا ہے، مگر اسے دستور کہنا لطیفہ سا معلوم ہوتا ہے؛ چنانچہ پہلی کتاب سموئیل (اشموئیل نبی)، باب ۸، آیت ۵ میں ہے کہ جب نبی عمر رسیدہ ہو گئے تو قوم نے ان سے مطالبہ کیا کہ ایک شخص کو وہ بادشاہ نامزد کریں۔ انھوں نے کہا (باب ۸، آیت ۱۱ تا ۱۷): بادشاہ معزز مردوں اور عورتوں کو ذلیل خدمتیں کرنے پر مجبور کرے گا؛ تمھارا مال چھینے گا اور تم سب اس کے غلام بن جاؤ گے۔ اس کے بعد بھی قوم کا اصرار رہا تو نبی نے بادشاہ کے مذکورہ سارے حقوق کو لکھ کر قوم سے صریح اقرار لیا کہ وہ اسے قبول کرتے ہیں۔ پھر ساول (طالوت) کو بادشاہ نامزد کیا۔ بائیبل کا مذکورہ دستور بس اتنا ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اوّلین مکمل دستور کو مدوّن کرنے اور ایک حکمنامے کے طور پر نافذ کرنے کا امتیاز نبی امّی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم ہی کو حاصل ہوا اور اس کا متن تاریخ نے محفوظ بھی رکھا ہے (دیکھیے الوثائق السیاسیہ، شمارہ ۱، ص ۱۵)۔ اس کا پہلا جملہ ہی یہ ہے: [هٰذا كتابٌ من محمّد النبي (رسول الله) بين المؤمنين من قريش و اهل يثرب و من تبعهم و لحق بهم و جاهد معهم] یعنی یہ ایک تحریری معاہدہ (کتاب=میثاق) ہے اللہ کے رسول حضرت محمدؐ کا، قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں" (اس میں توسیع مملکت کی صورت میں بھی لچک ہے)۔ دوسرا فقرہ ہے: تمام دنیا کے لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ امت ہوگی یا سیاسی معاشرہ ہوگا۔ اس کے بعد قبیلہ وار اجتماعی تحفظات کا ذکر ہے۔ قتل خطا پر خون بہا اور دشمن کی قید سے رہائی کا فدیہ دینے کا بار فرد پر نہیں، بلکہ مجموعی تحفظاتی ادارے یا خاندان پر پڑے گا (ف ۳ تا ۱۱)۔ ف ۳ میں ایک انقلاب انگیز حکم ہے کہ سارے مہاجرین کا ایک نیا اور واحد قبیلہ ہوگا (خونی رشتے کی قومیت کو برخاست کرکے عقیدے اور ہم خیالی کی اساس پر "قوم" بنانے کا یہ گویا آغاز تھا)۔ اگلی دفعات میں امت مسلمہ کو ایک وحدت بنا کر احکام دیے گئے ہیں (۱۲ ببعد)۔ ولاء کا حق مرکز کی جگہ ہر فرد رعیت کو دیا گیا ہے کہ وہ معاہداتی بھائی چارہ کرکے کسی اجنبی کو اپنے قبیلے یا خاندان کا رکن بنا سکتا ہے۔ عدل گستری فرد سے لے کر مرکز کے سپرد کرکے (ف ۱۳) اس وقت کے عربی معاشرے میں ایک مزید انقلاب برپا کیا گیا۔ پناہ دینے کا حق بھی (ف ۱۵) ہر فرد رعیت کو دیا گیا ہے۔ غیرمسلموں کو مساوات

marfat.com
Marfat.com

کی اساس پر (ف ۱۶) شہری بننے کی اجازت ہے ۔ جنگ اور صلح (ف ۱۷) مرکزی امور قرار دیے گئے ہیں ۔ مسلمانوں کے آخری عدالتی حکم کو "اللہ اور حضرت محمد" سے متعلق قرار دیا گیا ہے ۔ ف ۴۲ میں یہودیوں کے لیے بھی یہی اصول قرار دیا گیا ہے اور بظاہر یہ ان جھگڑوں کے متعلق ہے جو وہ خود اندرونی طور پر اپنی مذہبی یا خاندانی عدالت میں طے نہ کر سکیں ۔ دفاع ایک مشترکہ امر ہے ، جس میں مسلم و غیر مسلم سب پر مساوی ذمہ داری ہے (ف ۴۴) ۔ اس دستور میں آمدنی کے مسائل یا سرکاری واجبات کا ذکر نہیں ہے ، لیکن یہ دستور سنہ ۱ھ کا ہے ، جبکہ سرکاری واجبات کا حکم بعد میں دیا گیا ۔ البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی لوگ تجارتی کارواں لاتے تو ان سے قدیم سے جو چنگی لی جاتی تھی وہ برقرار رہی ۔ ہجرت سے قبل مدینے میں نقیب النقبا کی نامزدگی کا اوپر ذکر آ چکا ہے ، مگر متعلقہ فرد کی وفات پر وہ عہدہ برخاست کر دیا گیا [لیز رک بہ میثاق مدینہ] .

سِیَر (بین الاقوامی تعلقات) : رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے طریقے کی اساس پر مسلمان قانون کی ایک نئی شاخ کے بانی بنے ؛ اسے کم از کم زید بن علی [م ۱۲۲ھ ، شذرات ، ۱ : ۱۵۸] کے زمانے سے سِیَر کا نام دیا جانے لگا ۔ اس میں بیرونی ممالک سے جنگ ، امن اور غیرجانبداری کی حالت کے تعلقات کا ذکر ہوتا ہے ۔ اسے اب انگریزی میں انٹرنیشنل لاء (International Law) کہتے ہیں ، لیکن چونکہ اس میں قوموں سے نہیں بلکہ مملکتوں سے بحث ہوتی ہے ؛ اس لیے "بین الاقوامی" کی اصطلاح سے بہتر "بین الممالک" ہے اور خود مغرب میں اب اسے انٹرسٹیٹل، کہنا بہتر سمجھا جانے لگا ہے ۔

قدیم زمانے میں بیرونی تعلقات کے قواعد دو قسم کے ہوتے تھے : دوستوں کے ساتھ معینہ قاعدے مقرر تھے ، جب کہ دشمنوں کے ساتھ صرف صوابدید کو بروےکار لایا جاتا تھا ۔ یونانی دور میں یہ "ترقی" ہوئی کہ دشمن بھی اگر ہم نسل اور ہم مذہب ہو تو اس سے بھی معین قواعد کے مطابق برتاؤ کیا جاتا ۔ اس کے بعد جب رومی دور آیا تو دنیا کے تین حصے قرار دیے گئے : رومی ، معاہداتی دوست اور باقی دنیا ۔ معاہداتی ملک سے اگر کبھی جنگ چھڑ جائے تو اعلان جنگ تک معین قاعدہ رہتا ؛ پھر جنگ کی اثنا میں صوابدید رہتی ۔ سترھویں صدی عیسوی کے متعلق کروٹیوس وغیرہ نے لکھا ہے کہ "عیسائیت جیسے محبت سکھانے والے مذہب کو قبول کرنے کے باوجود یورپی حکمرانوں کے روابط کا یہ حال تھا کہ اس پر وحشی جانوروں کو بھی شرم آئے" ۔ ہمارے زمانے میں فرنگی قانون "مہذب اور غیرمہذب" کا فرق کرتا ہے ۔ سنہ ۱۸۵۶ء تک "مہذب" سے مراد عیسائی لیے جاتے تھے ؛ پھر نہ مجلس اقوام میں اور نہ اس کی جانشین مجلس اقوام متحدہ میں کوئی مملکت رکن بن سکتی ہے ، جب تک کہ دو رکن مملکتیں نئے امیدوار کے مہذب ہونے کی گواہی نہ دیں ۔ اسلام وہ پہلا اور تاحال واحد قانون ہے جو حکم دیتا ہے کہ سارے اجنبی مساوی ہیں اور دشمن چاہے وحشیانہ سلوک کرے ، ہم اپنے اصول پر عمل کریں گے ۔ قرآن مجید (۹ [التوبۃ] : ۷) میں غیر مسلموں سے معاہدے کی پابندی کا حکم ہے ۔ خیانت کے خطرے پر طرز عمل (۸ [الانفال] : ۵۸) ؛ مذہبی رواداری (۲ [البقرۃ] : ۲۵۶ ؛ ۱۰ [یونس] : ۹۹ تا ۱۰۰) ؛ کافروں کو پناہ طلبی پر پناہ دہی (۹ [التوبۃ] : ۶) ؛ انتقامی جنگ (۲ [البقرۃ] : ۱۹۰ تا ۱۹۲) ؛ دفاعی جنگ (۴ [النساء] : ۷۵ ؛ ۲۲ [الحج] : ۳۹) ؛ نیکی کے کاموں میں دشمن سے بھی تعاون (۵ [المائدۃ] : ۲) ؛ مفتوحہ اراضی کے احکام (۷ [الاعراف] : ۱۰۰ ؛ ۵۹ [الحشر] : ۴ ببعد) ؛ جنگی قیدیوں سے برتاؤ (۴۷ [محمد] : ۴ ؛ ۷۶ [الدھر] :

marfat.com
Marfat.com

۸ تا ۹)؛ قانون غیر جانبداری (۴ [النساء]: ۱۰۹ تا ۱۱۲)؛ ۵۹ [الحشر] : ۱۱ تا ۱۲) ۔ غرض بکثرت احکام ملتے ہیں اور احادیث میں تو سارے ہی مسائل کے قواعد کی تفصیل ہے .(تفصیل کے لیے دیکھیے محمد حمید اللہ : عہد نبوی ؐ میں نظام حکمرانی) ۔ پرانے اسلامی قواعد نہ صرف آج بھی کارآمد ہیں، بلکہ متعدد مسائل میں مغربی قواعد سے زیادہ مہذب اور انسانیت پرور ہیں ، مثلاً مستأمن وغیرہ کے حقوق ۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ہجرت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کی امانتیں واپس [کرنے کے لیے اپنے چچا زاد بھائی حضرت علی ؓ کو ننگی تلواروں کی چھاؤں میں چھوڑنا تو گوارا کیا، لیکن امانت میں خواہ خون کے پیاسے دشمن ہی کی ہو، خیانت کرنا گوارا نہیں کیا] .

قانون تغیر پذیر حالات میں : انسانی معاشرہ ایک تغیر پذیر چیز ہے ۔ اگر آئندہ کوئی نبی نہ آ سکے اور قانون تا قیامت بدل نہ سکے تو اصولاً اس سے ناقابل حل پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے ، لیکن اسلامی قانون رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا واقعی ایک قانونی معجزہ ہے کہ آپ ؐ کے دیے ہوے احکام میں چودہ سو سال (یعنی ۱۴۰۰ھ) تک تبدیلی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ، بلکہ ان کی مخالف اقوام اپنے قوانین بدلنے پر مجبور ہوگئیں (مثلاً عیسائیوں کے ہاں طلاق ، یا عورت کے انفرادی اور کامل حقوق ملکیت کا مسئلہ، جس میں ترمیم کی گئی)۔ بعض اسلامی احکام پر بعض کج فہم جو اعتراض کرتے رہے ہیں ان کا آخر میں یہاں ذکر بے محل نہ ہوگا : قرآن مجید (۵ [المائدۃ] : ۵) میں غیر مسلم (کتابیہ) عورت سے مسلمان کے لیے نکاح جائز قرار دیا گیا ہے اور حدیث میں اختلاف دین کو وراثت کا مانع قرار دیا گیا ہے ۔ یہ بیوی کے حق میں ظلم ہوتا ، لیکن عام قاعدے کو بدلنے کی جگہ اس کا حل [ایک تہائی تک) وصیت اور ہبہ [ترکہ بانٹ] کے ذریعے کر دیا گیا ، جو غیر مسلموں کے حق میں بھی کیے جا سکتے ہیں.

وراثت میں قریب تر کی موجودگی میں بعید تر محروم ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی اس منطقی قاعدے سے ناانصافی نظر آ سکتی تھی ، مثلاً ایک شخص کی وفات پر اس کا ایک بیٹا زندہ ہو اور دوسرا مر تو چکا ہو لیکن ایک بیٹا چھوڑ گیا ہو، جو موجودہ متوفی کا پوتا ہوتا ہے ۔ بیٹے کو حصہ ملے گا ، لیکن پوتا محروم ہوگا ، جس کے باپ کو اس کے اپنے باپ سے قبل مرنے کی وجہ سے باپ کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملا تھا ۔ اس کا حل بھی وصیت اور ہبے کے ذریعے با سانی ہوتا ہے : قانون کو بدلنے کی ضرورت نہیں ۔ وراثت ہی میں لڑکے کو لڑکی سے دگنا حصہ ملتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکی کو ہمیشہ نفقہ باپ ، شوہر ، بیٹے ، بھائی کسی نہ کسی مرد سے ملتا ہے اور اسے مہر بھی مزید برآں ملتا ہے.

شریعت میں تعدد اِزدواج (Polygamy) کی اجازت ہے ، وجوب نہیں ۔ خواتین اور ان کے بے جا حمایتی اس کے خواہ مخواہ مخالف ہیں ۔ ان کی خاطر بعض "اسلامی" مملکتوں میں قرآنی اجازت کو ممنوع بھی قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اسلام میں نکاح ایک معاہدہ ہوتا ہے اور سارے قانونی معاہدوں کی طرح اس میں ایک تو فریقین کی فرداً فرداً رضامندی لازمی ہے اور دوسرے اس معاہدے میں شرائط بھی طے کی جا سکتی ہیں۔ ایک بیوی کی موجودگی میں نئی شادی (Polygamous marriage) کا سوال ہو تو اس دوسری عورت پر کوئی جبر نہیں ، وہ نکاح سے انکار کر سکتی ہے ۔ اس طرح مسئلہ تعدد ازدواج ختم ہو جائے گا ، یا پھر اگر باقی رہے تو ایسی عورتوں میں جو تعدد ازدواج کو برا نہیں سمجھتیں ۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خود پہلی

marfat.com

Marfat.com

بیوی بھی عقد نکاح میں یہ شرط لگا سکتی ہے کہ اس کا شوہر اس زوجہ کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کرے گا [اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یہ اجازت مشروط ہے محبت، برتاؤ اور سلوک میں کامل مساوات کے ساتھ، جو عام طور پر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتی ہے۔ اس بنا پر نکاح ثانی کی اجازت عام نہیں ہو سکتی] ۔ کہا جاتا رہا ہے کہ مسلمان بیوی کو طلاق کا حق نہیں، صرف شوہر ہی کو ہے۔ یہ بھی ناواقفیت پر مبنی ہے۔ نکاح کے وقت عورت مرد سے اختیار طلاق (خیار طلاق) لے سکتی ہے کہ وہ جس وقت چاہے خود کو اس سے علیحدہ کر سکتی ہے۔ طلاق کا حکم بعد میں بھی عورت کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ شوہر منظور کرے۔ جہاں تک چوری پر ہاتھ کاٹنے کے حکم کا تعلق ہے [تو اس کا مقصد انسداد جرائم ہے نہ کہ تربیت جرائم اور واقعہ یہ ہے کہ ایسے جرائم پر ڈھیلی ڈھالی سزاؤں سے جرائم کی پرورش ہوتی ہے، انسداد نہیں ہوتا، جس کی عبرت ناک تصویر آج ہم اپنے معاشرے کے علاوہ یورپ میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ حجاز میں جہاں چوری کی بہتات تھی] ، سلطان ابن السعود نے اسے دو چار ہفتوں ہی میں ختم کر دیا۔ دو چار آدمیوں کے ہاتھ کٹتے ہیں، پھر چوری کے واقعات شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں۔ ارتداد کی ممانعت پر اعتراض کرنے والے دو چیزیں بھول جاتے ہیں: ایک تو سزائے ارتداد کے عدم نفاذ، بلکہ مسلمانوں کے علاقوں پر غیر مسلم اقتدار اور وہاں عیسائیت وغیرہ کی پرزور تبلیغ کے باوجود، مسلمان شاذ ہی مرتد ہوئے ہیں، دوسرے الفاظ میں ارتداد پر سزا کے ڈر سے نہیں، بلکہ اپنے دین کی حقانیت کے باعث مسلمان مرتد نہیں ہوتا، گویا یہ سزا عملاً غیر موجود ہے۔ دوسرے یہ واقعہ بھی لوگ بھول جاتے ہیں کہ یہ سزا مثلاً بوزنطی عیسائیوں کے ہاں بھی رہی ہے، اگرچہ اسلام اسے اپنے لیے حجت اور دلیل نہیں بناتا۔

غرض، یہ اور دیگر مثالیں واضح کر سکتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتویں صدی عیسوی میں دیے ہوئے احکام اتنے معقول اور مناسب ہیں کہ ان میں تبدیلی کی کم از کم اب تک تو کسی سنجیدہ شخص کو ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ تاریخ قانون عالم میں یہی ایک بات حیران کن معجزے سے کم نہیں۔

مآخذ: (۱) ابن القیم: احکام اهل الذمة؛ (۲) وہی مصنف: اعلام الموقعین؛ (۳) وہی مصنف: الطرق الحکمیة؛ (۴) ابو یعلی الفراء: الاحکام السلطانیة، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۵) القرطبی: اقضیة رسولؐ اللہ، مطبوعہ قاہرہ؛ (۶) الماوردی: الاحکام السلطانیة، مطبوعۂ قاہرہ (اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے)؛ (۷) وکیع: اخبار القضاة، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۸) محمد حمید اللہ: عہد نبوی میں نظام حکمرانی؛ (۹) وہی مصنف: رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی؛ (۱۰) وہی مصنف: قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں؛ (۱۱) وہی مصنف: الوثائق السیاسیة لعهد النبوی و الخلافة الراشدة، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۶ء؛ (۱۲) وہی مصنف: *Le Prophete De L'Islam*, *sa vie et son oeuvre* (فرانسیسی)، ۲ جلدیں، جہاں ف ۱۳۵۱ تا ۱۳۹۱ میں دستور اور ف ۱۳۹۲ تا ۱۵۱۰ میں قانون سازی کا ذکر ہے؛ (۱۳) وہی مصنف: *The First Written Constitution in the World*؛ (۱۴) وہی مصنف: *Battlefields of the Prophet Muhammad*، اردو ترجمہ عہد نبوی کے میدان جنگ، مطبوعۂ حیدر آباد (دکن)؛ (۱۵) Enost Nys: *Les origines du droit international*؛ (۱۶) Le droit des gens dans les rapports des Arabes et des Byzantins، در (*Revuo du droit international et legislation comparee*، ج ۱، Bruxolles ۱۸۹۳ء)؛ (۱۷) Walker: *History of the Law of Nations*، ج ۱، باب ۳۵ تا ۶۶، مطبوعہ کیمبرج؛ (۱۸) Holtzendarff: *Handbuch des Voelkerrechts*، ج ۱؛ (۱۹) Wellhausen:

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

Ein Gemeinwesen ohne Obrigkeit، گوٹنگن ۱۹۰۰ء، *Gemeindeordnung von Medina*، در *Skizzen und Vorarbeiten*، ج ۱ : (۲۰) Majid Khadduri : *The Law of war and peace in Islam*، ۱۹۵۵ء؛ (۲۱) *The Shybani's Siyar: Islamic Law of Nations*، ۱۹۶۶ء؛ (۲۲) *Islam and the Modern Law of Nations*، در *American Journal of International Law*، ص ۳۵۸ تا ۳۷۲، ۱۹۵۶ء؛ (۲۳) Hans Kruse : *Islamische Voelkerrechtslehre*، گوٹنگن ۱۹۵۳ء؛ (۲۴) Heffening : *Das Islamische Fremdenrecht*، ہنوور ۱۹۲۵ء۔

(محمد حمید اللہ [و ادارہ])

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم بحیثیت خطیب : خطابت نبوت کے لوازم میں شامل ہے۔ مشیت ایزدی کا تقاضا بھی یہی رہا ہے کہ انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جو انبیاے کرام مبعوث ہوے انھیں فصاحت کلام اور بلاغت بیان سے نوازا جاے تاکہ وہ پیغام ربانی کو کھول کر بیان کر سکیں اور اپنی اپنی امت کی رہنمائی کرنے کا فرض منصبی انجام دے سکیں (دیکھیے القرآن الحکیم، ۱۴ : [ابراہیم] : ۴ ؛ روح المعانی، ۱۳ : ۵ے ؛ الجاحظ : البیان و التبیین، ۱ : ۸ تا ۹ ؛ شبلی : سیرت النبی، ۲ : ۲۳۳ ؛ احمد حسن زیات : تاریخ الادب العربی، ۱۸ ببعد ؛ احسان النصر : الخطابة العربیة، ص ۴۸)۔ اہل عرب خطابت میں فصاحت و بلاغت کی بلندیوں پر تھے، جنھیں فارس و یونان کے فکر و فن کے عوض اللہ تعالی نے فصاحت لسان اور بلاغت بیان سے نوازا تھا (الجاحظ : البیان و التبیین، ۱ : ۷۶، ۹۸ ؛ عبدالرحمن البرقوق : مقدمہ شرح دیوان حسان، ص ۷)۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم افصح العرب تھے، کیونکہ آپ قریش میں پیدا ہوے اور بنو سعد میں آپ کی پرورش ہوئی تھی۔ فصاحت و بلاغت میں یہی دو قبائل تمام عرب میں ممتاز تھے اور ان کی زبان سب کے لیے ایک نمونہ تھی۔ قریش کی زبان کو ہی اللہ تعالی نے عربی مبین قرار دیا ہے (۲۶ [الشعراء] : ۱۹۵ ؛ روح المعانی، ۱۹ : ۱۲۷ ؛ البیان و التبیین، ۱ : ۹۰ ببعد)۔ آپ کی فصاحت و بلاغت کی عرب فصحا و بلغا نے ستائش کی ہے اور کلام اللہ کے بعد آپ ہی کے کلام کو بلیغ ترین تسلیم کیا ہے (احسان النصر : الخطابة العربیہ، ص ۴۸ ؛ البیان و التبیین، ۲ : ۱۵ ببعد : تاریخ الادب العربی، ص ۱۸ ؛ الادب العربی و تاریخہ، ۱ : ۳۴)۔

آپ کی فصاحت و بلاغت اور آپ کا اسلوب بیان چونکہ فیضان الہی کا نتیجہ تھا، اس لیے وہ وحی الہی کے مشابہ تھا (تاریخ الادب العربی، ص ۱۸ ببعد)۔ آپ سلیس الفاظ میں نازک معانی بیان فرماتے تھے۔ تمام قبائل عرب کے لہجات و لغات کا اللہ نے آپ کو علم عطا کیا تھا (الادب العربی و تاریخہ، ۱ : ۳۴ ببعد)۔ الجاحظ نے لکھا ہے کہ نہ تو آپ نے الفاظ کی تلاش میں کبھی مشقت کی اور نہ معانی پیدا کرنے کے لیے تکلف سے کام لیا (البیان و التبیین، ۱ : ۲۷۱ ؛ ۲ : ۷۷)۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ تکلف و تصنع والی خطابت سے میں پرہیز کرتا ہوں؛ مجھے وہ لوگ اچھے نہیں لگتے جو بالتوفی اور زبان دراز ہوتے ہیں (کتاب مذکور، ۱ : ۱۳ ؛ ۴ : ۳۹)۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے آپ کے خطبات میں ہمیشہ صحت زبان، صداقت اور اخلاص کو جلوہ گر دیکھا۔ آپ کبھی زبان کی غلطی نہ کرتے اور ہمیشہ تائید ربانی آپ کے شامل حال رہتی (کتاب مذکور ۴ : ۳۱)۔

الجاحظ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے متعدد جوامع الکلم اور خطبات نقل کرنے کے علاوہ آپ کی فصاحت و بلاغت کی بھی بڑی اچھی تشریح کی ہے (البیان و التبیین، ۱ : ۱۳، ۱۵، ۲۷۱، ۳۱۴ ؛ ۲ : ۱۵ ببعد ؛ ۳ : ۱۳۲، ۳۰۴ ببعد)،

marfat.com
Marfat.com

...آپ کے انداز خطابت کے بارے میں کہتا ہے ۲ : ۱۶ تا ۱۸) کہ آپ کا کلام قلت الفاظ کے باوجود کثرت معانی (ثروت معانی) سے متصف تھا۔ آپ تصنع اور تکلف سے اجتناب کرتے تھے اور صحیح معنوں میں اللہ کے اس ارشاد کی عملی تفسیر ہوتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ! کہہ دیجیے کہ میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں [وَ مَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ (۳۸ [ص] : ۸۶)]۔ جہاں تفصیل کی ضرورت ہوتی آپ شرح و بسط سے کام لیتے، اور جہاں اختصار کا موقع ہوتا آپ مختصر خطاب فرماتے۔ آپ کے کلام میں نہ تو غیر مانوس الفاظ ہوتے اور نہ عامی الفاظ۔ آپ جب بھی بولتے، حکمت کے چشمے پھوٹتے نظر آتے۔ آپ کے اسلوب بیان کو اللہ کی حمایت و تائید اور توفیق حاصل تھی۔ آپ کا بیان معجز نظام ایسا تھا جسے اللہ کی جانب سے محبوب و مقبول ہونے کا شرف بخشا گیا تھا؛ جس میں رعب و دبدبہ بھی تھا اور شیرینی بھی؛ جو قلت الفاظ کے ساتھ ساتھ حسن تفہیم کا پہلو بھی رکھتا تھا۔ آپ کی بات اس قدر واضح اور عام فہم ہوتی کہ جسے دھرانے یا دوبارہ سننے کی حاجت نہ رہتی تھی؛ (پھر بھی اگر کوئی دھرانے کی درخواست کرتا تو آپ رد نہ فرماتے تھے)۔ آپ کے کلام میں کبھی لغزش یا نقص نہ پیدا ہوا۔ آپ کا بیان مدلل ہوتا تھا اور آپ کو کوئی خطیب کبھی بھی لاجواب نہیں کر سکا۔ آپ کے طویل خطبات میں جملے پرمغز و مختصر ہوتے تھے۔ حق و صداقت کی بات کرتے؛ الفاظ کے ہیر پھیر کا سہارا لینے یا عیب جوئی سے ہمیشہ اجتناب فرماتے؛ نہ سست روی سے کام لیتے نہ جلد بازی سے، نہ حد سے زیادہ طول دیتے اور نہ بات کرنے سے عاجز آتے، بلکہ آپ کے کلام سے زیادہ فائدہ بخش، لفظ و معنی میں متوازن، بامقصد کلام کسی کا نہ تھا۔ اثر میں کامل، ادا میں آسان، لفظوں میں فصیح اور مقصد میں بلیغ۔

آپ کے عہد کے شعرا و بلغا اکثر یہی کہتے تھے کہ آپ کو اور کچھ بھی عطا نہ ہوتا تو بھی صرف فی البدیہہ خطبات کی فصاحت و بلاغت کا معجزہ ہی کافی تھا (ابن قتیبہ : عیون الاخبار، ۱ : ۳۲۳ ؛ البیان و التبیین، ۱ : ۱۵ ؛ ابن ہشام : سیرۃ، ص ۲۹۷)۔ حضرت سعید بن المسیّب سے پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ بلیغ (اَبْلَغُ النَّاس) کون ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں (البیان و التبیین، ۱ : ۳۱۳)۔ محمد بن سلام نے یونس بن حبیب کا قول نقل کیا ہے کہ فصاحت و بلاغت کے جو اعلیٰ ترین نمونے ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کلام سے میسّر آئے ہیں وہ کسی خطیب کے کلام سے میسر نہیں آ سکے (البیان والتبیین، ۲ : ۱۸)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ! میں بلاد عرب میں اکثر گھوما پھرا ہوں؛ عرب کے بے شمار فصحا کی باتیں سنی ہیں، مگر آپ سے زیادہ فصیح و بلیغ کوئی نہیں دیکھا۔ آپ کو فصاحت و بلاغت کا یہ کمال کیونکر حاصل ہوا۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھے میرے رب نے ادب سکھایا ہے اور بہت ہی خوب سکھایا ہے (الادب العربی و تاریخہ، ۱ : ۳۴ ؛ عبدالکریم الجیلی : الانسان الکامل، ص ۱۲۷)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خطیب کی شستہ بیانی کو پسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ! السان کا حسن [شاید بمعنی تہذیب و شائستگی] کس بات میں ہے تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ انسان کا حسن و جمال اس کی زبان ہے (العقد الفرید، ۲ : ۲۲۱ ؛ عیون الاخبار، ۲ : ۱۶۸)۔

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

آپؐ متانت سے گرے ہوئے کلام سے ہمیشہ اجتناب کرتے تھے اور باچھیں کھول کر تقریر کرنے سے منع فرماتے تھے۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ اللہ تعالی ایسے خطبا کو (جو دوسرے اعتبار سے فصیح و بلیغ ہی کیوں نہ ہوں) ناپسند کرتا ہے جو اپنی تقریر کے دوران میں زبان اس طرح ہلاتے ہیں جس طرح کوئی گائے جگالی کرتی ہے (الترمذی : الجامع السنن ، باب ماجاء فی الفصاحۃ و البیان، ۲ : ۱۱۴)۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم عام لوگوں کی طرح جلدی جلدی نہیں بولتے تھے ، بلکہ آپؐ کا اندازِ کلام تو بالکل واضح اور صاف ستھرا (بکَلَامٍ بینہٗ فصل) ہوا کرتا تھا (الترمذی : الجامع السنن ، [۵ : ۶۰۰ ، حدیث ۳۶۳۹،]) اور مجلس میں بیٹھنے والا آپؐ کی باتوں کو آسانی سے حفظ کر سکتا تھا (حوالۂ مذکور)؛ بخاری (الجامع الصحیح ، کتاب العلم ، باب من اعاد الحدیث ثلاثاً ، ۱ : ۸۵) کی روایت ہے کہ آپؐ جب گفتگو فرماتے تو اپنی بات کو تین تین مرتبہ دہراتے ، تاکہ سننے والے آپؐ کی بات اچھی طرح سمجھ کر یاد کر سکیں۔ اگر کوئی شخص آپؐ کی بات کے الفاظ گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔ آپؐ کا کلام بے ساختہ ہوتا اور آپؐ کے اسلوب میں ترتیل اور سلیقہ نمایاں ہوتا تھا (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۲۷۵)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالی نے باد صبا کے ذریعے (غزوۂ احزاب [رکّ باں] میں) مجھے فتح و نصرت عطا فرمائی اور مجھے جوامع الکلم (مختصر مگر جامع و پُر مغز اندازِ بیان) بھی عنایت فرمایا ہے (البیان و التبیین ، ۳ : ۲۹)۔

الجاحظ (البیان و التبیین ، ۳ : ۲۸) نے بیان کیا ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے کئی اہم مواقع پر آپؐ کے طویل خطبات بھی سنے تھے ، مگر محض بات بڑھانے کے لیے یا طویل گفتگو پر قدرت کے اظہار کی خاطر آپؐ نے کبھی طویل خطبہ نہ دیا ، لیکن جب معانی کی کثرت ہوتی تو الفاظ کی بھی کثرت ہوتی تھی اور فالتو الفاظ بالکل استعمال نہ فرماتے تھے۔ آپؐ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اندازِ بیان بھی ایک جادو ہے اس لیے تم لوگ نماز کو تو طول دیا کرو ، مگر خطبات میں اختصار سے کام لیا کرو (عیون الاخبار ، ۲ : ۱۶۸)۔ ابوالحسن المدائنی کا بیان ہے کہ ایک دن حضرت عمارؓ بن یاسر نے تقریر کی ، مگر اختصار سے کام لیا ، لوگوں نے مزید تقریر پر اصرار کیا ، لیکن انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ نماز کو طول دیں اور خطبات میں اختصار سے کام لیا کریں (البیان و التبیین، ۱ : ۳۵۳)۔

خطابت میں حسنِ صوت یا خوش آواز ہونے کو بہت اھمیّت حاصل ہے۔ انبیا علیہم السّلام میں سے حضرت داؤدؑ کو فصلُ الخطاب (فیصلہ کن کلام (۳۸ [صٓ] : ۲۰) کے ساتھ ساتھ خوش الحانی اور حسن صوت سے بھی نوازا گیا تھا (۳۴ [سبا] : ۱۰؛ کتاب البیان و التبیین، ۴ : ۲۹۲)۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم خوش آواز بھی تھے اور بلند آواز بھی : چنانچہ حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو حُسن صوت کے ساتھ ساتھ حسن صوت کی نعمت بھی عطا فرمائی گئی تھی (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۳۷۶)۔ آپؐ کی آواز اتنی دور دور تک سنائی دیتی تھی ، جتنی دور کسی اور کی آواز سنی نہیں جا سکتی۔ آپؐ نے منی میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اسے لوگوں نے دور دور تک سنا تھا (حوالۂ مذکور)۔ حضرت امّ؟ ہانی سے روایت ہے کہ آدھی رات کے وقت جب آپؐ خانہ کعبہ میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے تو ہم اپنے گھروں کی چھتوں پر آپؐ کی آواز سنا کرتے تھے

marfat.com
Marfat.com

(ابن ماجه : سنن، باب ما جاء فی القراءۃ فی صلوۃ اللیل، ۱ : ۴۲۹م) - ترمذی (شمائل ، ص ۱۵ تا ۱۶) کی ایک اور روایت ہے کہ آپؐ اکثر خاموش رہتے اور صرف ضرورت کے وقت بات کرتے۔ جب آپؐ بات کرتے ہوئے اشارہ کرتے تو پوری ہتھیلی سے اشارہ فرماتے - جب تعجّب کا اظہار کرتے تو ہتھیلی کو الٹ کر اشارہ کرتے - جب بات کرتے تو دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصے سے ملاتے ؛ جب ناراض ہوتے تو رخ انور دوسری طرف پھیر لیتے ؛ جب خاموشی کا اظہار فرماتے تو آنکھیں موندھ لیتے تھے - آپؐ کے ھنسنے کی حد ایک مسکراھٹ تھی، آپؐ مسکراتے ہوئے یوں لگتے تھے جیسے بادل کی ٹھنڈک ہو .

علماے نقد و ادب نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی فصاحت و بلاغت اور آپؐ کے ارشادات و خطبات کے ادبی مقام و مرتبہ سے بحث کی ہے - آپؐ کے عہد کے حالات ، ماحول اور آپؐ کی تربیت پر اثر انداز ہونے والے اسباب و عوامل کا مطالعہ کیا ہے - وہ اس نتیجے پر پہنچے ھیں کہ عربی زبان کا علم و ذوق رکھنے والا ھر منصف مزاج عاقل و دانش مند شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ کلام عرب میں فصیح ترین کلام کلام الٰہی ہے اور اس کے بعد فصاحت و بلاغت میں آنحضرتؐ کے ارشادات کا مرتبہ ہے (بکری امین : ادب الحدیث النبوی ، ص ۱۷)۔ محققین نے آپؐ کے افصح العرب ہونے کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اوّلین سبب تو یہ تھا کہ آپؐ بنی ھاشم میں پیدا ہوئے اور قریش میں نشو و نما پائی ، دوسرا سبب یہ تھا کہ آپؐ کی رضاعت و تربیت بنو سعد بن بکر (بنو ھوازن) میں ہوئی تھی جن کی فصاحت و بلاغت قریش کے بعد مسلّم تھی - اس کے علاوہ آپؐ کے ننھیال بنو زھرہ تھے اور آپؐ کی رفیقۂ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا بنو اسد سے تھیں - یہ قبائل بھی فصاحت و بلاغت میں نمایاں مقام رکھتے تھے ؛ تیسرا سبب یہ ہے کہ اللہ کا آخری کلام قرآن مجید عربیٌ مُبِیْن میں نازل ہوا ، جس کے معجزانہ اسلوب بیان کے سامنے تمام فصحاے عرب اور جنّ و انس عاجز تھے - اس کتاب مُبِیْن کے اسلوب اعجاز نے بھی رسالت مآب صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی قوت بیان کو برکت عطا کی تھی؛ چنانچہ آپؐ کے کلام پر کلام اللہ کی چھاپ نمایاں تھی ؛ چوتھا اور سب سے بڑا سبب پیغمبر اسلام صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی فطرت سلیمہ تھی ، جس میں عنایت ایزدی نے تمام کمالات و دیعت فرما دیے تھے (ادب الحدیث النّبوی ، ص ۱۰۲ ببعد ؛ تاریخ الادب العربی ، ص ۱۸ ببعد) - یہی وجہ ہے کہ آپؐ کا فصیح و بلیغ کلام بعد کے اھل علم و ادب کے لیے ایک روحانی غذا ثابت ہوا - آپؐ کے اقوال حفظ کرکے ادب کو مزّین کیا گیا - احادیث کے اقتباسات سے اھل علم نے اپنی نگارشات کو سجایا - آپؐ کے ارشادات و خطبات سے اھل علم نے جو فوائد حاصل کیے ان میں سے چند یہ تھے کہ فقہا نے دینی مسائل کا استنباط کیا - محدثین نے آپؐ کے ارشادات کی تفسیر و تشریح کی - اھل لغت و ادب نے محاورات و تراکیب حاصل کیں - علماے بلاغت کو آپؐ کے کلام میں اعلٰی نمونے ملے - عام اھل ادب کو فصاحت و بلاغت کا ایک ذخیرہ میسر آ گیا (حوالۂ مذکور) .

الباقلّانی (اعجاز القرآن ، ص ۱۶۴ ، قاھرہ ۱۹۵۱ء) نے لکھا ہے کہ قرآن مجید کے معجز نما اسلوب بلاغت اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے فصیح و بلیغ ارشادات کے درمیان جو لفظی اور معنوی فرق ہے ، اسے عربی ادب کا ھر طالب علم بآسانی محسوس کر سکتا ہے .

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے خطابت

marfat.com
Marfat.com

کے اسلوب ، مقاصد اور طریقوں میں بعض ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جو قدیم عرب خطبا کے ہاں مروج نہ تھیں ۔ حمد و ثنا اور صلاۃ و سلام سے خطابت کا آغاز آپؐ نے فرمایا ۔ آغاز تقریر میں ایک قول کے مطابق امّا بعد (= اب اس کے بعد) کا لفظ بھی سب سے پہلے آپؐ ہی نے استعمال کیا ، جو بعد میں امت کے روزمرہ کا ایک معمول بن گیا (بخاری : الجامع الصحیح ، ۱ : ۶۷ ؛ ۲ : ۱۸۹ ؛ ادب الحدیث النبوی ، ص ۱۰۱ ببعد) ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم سے قبل خطباے عرب محض فصاحت و بلاغت کے اظہار یا اپنے قبیلے کی مدح سرائی یا دشمن کی تنقیص کے لیے خطابت کا سہارا لیتے تھے ، مگر آپؐ نے خطابت کو اشاعت توحید ، وعظ و نصیحت ، دعوت حق و عمل صالح ، اصلاح ذات البیّن ، ترغیب جہاد اور انسانیت کی دنیوی اور اخروی فلاح کے لیے صرف فرمایا (ابن الاثیر : الکامل ، ۲ : ۲۷ ؛ ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۵ ؛ احمد زکی : جمہرۃ خُطَب العرب ، ۱ : ۵۱ تا ۶).

ابن عبد ربّہ (العقد الفرید ، ۲ : ۲۲۱ ببعد) نے بیان کیا ہے کہ میں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے خطبات کا مسلسل مطالعہ کرنے کے بعد یہ دیکھا ہے کہ آپؐ کے خطبات کا آغاز ہمیشہ حمد و ثنا ، استغفار اور توکل علی اللہ کے جملوں سے ہوتا تھا ، سوائے خطبۂ عیدین کے کہ اس کا آغاز آپؐ تکبیر (اللہُ اَکْبَرُ) سے کیا کرتے تھے ۔ بیشتر خطبات میں آپؐ خوف خداوندی کی وصیت فرماتے تھے ۔ آپؐ کے ان خطبات میں جوش و جذبہ زیادہ ہوتا تھا جو آپؐ میدان قتال میں جہاد کا شوق ابھارنے کے لیے ارشاد فرماتے تھے یا جن میں توحید کا درس ہوتا یا جہنم سے ڈرانا مقصود ہوتا (عبدالکریم : الانسان الکامل ، ص ۱۳۱ ؛ شبلی و سلیمان ندوی : سیرۃ النبیؐ ، ۲ : ۲۲۴) ۔ تقریر ارشاد فرماتے وقت افصح العرب والعجم پر جو کیفیت طاری ہوتی تھی اسے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مختلف اوقات میں بیان کیا ہے ۔ جوش خطابت کے وقت آپؐ کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں ؛ آواز گرج دار اور بلند ہوتی تھی ؛ چہرۂ مبارک پر جلال کے آثار نمایاں ہو جاتے تھے ؛ جوش و جذبے کے عالم میں انگلیاں اٹھتی جاتی تھیں اور لگتا تھا کہ آپؐ لشکر اسلام کو جہاد کے لیے ہاتھ کے اشاروں سے جوش دلا رہے ہیں ؛ جسم مبارک جھومنے لگتا تھا ۔ ہاتھوں کی حرکت سے پٹھوں کے چٹخنے کی آوازیں سنائی دیتی تھی ؛ دوران تقریر میں کبھی مٹھی بند کر لیتے اور کبھی کھول دیتے تھے (شبلی : سیرۃ النبیؐ ، ۲ : ۲۳۵ ؛ ابن قیم : زادالمعاد ، ۱ : ۳۸ ؛ مسلم : الجامع الصحیح ، ۱ : ۲۸۴) ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے آپؐ کے ایک خطبے کے دوران میں جوش خطیبانہ کی تصویر پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کو برسر منبر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ خالق جبار ارض و سما کو مٹھی میں لے لے گا اور آپؐ ساتھ ہی اپنی مٹھی کبھی بند کرتے اور کبھی کھولتے جاتے تھے ۔ میں نے حضورؐ کو دیکھا کہ آپؐ کبھی دائیں جانب جھکتے، کبھی بائیں جانب جھکتے حتّٰی کہ میں منبر نبوی کو ہلتے ہوئے دیکھ کر یہ سوچنے لگا کہ کہیں یہ منبر گر نہ پڑے (ابن ماجہ : السنن ، ۲ : ۲۴۷ ؛ سیرۃ النبیؐ ، ۲ : ۲۳۳ ببعد) ۔ عقاد (عبقریۃ محمدؐ ، ص ۱۰۸) نے لکھا ہے چونکہ ابلاغ اور تبلیغ آپؐ کا مشن اور منصب تھا اس لیے بلاغت ہی آپؐ کے کلام کی نمایاں خصوصیت تھی ۔ آپؐ خطبہ حجۃ الوداع (البیان و التبیین ، ۲ : ۳۱ ؛ ابن ہشام : سیرۃ ، ۴ : ۲۵ ؛ جمہرۃ خطب العرب ، ۱ : ۵۹ ببعد) میں

marfat.com
Marfat.com

بار یہ لفظ دہراتے تھے : اَلَاھَلْ بَلَّغْتُ (کیا میں نے اچھی طرح خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے) ۔ عطیۃ الابراشی (عظمۃ الرسول صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم ، ص ۲۷۵) نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کو اللہ تعالٰی نے تمام قبائل عرب کی لغات و لہجات کا علم عطا کیا تھا، اس لیے ہر قبیلے کے لوگوں سے آپؐ ان کے لب و لہجے میں گفتگو فرماتے ؛ چنانچہ قریش و انصار اور اہل نجد و حجاز کے ساتھ آپؐ جو انداز گفتگو اختیار کرتے وہ اس سے مختلف تھا جو آپؐ قحطانی عربوں سے بات چیت کرتے ہوئے استعمال کرتے تھے ۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جب تعجب سے اس فصاحت و بلاغت کا سبب دریافت کرتے تھے تو آپؐ فرماتے تھے کہ میرے رب نے میری تربیت کی ہے اور قرآن مجید میری ہی زبان کے ذریعے اللہ نے نازل فرمایا ہے (حوالۂ مذکورہ ، ص ۸۲ ؛ الادب العربی و تاریخہ ، ۱ : ۳۴) .

آپؐ جب میدان جہاد میں مجاہدین اسلام سے خطاب فرماتے تو اپنی کمان کا سہارا لیتے تھے، کبھی کسی سہارے کے بغیر خطبہ ارشاد فرماتے اور کبھی اونٹنی پر سوار ہو کر خطاب فرماتے (سیرۃ النبیؐ ، ۲ : ۲۳۳) ۔ ہجرت کے بعد جب آپؐ نے مسجد نبوی میں مسلمانوں سے مختلف مواقع پر خطاب کا آغاز کیا تھا تو کھجور کے ایک تنے کے سہارے تقریر کرتے تھے ۔ جب اہل اسلام کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو صحابۂ کرامؓ نے آپؐ کے لیے ایک منبر بنوا دیا تھا تاکہ سب آپؐ کا دیدار کر سکیں (ابن سعد : الطبقات، ص ۹ تا ۱۲) ۔ کبھی آپؐ عصا کے سہارے خطبہ دیا کرتے تھے ۔ الجاحظ (البیان و التبیین، ۱ : ۶۹) نے بیان کیا ہے کہ یہ عصا خلفاے راشدین کو منتقل ہوتا رہا اور وہ اس سنت نبویؐ پر عمل کرتے رہے ۔ آخری اموی خلیفہ نے اپنا انجام دیکھ کر اپنے غلام کو حکم دیا تھا کہ چادر نبوی اور آپؐ کا عصا کہیں دفن کر دے، لیکن اس نے یہ دونوں چیزیں عباسی خلفا کو پہنچا دیں .

حضور صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے ارشادات جوامع الکلم کے سلسلے میں جاحظ نے لکھا ہے کہ بعض اقوال و کلمات نبویؐ ایسے ہیں جو آپؐ سے پہلے کسی عرب کی زبان پر وارد نہیں ہوئے ۔ آپؐ کے جوامع الکلم ضرب المثل بن کر عربی زبان و ادب کا حصہ بن گئے ہیں ، مثلاً مجاہدین اسلام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا : یَا خَیْلَ اللہِ اِرْکَبِیْ (اے اللہ کے گھوڑو یا شہسوارو ! سوار ہو جاؤ !) یہ محاورہ آپؐ سے قبل کسی نے استعمال نہیں کیا ؛ لَا تَنْتَطِحُ فِیْہِ عَنْزَانِ (اس میں دو بکروں کے سینگ نہیں ٹکراتے ، یعنی یہ بات جھگڑے کی نہیں !) ۔ جنگ کی شدت کے بارے میں یہ محاورہ بھی سب سے پہلے عربی زبان میں آپؐ ہی نے استعمال کیا تھا : اَلْآنَ حَمِیَ الْوَطِیْسُ ، (یعنی اب تنور گرم ہو گیا ہے مطلب یہ کہ معرکہ گرم ہوا ہے !) .

آپؐ کے جوامع الکلم: (۱) رَأْسُ الْعَقْلِ بَعْدَ الْاِیْمَانِ بِاللہِ مُدَارَاۃُ النَّاسِ ، یعنی اللہ تعالٰی پر ایمان لانے کے بعد عقل کی سب سے بڑی بات انسانوں کی دلجوائی کرنا ہے (البیان والتبیین ، ۲ : ۲۰ ؛ ادب الحدیث النبوی ، ص ۱۰۶ ؛ عظمۃ الرسول ، ص ۲۷۸) ؛ (۲) اَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی خَیْرِ مَا یَکْنِزُ الْمَرْءُ ؟ اَلْمَرْأَۃُ الصَّالِحَۃُ : اِذَا نَظَرَ اِلَیْھَا سَرَّتْہُ وَ اِذَا غَابَ عَنْھَا حَفِظَتْہُ فِیْ مَالِہٖ وَ عِرْضِہٖ ، یعنی کیا میں تمھیں ایک مرد کے بہترین سرمایہ کا پتا نہ دوں ؟ وہ ایسی نیک عورت ہے کہ اگر مرد اسے دیکھے تو اسے مسرت ہو اور اگر وہ اس سے دور ہو تو اس کے مال و عزت کی حفاظت کرے (ادب الحدیث النبوی ، ص ۱۰۵ ؛ عظمۃ الرسول ، ص ۲۷۷) ؛ (۳) مَاھَلَکَ اَمْرُءٌ عَرَفَ قَدْرَہٗ ، یعنی جس نے اپنا مرتبہ پہچان لیا

marfat.com
Marfat.com

وہ ملاکت سے بچ گیا (البیان والتبیین ، ۲ : ۲۳) ؛ (۴) لَوْ تَکَاشَفْتُمْ لَمَا تَدَافَنْتُم ، یعنی اگر تمھیں ایک دوسرے کے بھید معلوم ہو جائیں تو بوجہ نفرت ایک دوسرے کو دفن بھی نہ کرو (المبرد : الکامل، ص ۱۷۱ ؛ البیان والتبیین ، ۲ : ۲۳) ؛ (۵) مَنْ کَانَ آمِناً فِی سِرْبِہ ، مُعَافًی فِی بَدَنِہ، عِنْدَہ قُوتُ یَوْمِہ کَانَ کَمَنْ حِیزَتْ لَہُ الدنیا بحذا فیر ھا ، یعنی جو اپنے گھر والوں میں امن و اطمینان ، صحت و عافیت سے رہتا ہو ، اس کے پاس ایک دن کی خوراک بھی موجود ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے تمام دنیا و مافیہا اس کے لیے جمع کر دی گئی ہے (المبرد : الکامل ، ص ۹۱ ؛ عظمة الرسول ، ص ۲۷۶) .

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اولین خطبہ، جو تاریخ میں محفوظ ہے اس میں آپ[ص] نے اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہوئے قریش مکہ اور عرب و عجم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا : اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَہُ ، وَاللہِ لَوْ کَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعاً مَا کَذَبْتُکُمْ وَ لَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا غَرَرْتُکُمْ وَ اللہِ الَّذِی لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اِنِّی رَسُوْلُ اللہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّةً وَاِلَی النَّاسِ کَافَّةً وَاللہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ وَ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ وَ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ وَ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَ بِالسُّوْءِ سُوْءًا وَاِنَّمَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا (یعنی کوئی بھی خبر لانے والا اپنوں سے جھوٹ نہیں بولتا ! بخدا اگر میں سب لوگوں سے بھی جھوٹ بولتا تو بھی تم سے کبھی جھوٹ نہ بولتا اور اگر میں سب دنیا والوں کو بھی دھوکا دیتا تو تمھیں پھر بھی کبھی دھوکہ نہ دیتا ؛ قسم ہے اللہ کی . جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں ، جیسے تمھاری طرف خصوصاً بھیجا گیا ہے اور باقی تمام انسانوں کی طرف بھی بھیجا گیا ہوں ، واللہ ! تم اسی طرح مر جاؤ گے جس طرح تم سوتے ہو اور اسی طرح اٹھو گے جس طرح تم بیدار ہوتے ہو ! تمھیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہی ہوگا ۔ پھر (یاد رکھو) بھلائی کا بدلہ بھلائی اور برائی کا بدلہ برائی ہوگا ، پھر یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہوگی یا جہنم (ابن الاثیر : الکامل، ص ۲۷ ؛ سیرة النبی ، ۲ : ۲۳۶ ؛ الحلبیة ، ۱ : ۲۷۲ ؛ جمھرة خطب العرب ، ۱ : ۵).

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تبوک میں جو خطبہ ارشاد فرمایا، وہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور دانش و حکمت کا گنجینہ ہے (ابن قیم : زاد المعاد ، ۱ : ۱۲۴ ، مطبوعۂ قاھرہ) .

خطبۂ حجة الوداع میں آپ[ص] نے ارشاد فرمایا تھا : اَیُّھَا النَّاسُ ! اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ وَ لَا یَحِلُّ لِاْمرِئٍ مَالُ اَخِیْہِ اِلَّا عَنْ طِیْبِ نَفْسٍ مِّنْہُ، اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ ؟ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ ! فَلَا تَرْجِعُنَّ بَعْدِیْ کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ فَاِنِّیْ قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنْ اَخَذْتُمْ بِہ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ : کِتَابَ اللہِ اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ ؟ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ ! اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَ اِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ کُلُّکُمْ لِاٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ ، اَکْرَمُکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقَاکُمْ وَ لَیْسَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ فَضْلٌ اِلَّا بِالتَّقْوٰی، اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ ؟ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ ! قَالُوْا : نَعَمْ ! قَالَ فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ (یعنی اے لوگو ! تمام مومن بھائی بھائی ہیں، کسی کے لیے اپنے بھائی کا مال حلال نہیں ہے ہاں اگر وہ خوشی سے دے دے تو ٹھیک ہے ۔ سنو ، کیا میں نے (خدائی پیغام) پہنچا دیا ہے ؟ اے اللہ گواہ رہنا ! تم میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو ۔ کیوں کہ میں نے تم میں ایک ایسی چیز چھوڑی ہے اگر تم اس کے پابند رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور وہ ہے اللہ کی کتاب ! تو کیا میں نے (خدائی پیغام) پہنچا دیا ؟ اے اللہ گواہ رہنا ! اے لوگو، تمھارا رب ایک ہے ، تمھارا باپ بھی ایک ہے ، تم سب آدم[ع] سے ہو ، اور آدم[ع] مٹی سے تھے ، تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

متقی ہو ، کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے۔ تو کیا میں نے (خدائی پیغام) پہنچا دیا؟ اے اللہ! گواہ رہیو: لوگوں نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: تو جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچا دے (البیان والتبیین، ۲ : ۳۳ ؛ ابن الاثیر : الکامل ، ۲ : ۱۳۶ ؛ ابن ہشام : السیرۃ ، ص ۲۵۰ ببعد ؛ الباقلانی : اعجاز القرآن ، ص ۱۱۱ ؛ العقد الفرید ، ۲ : ۲۴۲ ؛ شرح نہج البلاغہ ، ۱ : ۱۴ ؛ جمہرۃ خطب العرب ، ۲ : ۲۴۶ ؛ البخاری : الجامع الصحیح ؛ السیرۃ الحلبیۃ ، ۳ : ۲۵۹).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خطبات کتب حدیث و سیرت ، تاریخ ، ادب اور بلاغت میں ملتے ہیں ، جن میں سے بیشتر خطبات احمد زکی صفوت (جمہرۃ خطب العرب فی عصور العربیۃ الزاہرۃ، ۱ : ۱۵ تا ۶۰) نے یکجا کر دیے ہیں۔

مآخذ : (۱) المبرد: الکامل، مطبوعہ لائپزگ؛ (۲) ابن قتیبہ : عیون الاخبار، قاہرہ ۱۹۲۲ء؛ (۳) وہی مصنف: ادب الکاتب ، لائیڈن، ۱۹۰۰ء ؛ (۴) ابن عبد ربّہ : العقد الفرید، مطبوعۂ قاہرہ (بدون تاریخ) ؛ (۵) احمد زکی صفوت : جمہرۃ خطب العرب فی عصور العربیۃ الزّاہرہ ، قاہرہ ۱۳۵۲ھ؛ (۶) الجاحظ : البیان والتبیین ، قاہرۃ ۱۹۶۰ء ؛ (۷) احمد حسن الزیات : تاریخ الادب العربی ، مطبوعۂ قاہرہ ؛ (۸) محمود شکری آلوسی : روح المعانی ، مطبوعۂ قاہرہ ، (بدون تاریخ) ؛ (۹) احمد ضیف : مقدمۃ لدراسۃ بلاغۃ العرب ، قاہرہ ۱۹۲۱ء ؛ (۱۰) ابوالقاسم الزمخشری : اطواق الذہب فی المواعظ والخطب ، قاہرہ ۱۳۲۸ھ؛ (۱۱) محمّد عبدالغنی حسن : الخُطب والمواعظ، قاہرہ ۱۹۰۰ء ؛ (۱۲) ابن الاثیر : المثل السائر فی ادب الکاتب والشعر، قاہرہ ۱۳۱۲ھ ؛ (۱۳) سعید الافغانی : اسواق العرب فی الجاہلیۃ والاسلام ، دمشق ۱۹۳۷ء ؛ (۱۴) جوّاد علی : تاریخ العرب قبل الاسلام ، بغداد ۱۹۵۵ء؛ (۱۵) عبدالملک العصامی المکی : سمط النجوم العوالی ، قاہرہ ۱۳۸۰ھ ؛ (۱۶) عبدالوہاب عزام : موقع عکاظ ، ۱۹۵۰ء ؛ (۱۷) النویری : نہایۃ الارب فی فنون العرب ، قاہرہ ۱۹۵۱ء ؛ (۱۸) الباقلانی : اعجاز القرآن ، قاہرہ ۱۹۵۱ء ؛ (۱۹) ابن ہشام : السیرۃ النبویۃ ، قاہرہ ۱۹۳۷ء ؛ (۲۰) القلقشندی : صبح الاعشٰی ، قاہرہ ۱۹۶۳ء ؛ (۲۱) شبلی : سیرۃ النبی، اعظم گڑھ، ۱۳۳۲ھ ؛ (۲۲) الترمذی: السنن، مطبوعۂ دہلی، بدون تاریخ ؛ (۲۳) البخاری : الجامع الصحیح ، مطبوعہ قاہرہ ؛ (۲۴) ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ ، قاہرہ ۱۹۶۴ء؛ (۲۵) بکری امین : ادب الحدیث النبوی ، قاہرہ ۱۹۷۵ء؛ (۲۶) العقاد : عبقریۃ محمدؐ، بیروت ۱۹۶۹ء ؛ (۲۷) محمد عطیہ الابراشی : عظمۃ الرسول ، قاہرہ ۱۹۶۶ء؛ (۲۸) محمد المبارک : الامۃ العربیۃ ، دمشق ۱۹۶۳ء ؛ (۲۹) ابن تیمیہ : اقتضاء الصّراط المستقیم ، قاہرہ ۱۹۰۷ء ؛ (۳۰) حسن کامل : رسول اللہ فی القرآن الکریم، قاہرہ ۱۹۷۱ء ؛ (۳۱) العقاد : مطلع النور او طوالع البعثۃ المحمدیہ ، مطبوعۂ بیروت؛ (۳۲) عبدالحی الکتانی: نظام الحکومۃ النبویہ، مطبوعۂ بیروت؛ (۳۳) احسان النص: الخطابۃ العربیّہ ، قاہرہ ۱۹۶۲ء .

(ظہور احمد اظہر)

خواتین کے حقوق و حیثیت حضورؐ کی نظر میں : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے معاشرے میں خواتین کو جو بلند اور باوقار مقام عطا کیا اور ان کے ساتھ جس مہر و محبت اور شفقت و رافت سے پیش آنے اور پیش آنے کا حکم دیا ، اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ازمنۂ قدیمہ اور عہد حاضر کی متمدّن اقوام نے عورت کو جو مقام دیا ہے، اس کا سرسری سا جائزہ پیش کر دیا جائے.

عورت قدیم تہذیبوں اور مذاہب میں: بنی نوع انسان کی بقا کا مدار مرد و زن کے باہمی تعاون و

marfat.com
Marfat.com

اشتراک پر منحصر ہے ، لیکن تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قدیم متمدن معاشروں میں ترقی صرف ایک صنف، یعنی مرد، کی کوششوں تک محدود سمجھی جاتی رہی ہے ۔

ہندوستان کے قریب ترین مذاہب ہندو دھرم اور بدھ مت میں عورت کو بدی کی جڑ کہا گیا اور اسے نہایت حقیر و ذلیل سمجھا جاتا تھا ؛ چنانچہ ان کے ہاں لڑکی کے لیے لفظ "دوہتر" (دور کر دی گئی) اور بیوی کے لیے "پتنی" (کنیز) کے الفاظ اور "ستی" ہونے کی رسم اس بات کی تصدیق کے لیے کافی ہیں (نیز دیکھیے منو سمرتی، ۵ : ۱۴۵؛ ۹ : ۱۷ وغیرہ)

ترقی و تمدن کے گہوارے یونان میں اسے شیطان [سے مشابہ قرار دیا گیا اور اہل یونان نے عورت کی ناقدری بڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی]۔ شوہر کو بیوی پر پورا اختیار حاصل ہوتا تھا ۔ وہ عورت کو جب چاہتا گھر سے نکال سکتا ، بحیثیت مجموعی باعصمت یونانی عورت کا مرتبہ نہایت پست تھا ۔ اس کی زندگی غلامی میں بسر ہوتی تھی ۔ طلاق کا حق اسے قانوناً ضرور حاصل تھا ، تاہم وہ عملاً اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی ۔ اگر افلاطون نے عورت کی آزادی اور مساوات کا دعوٰی کیا بھی تو یہ محض زبانی تعلیم تھی؛ عملی طور پر اس کی حالت کو بہتر بنانے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ۔ غلاموں کی طرح عورت سے خدمت لی جاتی تھی ۔ بوزنطی مملکت میں اس کے قانونی حقوق کچھ نہ تھے (روم کے مختلف ادوار میں عورت کی سماجی و معاشرتی حیثیت کے لیے دیکھیے : *Encyclopaedia Britannica* ، ج ۱۹، بذیل Rom ؛ نیز لیکی: تاریخ اخلاق یورپ ، ص ۳۵ ، ۴۴ تا ۴۵ ، ۸۱ تا ۸۳ ، ۲۸۹ ، ۲۹۱ ، ۲۹۳ ، ۳۰۱ تا ۳۰۵ ، ۳۶۷ تا ۳۶۸، ۵۶۵ تا ۵۶۸؛ Will Durant : *The life of Greece*، ص ۵۶۵ تا ۵۶۸).

عورت کو ایک بے جان قالب سمجھا جاتا

اور کہا جاتا کہ وہ بنی آدم کو بہکانے کا ایک دلکش آلہ ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے *Encyclopaedia Britannica* ، ج ۱۰ ؛ Will Durant : *Our Oriental Heritage* : Stewart : *Heritage of the Ancient World*) .

بابل و ایران کی حالت روم و یونان سے چنداں مختلف نہ تھی ۔ عورت کو یہاں بھی نہایت بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا [. . . . . بعض دوسرے مذاہب میں بھی صورت حال بہتر نہ تھی] .

عرب معاشرے میں بھی عورت کی حالت ناگفتہ بہ تھی ۔ بعض قبائل میں لڑکیاں زندہ درگور کرنے کا رواج تھا ۔ نکاح و طلاق پر کوئی پابندی نہیں تھی ۔ عورت کو وراثت میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا [محمود شکری آلوسی : بلوغ الارب ، ۲ : ۲ تا ۵۶ ، مطبوعۂ بغداد ، ۱۳۱۴ھ، بار اول] .

عصر جدید : [عصر جدید میں آزادی نسواں کے نعروں کے باوجود ، عورتوں کے ساتھ ایک دوسرے طریق سے فریب کھیلا جا رہا ہے ، وہ یوں کہ زندگی اور تمدن کے لیے مرد و زن کے مابین اشتراک اور تعاون و محبت کی ضرورت ہے ۔ مغربی تحریکیں بجاے تالیف کے مخاصمت اور تفریق کی تبلیغ کرکے بیگانگی کی خلیج وسیع کر رہی ہیں اور تعاون کے بجاے باہمی بیزاری پیدا کی جا رہی ہے اور آزادی کے نام پر ان کو بے راہ روی اور مادر و پدر آزادی سکھائی جا رہی ہے] .

مغرب کی تقلید میں مشرق اور دیگر مسلمان ممالک کو بھی یہی صورت حال در پیش ہے ۔ مصر، شام، عراق، ترکی، ایران، افغانستان، اور پاکستان میں بھی آج اس تحریک کی صداے بازگشت سنائی دیتی ہے موجودہ تہذیب نے عورت کو جو آزادی

marfat.com
Marfat.com

دی ہے [وہ بھی ایک فریب اور ملمع سازی ہے، ورنہ در حقیقت یہ آزادی نہیں ، بلکہ یہ تو عہد عتیق کی غلامی سے بھی بدتر ہے ۔ صحیح آزادی وہی ہے جو پیغمبر اسلام علیہ الصّلاۃ والسلام نے عورتوں کو عطا کی، جس سے عورتوں کو ان کے جائز حقوق بھی مل جاتے ہیں اور اس سے ایک صالح معاشرہ بھی تشکیل پا سکتا ہے] .

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا عظیم اصلاحی کارنامہ : حقیقت یہ ہے کہ معاشرے میں مردو زن کے صحیح رشتے کو متعین کرنے میں قدیم و جدید تمام تصورات یکطرفہ اور ناقص ہیں ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے دنیا کو یہ بتایا کہ زندگی مرد و زن دونوں کے ارتباط کی محتاج ہے ۔ آپؐ نے بڑے واضح الفاظ میں عورت اور مرد کے [لازمی ارتباط پر زور دیا اور یہ واضح کیا ہے کہ نسلی اور فطری اعتبار سے کسی صنف کو دوسری صنف پر برتری حاصل نہیں بجز تقوٰی کے] ۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے : یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً (۴ [النساء] : ۱ ، [یعنی اے لوگو ، اپنے پروردگار سے ڈرو ، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورتیں پھیلا دیے] ؛ پھر دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ دونوں کے باہمی حقوق ہیں اور دونوں کے باہمی فرائض بھی : وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲ [البقرۃ] : ۲۲۸)، [یعنی اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ عورتوں پر حق ہے موافق (دستور) شرعی کے] ۔ اسی طرح قرآن مجید نے تقوٰی اور فلاح دارین کا جو معیار مرد کے لیے مقرر کیا ہے وہی عورت کے لیے بھی کیا ہے : مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً وَ لَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۶ [النحل] : ۹۷) ، [یعنی ایک عمل جو کوئی بھی کرے گا ، مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحب ایمان ہو ، تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ہم انہیں ، ان کے کاموں کے عوض میں ، ضرور اجر دیں گے] ۔ پھر ایک اور جگہ ارشاد ہے : اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ (۳ [آل عمران] : ۱۹۵) ، [یعنی میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے ، خواہ مرد ہو یا عورت ، عمل کو ضائع ہونے نہیں دیتا) ، لیکن مساوات کے اس اعلان کے ساتھ قرآن مجید نے اسلامی معاشرے میں مسلمان عورت کے فرائض اور اس کی تگ و دو کے خطوط کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ۔ اسلام نے دونوں کے طبعی و فطری رجحانات کو مد نظر رکھ کر ہر ایک کے لیے علٰحدہ دائرہ عمل بھی مقرر کر دیا ، جس کی نوعیت میں فرق ضرور ہے ، لیکن اہمیّت اور قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں اور ہر صنف کا کمال اسی میں ہے کہ اس کی طبعی صلاحیتیں منشاے قدرت کی تکمیل میں صرف ہوں ۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم [جن پر قرآن مجید نازل ہوا] ، جو اس کے کامل مفسر ، شارح بلکہ مجسّم قرآن ہیں ، خود ان کا خواتین کے ساتھ کیسا رویّہ اور سلوک تھا اور وہ کون سے حقوق ہیں جن پر آپؐ نے اپنی عملی زندگی میں زور دیا۔ [آپؐ نے مردوں کی طرح عورتوں کے حقوق محفوظ کیے ، اسی طرح ان کے کچھ فرائض بھی مقرر کیے ۔ اور تعمیل پر حسن اجر کا وعدہ کیا]۔ آپؐ نے واضح طور پر فرما دیا کہ زندگی میں عورت کا دائرۂ عمل مرد کے دائرۂ عمل سے مختلف ہے۔ [زندگی عبارت ہے فرائض و اعمال سے] ، مرد گھر سے باہر کی دنیا کا ذمہ دار ہے ، تو عورت گھر کی ذمہ دار [یہ تقسیم عمل ہر طرح عقلی اور فطری

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

ہے]۔ دیگر مذاہب اور معاشروں میں رشتوں کی حرمت کا کوئی خیال نہیں کیا گیا۔ آپؐ نے محرم و نامحرم رشتوں کی وضاحت فرمائی؛ عورت کو نا محرم کے سامنے زیب و زینت کرنے اور ایسا لباس استعمال کرنے سے منع فرمایا جو باریک ہو اور ساتر نہ ہو [یا جو اتنا تنگ ہو کہ اس سے جسم کے ابھار نمایاں ہوتے ہوں؛ خلاف ورزی کی صورت میں جہنم کی وعید سنائی] (مسلم: الجامع الصحیح، ۶: ۱۵۸، مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۳۲ھ)۔ [نیز مردوں کو حکم دیا کہ اگر دفعۃً کسی عورت سے سامنا ہو جائے تو نگاہ جھکا لیا کریں] (الترمذی: الجامع السنن، ابواب الادب، ص ۱۳۸، مطبوعہ قاہرہ، ۱۲۹۲ھ)۔ آپؐ نے باہر نکلتے وقت زیب و زینت کو چھپانے اور مردوں سے الگ تھلگ رہنے کی تاکید فرمائی (ابو داؤد: الجامع السنن، ۴: ۸۶ تا ۹۰)۔ آپؐ نے عورت کو نامحرم کے ساتھ سفر کرنے اور تنہائی میں اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی ممانعت فرمائی ہے (البخاری: الجامع الصحیح، ۷: ۴۸؛ الترمذی، ۵: ۱۲۱)۔ آپؐ کا خود یہ طریقہ تھا کہ خواتین سے بیعت لیتے وقت ان کا ہاتھ مس نہیں کرتے تھے (البخاری: کتاب مذکور، ۷: ۶۴)۔ خوشبو اور عطریات، جو جذبات کو برانگیختہ کرنے والے ہیں، آپؐ نے خواتین کو گھروں سے باہر نکلتے وقت استعمال کرنے سے منع فرمایا (مشکوٰۃ المصابیح، ۱: ۳۳۴)۔ یہ تھے وہ اصول و ضوابط جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عورت کو اندرون خانہ اور بیرون خانہ ملحوظ رکھنے کے سلسلے میں تلقین فرمائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عورت کو جو حقوق عطا فرمائے ان کی فہرست بڑی طویل ہے: ان حقوق نے عورت کی زندگی میں جو تبدیلی پیدا کی اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس قول سے ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ہم لوگ عورتوں کو بالکل ہیچ سمجھتے تھے، مدینے میں نسبتاً ان کی قدر تھی، لیکن جب اسلام آیا اور ان کے متعلق آیات نازل ہوئیں تو ہم کو ان کی قدر و منزلت کا صحیح احساس ہوا (البخاری، النکاح باب ۸۳، ۳: ۴۴۳ تا ۴۴۴)۔ اس سے بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو صرف چند حقوق ہی عطا نہیں کیے، بلکہ ان کو معاشرے میں ان کا جائز مقام دلا کر انسانیت کی تکمیل کی ہے؛ چنانچہ آپؐ کا ارشادگرامی ہے: مرد اپنے اہل خانہ کا راعی ہے اور ان سے متعلق اس سے جواب طلبی ہوگی اور عورت شوہر کے گھر کی محافظ و نگہبان ہے اور اس سے اس کے متعلق باز پرس ہوگی (البخاری [کتاب مذکور، باب ۹۰/۶۷ (۳: ۴۴۶)]؛ احمد بن حنبل: مسند، ۷: ۱۶۰؛ نیز ۸: ۱۹۸)۔ آپؐ نے مرد کو قوّام اور اہل خانہ کے نان و نفقے کا ذمہ دار بنایا (۴ [النسآء]: ۳۴)، تو عورت کو اس سے بھی مشکل، لیکن اہم اور نازک کام یعنی تربیت اولاد کی ذمہ داری سونپی (حوالۂ مذکور)۔ عورتوں کو نازک آبگینوں سے تشبیہ دی۔ ایک سفر میں جب کہ ازواج مطہرات بھی ساتھ تھیں اور حدی خوان ذرا تیز آواز سے سواریوں کو چلا رہے تھے، تو آپؐ نے فرمایا: انجشہ رویدک بالقواریر (الاصابہ، ۴: ۳۰۴)، [یعنی نازک آبگینوں (خواتین) کا خیال رکھو اور نرم روی اختیار کرو]۔ آپؐ نے علم کے دروازے مرد و عورت دونوں کے لیے یکساں طور پر کھول دیے، فرمایا: طلب العلمِ فریضۃ علی کلِ مسلمٍ (مشکوٰۃ، ۱: ۷۶)، [یعنی علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے]۔ صحابیات آپؐ کی مجالسِ وعظ و تلقین میں شریک ہوتی تھیں، لیکن مردوں کی کثیر تعداد کی وجہ سے بسا اوقات آپؐ کے ارشادات سن نہ سکتیں تو اس پر عورتوں نے آپؐ سے ان کے لیے علیحدہ دن مخصوص کرنے کی درخواست کی، جو قبول کر لی گئی؛ چنانچہ

marfat.com
Marfat.com

آپؐ گاہے بگاہے عورتوں کو خطاب فرماتے (البخاری : الجامع الصحیح ، کتاب ۳، باب ۳۲، ۱ : ۳۷) ۔

عورتوں کو احکام دین سیکھنے کے لیے مساجد میں آنے اور نماز عیدین میں بھی شریک ہونے کی اجازت دی، [بشرطیکہ زمانہ فتنے کا نہ ہو اور شرکت کی صورت میں (دھکم پیل) سے بچنے اور اختلاط سے محفوظ رکھنے کی خاطر] یہ وضاحت بھی فرما دی کہ عورتیں با جماعت نماز میں سب سے آخری صف میں کھڑی ہوں (مشکوۃ المصابیح ، ۱ : ۳۳ ؛ الترمذی، ۳ : ۱۰۳ ؛ الدارمی ، ۱ : ۲۹۱) ، مگر یہ بھی فرمایا کہ بیوتھن خیر لھن (مشکوۃ ، ۱ : ۲۳۴) ، [یعنی عبادت وغیرہ کے لیے ان کا گھر ان کے لیے بہترین جگہ ہے ، کیونکہ باہر کی زندگی میں فتنوں کی کثرت ہے ، جس سے وہ کمزور ہونے کی وجہ سے بچ نہیں سکتیں] ۔ خواتین سے شفقت آمیز سلوک کا مظہر اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ خواتین بلا تکلف آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتیں ، ذاتی نوعیت کے مسائل کا حل دریافت کرتیں ، یہاں تک کہ شوہروں کی بد سلوکی کے بارے میں شاکی ہوتیں ، جس پر آپؐ شوہروں کو تنبیہ فرماتے (ابو داؤد : السنن ، ۲ : ۳۰۰) ۔ ایک دن خواتین دربار رسالت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ آپؐ [زن و مرد دونوں کے لیے] رسول ہیں؛ ہم [عورتیں آپؐ پر (مردوں ہی کی طرح)] ایمان لائیں ، مگر ہم پردہ دار ہیں ، گھر کی رکھوالی کرنے اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے والی ہیں ، جبکہ مرد نماز باجماعت، جنازہ اور جہاد میں شرکت کی وجہ سے سبقت لے گئے [اور عورتیں ان فضیلتوں سے محروم رہتی ہیں۔ اس پر آپؐ نے] فرمایا : عورتوں کا شوہر کی خدمت کرنا، ان کی مرضی کے مطابق کام کرنا ان سب کاموں پر بھاری ہے (اسد الغابۃ، ۵ : ۳۹۸ تا ۳۹۹) ۔ [مطلب یہ کہ مردوں کی ذمے داریاں سخت ہیں ، جن کو عورتیں اپنی طبعی اور جسمانی ساخت کی بنا پر پورا نہیں کر سکتیں ۔ یہ سخت کام مرد ہی کر سکتے ہیں ۔ عورتیں ان گراں خدمات انجام دینے والوں (مردوں) سے اپنی حدود میں اور اپنی استعداد کے مطابق تعاون کریں اور ان کو آرام پہنچائیں تاکہ وہ جہاد جیسی مشقت کو بخوشی برداشت کرنے کے قابل رہیں] ۔ آپؐ عورتوں کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جاتے؛ ان کی دلجوئی فرماتے اور بطور شفقت تحائف بھی دیتے۔ ام خالد کے بارے میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں ایک چادر بطور ھدیہ دی (ابن سعد : الطبقات، ۸ : ۲۳۴) ۔ آپؐ نے مختلف مواقع پر اپنی بعض رشتے دار عورتوں کے ہاں قیام فرمایا (اسد الغابہ ، ۵ : ۲۷۷ تا ۲۷۸ ؛ الطبقات ، ۸ : ۲۲۲) ۔ آپؐ جب بھی قباء تشریف لے جاتے اپنی رضاعی خالہ کے ہاں قیام فرماتے اور ان کے ہاتھ کا تیار کردہ کھانا تناول فرماتے اور انہیں کے گھر آرام بھی فرماتے ۔

ایک مرتبہ بعض قرابت دار عورتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ بیٹھی گفتگو کر رہی تھیں کہ حضرت عمرؓ آئے تو وہ اٹھ کر چلی گئیں ۔ آپؐ نے تبسم فرمایا تو حضرت عمرؓ بولے : خدا آپؐ کو خنداں رکھے ! کیوں تبسم فرمایا ؟ فرمایا ان عورتوں پر تعجب ہوا کہ تمہاری آواز سنتے ہی آڑ میں چھپ گئیں ۔ حضرت عمرؓ نے خواتین سے پوچھا کہ کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو اور آنحضرتؐ سے نہیں ڈرتیں ؟ انھوں نے جواب دیا کہ نبی کریمؐ کی نسبت آپ ذرا سخت مزاج ہیں ۔ اسی طرح آپؐ ایک دن حضرت عائشہؓ کے گھر منہ ڈھانپ کر سوئے ہوئے تھے ، عید کا دن تھا ۔ لڑکیاں بالیاں گا بجا رہی تھیں ۔ اس اثنا میں حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے تو خفا ہوئے [کہ حضورؐ سو

marfat.com
Marfat.com

رہے ہیں اور تم نیند میں خلل ڈال رہی ہو ؟ اس پر آپؐ نے فرمایا انھیں کچھ نہ کہو، یہ ان کی عید کا دن ہے (مسلم : الجامع الصحیح ، ۳ : ۲۱ تا ۲۲) .

دنیا کی اکثر اقوام نے عورت کو کسی نہ کسی طرح میراث سے محروم رکھا ، لیکن اسلام نے عورت کو بحیثیت بیٹی ، بیوی اور ماں [اور دیگر ممکن رشتوں کے] میراث سے حصہ دلایا - جاھلی عرب معاشرے میں لڑکی کی پیدائش کو منحوس قرار دیا جاتا اور وہ ہر قسم کے حقوق سے محروم رہتی تھی - بعض قبائل میں بچی کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی زندہ دفن کردیا جاتا [محمود شکری آلوسی : بلوغ الارب ، ۱ : ۳۱۴ ببعد] ، لیکن آنحضرتؐ نے بچی کی پیدائش کو نزول رحمت سے تعبیر فرمایا اور پھر بچیوں کی تربیت کی تلقین کی اور بالغ ہونے پر نکاح کرنے والوں کے لیے جنت کی نوید سنائی ؛ چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے دو بیٹیوں ، یا بہنوں کی ، بالغ ہونے تک پرورش کی اور ان پر لڑکوں کو ترجیح نہ دی ، وہ اور میں قیامت کے دن، اپنی دو انگلیوں کو اکٹھا کرکے اشارے سے ظاہر کیا ، اس طرح اکھٹے ہوں گے (مشکوۃ ، ۲ : ۶۰۵).

آپؐ خود ان تعلیمات کا مکمل نمونہ تھے - آپؐ اپنی صاحبزادیوں اور ان کے بچوں کے لیے سراپا شفقت تھے - حضرت فاطمۃ الزہراءؓ [رک بآں] سے آپؐ کو جو محبت تھی اس کا اندازہ اس قول مبارک سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ : فاطمہؓ میرے جگر کا ٹکڑا ہے ، اس کے دکھ سے مجھے تکلیف ہوتی ہے (مسلم : الجامع الصحیح، ۷ : ۱۴۱) - آپؐ کا معمول تھا کہ جب بھی حضرت فاطمہؓ تشریف لاتیں تو ان کا کھڑے ہو کر استقبال فرماتے اور خوشی کا اظہار کرتے (البخاری: الجامع الصحیح ، ۷ : ۱۴۱) - آپؐ کی (ننھی) نواسی حضرت امامہؓ بنت زینبؓ ، نماز کے دوران میں آپؐ پر سوار ہو جاتیں ، جب آپؐ قیام فرماتے تو آپؐ انھیں گود میں اٹھا لیتے (مشکوۃ المصابیح ، ۱ : ۳۱۲) - [حکم سکون آنے سے پہلے نماز میں حرکت جائز تھی (دیکھیے ۲ [البقرۃ] : ۲۳۸ ؛ نیز روح المعانی ، ۲ : ۱۵۸)- لڑکی کے نکاح کے معاملے میں باپ اور ولی کے لیے لازمی قرار دیا کہ اس معاملے میں لڑکی کی رائے لیں (مسلم : الجامع الصحیح ، ۴ : ۱۴۰ تا ۱۴۱ ؛ ابو داؤد ، ۲ : ۳۱۱)- خنساء بنت خذام [انصاری خاتون ، جوثیبّہ تھیں] کے والد نے ان کا نکاح ان کی مرضی کے بغیر کر دیا ، وہ دربار رسالت میں والد کی شکایت لے کر پہنچیں تو آپؐ نے انھیں نکاح کو رد کرنے کا حق دے دیا (مشکوۃ ، ۲ : ۱۷۰ ، حدیث ۳۱۳۶)، بخاری شریف (۳ ، کتاب النکاح ، باب ۴۲) میں ایک ایسی ھی روایت باکرہ کے متعلق بھی ہے .

بیویوں کے بارے میں حضورؐ کا عمل اور ارشادات : اسلام نے بیویوں کے انفرادی تشخّص کو تسلیم کرکے ان کے فرائض کے ساتھ ساتھ ان کے حقوق بھی بیان کیے ہیں [آنحضورؐ نے خاندانی زندگی میں فرائض اور حقوق کی حد بندی کرتے ہوئے بھی بیویوں کے الگ وجود کو تسلیم کرایا] ، آپؐ نے فرمایا : الدُّنیا کُلُّھا مَتَاعٌ و خَیْرُ مَتَاعِ الدُّنیا المراۃ الصالحۃ (مشکوۃ المصابیح ، ۲ : ۱۵۸) [یعنی ساری کی ساری دنیا نعمت ہے اور بہترین نعمت نیک بیوی ہے] ؛ مزید فرمایا : تم میں بہتر وھی ہے جس کا سلوک اپنی بیویوں سے اچھا ہے اور میرا سلوک میری بیویوں سے سب سے اچھا ہے [الترمذی : السنن، ۳ : ۳۲۲ ، قاھرہ ۱۲۹۲ھ] ؛ آپؐ نے مزید فرمایا کہ کوئی شخص بیوی کو] غلام یا باندی کی طرح نہ مارے پیٹے (البخاری : الجامع الصحیح ، ۳ : ۴۴۸ ، کتاب ۶۷ ، باب ۹۳] ؛ اگر شوہر کو بیوی کی کوئی عادت ناپسند ہو تو یقیناً کوئی عادت

marfat.com
Marfat.com

پسندیدہ بھی ہوگی [اپنی پسندیدہ عادت کی قدر کرے اور ناپسندیدہ پر در گزر اور صبر کرے اور تدریجی اصلاح کی کوشش کرے] (مسلم : الجامع الصحیح ، ۴ : ۱۷۸ ؛ مشکوٰۃ ، ۲ : ۱۹۸) - [ہاں اگر وہ ان جرائم میں سے کسی کا ارتکاب کرے ، جن کی سزا اسلام نے ضروری قرار دی ہے تو وہ مستحق سزا ہے]- خطبۂ حجۃ الوداع میں آپؐ نے فرمایا : ”عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو ، وہ تمھیں اللہ کی امانت کے طور پر ملی ہیں اور خدا کے حکم سے تم نے ان کا جسم اپنے لیے حلال بنایا ہے - تمھاری طرف سے ان پر یہ ذمے داری ہے کہ وہ کسی غیر کو (جس کا آنا تم کو گوارا نہیں ہے) اپنے پاس گھر میں نہ آنے دیں ، اگر وہ ایسا کریں تو تنبیہ کا حق مردوں کو ہے (الترمذی : الجامع السنن، ۵ : ۱۱۱؛ ابن ہشام : السیرۃ ، ۴ :۲۵۱، قاہرہ ۱۹۳۶ء) .

[آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے شوہر پر بیوی کی معاشی کفالت لازم قرار دی ہے (کیوں کہ وہ گھر کی ذمے داریوں کی وجہ سے خود اپنے لیے معاش کا بندوبست نہیں کر سکتی ؛ ابو داؤد : السنن ، ۲ : ۳۲۸)] اور پھر معاشی طور پر اس کی حالت مزید مستحکم کرنے کے لیے مرد پر ادائیگی مہر کی ذمے داری ڈالی (ابو داؤد : السنن ، ۲ : ۳۲۸ ؛ البخاری، ۷ : ۲۵ و بعد؛ مسلم : الجامع الصحیح ، ۴ : ۱۴۴ و بعد ؛ الترمذی ، ۵ : ۳ تا ۱۰) - اگر شوہر خوشحالی کے باوجود بیوی بچوں کے اخراجات برداشت نہیں کرتا تو آپؐ نے عورت کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنی اور اپنی اولاد کی ضرورت کے مطابق اس کے مال میں سے وصول کر سکتی ہے (البخاری : الجامع الصحیح، [۳ : ۴۸۸]).

آپؐ ازواج مطہرات کے لیے سراپا محبّت تھے، [گویا ھُنّ لِبَاسٌ لَّکُمْ کی مجسّم تصویر تھے : لاڈ پیار ، ناز برداری ، روٹھنا ، منانا دلچسپی کے پہلو پیدا کرنا ، رائے لینا اور ناموافق رائے کو برداشت کرنا ، وغیرہ وغیرہ ، وہ سب امور جو ازدواجی زندگی میں پیش آتے ہیں ؛ آپؐ ان سب میں محبت ، رفق، اور مودت و رحمت کا پیکر تھے (مسلم : الجامع الصحیح ، ۷ : ۱۳۵)] .

دنیا کی اکثر اقوام میں بیوہ کی کوئی حیثیت نہ تھی - ہندو مذہب میں شوہر کی موت کے ساتھ اس کو بھی اپنی زندگی ختم کرنا پڑتی تھی - عربوں کا دستور تھا کہ جب باپ وفات پا جاتا تو بڑا لڑکا اپنی سوتیلی ماں کا جائز وارث سمجھا جاتا - [اسلام نے بیوہ کا حق وراثت تسلیم کیا - بعض اقوام میں بیوہ سے شادی ممنوع تھی ، لیکن اسلام نے شادی کی تلقین کی اور حضور پاکؐ نے خود بھی اس پر عمل کیا] - آپؐ ہمیشہ ازواج مطہراتؓ کے درمیان عدل و انصاف سے کام لیتے - حضرت عائشہؓ خود اس بات کی گواہی دیتی ہیں ، فرماتی ہیں : کہ آپؐ نے ہماری باریاں مقرر کر رکھی تھیں اور ہمیشہ ہم سب کے درمیان عدل سے کام لیتے (ابو داؤد : السنن، ۲ : ۳۲۶) .

ازواج مطہراتؓ کے ساتھ یہ مہر و محبّت کا سلوک ان کی زندگی تک ہی محدود نہ تھا ، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:وفات حضرت خدیجہؓ کے بعد جب کبھی گھر میں جانور ذبح ہوتا ، تو آپؐ ان کی سہیلیوں کو بھجواتے اور آپؐ اکثر حضرت خدیجہؓ کا ذکر کرتے (مسلم : الجامع الصحیح ، ۷ : ۱۳۴) .

آپؐ نے رشتۂ نکاح کو پائدار بنانے اور استحکام بخشنے کے لیے ہر ممکن اقدام فرمایا اور اس میں رخنہ ڈالنے والے ، یا زوجین میں تفریق کرانے والے کو وعید سنائی کہ وہ ہم میں سے نہیں جو یہ کام کرے (ابو داؤد : السنن ، ۲ : ۳۴۲) - عورتوں کو نصیحت فرمائی کہ عورت ، کسی دوسری عورت

marfat.com
Marfat.com

کی طلاق کی خواہاں نہ ہو؛ اگر ان کوششوں کے باوجود زوجین کی ناچاقی ختم نہ ہو سکے اور معاملات کی اصلاح نہ ہو سکے تو اس تعلق کو ختم کیا جا سکتا ہے (مشکوٰۃ المصابیح، ۲ : ۲۰۹)، [لیکن طلاق کی ناگواری کو محسوس کرکے اسے ابغض الحلال کہا] ۔ عورت کو خلع کا حق بھی دیا اور ساتھ ہی صراحت فرما دی کہ جس عورت نے معقول وجہ کے بغیر مرد سے طلاق کا مطالبہ کیا وہ منافقہ ہے اور وہ جنت کی خوشبو سے محروم رہے گی (الترمذی : السنن، ۵ : ۱۶۲ ؛ مشکوٰۃ المصابیح، ۲ : ۲۰۹).

عورت بحیثیت ماں : قرآن و سنت کی رو سے ماں کا درجہ معراج انسانیت ہے ۔ قرآن کریم (۲ [البقرۃ] : ۸۳ ؛ ۱۷ [بنی اسرآئیل] : ۲۳ تا ۲۴؛ ۲۹ [العنکبوت] : ۸ ؛ ۳۱ [لقمان] : ۱۴ - ۱۵) میں بالتصریح ارشاد ہے کہ توحید کے بعد والدین کی اطاعت کا درجہ ہے اور والدین میں بھی (خدمت میں) والدہ کا حق فائق ہے ۔ کسی صحابیؓ نے آپؐ سے پوچھا کہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے تو آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا تمھاری ماں، چوتھی بار فرمایا تمھارا باپ (مسلم : الجامع الصحیح، ۸ : ۲ ؛ الترمذی : السنن، ۸ : ۹۲ ؛ مشکوٰۃ المصابیح، ۲ : ۵۹۷) ؛ والدین کی نافرمانی کو آپؐ نے کبیرہ گناہ (اکبر الکبائر) سے تعبیر فرمایا ۔ حسن سلوک کے اس دائرے کو حقیقی والدین سے بڑھا کر رضاعی والدین اور دیگر اعزہ و اقارب تک وسیع کر دیا ۔ والدہ اگر غیر مسلمہ بھی ہو تو اس صورت میں بھی اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا (الترمذی : الجامع السنن، ۸ : ۹۸؛ مشکوٰۃ المصابیح، ۲: ۲۰۹).

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا باندیوں سے حسن سلوک: اسلام نے مختلف گناہوں کے کفارے میں غلام کی آزادی کی شرط لگائی (۴ [النساء]: ۹۲ ؛ ۵ [المائدۃ] : ۸۹ ؛ ۵۸ [المجادلۃ] : ۳) .

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے لونڈیوں کو آزاد کرنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور ان سے نکاح کرنے کی مسلمانوں کو تاکید کی اور آقاؤں کو ان کا سرپرست قرار دیا ۔ آپؐ لونڈیوں کو آزاد کر دیتے، ان کے نکاح کا انتظام کرتے ۔ آزاد ہونے پر انھیں وہی حقوق حاصل ہوتے جو ایک آزاد عورت کو حاصل ہوتے ہیں ۔ ام ایمنؓ کو، جو آپؐ کی آزاد کردہ لونڈی [اور آپؐ کی خدمت گزار تھیں] آپؐ یا امہ (اے ماں) کہہ کر مخاطب فرماتے اور جب آپؐ ان کی طرف دیکھتے تو فرماتے یہ میرے اہل بیت میں سے ہے ۔ ان کی خدمت و سعادت کو دیکھ کر فرماتے: جو کسی جنتی خاتون کو دیکھنا چاہے تو وہ ام ایمن کو دیکھ لے ؛ آپؐ اس سے مزاح بھی فرماتے (ابن سعد : الطبقات، ۸ : ۲۲۳ ، ۲۲۴) ۔ آپؐ نے جب حضرت بریرہؓ کو آزاد کیا تو انھیں زمانۂ غلامی کے نکاح کے فسخ کا اختیار دیا ۔ حضرت بریرہؓ نے اس اختیار کو استعمال کیا اور جدائی اختیار کی ۔ ان کے شوہر کو ان سے بے حد محبت تھی ۔ روایات میں ہے کہ اس تفریق کے بعد وہ مدینۂ منورہ کی گلیوں میں پریشان حال پھرتے ۔ آپؐ کو اس کی حالت پر رحم آیا اور حضرت بریرہؓ سے ان کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہا تو بولیں : یا رسول اللہ ! کیا یہ آپؐ کا حکم ہے ؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں سفارش کرتا ہوں ۔ اس پر حضرت بریرہؓ نے جواب دیا : تو پھر مجھے اس کی ضرورت نہیں (البخاری: الجامع الصحیح، ۷ : ۶۱ ؛ الطبقات، ۸ : ۲۵۹، ببعد ؛ الاصابہ، ۴ : ۲۴۵) .

تعلیم نسواں : پرانے معاشروں میں عورت پر تعلیم کے دروازے بند تھے، لیکن آپؐ نے آغاز ہی سے اس کی طرف توجہ مبذول فرمائی ۔ آپؐ کا

marfat.com
Marfat.com

فرمان : طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِم ، یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے ۔ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حصول علم کسی ایک صنف سے مخصوص نہیں ، بلکہ یہ مرد و عورت دونوں کا حق ہے ۔ آپ نے خواتین کو دین کے احکام سیکھنے کے لیے مسجدوں میں آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ صحابیات کو جب کوئی مسئلہ در پیش ہوتا تو کاشانۂ نبوت میں حاضر ہوتیں اور آپ سے براہ راست یا بواسطۂ ازواج مطہرات استفادہ کرکے لوٹتیں ۔ اس معاملے میں خواتین انصار پیش پیش تھیں ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالٰی عنہا فرماتی ہیں کہ عورتوں میں انصاری عورتیں خوب ہیں کہ انھیں دین کی تعلیم میں حیا مانع نہیں ہوتی (مسلم : الجامع الصحیح ، ۱ : ۱۸۰) ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی مجالس میں خواتین بڑے شوق سے حاضر ہوتیں ۔ حضرت خولہ بنت قیس کہتی ہیں : میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا خطبہ جمعہ کے دن سب سے پچھلی صف میں بیٹھی ہوئی سنتی تھی (الاصابہ ، ۴ : ۲۸۶) اور اگر آپ کو کسی وقت یہ محسوس ہوتا کہ خواتین آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکیں یا ان تک بات پوری نہیں پہنچتی تو آپ اس کا اعادہ فرما دیتے تھے (البخاری: الجامع الصحیح ، ۱ : ۳۶ ، کتاب ۳ ، باب ۳۰) ، لیکن جب عورتوں کی اس طرح تسلی نہ ہوئی تو آپ نے ان کی درخواست پر ان کے لیے ایک علیحدہ دن مقرر کر دیا کتاب مذکور ، ۱ : ۳۷ ، کتاب ۳ ، باب ۳۶) ۔ ایسا بھی ہوتا کہ آپ اس خدمت پر اپنی طرف سے کسی نمائندے کو مقرر فرما دیتے ۔ حضرت ام عطیہ روایت کرتی ہیں کہ آپ جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے انصاری خواتین کو ایک گھر میں جمع کیا اور ہمارے پاس حضرت عمر بن الخطاب کو وعظ و نصیحت کے لیے بھیجا ۔ انھوں نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر سلام کیا اور کہا میں تمھارے پاس آپ کے قاصد کی حیثیت سے آیا ہوں ؛ حضور نے حکم دیا ہے کہ عیدین میں نوجوان اور حائضہ عورتیں بھی عید گاہ چلیں (مگر مؤخرالذّکر نماز میں شریک نہ ہوں) اور یہ کہ عورتوں پر جمعہ فرض نہیں ۔ اور آپ نے عورتوں کو جنازے کے پیچھے چلنے سے منع کیا (ابو داؤد : السنن، ۱ : ۳۰۶) ۔ آپ نے والدین اور شوہروں کو اس بات کی تلقین فرمائی کہ وہ اپنی بچیوں کو دین کے احکام سے روشناس کرائیں ۔ آپ نے اس صنف کو فکری اور عملی اعتبار سے آگے بڑھانے کی مختلف طریقوں سے ترغیب دلائی ، کہیں آپ نے ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنے والوں کے لیے جنت کی بشارت سنائی (البخاری : الجامع الصحیح ، ۳/۳۱ ، ۱ : ۳۶) اور کہیں فرمایا کہ مہر کے عوض بیوی کو چند سورتیں ہی سکھا دی جائیں، کتاب مذکور ، ۳ : ۴۲۳ ، کتاب ۶۷ ، باب ۳۲ ، ۴۳۲ ، باب ۵۰). آپ نے ضروری خیال فرمایا کہ یہ صنف زبانی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ کتابت سے بھی واقف ہو ۔ آپ نے حضرت شفاء رض بنت عبداللہ سے فرمایا کہ تم نے حضرت حفصہ رض کو جس طرح کتابت سکھائی ہے اس طرح چیونٹی کے کاٹنے کی دعا بھی سکھا دو (ابو داؤد : السنن ، ۴ : ۱۵ ؛ مشکوۃ المصابیح ، ۲ : ۵۱۷ ، حدیث ۴۵۶۱) .

آپ کی اسی توجہ اور تعلیم کا نتیجہ تھا کہ نہایت قلیل عرصے میں صحابیات کی ایک کثیر تعداد مختلف اسلامی علوم میں ماہر ہوگئی، حضرت عائشہ ، حضرت اُم سلمہ اور اُم ورقہ رض نے پورا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا (فتح الباری ، ۹ : ۴۷) ۔ حضرت ہند بنت اُسَید ، حضرت امّ ہشام بنت حارثہ اور

marfat.com
Marfat.com

امِ سعدؓ قرآن کریم کے بعض حصوں کی حافظہ تھیں؛ امِ سعدؓ تو قرآن مجید کا درس بھی دیتی تھیں (ابن سعد : الطبقات ، ۵ : ۵۸۶) - تفسیر میں حضرت عائشہؓ کو خاص درک حاصل تھا - صحابیات کی ایک کثیر تعداد نے آپؐ سے احادیث کی روایت بھی کی ہے؛ امہات المؤمنین کے علاوہ امِ عطیہؓ، اسماء بنت ابی بکرؓ اور فاطمہؓ بنت قیس کا شمار بھی کثیر الروایت صحابیات میں ہوتا ہے ۔

فقہ میں صحابیاتؓ کو خاصا درک حاصل تھا اور ان کی فہم و بصیرت نے لوگوں کی راہنمائی کا اہم فریضہ سر انجام دیا ہے؛ فقہ میں حضرت عائشہؓ کا درجہ تو اتنا بلند ہے کہ ان کا شمار مجتہدین صحابہ میں ہوتا ہے (الاستیعاب ، مع الاصابہ ، ۴ : ۳۴۸) .

علوم اسلامیہ کے علاوہ دیگر علوم میں بھی صحابیاتؓ کو عبور حاصل تھا؛ حضرت عائشہؓ کو طبّ، تاریخ عرب اور حضرت امِ سلمہؓ کو علم اسرار الدین میں بڑا ملکہ حاصل تھا - حضرت امِ سلمہؓ کی فراست و ذہانت کا اندازہ حدیبیہ کے اس واقعے سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب صلح حدیبیہ کی شرائط کی وجہ سے بد دلی پھیلی تو آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کو اپنے جانور ذبح کرنے کا تین بار حکم دیا ، لیکن وہ اتنے شکستہ خاطر تھے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ اٹھا؛ آپؐ حضرت امِ سلمہؓ کے پاس تشریف لائے اور واقعہ بیان کیا تو انھوں نے کہا: آپؐ باہر نکل کر خود قربانی کیجیے اور عملی نمونہ پیش فرمائیے؛ چنانچہ آپؐ نے ایسا ہی کیا - آپؐ کو دیکھ کر صحابۂ کرامؓ بھی اٹھے اور آپؐ کو دیکھ کر قربانی کی اور بال کٹائے (البخاری : الجامع الصحیح ، ۲ : ۲۳۴) - حضرت اسماءؓ بنت سکن اتنی عمدہ خطیبہ تھیں کہ ایک موقعہ پر آپؐ نے ان کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف فرمایا تھا (اسد الغابہ ، ۵ : ۳۹۸ تا ۳۹۹ ؛ الاصابہ ، ۴ : ۲۲۹ ؛ تہذیب التہذیب ، ۱۲ : ۳۹۹) - علم تفسیر میں حضرت اسماءؓ بنت عمیس کا شہرہ تھا (تہذیب ، ۱۲ : ۳۹۸ تا ۳۹۹ ؛ الاصابہ ، ۴ : ۲۲۵ ؛ اسد الغابہ ، ۵: ۳۹۵)؛ علم طبّ میں حضرت عائشہؓ کے علاوہ رفیدہ اسلمیہ (الاصابہ ، ۴ : ۲۹۶) ، ام مطاعؓ (الاصابہ ، ۴ : ۴۷۳)، امّ کبشہؓ (الاصابہ، ۴ : ۴۶۳) ، امّ عطیہؓ (الاصابہ ، ۴ : ۴۵۵) ، ربیعؓ بنت معوّذ (الاصابہ ، ۴ : ۲۹۳) کے نام قابل ذکر ہیں - روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رفیدہؓ کا خیمہ، جس میں سامان جراحی ہوتا تھا ، مسجد نبوی کے پاس تھا (الاصابہ ، ۴ : ۳۴۷ ؛ اسد الغابہ ، ۵ : ۴۵۳ ؛ الطبقات ، ۸ : ۲۹۱)- صحابیاتؓ کو زبان و ادب پر بھی پورا ملکہ حاصل تھا؛ اس صنف نازک نے شاعری کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا - صحابیاتؓ میں اروىؓ بنت عبدالمطلب اور ان کی بہن آمامہ، ہندؓ بنت حارث، سُعدٰی ، میمونہؓ وغیرہا شاعری میں زیادہ معروف ہیں اور حضرت خنساء بنت عمرو السلّمیہ تو چوٹی کی شاعرہ تھیں (ان تمام صحابیاتؓ کے لیے دیکھیے الاصابہ ، ج ۴ ؛ ابو داؤد : السنن ، ۴ : ۹۷) .

عورت میدان عمل میں : یہ حقیقت ہے کہ اسلام نے عورت کا حقیقی میدان عمل اس کا گھر قرار دیا ہے اور معاشی مشقت کے جھمیلوں سے حتی الامکان اسے دور رکھا ہے اور مرد کو عورت کا معاشی کفیل بنایا ہے ، اس لیے نہیں کہ وہ عورت سے معاشی استقلال یا حق عمل چھین لے ، کیوں کہ انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں میں اس کے اس حق کی ضمانت دے دی گئی ہے - مرد کو عورت کا کفیل اس لیے بنایا گیا کہ عورت اپنے فرائض یعنی گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی تربیت عمدگی سے کر سکے اور دوسری طرف

marfat.com
Marfat.com

مرد اپنی بھرپور قوتوں کے ساتھ زندگی کے مشقت طلب اعمال اور ضروریات زندگی کے حصول میں لگا رہے ، لیکن ہنگامی صورتوں میں عورت باہر کی عملی زندگی میں بھی حصّہ لے سکتی ہے ، [لیکن اس میں شدید ضرورت اور ہنگامی غیر معمولی حالات خاص طور سے مدنظر رہیں] ۔ آپ ﷺ نے بعض مخصوص حالات میں کسب معاش کی اجازت دے کر یہ بات واضح کر دی ہے کہ عورت اپنی ہنر مندی ، ذہانت اور فطانت سے دوسرے کام بھی سر انجام دے سکتی ہے ۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین نے کھیتی باڑی ، تجارت اور صنعت و حرفت میں بھی حصّہ لیا ہے ۔ مدینہ منورہ میں بعض انصاری عورتوں کا مشغلہ کاشتکاری تھا (البخاری : الجامع الصحیح ، ۷ : ۴۵) ۔

بعض صحابیات ؓ تجارت کے پیشے سے بھی وابستہ تھیں ؛ امّ المؤمنین حضرت خدیجہ ؓ کی تجارت وسیع پیمانے پر مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی ؛ قیلہ ؓ ام انمار ، حضرت اسماء ؓ بنت مخربہ ، خولہ ، مُلَیکہ ؓ وغیرہا عطر کی تجارت کرتی تھیں (ابن سعد : الطبقات ، ۸ : ۳۰۰ ، ۳۱۱ ؛ الاصابہ ، ۴ : ۳۱۸ ، ۳۲۶ ؛ اسد الغابہ ، ۵ : ۴۳۲ ، ۵۴۸) ۔ صحابیات ؓ مختلف صنعتوں سے بھی آگاہ تھیں ؛ امّ المؤمنین حضرت سودہ ؓ کے بارے میں ہے کہ وہ کھالوں کی دباغت کا کام جانتی تھیں (اسد الغابہ ، ۵ : ۴۴) ؛ حضرت زینب ؓ امور دستکاری میں ماہر تھیں (اسد الغابہ ، ۵ : ۴۶۵) ؛ ایک اور صحابیہ حضرت ریطہ ؓ [بنت عبداللہ] بھی دستکاری میں مہارت رکھتی تھیں (ابن سعد : الطبقات ، ۸ : ۲۹۰) ۔

دینی خدمات : یہ بھی حقیقت ہے کہ خواتین نے اپنے دین کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں ۔ حضرت سمیّہ ؓ والدۂ عمار بن یاسر ؓ کو راہ حق میں ثابت قدم رہنے کی پاداش میں ابو جہل نے سخت تکالیف کا نشانہ بنایا اور بالآخر وہ راہ حق میں شہید ہو گئیں (الاصابہ ، ۴ : ۲۲۱) ۔

مذہبی خدمات کے سلسلے میں سب سے اہم خدمت جہاد ہے ۔ خواتین نے [غیر معمولی اور شدید ضرورت کے وقت] جس عزم و حوصلے سے یہ خدمت انجام دی ہے اس کی نظیر ملنی مشکل ہے ۔ تاہم بیرون خانہ عورت کی سرگرمیوں کی آپ ﷺ نے ہمیشہ حوصلہ شکنی فرمائی اور گھر کو لازم پکڑنے کی تلقین کی ۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ ؓ صدیقہ نے جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کی تو فرمایا کہ تمہارا جہاد حج ہے (البخاری : الجامع الصحیح ۳ : ۲۴ ؛ ۴ : ۳۹) ۔ آپ ﷺ نے ایک اور موقع پر یہ حقیقت بھی واضح کر دی تھی کہ عورت کا شوہر کی خدمت اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے کا ثواب مردوں کے جہاد اور باجماعت نماز میں شرکت سے بڑھ کر ہے (اسد الغابہ ، ۵ : ۳۹۸) ، لیکن بوقت ضرورت آپ ﷺ نے خواتین کو جہاد میں شرکت کی اجازت دی اور اس شرکت کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پیشگی اجازت لینی ضروری تھی ۔ اگر آپ ﷺ کسی عورت کے مزاج ، اس کی گھریلو مصروفیات اور حفاظت کے تمام انتظامات سے مطمئن ہوتے تو اس کو شرکت کی اجازت دے دیتے تھے ۔ جنگ احد میں جس وقت کفار نے عام حملہ کر دیا تھا اور آپ ﷺ کے ساتھ چند جاں نثار رہ گئے تھے تو اس افراتفری میں حضرت ام عُمارہ بنت کعب النّجاریہ ؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس پہنچیں اور سینہ سپر ہو گئیں ۔ کفار جب آپ ﷺ کی طرف بڑھتے تو حضرت ام عمارہ ؓ ان کو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں اور اس طرح وار کو روکنے کی کوشش میں خود شدید زخمی ہوئیں ۔ آپ ﷺ نے اس موقع پر ان کی شجاعت کی تعریف فرمائی (ابن ہشام : السیرۃ ،

marfat.com
Marfat.com

۲ : ۸۶ ، ۸۷ ؛ الاصابہ ، ۴ : ۳۵۷ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ج ۸) ۔ غزوۂ خندق میں حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب نے جس پامردی سے ایک یہودی کو قتل کیا اور قلعہ میں موجود عورتوں کی حفاظت کی وہ نہایت حیرت انگیز ہے ؛ ان کے متعلق غزوۂ احد [رک بہ احد] میں بھی دشمن پر نیزے سے حملہ کرنے کی شہادت موجود ہے (ابن ہشام : سیرة ، ۳ : ۲۳۹ ؛ الاصابہ ، ۴ : ۳۴۰ ؛ اسد الغابہ ، ۵: ۴۹۳)۔ غزوۂ حنین [رک بہ حنین] میں حضرت ام سلیمؓ کا یہ حال تھا کہ وہ خنجر لیے پھرتی تھیں ، تاکہ جہاں دشمن دین نظر آئیں ان کا پیٹ چاک کر دیں (مسلم ، ۵ : ۱۹۶ ؛ الاصابہ ، ۴ : ۴۴۲) ۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اپنے ساتھ حضرت ام سلمہؓ اور دیگر انصاری عورتوں کو جنگوں میں لے جاتے تھے اور وہ سپاہ اسلام کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمت انجام دیتی تھیں (مسلم ، ۵ : ۱۹۶ ؛ ابوداؤد : السنن ، ۳ : ۲۶) ۔

کعیبہؓ بنت سعد [سعید] کے بارے میں روایت ہے کہ وہ آپؐ کے ساتھ غزوۂ احزاب اور غزوۂ خیبر میں شریک ہوئیں ۔ جنگ خندق میں جب حضرت سعدؓ بن معاذؓ زخمی ہوئے تو ان کا علاج بھی وہی کرتی رہیں (ابن سعد : الطبقات ، ۸ : ۲۹۱) ۔ حضرت ربیعؓ بنت معوذ بھی آپؐ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوتیں ؛ مجاہدوں کو پانی پلانا ، جنگ میں کام آنے والوں اور زخمیوں کو مدینہ منورہ پہنچانا ان کے ذمے تھا (البخاری ، ۴ : ۴۱).

حضرت ابو طلحہؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے جنگ احد کے موقعہ پر حضرت عائشہؓ اور ام سلیطؓ کو زخمیوں کو پانی پلاتے دیکھا (مسلم ، ۵ : ۱۹۷ ؛ البخاری ، ۵ : ۱۲۵ ، ۱۲۸)۔ غزوۂ احد کے موقعہ پر حضرت فاطمہؓ نے بھی یہی خدمات سر انجام دیں اور جب آپؐ زخمی ہوئے تو حضرت فاطمة الزہراءؓ نے ہی زخم کو چٹائی کی راکھ سے بھرا تھا (البخاری ، ۵ : ۱۳۰) ۔ حضرت حمنہؓ بنت جحش بھی آپؐ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئیں ؛ جنگ احد میں پانی پلانا اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا ان کے ذمے تھا (الاصابہ ، ۴ : ۲۶۶) ۔ ام زیادؓ اور چند دوسری عورتوں نے غزوۂ خیبر [رک بہ خیبر] کے موقعے پر چرخہ کات کر مسلمانوں کی مدد کی ؛ وہ میدان جنگ سے تیر اٹھا کر لانے اور مجاہدین کو ستو پلانے پر مامور تھیں (اسد الغابہ ، ۵ : ۴۵۱) .

بعض خواتین نے دین حق کی مدافعت شمشیر و سناں سے کی ، جب کہ بعض نے یہ فریضہ اپنی زبان و بیان اور درہم و دینار سے ادا کیا ۔ آرویؓ بنت عبدالمطلب کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مدد کرنے اور آگے بڑھنے کی ترغیب دلاتی تھیں (الاستیعاب ، ۴ : ۲۲۱) ؛ ہند بنت عتبہ نے حضرت حمزہؓ اور دیگر شہدائے احد کے خلاف اشعار کہے، تو ہندؓ بنت ابان نے ان کا اسی لہجے میں جواب دیا (الاصابہ ، ۴ : ۴۰۷) ۔ آپؐ نے جنگ میں شامل عورتوں کو مال غنیمت میں سے حصہ بھی دیا (مسلم، ۵ : ۱۹۷) .

حقیقت تو یہ ہے کہ آپؐ نے طبقۂ نسواں کو ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے حقوق عطا فرمائے ، [لیکن ظاہر ہے کہ جہاں حقوق کا سوال آتا ہے وہاں فرائض کا ذکر بھی لازم ہے ، جہاں رعایتوں اور آزادیوں پر زور دیا جاتا ہے وہاں ان قیود و شرائط کا لحاظ بھی ضروری سمجھا گیا ہے جو رعایتوں کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں، مگر آج کل ان پر نظر نہیں رکھی جاتی] .

مآخذ : (۱) محمد فؤاد عبدالباقی : معجم المفہرس

marfat.com
Marfat.com

لالفاظ القرآن الکریم : (۲) ابن کثیر : تفسیر ، مطبوعۂ قاہرہ ، ۱۳۴۵ھ ، بمواضع کثیرہ : (۳) البخاری : الجامع الصحیح ، قاہرہ ۱۳۴۵ھ [و لائیڈن] ؛ (۴) مسلم بن حجاج القشیری : الجامع الصحیح ، قاہرہ ۱۳۳۴ھ ؛ (۵) الترمذی : الجامع (یا السنن)، مع شرح ابن العربی، مطبوعۂ قاہرہ ، ۱۳۵۲ھ ؛ (۶) ابو داود : السنن ، قاہرہ ۱۹۵۰ء ، (۷) الدارمی، السنن، دمشق، ۱۳۴۹ھ؛ (۸) محمد بن عبداللہ خطیب التبریزی : مشکوٰۃ المصابیح ، مطبوعۂ دمشق ، (۳ جلدیں) : (۹) ابن ہشام : السیرۃ النبویہ، قاہرہ ۱۹۳۶ء (۴ جلدیں) ؛ (۱۰) ابن سعد : کتاب الطبقات الکبیر ، بیروت ۱۹۶۰ء (۸ جلدیں) ؛ (۱۱) ابن حجر العسقلانی : الاصابہ فی تمییز الصحابۃ ، قاہرہ ، ۱۳۵۸ھ ؛ (۱۲) وہی مصنف : تہذیب التہذیب ، مطبوعۂ حیدر آباد (دکن) : (۱۳) ابن عبدالبر: الاستیعاب فی اسماء الاصحاب (مع الاصابہ)، مطبوعۂ قاہرہ ؛ (۱۴) ابن الاثیر : اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ، تہران ؛ (۱۵) ہنری مارٹن : فطرت نسوانی ، اردو ترجمہ از عبدالسلام ندوی ، منڈی بہاؤ الدین ۱۹۳۳ء ؛ (۱۶) Will Durant : *Our Oriental Heritage* ، مطبوعۂ نیویارک ، ۱۹۵۴ء ؛ (۱۸) Steward Easton : *The Heritage of Ancient World* .

(جمیلہ شوکت [و ادارہ])

معجزات نبوی : معجزات (واحد معجزۃ) ، مادہ (ع - ج - ز) عَجَز یَعْجِزُ عَجْزاً؛ عجز کے لغوی معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانے ، یا اس کے اس وقت حاصل کرنے کے ہیں جب کہ اس کے حصول کا وقت گزر چکا ہو ، لیکن عام طور پر اس کا استعمال کسی کام کے کرنے سے قاصر رہنے پر ہوتا ہے اور یہ القدرۃ کی ضد ہے ؛ قرآن کریم میں ہے : اَعَجَزْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِثْلَ ہٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَۃَ اَخِیْ ج (۵ [المآئدۃ] : ۳۱)، یعنی میں اس بات سے بھی قاصر رہا کہ اس کوّے کی طرح اپنے بھائی کے مردہ جسم کو چھپا سکتا (دیکھیے الراغب الاصفہانی : مفردات فی غریب القرآن ، بذیل مادہ)۔ اسی مادے سے معجزۃ ہے (اصل میں معجِز تھا ، حرف تا ء یا تو مبالغے کے لیے ہے اور یا صفت محذوف ہے (ابن حجر العسقلانی : فتح الباری شرح صحیح البخاری ، مطبوعہ لاہور ۱۳۰۱ھ/۱۹۸۱ء ، ۶ : ۵۸۱ تا ۵۸۲) اور اس سے مراد انبیا علیہم السلام سے صادر ہونے والے وہ خارق عادت افعال ہیں ، جن کا اہل زمانہ معارضہ نہ کر سکیں (حوالۂ مذکور) ۔ علامات (یا آیات) نبوت اور معجزات میں فرق یہ ہے کہ معجزات فقط وہ ہوتے ہیں جن کے ساتھ نبی کی طرف سے مخالفین کو تحدی (چیلنج) بھی ہو ، مثلاً یوں : اگر میں یہ کام کر دکھاؤں تو میں سچا ورنہ جھوٹا ہوں گا ، جب کہ آیات و علامات کے لیے تحدی کا ہونا شرط نہیں ہے۔ گویا ان میں باہم عام خاص کی نسبت ہے (حوالہ مذکور) .

قرآن حکیم میں معجزے کا اس کے اصطلاحی مفہوم میں استعمال مفقود ہے (لغوی معنی کے استعمال کے لیے دیکھیے ۹ [التوبہ] : ۲) ؛ قرآن حکیم میں اس کے بجائے آیات (واحد آیۃ) کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے ، جو معجزہ کے لفظ سے زیادہ وسعت و عمومیت کی حامل ہے (دیکھیے بالا) .

ہر شخص کی زندگی میں کم و بیش ایسے حالات ضرور رونما ہوتے ہیں جن کی انسان اپنی تمام تر کاوش کے باوجود کوئی توجیہ نہیں کر سکتا : حادثے سے بال بال بچ جانا ، مہلک بیماری سے نجات پا جانا، موت کے منہ سے بچ کر چلے آنا ، اچانک کسی غیر متوقع خوشی کا سامنا ہو جانا ، یا دفعۃً حالات کا کوئی غیر متوقع رخ اختیار کر لینا ، وغیرہ ۔ ایسے مواقع پر اکثر و بیشتر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تو کوئی معجزہ ہو گیا ہے ورنہ یہ توقع تو نہ تھی ؛ لیکن انبیا علیہم السلام کو دعوائے نبوت کے بعد عطا کیے جانے والے معجزات اس سے قطعی مختلف اور اس سے

marfat.com
Marfat.com

کہیں زیادہ بلند سطح کے حامل ہوتے ہیں ۔ یہ کہنا درست نہیں کہ معجزات نظام کائنات کو مختل کر دینے کا نام ہے ۔ دراصل نظام کائنات کے جس تصور سے ہم آشنا ہیں وہ قطعی اور مکمل تصور ہرگز نہیں ہے ، بلکہ یہ تصور ابھی معرض تحقیق میں ہے ۔ کچھ بھی ہو ، انسان ابھی کائنات کے تمام اسرار و غوامض کو قطعی طور پر نہیں جان سکا ۔ اسی بنا پر خود اس کی اپنی ذات سے متعلق بھی ابھی بہت سے مسائل تصفیہ طلب ہیں ۔

معجزات در حقیقت قانون قدرت کے مطابق ہی ہوتے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ قدرت کا اعلٰی و ارفع قانون ہوتا ہے ، جس کے پس منظر اور پیش منظر کو جاننا ہمارے بس میں نہیں ہوتا (شبیر احمد عثمانیؒ: معجزات و کرامات، مطبوعہ لاہور، ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء ، ص ۸۱ تا ۸۷) ۔ ان معجزات کو انبیاے کرام کی روحانی و معنوی تائید کی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔ ان کے لیے (حیرت انگیز طور پر) فطرت کے بعض قوانین بدل دیے جاتے ہیں یا ان کی صورت تبدیل کر دی جاتی ہے ۔ ان کی عنداللہ مقبولیت کو واضح کرنے کے لیے ان کے ہاتھوں سے غیر معمولی کارنامے انجام پاتے ہیں ۔ اسی بنا پر کم و بیش معجزے کا تصور عالمگیر حیثیت رکھتا ہے اور ہر مذہب نے اسے اپنی اساس قرار دیا ہے ۔ حضرت نوحؑ کا طوفان ، حضرت ہودؑ کی بد دعا پر قوم عاد کی تباہی ، ناقۂ صالح [رک بہ صالحؑ] کی کونچیں کاٹنے پر قوم ثمود کی بربادی ، قوم لوطؑ کی نافرمانی پر نزول عذاب ، حضرت ابراھیمؑ [رک باں] پر آتش نمرود کا سرد ہونا ، ان کی نسل میں برکت کا ہونا ، حضرت موسٰیؑ [رک باں] کی بددعا پر فرعون مصر اور اس کے حواریوں پر ہلکے ہلکے عذابوں کے بعد غرق کی تباہی کا نازل ہونا ، ان کے ہاتھ کا سفید (یدبیضاء) اور ان کے عصا کا سانپ بن جانا ، حضرت عیسٰیؑ [رک باں] کا مُردوں کو زندہ کرنا ، بیماروں کو ہاتھ پھیر کر صحت یاب کر دینا ، اندھوں کو بینائی کا مرحمت ہونا ، یہ سب تائید الٰہی کے ایسے مظاہر ہیں جو تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں ، تاہم جن مذاہب میں معجزات کو اساس مذہب کی حیثیت دی گئی ، وہ فی الواقع درست نہ تھیں ۔

قرآن کریم کے مطابق معجزات کسی آسمانی مذہب کی تائید و حمایت کے لیے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ابتدائی اور اساسی اہمیت عقل و فکر کو اور اس پیغمبر کی سیرت و کردار اور اس کی تعلیمات کو حاصل ہوتی ہے ۔ اسی بنا پر قرآن حکیم میں معجزات کی طلب پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا اور عقل و خرد سے کام لینے کی ضرورت پر زور دیا گیا، فرمایا : اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴ [النسآء] : ۸۲) ، یعنی یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے ، اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے ۔ یہودیوں کے انکار رسالت کے لیے آتشیں معجزہ پیش نہ کرنے کے عذر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا : قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳ [آل عمران] : ۱۸۳)، یعنی اے پیغمبر ان سے کہ دو کہ مجھ سے پہلے کئی پیغمبر تمھارے پاس کھلی ہوئی نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتابیں لے کر آئے اور وہ (آتشیں معجزہ) بھی جو تم کہتے ہو ، تو اگر تم سچے ہو تو تم نے ان کو قتل کیوں کیا ۔ قریش مکہ کے مطالبات کی ایک طویل فہرست پیش کرنے پر بطور تبصرہ ارشاد فرمایا : قُلْ سُبْحٰنَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۱۷ [بنی اسرآئیل] : ۹۳) ، یعنی آپؐ کہ دو کہ میرا پروردگار پاک ہے ، میں تو صرف پیغام پہنچانے والا انسان ہوں ۔ ایک دوسرے موقع پر عجیب و غریب اور بے سروپا

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

سوالات کرنے والوں کو متنبہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓى اِلَیَّ (٦ [الانعام] : ٥٠)، یعنی آپ کہ دیجیے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالٰی کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں ؛ میں تو صرف اس حکم پر چلتا ہوں، جو مجھے خدا کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے - ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا : وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ ؕ (٦ [الانعام] : ٣٥)، یعنی اور اگر ان کی روگردانی آپ؛ پر شاق گزرتی ہے تو اگر طاقت ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالو، یا آسمان پر سیڑھی (تلاش کر لو) پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لے آؤ - ان تمام مقامات سے اس مضمون کی شہادت ملتی ہے کہ خدا تعالٰی کو معجزات کا طلب کرنا اور ان کو مدار ایمان قرار دینا قطعی پسند نہ تھا .

اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ قرآن حکیم نے سرے سے معجزات کے وجود کا ہی انکار کر دیا ہے۔ خود قرآن حکیم سابقہ انبیا؛ کے علاوہ آپ؛ کے متعدد معجزات کا بھی ذکر کرتا ہے اور متعدد مقامات پر آپ؛ کے معجزات کی واضح صراحت کی گئی ہے، سورۂ قمر میں ہے : وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (٥٤ [القمر]: ٢)، یعنی اور اگر (کافر) کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک ہمیشہ کا جادو ہے - ایک اور مقام پر فرمایا : وَاِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا (٧ [الاعراف] : ١٤٦)، یعنی اگر یہ سب نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں - ایک اور جگہ ارشاد ہے: وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ (٣٠ [الروم] ٥٨)، یعنی اور اگر تم ان کے سامنے کوئی نشانی پیش کرو تو کافر کہ دیں گے کہ تم تو جھوٹے ہو - ان تمام مقامات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معجزات کی طرف اشارہ ہے .

محولہ بالا تمام مقامات میں ہر جگہ آیت سے مراد معجزہ قرآن نہیں ہو سکتا، کیونکہ قرآن کو پڑھا تو جاتا ہے، دیکھا نہیں جاتا - جب کہ محولہ بالا آیات میں نشانی دیکھنے اور اس کے باوجود اس پر ایمان نہ لانے کا ذکر ہے (نیز دیکھیے ٢١ [الانبیآء] : ٣ ؛ ٣٧ [الصّٰفّٰت] : ١٤ تا ١٥ ؛ ٤٣ [الزخرف] : ٣٠ ؛ ٥٢ [الطور] : ٢٩ ؛ ٦١ [الصّفّ] : ٦ ؛ نیز دیکھیے نیچے) .

قرآن حکیم کا بڑا مقصد اس حقیقت کو ذہن نشین کرنا ہے کہ معجزات سے کسی قوم یا ملت کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات ان کی کثرت معاندانہ و باغیانہ روش کا موجب بن جاتی ہے - جن لوگوں نے ایمان قبول کرنا ہوتا ہے، ان کے لیے عقل و بصیرت کی نشانی ہی کافی ہے اور جنھوں نے ہدایت قبول ہی نہ کرنی ہو، انھیں چاند کو دو نیم کر کے دکھانے سے بھی ہدایت نہیں مل سکتی .

امام غزالی؛ اس قرآنی طرز فکر کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اخلاق حمیدہ، آپ؛ کی سیرت و کردار، آپ؛ کا حسن تدبیر سیاست و معاملات، آپ؛ کا مختلف المزاج لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا، آپ؛ کے ارشاد فرمودہ قوانین شریعت، معارف و حقائق اور کلمات طیبات سبھی آپ؛ کی نبوت و رسالت کا ناقابل تردید ثبوت بہم پہنچاتے ہیں، کیونکہ اتنے عظیم الشان اہمیت کے حامل امور کسی متنبی سے اور بغیر تائید الٰہی ہرگز انجام نہیں پا سکتے اور اس پر مستزاد یہ کہ آپ؛ اُمّی محض تھے !

بن ناہ

marfat.com
Marfat.com

آپؐ نے نہ تو اپنے شہر میں تعلیم حاصل کی اور نہ ہی بغرض تعلیم کسی دوسرے شہر کا سفر اختیار کیا ۔ یہ ظاهری امور آپؐ کی صداقت و حقانیت کے لیے کافی تھے ، لیکن بعض طبائع ظاہری امور کے ساتھ ساتھ باطنی امور میں بھی تائید الٰہی کی طالب ہوتی ہیں ان کے لیے کچھ باطنی تائیدات (یعنی معجزات) کا ذکر بھی کیا جاتا ہے (احیاء علوم الدین، ۲ : ۳۳۱ ، کتاب آداب المعیشة و اخلاق النبوة ، مطبوعۂ قاهره ۱۳۵۲ھ ، الزبیدی : اتحاف شرح احیاء العلوم ، ۷ : ۱۹۸) ۔

امام موصوف دوسری جگہ (المنقذ من الضلال، ص ۵۵ تا ۵۹ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء) اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کی نسبت یہ شبہہ ہو کہ یہ نبی ہے یا نہیں تو اس کی تصدیق صرف اس کے احوال کی معرفت سے ہی ہو سکتی ہے ؛ اس معرفت کے دو طریقے ہیں: یا تو ذاتی مشاہدے سے ہو ، جیسے صحابہؓ کو تھی اور یا خبر متواتر سے ہو ، جیسے اب عام لوگوں کو ہے ۔ اب جس شخص کو نبوت کے آثار و کیفیات کی ذوق شناسی ہوگی وہی مائل بہ تصدیق ہو گا۔ دوسرا نہیں ، مثلاً اگر فن طبابت سے کچھ مس ہو تو تبھی کسی طبیب کو دیکھ کر اس کی طبابت میں مہارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح جالینوس کی طبابت اور امام شافعیؒ کے تفقہ کا علم ان کی سوانح اور تصنیفات کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے، و علٰی ھذا القیاس ۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم گو ہم میں موجود نہیں، مگر آپؐ کی سیرت طیبہ اور شریعت و تعلیمات موجود ہیں ، ان کے مطالعے سے ہر شخص آپؐ کی نبوت و رسالت کی تصدیق کر سکتا ہے ۔

امام الرازی نے بھی قریب قریب یہی موقف اختیار کیا ہے ۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ نبوت کے ماننے والوں کی دو اقسام ہیں : ایک وہ جو معجزے کو نبوت کی دلیل ٹھہراتے ہیں ۔ یہ جمہور اہل مذاہب کا مسلک ہے ؛ دوم وہ جو کہتے ہیں کہ پہلے ہمیں خود غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے کہ فی نفسہٖ صداقت و راستی کیا ہے ۔ اس کے بعد ہم ایک شخص کو دعوائے نبوت کے بعد لوگوں میں وعظ و نصیحت کرتا ہوا پاتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس کی دعوت مؤثر ہے اور اس کے ذریعے مختلف اشخاص کو هدایت نصیب ہو رہی ہے تو ہم یقین کر لیں گے کہ یہ سچا پیغمبر ہے ! یہ طریقہ قریب العقل اور قریب الشہادت ہے ۔ امام موصوف کے مطابق اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسانیت کا کمال قوت علمی و عملی کی تصحیح ، تکمیل اور تزکیہ ہے ۔ اس قوت کے لحاظ سے انسانوں کے تین طبقے ہیں : ایک وہ جو ناقص ہیں ، یعنی جن کی نظری و عملی دونوں قوتیں کمزور ہیں ، یہ عوام الناس ہیں ؛ دوسرے وہ جو خود کامل ہیں ، مگر دوسروں کو کامل نہیں کر سکتے ، یہ اولیا و صلحا ہیں ؛ سوم وہ جو خود بھی کامل ہیں اور ان کی تربیت دوسروں کو بھی کامل بنا دیتی ہے ، یہ انبیا اور رسول ہیں ۔ اس کمال و نقص کے ہزاروں درجے متفاوت ہیں ، انھی کے لحاظ سے ان کی قوت و نقص کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ ان کی علمی قوت کے سامنے تمام مقدمات بدیہی ہوتے ہیں اور جملہ معارف الٰہی پر ان کو عبور حاصل ہوتا ہے اور ان کی قوت عملیہ اس عالم جسمانی میں تصرفات کرتی ہے اور یہی معجزات کا مقصد بھی ہے ۔ اس قوت علمی و عملی کے کمال کے ساتھ یہ لوگ ناقصوں کو اپنے فیض صحبت سے کامل کر دیتے ہیں ؛ یہی ان کی نبوت کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے ۔ آگے چل کر امام موصوف اسی طریقے کو قرآن حکیم میں اختیار کردہ اثبات نبوت کا طریقہ قرار دیتے

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

ہیں (الرازی : مطالب عالیہ ، ضمیمہ در شبلی نعمانی : علم الکلام ، اور الکلام ، ص ۳۲۸ تا ۳۳۷ ؛ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۴ء)۔

امام الرازیؒ کا معجزات کو انبیا علیہم السلام کی قوت عملیہ کے عملی تصرفات قرار دینا محل نظر ہے ، کیونکہ قرآن حکیم بار بار اس ایک نکتے پر زور دیتا ہے کہ کسی بھی معجزے یا نشان کا پیش کرنا انبیا کے بس سے باہر ہوتا ہے ، بلکہ بعض اوقات ان کی خواہش پر بھی معجزے کا ظہور نہیں ہوتا (دیکھیے (۶ [الانعام]: ۳۵)؛ اس کے برعکس معجزات یا خوارق عادت کا ظہور محض اور محض اللہ تعالی کے فضل و کرم کا نتیجہ ہوتا ہے ، اسی بنا پر قرآن حکیم میں انبیا کے معجزات کے ذکر کے موقع پر ایک جگہ باذن اللہ (۳ [آل عمران] : ۴۹) اور دوسری جگہ باذنی (۵ [المائدة] : ۱۱۰) کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے .

سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو قدرت کی طرف سے جو معجزات عطا ہوے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ امام بیہقی ، اور احناف میں سے علامہ الزاہدی نے معجزات نبوی کی تعداد ایک ہزار ، امام نووی ، (صاحب شرح صحیح مسلم) نے بارہ سو ، اور بعض نے تین ہزار تک بیان کی ہے (ابن حجر العسقلانی : فتح الباری ، ۶ : ۶۸۳)۔ شیخ جلال الدین السیوطی نے الخصائص الکبری میں ایک ہزار معجزات شمار کیے ہیں ، ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو مستند اور معتبر رواۃ سے منقول ہوے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا بھی اس زمانے کے کسی آدمی سے انکار ثابت نہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر روایات معجزات کو تواتر کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے ، اگرچہ ان میں سے بعض روایات طریقۂ احاد سے مروی ہیں (کتاب مذکور ، ص ۵۸۲ ببعد) .

معجزات نبوی کی پھر مزید دو اقسام بیان کی گئی ہیں : (۱) وہ معجزات جن کے معارضے پر لوگ قادر تھے ، مگر بوجوہ نہ کر سکے ، مثلاً یہود کے لیے تمناے موت ، یا تمام دنیاے کفر کے لیے قرآن حکیم کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثل پیش کرنے کا حکم (۲ [البقرة] : ۲۳) ؛ (۲) دوسری قسم ان معجزات کی ہے کہ جن کا معارضہ کرنا کسی انسان کے بھی بس کا نہیں ، مثلاً انگلیوں کے درمیان سے پانی کا رواں ہونا ، تھوڑے کھانے کا زیادہ افراد کے لیے کافی ہونا ، وغیرہ (قاضی عیاض : الشفا بتعریف حقوق المصطفی ، مطبوعہ بریلی (بدون تاریخ) ، ص ۱۲۲)۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہاتھوں پر یہ دونوں اقسام کے معجزات صادر ہوے ، جو آپؐ کی تائید ایزدی کا بین ثبوت ہیں۔ ایک اور اعتبار سے بھی معجزات دو اقسام پر منقسم ہیں : (۱) اول وہ جن کا علم کسی قطعی ذریعۂ علم سے ہوا ہے ، مثلاً قرآن کریم اور اس میں مذکور معجزات ؛ ان کا انکار کرنا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اسلام کے انکار کے مترادف ہے اور ایسے ہی ہے گویا مکمل قرآن کا انکار کر دینا یا کسی اسلامی رکن کا انکار کر دینا ؛ (۲) دوسری قسم کے معجزات وہ ہیں جو اس درجہ معتبر اور مستند تو نہیں ، مگر وہ ثابت ضرور ہیں ؛ ان کی آگے پھر متعدد اقسام ہیں : (الف) مشتہر اور منتشر ، یعنی وہ معجزات جن کے انفرادی اور جزئی واقعات تو خبر احاد سے بہم ہوے ہوں مگر مجموعی طور پر اس قسم کے واقعات کی بکثرت موجودگی کا پتا چلتا ہو اور اس نوع کے واقعات کو تعداد کثیر نے نقل کیا ، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی خبر خوب پھیل چکی ہے ، مثلاً دست مبارک کی انگلیوں سے

marfat.com
Marfat.com

چشمۂ آب کا جاری ہونا وغیرہ ، مشتہر اور منتشر معجزات کہا جاتا ہے ؛ (ب) وہ معجزات جنھیں چند ایک آدمیوں نے نقل کیا ہے اور اسی بنا پر وہ حصہ اول کی طرح مشہور اور مشتہر تو نہیں ، تاہم اگر ان روایات کو بالمعنی جمع کیا جائے تو راویوں کی تعداد کثیر ہو جاتی ہے ۔ یہ دونوں اقسام قطعی الدلالۃ ہوتی ہیں ، ان میں سے کسی کا انکار نقص ایمان پر دال ہوتا ہے ؛ (ج) وہ معجزات جو محض خبر احاد سے ثابت ہوے ہوں ؛ ان میں سے بھی بیشتر ، راوی کے منفرد ہونے کے باوجود ، اپنے رواۃ کی ثقاہت و دیانت کی بنا پر ، واضح الثبوت ہوتے ہیں ۔ ان کا انکار بھی درست نہیں ہوتا (قاضی عیاض: الشفا ، ص ۱۲۳ تا ۱۲۵ ؛ ابن حجر : فتح الباری ، ۶ : ۵۸۴) .

معجزات کی تقسیم عقلی اور نقلی اعتبار سے بھی کی گئی ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ امتیاز اور تفوق بھی حاصل ہے کہ آپ کو دونوں قسم کے معجزات مرحمت فرمائے گئے : (۱) عقلی معجزات سے مراد وہ خوارق عادت امور ہیں جن کے فہم و ادراک میں عقل کو دخل ہوتا ہے ؛ (۲) حسی معجزات وہ معجزات ہیں جن کا ادراک حواس سے کیا جاتا ہے ۔ تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) عقلی معجزات : سیرت نگاروں نے حسب ذیل خوارق عادت امور کو عقلی معجزات شمار کیا ہے : (۱) وحی الٰہی اور خدا تعالٰی اور ملائکہ سے شرف ہم کلامی : قرآن کریم اور تواتر احادیث سے یہ امر ثابت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ آپ پر وحی نازل ہوتی تھی [رک بہ وحی ؛ (نیز محمد فؤاد عبدالباقی : معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم ، مطبوعہ قاہرہ ، بذیل مادہ)] ۔ وحی ایک قسم کی خداوند تعالی سے ہم کلامی ہے ، جو عام طور پر کسی فرشتے کی وساطت سے ہوتی ہے ۔ بعض انبیا کو براہ راست بھی خدا تعالٰی سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے (۲ [البقرۃ] : ۲۵۳ ؛ ۴ [النساء] : ۱۶۴) ۔ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ شرف کئی بار حاصل ہوا ، بالخصوص شب معراج میں (علی حسب الاقوال: دیکھیے قاضی عیاض : الشفاء ، ذکر معراج) جہاں بقول بعض عبد و معبود کے درمیان سے ہر حجاب اٹھا لیا گیا تھا ، اس لیے فرمایا : فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی (۵۳ [النجم] : ۱۰) ، یعنی پھر خدا نے اپنے بندے کی طرف جو چاہا وحی کی ۔ اس کے علاوہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک خدا تعالٰی کا پیغام حسب ذیل صورتوں میں پہنچتا تھا : (۱) رویاے صادقہ؛ (۲) نفث فی الروع یا القا فی القلب (دل میں کسی پیغام کا پھونکنا یا ڈالنا ؛ (۳) صلصلۃ الجرس (گھنٹی کی طرح کی آواز) ؛ (۴) فرشتے کا اپنی اصلی شکل و صورت میں نظر آ جانا (ابن القیم : زادالمعاد ، ۱: ۷۸ تا ۸۰، مطبوعۂ کویت ، ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء).

آخری صورت کے مطابق فرشتے بعض اوقات صحابہ کرام کو بھی نظر آتے تھے (دیکھیے مثلاً مسلم : الصحیح ، حدیث ۹۸) ، تاہم اس کی انتہائی صورت یہ تھی کہ فرشتہ اپنی اصلی شکل و صورت میں حضور کو نظر آتا تھا (مسلم، حدیث ۷۷ ؛ الترمذی، حدیث ۳۲۷۷؛ زاد المعاد ، ۱: ۸۰) ۔ اللہ تعالٰی سے اور فرشتوں سے ہم کلام ہونا (جس کی شہادت انتہائی معتبر ذرائع سے ملی ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عظیم عقلی معجزہ ہے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کمالات علمیہ : خداوند قدوس کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو علمی اور عملی محاسن

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

وکمالات مرحمت ہوئے وہ دنیا کے کسی بھی انسان کو نصیب نہیں ہو سکے۔ علمی کمالات کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ علماے اسلام کی تحقیق و کاوش کا صدیوں مرکز بنا رہا اور ماہرین اپنی طویل عمروں میں بھی ان کے حقائق اور رموز و اسرار کو کماحقہٗ نہ جان سکے۔ احادیث کے ہر جملے سے کئی کئی مسائل ونکات معلوم کیے گئے۔ معلومات کا یہ عالم کہ جس طرف روے سخن پھر گیا، معلوم ہوتا کہ یہی آپؐ کا اصلی میدان ہے۔ الفاظ اس طرح کے مہذّب و شائستہ کہ اہل علم کی زبانیں اس کی تعریف کرنے سے قاصر ہیں۔ علم و عرفان کی یہ وسعت اور سیرت و کردار کی عظمت آپؐ کی نبوت کی زبردست دلیل ہے۔ اسی بنا پر امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے آپؐ کے اخلاق، افعال، احوال و عادات اور سیاسیات و معاملات کا، نیز آپؐ کے بلند پایہ علمی مقام کا، کہ مشکل سے مشکل سوالات کے فی البدیہہ ایسے جوابات دیے جن کی حقیقت دریافت کر کے انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے، مطالعہ کیا ہے، اس نے یہ یقین کر لیا ہے کہ حضورؐ اللہ کے سچے نبی تھے، کیونکہ اس طرح کے علمی و عملی کمالات کا جمع ہونا اذن ربی کے بغیر ناممکنات میں سے ہے (احیاء العلوم، ۲: ۳۴۱)؛ (۳) آپؐ کی امیت: آپؐ کی زبان مبارک سے معجزۂ قرآنی ظاہر ہوا، جو دنیا میں سب سے بڑی کتاب اور علوم و معارف کا سب سے بڑا مخزن ہے۔ اس کے علاوہ ہر موضوع پر آپؐ کے اقوال و ارشادات کثیر تعداد میں مروی ہیں، مگر اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ آپؐ امی محض تھے، نہ کسی سے آپؐ نے پڑھنا لکھنا سیکھا، نہ اس مقصد کے لیے کوئی سفر کیا اور اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد ہے: اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ (۷ [الاعراف]: ۱۵۷)، یعنی وہ جو (محمدؐ) رسول (اللہ) کی، جو نبی امی ہیں پیروی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (۲۹ [عنکبوت]: ۴۸)، یعنی اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے۔ سورۂ یٰسٓ میں اعلان کیا گیا: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (۳۶ [یٰس]: ۶۹)، یعنی اور ہم نے ان (پیغمبر) کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ ان کو شایاں ہے۔ قریش مکہ آپؐ کو ابتدا سے جانتے تھے اگر یہ دعواے امیت خلاف واقعہ ہوتا تو قریش ضرور اس کی تردید کر دیتے، مگر تاریخ میں کسی بھی دشمن اسلام کی طرف سے یہ صراحت تو کیا، اشارہ وکنایہ بھی نہیں ملتا کہ یہ ثابت کیا گیا ہو کہ آپؐ نے کسی شخص کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیے تھے۔

(۴) اعجاز قرآن: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عقلی معجزات میں آپؐ کا سب سے عظیم، لافانی اور ابدی معجزہ قرآن حکیم ہے: قرآن حکیم اپنے الفاظ اور معانی دونوں اعتبار سے معجزہ ہے۔

اعجاز قرآن پر گفتگو "وجوہ اعجاز قرآن" کہلاتی ہے (تاریخی اور تصنیفی بحث کے لیے [رک بہ قرآن: اعجاز قرآن]) اور ہر سیرت نگار یا مفسر نے، اس موضوع پر اپنے اپنے خیال سے بحث کی ہے اور مجموعی طور پر کوشش کی ہے کہ اس پیکر فصاحت و بلاغت کے وجوہ اعجاز کو نمایاں کیا جائے؛ ان تمام مصنفین کی کاوشوں میں، گو اپنی اپنی انفرادیت کی جھلک بھی پائی جاتی ہے، مگر مجموعی طور پر کچھ باتوں میں سب کا اشتراک ہے، تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) فصاحت و بلاغت قرآن: قرآن حکیم کی سب سے نمایاں اور بیّن خصوصیت اس کی سادگی

marfat.com
Marfat.com

اور سلاست کے ساتھ ساتھ اعلٰی درجے کی لفظی و معنوی فصاحت و بلاغت بھی ہے ، جس کا معارضہ فصحاے عرب کوشش کے باوجود نہیں کر سکے ۔ قرآنی فصاحت و بلاغت کے حسب ذیل پہلو لائق توجہ ہیں : (الف) لفظی محاسن : قرآن حکیم میں لفظوں اور جملوں کی بندش ، فقرات و کلمات کی برجستگی اور مختلف تراکیب کی چستگی اپنے منتہاے کمال پر دکھائی دیتی ہے ۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ اہل عرب اس فن میں اس درجہ مہارت رکھتے تھے کہ وہ اپنے سوا ہر قوم کو عجمی (گونگے) کہا کرتے تھے اور یہ فصاحت و بلاغت گویا ان کو فطری طور پر وراثت میں ملی تھی ؛ پیدائشی طور پر ہر بچہ فصیح زبان سنتا اور بولتا تھا ۔ ان میں سے کوئی قبیلہ دوسرے قبیلے سے فصاحت و بلاغت میں مرعوب نہیں ہوتا تھا ، مگر اس کے باوجود قرآن حکیم کو سن کر ، اس کی تلاوت کا حظ اٹھا کر وہ ہر کلام کی لذت اور حلاوت کو بھول گئے ۔ یہ تبھی ممکن ہے جب یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآنی فصاحت و بلاغت کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا ۔ ولید بن مغیرہ کی نسبت منقول ہے کہ اس نے ایک آیت قرآنی کو سن کر کہا : بخدا ! اس میں حلاوت اور رونق و حسن ہے ، اس کا باطن پانی سے لبالب معمور (مغدق) اور اس کا ظاہر ثمر آور ہے اور یہ کسی انسان کا کلام نہیں (الشفا ، ص ۲۷۱) ؛ ایک اعرابی نے آیت قرآنیہ سن کر سجدہ کیا ، پھر کہا کہ میں نے اس کی فصاحت و بلاغت کو سجدہ کیا ہے (حوالۂ مذکور) ۔ حضرت عمر فاروق؅ ایک مرتبہ مسجد میں استراحت فرما رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ ان کے سرہانے دو بوزنطی بطریق کلمۂ شہادت پڑھ رہے ہیں ۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے روم میں ایک مسلمان قیدی کی زبان سے ایک آیت سنی تھی ۔ اس کے الفاظ کی شان و شوکت اور اس کے معانی پر غور و فکر کرنے سے ان پر راہ حق و صداقت واضح ہوگئی (کتاب مذکور ، ص ۱۲۸) ۔ حلاوت قرآن کا یہ عالم ہے کہ مشہور دشمن اسلام ابو جہل بن ہشام اور اس کے دو ساتھی (ابو سفیان اور الاخنس بن شریک) مسلسل تین روز چھپ چھپا کر آیات قرآنیہ سنتے رہے (ابن ہشام : السیرة النبویه ، ۱ : ۳۳۷ تا ۳۳۸) ؛

(ب) اسلوب قرآن کی انفرادیت : اہل عرب میں عام طور پر کلام کی تین اقسام رائج تھیں : (۱) نظم ؛ شعر و اشعار ؛ (۲) نثر ، روزمرہ کی بول چال اور خطوط اور خطبات کی زبان ؛ (۳) سجع ، یعنی مقفّٰی و مسجع عبارت ، جو عام طور پر کاہن بولتے تھے اور جس میں الفاظ زیادہ سے زیادہ پر شوکت ، مگر معانی انتہائی بے وقعت ہوا کرتے تھے (دیکھیے الجاحظ : البیان والتبیین ؛ المبرد : الکامل ؛ ابن قتیبه : عیون الاخبار ؛ الآلوسی : بلوغ الارب ؛ احمد زکی : جمھرة خطب العرب ؛ ابن عبد ربه : العقد الفرید ؛ الیاقوت الحموی : معجم الادبا ، وغیرہ میں مختلف قبیلوں کے فصحا و بلغا کا کلام) ۔ قرآن حکیم نے ان سب سے ایک منفرد اور ایک الگ تھلگ اسلوب اپنایا ، جو نہ شعر تھا ، نہ نثر اور نہ ہی سجع ، بلکہ یہ کلام کہیں چھوٹی چھوٹی آیات (قطعات) پر مشتمل ہے اور کہیں بڑی بڑی آیات سے عبارت ہے ، مگر ہر جگہ الفاظ کی رونق اور چمک دمک کے ساتھ ساتھ معانی کا ایک بحر بیکراں موجیں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے ، اسی بنا پر فصحاے عرب کو اس کلام کی صنف متعین کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا ؛ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ولید بن المغیرہ نے قرآن کی کوئی آیت سنی ، اس سے متأثر ہوا ۔ ابوجہل نے

marfat.com
Marfat.com

جب اسے متأثر دیکھا تو اس کا اثر دور کرنے کے لیے کہا کہ یہ نظم کی کوئی قسم ہے ۔ ولید بن المغیرہ نے کہا : بخدا مجھ سے زیادہ تم میں عربی اشعار کا جاننے والا کوئی نہیں ؛ شعر سے اس کلام کو کوئی مناسبت نہیں ۔ ایک دوسرے موقع پر کسی نے آپ کو کاھن ، جادو گر ، یا مجنون کہنے کی تجویز پیش کی ، ولید نے مخالفت کی اور کہا ، نہ تو یہ کاھن ہیں ، کیوں کہ ان کے کلام کو کاھنوں کے کلام سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ھی جادو گر اور مجنون (الشفا ، ص ۱۲۹) ۔ عتبہ بن ربیعہ سردار قریش نے یہ کلام سنا تو کہا : بخدا ! آج تک میں نے ایسا کلام کبھی نہیں سنا ، نہ تو یہ شعر ہے اور نہ سحر (کتاب مذکور ، ص ۱۳۰) ۔ اسی طرح انیس (برادر ابی ذرؓ) نے ، جو خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھا ، اسلوب قرآن کی نسبت یہ گواھی دی : میں نے آپ کا کلام سنا ، مگر آپ کے کلام کو شعر سے کوئی تعلق نہیں ، آپ کے بلند پایہ کلام سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں سچ ہے اور آپ کے دشمن جھوٹے ہیں (حوالۂ مذکور) ؛ (ج) صوتی ترنم و تنغّم : قرآن حکیم کے ہر ایک مطلع و مقطع میں ایک خاص قسم کا حسن و جمال پایا جاتا ہے ، یہ الفاظ کی نغمگی اور جملوں کی موسیقیت ، اوزان و قوافی سے مبرا و منزہ ہونے کے باوجود ہر جگہ فراوانی کے ساتھ محسوس ہوتی ہے ۔ اس اعتبار سے اگر مزید غور کیا جائے تو قرآنی آیات کو تین حصوں میں منقسم دیکھتے ہیں : طویل آیات ، مثلاً سورۃ البقرہ میں ؛ اوساط مثلاً الاعراف اور الانعام میں؛ قصار مثلاً سورۃ الرحمٰن اور المرسلٰت میں ۔ ان سب میں قرآنی آیات کے الفاظ و حروف کا ایک خاص اسلوب ہے ۔ معانی کی وسعت کے ساتھ آیات کے حروف و اصوات ایک خاص منظر اور ایک خاص لذت پیدا کرتی ہیں ؛ جب یہ آیات پڑھی جا رہی ہوں تو باھمی موزونیت اور روانی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دریا رواں ہے ؛ آواز کے اتار چڑھاؤ سے بلاشبہہ کسی آبشار کے گرنے کا سماں بندھتا ہے ۔ اسی بنا پر اشعار و نظم سے معرّا ہونے کے باوجود یہ واحد کتاب ہے جس کو پڑھنے (تلاوت کرنے) کا خاص فن (فن تجوید و قراءت [رکّ بہ قرآن]) پیدا ہوا اور اس نے وہ عروج حاصل کیا کہ ہر زمانے میں ہزار ہا افراد اس فن سے وابستہ رہے ہیں اور روز بروز اس کو ترقی نصیب ہو رہی ہے ۔

قرآنی آیات کے ترنم و تنغّم کا یہ عالم ہے کہ باوجود اس کے کہ بہت سے لوگ اس زبان سے ناواقف ہیں ، مگر پھر بھی ہر سننے والا کان بھرپور طریقے سے اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے ۔ اور اس طرح ایک ایسا سماں بندھتا ہے جس میں پوری کائنات خاموش محسوس ہوتی ہے اور قرآن کے الفاظ پوری طرح فضا پر چھا جاتے ہیں ؛ (د) ایجاز و اطناب : علما نے بلاغت کی ایک تعریف یہ بھی کی ہے کہ بلیغ کلام وہ ہے جس میں موقع و محل کے مطابق بات کی گئی ہو ۔ اختصار کے موقع پر مختصر اور اطناب کے موقع پر مفصل (السیوطی: الاتقان، ۳ : ۱۷۹) ۔ ان ظاہری خوبیوں کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات بیّنات کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس میں ایجاز و اختصار بھی کامل درجے کا ہے ۔ کسی جگہ خوامخواہ مضمون کو طول دینے کی کوشش نہیں کی گئی ۔ اگر مضمون تین آیات میں پورا ہو گیا ہو تو چوتھی آیت کا اضافہ نہیں کیا گیا اور اس پر لطف کی بات یہ ہے کہ معانی کی وہ وسعت ہے کہ سینکڑوں تفاسیر لکھی جانے کے باوجود اس کی توضیح و تشریح

marfat.com
Marfat.com

کا حق ادا نہیں ہو سکا ۔ ایک ایک آیت اور ایک ایک سورۃ کی تفسیر کئی کئی مجلدات میں بھی مرتب کی گئی ہے ۔ خود حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ میں سورۂ فاتحہ کی اگر تفسیر لکھنے بیٹھ جاؤں تو ساٹھ اونٹ کتابوں سے بھر سکتے ہیں (علی نقی لکھنوی : مقدمۂ تفسیر، مطبوعہ ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء؛ عربی ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء)، لیکن بایں ہمہ یہ ایجاز و اختصار کسی مقام پر مغلق و مبہم کے درجے کو نہیں پہنچا ۔ ایجاز کی مختلف اقسام اور قرآن میں ان کی مثالوں کے لیے دیکھیے السیوطی : الاتقان، مطبوعہ ۱۹۷۵ء، ۳ : ۱۷۹ تا ۲۱۶ ۔

اسی طرح جہاں ضرورت پڑی ہے اور موقع ہوا ہے اطناب بھی اختیار کیا گیا ہے، مگر اس اطناب میں بھی اعلیٰ درجے کی نزاکت و مہارت کا خیال رکھا گیا ہے اور وہاں واقعات کے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے کہ جن سے خاص نتائج پیدا ہونے کی توقع ہو سکتی ہے، مثلاً سورۃ المؤمن میں فرشتوں کے ذکر میں : یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (۴۰ [المؤمن] : ۷)، یعنی وہ (فرشتے) اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح پڑھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، میں یؤمنون بہ کا اضافہ ایمان کی اہمیت جتلانے کے لیے کیا گیا ہے (السیوطی : الاتقان، ۳ : ۲۱۶) ۔ اسی طرح سورۂ حٰم السجدہ میں مشرکین کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی طرف زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی بات کا منسوب کرنا (۴۱ [حم السجدہ] : ۷) مؤمنین کو ادائے زکوٰۃ کی طرف راغب کرنے کے لیے کیا گیا (کتاب مذکور، ۳ : ۲۱۷ تا ۲۲۱)؛ (ہ) فواصل القرآن : قرآن حکیم کی تمام آیات کو ایک خاص نہج پر ختم کیا گیا ؛ ان کو فواصل قرآن یا خواتم الایات کہا جاتا ہے ۔ عام طور پر نثر میں جملوں کو ایک نسق پر چلانا ممکن نہیں ہوتا، خاص طور پر ایک مدلل و مفصل گفتگو میں تو یہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، مگر قرآن حکیم کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس میں تمام آیات کو ایک خاص انداز پر ختم کیا گیا جس سے آیات قرآنیہ میں ایک نظم، تسلسل اور روانی نظر آتی ہے ۔

علما نے فواصل آیات کو چار اقسام پر تقسیم کیا ہے : (۱) تمکین؛ (۲) التصدیر؛ (۳) التوشیح اور (۴) ایغال؛ ان میں سے ہر ایک کا جدا جدا اصول ہے (دیکھیے الاتقان، ۳ : ۲۴۵ ببعد)۔ یہ فواصل اس پائے کے ہیں کہ محض ان کے جاننے سے پوری آیت کا مضمون سامنے آ جاتا ہے اور اگر ان میں سے کوئی لفظ ادھر ادھر ہو جائے تو اس کا فوراً اندازہ ہو جاتا ہے ۔ امام السیوطیؒ نقل فرماتے ہیں کہ ایک بدّو نے ایک شخص کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا : فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲ [البقرۃ] : ۲۰۹) جیسے، قاری نے عزیز حکیم کے بجائے غفور رحیم پر ختم کیا، یہ اعرابی فوراً بول اٹھا کہ اللہ کے کلام میں ایسا نہیں ہو سکتا، بعد میں تحقیق کی گئی تو اعرابی کا گمان درست نکلا (الاتقان، ۳ : ۲۴۷)۔

(و) الفاظ سے معانی پر دلالت : قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ان میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں کہ اگر ذرا سا ذوق لطیف ہو تو قاری محض لفظوں کی مدد سے ان کے مطلب تک رسائی حاصل کر سکتا ہے ۔

(ز) بدائع و صنائع : قرآن حکیم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بدائع اور صنائع کا بکثرت استعمال کیا گیا ہے، یعنی ان لفظی و معنوی اصولوں کا، جن کی وجہ سے کوئی کلام درجۂ کمال کو پہنچتا ہے ؛ چند مثالیں

marfat.com

Marfat.com

حسب ذیل ہیں : (۱) امام السیوطی سورۂ ہود کی آیت : وَ قِيۡلَ يٰۤاَرۡضُ ابۡلَعِيۡ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقۡلِعِيۡ وَ غِيۡضَ الۡمَآءُ وَ قُضِيَ الۡاَمۡرُ وَ اسۡتَوَتۡ عَلَى الۡجُوۡدِيِّ وَقِيۡلَ بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ (۱۱ [ھود] : ۴۴)، یعنی اور حکم دیا گیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا اور پانی خشک کر دیا گیا، اور حکم تمام ہوا اور کشتی جودی (پہاڑ) پر آ ٹھیری اور فرمایا گیا کہ دور ہوں ظالم لوگ؛ کی نسبت ابن ابی الاصبع کا قول نقل فرماتے ہیں کہ میں نے آج تک اس کلام کی مثال نہیں دیکھی، اس میں ۱۷ الفاظ ہیں اور بیس بدائع (الاتقان فی علوم القرآن، ۳ : ۳۳۰) : (۲) امام السیوطیؒ نے سورۂ آل عمران کی آیت : اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ (۲ [البقرة] : ۱۷۹) پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور اس کے ۱۲۰ بدائع بیان کیے ہیں (کتاب مذکور) : (۳) الاصمعی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے ایک لڑکی سے کچھ اشعار سنے تو ان کی تعریف کی اور کہا، اے جاریہ تم کتنی فصیح ہو؛ وہ کہنے لگی کہ کیا اللہ تعالی کے ارشاد : وَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوۡسٰۤى اَنۡ اَرۡضِعِيۡهِ ج فَاِذَا خِفۡتِ عَلَيۡهِ فَاَلۡقِيۡهِ فِي الۡيَمِّ وَ لَا تَخَافِيۡ وَ لَا تَحۡزَنِيۡ ج اِنَّا رَآدُّوۡهُ اِلَيۡكِ وَ جَاعِلُوۡهُ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ (۲۸ [القصص] : ۷) کے بعد بھی میرے ان اشعار کو فصاحت کہا جائے گا، کہ جس آیت میں اللہ تعالی نے دو امر، دو نہی، دو خبریں اور دو بشارتیں ایک ہی جگہ جمع کر دی ہیں (الشفا، ص ۱۲۸) : (۴) قرآن کریم میں ارشاد ہے : وَ لَكُمۡ فِي الۡقِصَاصِ حَيٰوةٌ (۲ [البقرة] : ۱۷۹)، یعنی اور تمہارے لیے قصاص میں ہی زندگی کا راز مضمر ہے۔ امام السیوطی کے بقول اس میں بیس صنائع ہیں۔' صرف چند آیات پر ہی موقوف نہیں، قرآن حکیم کی تمام آیات اسی نسق و نہج کی بلاغت پر مشتمل ہیں (تفصیلات کے لیے دیکھیے : السیوطی : الاتقان فی علوم القرآن، ۳ : ۲۸۴ تا ۳۳۱، فی بدائع القرآن ؛ الزرکشی : الاعلام فی علوم القرآن ؛ مختصر المعانی ؛ الباقلانی : اعجاز القرآن، مطبوعۂ قاہرہ، طبع سید احمد سقر ؛ عبد القاہر الجرجانی : دلائل الاعجاز، مطبوعۂ قاہرہ)۔

(ح) تکرار آیات و قصص : عام طور پر الفاظ اور واقعات کا بار بار تکرار ذوق لطیف پر گراں گزرتا ہے ، مگر قرآن حکیم کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بہت سے مقامات پر الفاظ و تراکیب کا اعادہ کیا گیا ہے ، لیکن اس کے باوجود وہاں حسن و لطافت میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہوا ہے، مثلاً سورۃ الرحمٰن میں آیت فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ، یعنی پس تم میری کون کون سی نعمتوں کا انکار کرو گے، کا اکتیس (۳۱) بار، سورۃ المرسلٰت میں وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ کا دس مرتبہ، سورۃ الشعراء میں آیت : اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ط وَ مَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ کا آٹھ مرتبہ اور سورۂ قمر میں آیت : وَ لَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ (یعنی اور ہم نے قرآن سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے جو سمجھے) کا چار مرتبہ تکرار کیا گیا ہے، مگر اس کے باوجود ان مقامات پر حسن و بلاغت میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا ہے اور ہر جگہ ان آیات کے تکرار نے نئے معانی پیدا کیے ہیں۔ الفاظ کے تکرار کے ساتھ ساتھ اکثر جگہ مضمون کا تکرار بھی کیا گیا ہے ، مگر ہر جگہ کوئی نہ کوئی نیا نکتہ پیدا ہوتا ہے اور تکرار و تشابہ کے باوجود مضمون کی وسعت و گہرائی میں فرق نہیں آنے دیا گیا (دیکھیے السیوطی : الاتقان، ۳: ۲۲۴ تا ۲۳۰)۔ علامہ السیوطی کے مطابق' البدر بن جماعہ

marfat.com
Marfat.com

نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب (المقتنص فی فوائد تکرار القصص) تصنیف کی، جس میں قصص کو بار بار دہرانے کے فوائد بیان کیے گئے ہیں (الاتقان، ۲ : ۲۳۰).

(۲) جامعیت و کاملیت : الفاظ و حروف کی اس درجہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی جامعیت و کاملیت بھی ہے۔ یہ شرف آج تک دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوا۔ جامعیت کے سلسلے میں ارشاد باری ہے : وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (۱۷ [بنی اسرائیل] : ۸۹)، یعنی اور ہم نے اس قرآن میں سب باتیں طرح طرح سے بیان کر دی ہیں، مگر اکثر لوگوں نے انکار کے سوا قبول نہ کیا؛ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا : وَ لَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا (۲۵ [الفرقان] : ۳۳)، یعنی اور یہ لوگ تمہارے پاس جو اعتراض کی بات لاتے ہیں، ہم تمہارے پاس اس کا معقول اور مشرح جواب بھیج دیتے ہیں۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا : علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ و ما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ (ابو داؤد، ۵ : ۱۱، حدیث ۴۶۰۴؛ الترمذی ۲۶۶۶؛ ابن ماجہ، حدیث ۱۲)، یعنی تم کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لو، جو اس میں حلال ٹھیرایا گیا ہے اس کو حلال اور جو حرام قرار دیا گیا ہے اس کو حرام جانو۔ اگر کتاب اللہ میں کوئی کمی رہ گئی ہوتی تو یہ دعوٰی ہرگز نہیں کیا جا سکتا تھا؛ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر دینی، مذہبی، عائلی، خاندانی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی و اقتصادی مشکلات کا تسلی بخش حل اس کتاب میں مذکور ہے، اس لیے یہ کتاب ایک منشور اور دستور حیات کی حیثیت رکھتی ہے؛ البتہ اس کتاب کے اشارات و تلمیحات اور اس کے کنایات و مجازات کو سمجھنے کے لیے مہبط وحی نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشادات کو سامنے رکھنا اشد ضروری ہے اور خود قرآن مجید کی تصریحات کے مطابق، یہ تعلیمات نبوی حیطہ قرآن سے باہر نہیں، بلکہ اسی کے اندر ہیں۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا : میں تم میں دو بنیادی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم ان کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور وہ ہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (البخاری)۔ اس جامعیت کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی کاملیت کا یہ عالم ہے کہ سورۃ المائدہ میں ارشاد باری ہے : اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵ [المائدہ] : ۳)، یعنی آج ہم نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے دین اسلام پسند کیا۔ یہ خصوصیت صرف اور صرف قرآن حکیم کو حاصل ہے کہ اس پر اتمام دین ہوا، ورنہ پہلی امتیں اس خوش‌خبری سے محروم رہیں۔ امام بخاری (۳ : ۲۳۳، مطبوعۂ لائڈن) نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک یہودی حاضر ہوا، اور اس نے آ کر عرض کیا کہ اے عمرؓ! تم اپنی کتاب میں ایسی آیت پڑھتے ہو جو اگر ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن کو جشن عید کی طرح منایا کرتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا : مجھے معلوم ہے کہ وہ کون سی آیت ہے، کون سے دن اور کون سے مقام پر نازل ہوئی۔ القصہ، قرآن حکیم جامع و مانع بھی ہے اور کامل و مکمل بھی۔ اب اس کتاب میں نہ کمی کی گنجائش ہے اور نہ اضافے کی۔ قرآن حکیم کا یہ اتمام و اکمال

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

اس کا عظیم معجزہ ہے۔

(ب) عدم تناقض و تعارض: قرآن حکیم کے مضامین میں اس وسعت و تنوع کے باوجود اس کے مضامین میں کسی جگہ تعارض و تناقض نہیں ہے، بلکہ قرآن کریم کی آیات ایک دوسری کی تصدیق و تفسیر کرتی ہیں (القرآن یفسر بعضها بعضاً)۔ قرآن حکیم میں ایک واقعہ بعض اوقات ایک سے زائد مرتبہ بیان ہوا ہے، ہر چند کہ موقع و محل اور سیاق و سباق مختلف ہیں، مگر اس کے باوجود اصل واقعے اور اس کے متعلقات میں خفیف سا بھی کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ یہ قرآن ایک موقع کی تصنیف نہیں، بلکہ اس کا نزول تئیس سال کے عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ اس کا آغاز غار حرا کے گوشۂ تنہائی سے ہوا اور تکمیل حِجّة الوداع کے موقع پر ہزاروں کے مجمع میں ہوئی؛ اس کے باوجود اس کے معانی میں کسی باریک سے باریک فرق کو بھی محسوس نہیں کیا جا سکتا (آیات متشابہات کی وضاحت کے لیے دیکھیے السیوطی: الاتقان، ۲: ۳۹۰ تا ۳۹۶)۔

(ج) انتشار مطالب: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ قرآنی علوم و معارف پانچ انواع پر منقسم ہیں: علم الاحکام؛ (۲) علم المخاصمة؛ (۳) علم التذکیر بآلاء اللہ (۴) علم التذکیر بایام اللہ؛ (۵) علم التذکیر بالموت و ما بعدہ (الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۱ تا ۲، مطبوعۂ لاہور، ۱۳۷۱ھ)، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حکیم اس بات کی رعایت نہیں کرتا کہ اس سورۃ میں یا اس حصے میں صرف فلاں قسم کے مضامین مذکور ہوں گے اور دوسری نوع کے دوسری سورت میں، اس کے برعکس ایک ہی سورۃ میں یکے بعد دیگرے متعدد قسم کے مضامین مذکور ہوتے ہیں۔ مضامین کے اس تنوع کے باوجود نہ تو مضمون کے تسلسل اور روانی میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ ہی قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب پرانے موضوع کی جگہ نیا موضوع شروع ہو رہا ہے، حالانکہ اگر کسی دوسری کتاب میں یہ انداز بیان اختیار کیا جائے تو یقیناً گراں گزرے۔ معانی اور مضمون کے انتشار کے ساتھ الفاظ و انداز بیان بھی بدلتے رہتے ہیں: ابھی صیغۂ غائب ہے تو ابھی حاضر، ابھی حاضر ہے تو ابھی متکلم، مگر ان سب کے باوجود معانی کی لذت دوبالا ہوتی ہے (دیکھیے مختصر المعانی، وغیرہ)۔ یہ قرآن حکیم کی چند خوبیاں ہیں، [اس موضوع پر تفصیل کے لیے رک بہ قرآن]۔ واقعہ یہ ہے قرآن مجید کی ہر آیت بلکہ ہر سطر میں ایسے ایسے ظاہری اور معنوی محاسن پوشیدہ ہیں کہ جنھیں محسوس تو کیا جا سکتا ہے، مگر بیان نہیں کیا جا سکتا؛ اس کی حلاوت شعوری اور ادراکی بھی ہے اور وجدانی بھی۔

ان سب خصوصیات کے جمع ہونے سے قرآن مجید ایک ایسے کلام کے طور پر دنیا میں موجود ہے جس کا کوئی ثانی و مثیل نہیں اور بار بار کے اعلانات کے باوجود دنیاے کفر انفراداً اور نہ اجماعاً اس کی کوئی نظیر پیش کر سکی (دیکھیے نیچے پیش گوئیاں)۔ یہ تمام کی تمام خوبیاں کسی انسان کے کلام میں جمع نہیں ہو سکتیں، بلکہ ضرور ہے کہ ان کے پیچھے کوئی غیر معمولی قوت کام کر رہی ہو؛ یہ قوت وحی کی قوت ہے، جو کسبی نہیں بلکہ وہبی حقیقت ہے۔

(۳) اخبار غیب: قرآن حکیم کی تیسری خصوصیت اس میں غیب کی خبروں کا بکثرت ہونا ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے: تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ

marfat.com
Marfat.com

قَبْلِ هٰذَا (۱۱ [هود] : ۴۹)، یعنی یہ (حالات) منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں ، جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں اور اس سے پہلے نہ تم ہی ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم ہی ان سے واقف تھی۔ دوسری جگہ فرمایا : ذٰلِکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ ؕ وَ مَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (۳ [آل عمرٰن] : ۴۴)، یعنی (اے محمد[ص]) یہ باتیں اخبار غیب میں سے ہیں ، جو ہم تمہارے پاس بھیجتے ہیں ، اور جب وہ وہ لوگ اپنے قلم (بطور قرعہ) ڈال رہے تھے کہ مریم کا متکفل کون ہوگا تو اس وقت آپ ان کے پاس نہیں تھے۔

قرآن حکیم میں مندرج اخبار غیب کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے : (الف) اخبار ماضیہ اور (ب) اخبار مستقبلہ ؛ (الف) اخبار ماضیہ : آپ[ص] چونکہ اُمی محض تھے (دیکھیے بالا) ؛ اس لیے آپ[ص] کی زبان سے ان خبروں کا ادا ہونا ، گو وہ کسی سابقہ کتاب میں بھی موجود ہوں، آپ[ص] کے لیے علم غیب پر اطلاع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان کی تین اقسام ہیں : (۱) سابقہ کتب کی مطابقت ؛ (۲) سابقہ کتب کی مخالفت ؛ (۳) بالکل نئے واقعات ؛ تفصیل حسب ذیل ہے : (۱) سابقہ کتب کی مطابقت : نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اُمی ہونے کے باوجود بعض ایسے واقعات کی خبریں دیں جو موازنہ کرنے پر کتب سابقہ میں بھی ہو بہو ویسے ہی پائے گئے مثلاً دیکھیے یوسف علیہ السلام، موسی علیہ السلام ، وغیرہ کے واقعات۔ اس قسم کے واقعات کی معتدل اہل کتاب نے نہ صرف تصدیق کی ہے بلکہ آپ[ص] کی رسالت و نبوت کی گواہی بھی دی (مثلاً عبداللہ بن سلام ، کعب احبار ، وہب بن منبہ وغیرہ)۔ متعدد مواقع پر ایسا بھی ہوا کہ یہودیوں نے خود یا مشرکین

کے ذریعے اپنی سابقہ کتب میں مذکور کسی خاص واقعے کی نسبت استفسار کیا اور یہ ظاہر کیا کہ ان واقعات کی اطلاع کسی نبی کے سوا اور کسی کو نہیں ہو سکتی ، مثلاً روح کی نسبت (۱۷ [بنی اسرائیل] : ۸۵) ، اصحاب کہف (۱۸ [کہف] : ۹ تا ۲۶) اور ذوالقرنین (۱۸ [کہف] : ۸۳ ، ببعد) کے متعلق استفسارات (ابن ہشام : السیرۃ النبویہ ، ۱ : ۳۱۵ تا ۳۳۵ ، بعنوان : مَا دَارَ بَیْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ[ص] وَ بَیْنَ رُؤَسَاءِ قریش و تفسیر سورۃ کہف) : (۲) کسی سابقہ کتاب میں بیان کیے گئے واقعے کی اصلاح : قرآن حکیم نے صرف اہل کتاب کے موافق ہی واقعات بیان نہیں کیے ، کہ یہ کہا جا سکے یہ تو ان کی ہو بہو نقل ہے، بلکہ اکثر و بیشتر ان کتابوں میں مذکور غلط بیانیوں اور تحریفات و ترمیمات کی وضاحت بھی فرمائی ہے ، مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کی جادوگری اور بت پرستی کی نسبت یہودیوں کے خیال کی تردید (۲ [البقرۃ] : ۱۰۲) ، جادو کے من جانب اللہ نازل ہونے کی تردید (۲ [البقرۃ] : ۱۰۲) ؛ آدم علیہ السلام کی غلطی کی تردید ؛ اس کی جگہ نسیان کا نظریہ پیش کیا، (۲۰ [طٰہٰ] : ۱۱۶) ؛ ابراہیم علیہ السلام کے یہودی یا عیسائی ہونے کی تردید (۳ [آل عمران] : ۶۷)، عیسٰی علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کی تردید (۲۰ [طٰہٰ] ۸۸۔۹۳)۔ ظاہر ہے کہ یہ تردید کوئی بھی شخص محض اپنی عقل اور سوجھ بوجھ سے نہیں کر سکتا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ جب مقابلے پر دنیا کے دو مقبول ترین اور قدیم ترین مذہب ہوں۔ آپ[ص] کو اپنے ان دعووں پر یہاں تک اعتماد اور یقین تھا کہ آپ[ص] کی طرف سے الٰہیں کہا گیا : قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ (۳ [آل عمران] : ۹۳)، یعنی اگر میری بات غلط ہے اور تم سچے ہو تو تورات لے آؤ، اسی طرح نصارائے نجران

marfat.com

Marfat.com

کو مباہلے [رک باں] کی دعوت دی گئی ۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت اذعان و یقین اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جس کے پاس کوئی مافوق البشری ذریعۂ معلومات ہو اور وہ وحی ہے ۔ اسی لیے ارشاد فرمایا : قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۱۸ [کہف] : ۱۱۰)، یعنی آپ کہ دو کہ میں تمھاری طرح کا ایک بشر ہوں ، (البتہ) میری طرف وحی آتی ہے ۔

(۳) نئے واقعات کا بیان : قرآن حکیم صرف سابقہ کتب میں مذکورہ واقعات کی موافقت یا مخالفت ہی نہیں کرتا، بلکہ بعض ایسے واقعات بھی بیان کرتا ہے جن کے ذکر سے کتب سابقہ کے اوراق خالی ہیں، مثلاً ملاے اعلیٰ میں آدم کی خلافت کے متعلق فرشتوں کا تبصرہ، قوم عاد (عاد ارم، عاد اولیٰ)، قوم ہود کے حالات، سیل عرم کا عظیم الشان واقعہ، فرعون کے غرق کے بعد کچھ عرصے کے لیے مصر میں یہودیوں کی حکومت کا قیام، عیسیٰ علیہ السلام کے کارنامے، حضرت مریم کے اقنوم ہونے کا غلط تصور، خانہ کعبہ کا سب سے پہلے تعمیر ہونا، ہر قوم میں الگ الگ انبیا کا آنا ، آنحضرت کا خاتم النبیین ہونا وغیرہ (دیکھیے قاضی سلیمان سلمان منصور پوری : رحمة للعالمین ، ۳ : ۳۲۵ تا ۳۲۶)۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کا مأخذ و مصدر کتب سابقہ ہرگز نہیں، بلکہ ان سے اور سب انسانی حواس و ذرائع سے بھی برتر کوئی ذریعہ ہے ، اور یہ ذریعہ صرف اور صرف وحی الٰہی ہی ہو سکتا ہے ۔

(ب) اخبار مستقبلہ : قرآن حکیم میں نہ صرف پچھلی امتوں اور پیغمبروں کے حالات و واقعات سے آگاہ کیا گیا ہے، بلکہ آئندہ زمانے کی نسبت بھی ایسی اہم پیشین گوئیاں کی گئی ہیں جو قرآن حکیم کے من جانب اللہ ہونے کی زبردست شہادت ہے ؛ حسب ذیل چند پیشین گوئیاں ملاحظہ فرمائیے :

(۱) غلبۂ روم کی پیشین گوئی : یہ پیشین گوئی سب سے حیرت انگیز ہے ۔ بعثت نبوی کے پانچویں سال ، تقریباً ۶۱۴ - ۶۱۶ء میں جب کہ ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کی شکست کا آغاز ہو چکا تھا ۔ سورۂ روم میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ اگرچہ اہل روم اب مغلوب ہو رہے ہیں ، مگر چند ہی سالوں میں (بضع سنین=۹ سالوں : دیکھیے ترمذی، ۵ : ۳۲۴ تا ۳۴۳، حدیث ۳۱۹۱) میں دوبارہ غالب ہوں گے (۳۰ [الروم]: ۲ تا ۴) ۔ اس لڑائی میں جو روم پر اہل فارس نے مسلط کی تھی اور جس میں مسلمانوں کی ہمدردیاں اہل کتاب ہونے کی بنا پر اہل روم کے ساتھ اور مشرکین کی اہل شرک یعنی اہل فارس کے ساتھ تھیں ۔ ابتدا میں اہل روم کا بھاری جانی و مالی نقصان ہوا اور بہت سا علاقہ بھی ان سے چھن گیا ۔ بظاہر حالات ایسے نہیں دکھائی دیتے تھے کہ اہل روم کو کبھی غلبہ بھی حاصل ہو سکے گا، مگر دنیا نے یہ منظر حیرت و استعجاب سے دیکھا کہ ۶۲۲ء/ ۱ھ، سال ہجرت میں رومیوں کے تن مردہ میں پھر جان پیدا ہوئی اور ۶۲۲-۶۲۳ء/۲ھ یعنی پیشین گوئی سے صرف ۹ سال بعد اہل روم نے ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے ساحلوں سے ہٹا کر دجلہ اور فرات کے کناروں تک پہنچا دیا ۔ اس پیشین گوئی کے ظہور پر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے (رحمة للعالمین، ۳ : ۳۲۵) ؛ (۲) غزوۂ بدر میں فتح و نصرت کی پیشین گوئی : سورۂ روم میں ارشاد ہے کہ جس روز رومیوں کی فتح کی خبر آئے گی اس روز مسلمان بھی اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے (۳۰ [الروم] : ۴ تا ۶) ؛ اسی سورت میں آگے جا کر

marfat.com
Marfat.com

ارشاد فرمایا : وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۰ [الروم] : ۴۷)، یعنی اور مسلمانوں کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے؛ چنانچہ یہ دونوں پیشین گوئیاں، جو ہجرت سے تقریباً ۷ سال قبل کی گئی تھیں، سنہ ۲ھ/ ۶۲۲ - ۶۲۳ء میں حرف بحرف پوری ہوئیں، اسی روز غلبۂ روم کی خبر آئی اور اسی روز مسلمانوں نے دنیاے کفر کو پہلی شکست سے دو چار کیا (رحمة للعالمین، ۳ : ۳۲۴)؛ (۳) غزوۂ احزاب میں فتح کی پیشین گوئی : سورۂ قمر میں ارشاد ہے : اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ○ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (۵۴ [قمر] : ۴۴-۴۵)، یعنی کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ (ہماری جماعت بہت مضبوط ہے اور) ہم سب باہم مجتمع ہیں ؟ عنقریب یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ یہ آیات مکی دور میں نازل ہوئیں۔ اس وقت کسی کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کبھی کفار مسلمانوں کے خلاف اتنا بڑا گٹھ جوڑ قائم کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے، مگر اس سورت میں نہ صرف اس گٹھ جوڑ کی خبر دی گئی، بلکہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جانے کی بھی پیشین گوئی فرمائی؛ چنانچہ ۵ھ میں جب تمام کفار نے ایکا کرکے مسلمانوں پر یلغار کی تو اس پیشین گوئی کی صداقت آنکھوں کے سامنے آ گئی، اس طرح یہ پیشین گوئی بھی حرف بحرف پوری ہوئی؛ (۴) فتح مکہ کی پیشین گوئی : ۶ھ / ۶۲۸ء میں آپؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کی نیت سے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوے۔ راستے میں دشمنوں نے روک لیا۔ باہمی گفت و شنید سے دس سال کے لیے ایک باہمی معاہدہ طے پا گیا۔ اس وقت کسی کو یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اہل اسلام کبھی مکہ کو فتح کر سکیں گے، لیکن عین انھی دنوں سورة الفتح نازل ہوئی، جس میں فتح مکہ کی بشارت دیتے ہوے فرمایا : اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (۴۸ [الفتح] : ۱)، یعنی اے محمدؐ ! ہم نے آپ کو فتح دی ہے، فتح بھی صریح و صاف؛ چنانچہ اس سورة کے نزول کے صرف دو سال بعد مکہ مکرمہ بغیر کسی واضح خون ریزی کے فتح ہو گیا؛ (۵) فتح خیبر کی اطلاع : سورۂ فتح ہی میں فتح خیبر کی پیشین گوئی نازل ہوئی اور فرمایا : سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ (۴۸ [الفتح] : ۱۵)، یعنی عنقریب جب تم لوگ غنیمتوں کو لینے چلو گے تو جو لوگ (صلح حدیبیہ میں) پیچھے رہ گئے تھے وہ کہیں گے ہمیں بھی اجازت دیجیے کہ ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں؛ چنانچہ اگلے ہی سال، یعنی ۷ھ/۶۲۹ء میں یہ پیشین گوئی بھی پوری ہو گئی؛ (۶) اس کے علاوہ مجموعی طور پر یہ پیشین گوئی کی گئی تھی: وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۳۷ [الصّٰفّٰت]: ۱۷۳) اور یقیناً ہمارا ہی لشکر کامیاب رہتا ہے؛ چنانچہ مسلمان اپنی تعداد اور اسلحے کی واضح کمی کے باوجود ہر جنگ میں اپنے دشمن پر غالب ہی رہے۔ ان کے مقابلے میں غیر مہذب عربوں سے لے کر روم و فارس کی متمدن سلطنتوں تک سبھی آئے، مگر سب کو ناکامی ہوئی اور اللہ کی طرف سے کی گئی یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی؛ (۷) قیام خلافت اور قیام امن و امان کی پیشین گوئی : سورۂ نور میں قیام خلافت کی خبر دیتے ہوے ارشاد فرمایا: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط (۲۴ [النور]: ۵۵)، یعنی جو لوگ تم میں سے ایمان لے آئے اور نیک کام کرتے رہے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا،

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے ، مستحکم اور پائدار کرے گا اور خوف کے بعد امن بخشے گا ؛ چنانچہ یہ وعدۂ الٰہی بھی حرف بہ حرف پورا ہوا اور مسلمان نصرت اور امن و سلامتی سے شاد کام ہوئے؛ مزید فرمایا : وَ یَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (۲۷ [النمل] : ۶۲)، یعنی تمھیں زمین میں اگلوں کا جانشین بنائے گا ۔ اس آیت کے مصداق تمام مسلمان تھے ۔ اسی پیشین گوئی کا ظہور ہے کہ عہد فاروقی سے لے کر آج تک مختلف علاقوں میں ہزاروں کی تعداد میں مسلم خانوادوں نے حکومت کی ؛ (۸) اس کے علاوہ تنگ دستی کے بعد غنا کی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا : وَ اِنْ خِفْتُمْ عَیْلَۃً فَسَوْفَ یُغْنِیْکُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖٓ اِنْ شَآءَ (۹ [التوبہ] : ۲۸) ، یعنی اگر تم کو مفلسی کا خوف ہے تو خدا چاہے گا تو تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا ؛ چنانچہ کبھی تو تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ اکثر صحابہؓ بھوک سے نڈھال رہتے تھے اور پھر رزق کی فراوانی کا یہ عالم ہوا کہ غریب سے غریب صحابی بھی آرام سے زندگی گزارنے کے لائق ہو گیا ؛ (۹) اس کے ساتھ ہی قرآن مجید نے یہ پیشین گوئی بھی کر دی تھی کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد غیر عرب اقوام مسلمان ہوں گی اور اسلام کی نمایاں خدمت انجام دیں گی ، ارشاد ہے : وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ (۴۷ [محمد] : ۳۸)، یعنی اگر تم منہ پھیر لوگے تو اللہ تمھاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا اور وہ تمھاری طرح کے نہ ہوں گے ؛ چنانچہ دوسری صدی ہجری سے ہی سیاسی اور مذہبی قیادت غیر عربوں کے ہاتھ آ گئی اور انھوں نے اسلام کی خدمت و اشاعت میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا (۱۰) غلبۂ دین کی پیشین گوئی: قرآن حکیم کے تین مقامات پر یہ اعلان دہرایا گیا : ہُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْہُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ (۹ [التوبہ] : ۳۳ ؛ ۴۸ [الفتح] ، ۲۸ ؛ ۶۱ [الصف] : ۹) ، یعنی وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبرؐ کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اس دین کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کرے ۔ گو ابتدا میں حالات بڑے ناساعد تھے ، دشمنوں کی طاقت و قوت کا پلہ ہر سطح پر بھاری تھا ، مگر آہستہ آہستہ حالات بدلتے گئے اور قرآنی پیشین گوئی حق و صداقت بن کر منظر عام پر آ گئی ؛ بالآخر دوسرے وعدوں کی طرح یہ وعدۂ الٰہی بھی پورا ہوا اور چار دانگ عالم میں اسلام کی قوت و شوکت کا چرچا ہونے لگا ، لیکن اس کا قطعاً یہ مفہوم نہیں کہ اسلام کی اشاعت بزور شمشیر ہوئی ۔ کیونکہ اسلام کی اشاعت تو ان ممالک میں بھی ہوئی جہاں مسلمانوں کی شمشیر نہیں پہنچی ، مثلا چین ، روس کے دور دراز علاقے وغیرہ مسلمانوں کی حکومت سے ہمیشہ باہر رہے ، اس کے باوجود وہاں بکثرت مسلمان پائے جاتے ہیں ؛ (۱۱) اسی سلسلے میں دوسری پیشین گوئی یہ ہے کہ اسلام کا نور مکمل ہو کر رہے گا : وَ اللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَ لَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ (۶۱ [الصف] : ۸)، یعنی اور اللہ تعالٰی اپنی روشنی کو پورا کرکے رہے گا ، خواہ کافر ناخوش ہی ہوں ۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب بظاہر دین اسلام کے مقاصد کی تکمیل مشکل نظر آتی تھی اور صحابہ کرامؓ کو یہ بھی میسر نہ تھا کہ وہ اطمینان سے بیٹھ کر دو وقت کا کھانا کھا سکیں؛ مگر دوسری پیشین گوئیوں کی طرح یہ پیشین گوئی بھی پوری ہوئی؛ (۱۲) اسی سلسلے کی ایک اور پیشین گوئی قرآن حکیم کا خود کو ایک شجرۂ طیبہ سے تشبیہ دینا

marfat.com
Marfat.com

بھی ہے (۱۴ [ابراہیم] : ۲۴)، جس کا مقصد یہ ہے کہ شجر اسلام روز بروز پھیلتا! اور بڑھتا چلا جائے گا اور ہر آنے والا دن اس کی جڑوں کو استحکام بخشنے کا ذریعہ ثابت ہوگا؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

(۱۳) فتنۂ ارتداد اور اس پر قابو پانے کی پیشین گوئی: آپؐ کے وصال کے معاً بعد ہی جزیرۂ عرب میں فتنۂ ارتداد کی ایک ایسی لہر اٹھی جس نے عرب کے بہت سے قبیلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور حالت یہ ہو گئی کہ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے سوا کوئی شہر اس کی لپیٹ میں آنے سے نہ بچ سکا۔ ان نازک حالات کی بھی قرآن حکیم میں پیشین گوئی کر دی گئی تھی، ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ (۵ [المائدہ]: ۵۴)، یعنی اے اہل ایمان اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے گا اور وہ اسے دوست رکھیں گے؛ چنانچہ ارتداد ہوا، مگر اس کو ختم کرنے والے بھی مخلص لوگ پیدا ہو گئے۔

(۱۴) قرآن مجید کی اپنے متعلق پیشین گوئیاں: قرآن حکیم نے اپنے متعلق سات پیشین گوئیاں کی ہیں: عدم مثلیت: کہ اگر جن و انس باہم متحد اور متفق بھی ہو جائیں تو اس کی نظیر بنا کر پیش نہیں کر سکیں گے (۱۷ [بنی اسرائیل]: ۸۸)؛ چنانچہ پہلے پورے قرآن حکیم کی (حوالۂ مذکور)، پھر دس سورتوں (۱۱ [ہود] : ۱۳)، پھر ایک سورۃ (۲ [البقرۃ] : ۲۳)؛ ۱۰ [یونس] : ۳۸) کی مثال پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا، مگر باوجود اس کے کہ ان کے پاس شعرا اور فصحا کی کمی نہ تھی، انھوں نے اس کے مقابلے میں معذوری ظاہر کی تو سب سے آخر میں یہ پیشین گوئی کی گئی: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا (۲ [البقرۃ] : ۲۴)، یعنی اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے۔ حافظ ابن حجر (فتح الباری، ۶ : ۳۸۰ تا ۳۸۱) فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کی سب سے چھوٹی سورت سورۃ الکوثر ہے، جس کی کل تین آیات ہیں، تو اگر دنیاے کفر باہم مل کر تین آیات کی سورت بنا کر پیش کر دیتے یا اپنے سے پیشتر زمانے کی نثر میں سے ان کی کوئی مثال تلاش کرکے پیش کر دیتے تو قرآن حکیم کی پیشین گوئی کو غلط ثابت کر سکتے تھے، مگر وہ یا ان کے بعد آنے والے کبھی ایسا نہیں کر سکے اور نہ ہی کر سکیں گے؛ (۱۵) حفاظت قرآن کریم کا وعدہ: ارشاد ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵ [الحجر] : ۹)، یعنی ہم نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

قرآن حکیم، اس حقیقت کے باوجود کہ پہلی کتب مقدسہ دنیا میں زیادہ عرصے تک محفوظ نہ رہ سکیں (دیکھیے رحمت اللہ کیرانوی: اظہار الحق؛ نیز اردو ترجمہ: بائبل سے قرآن تک، مطبوعہ کراچی مع: تقی عثمانی: مقدمہ؛ [نیز رک بہ توریت؛ انجیل])، آج تک نہ صرف صحیح و سلامت، بلکہ اپنی اسی آب و تاب اور شکل و صورت میں کہ جس میں اس کا نزول ہوا تھا، صفحۂ کائنات پر موجود ہے؛ باوجود اس حقیقت کے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں اس کے لاکھوں نسخے موجود ہیں، مگر ان میں ایک لفظ یا ایک حرف کا بھی فرق نہیں تلاش کیا جا سکتا؛ (۱۶) جمع و تدوین قرآن: ارشاد باری ہے: اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ (۷۵ [القیامۃ] : ۱۷)، یعنی اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ہی ذمہ ہے۔

قرآن حکیم توریت کی طرح لکھا لکھایا نازل

marfat.com
Marfat.com

نہیں ہوا ، بلکہ یہ تئیس سال کے عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ، گو یہ تمام کلام مجید عہد نبوی ہی میں مرتب اور مدون ہو چکا تھا ، لیکن چونکہ آیات کا نزول وقفے وقفے سے ہوتا تھا اور کتابت کے لیے بھی کوئی ایک شخص مقرر نہ تھا ، بلکہ متعدد کاتبین وحی اس کام پر مامور تھے ، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس کی تدوین کی بڑی فکر رہتی تھی؛ سورۂ قیامہ کی مذکورہ آیت میں اللہ تعالٰی نے یہ پیشین گوئی فرمائی کہ قرآن مدوّن و مرتب شکل میں ہمیشہ موجود اور برقرار رہے گا ؛ (۱۷) حفظ کیے جانے کی پیشین گوئی : ارشاد ہے : بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۲۹ [العنکبوت] : ۴۹) ، یعنی بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں ، جن کو علم دیا گیا ان کے سینوں میں (محفوظ) ہیں ؛ کسی کتاب کو حفظ کرنے کا تصور ایک نیا تصور تھا - اہل عرب قصیدوں کو حفظ کر لیتے تھے ، مگر ایک ضخیم کتاب کو حفظ کرنے کی ان کے خیال میں کوئی گنجائش نہ تھی - قرآن حکیم نے اعلان کیا کہ اس کتاب کو حفظ کیا جا سکے گا اور اس کو لوگ کثیر تعداد میں حفظ کریں گے - اس پیشین گوئی کی صداقت کسی تعارف کی محتاج نہیں؛ (۱۸) حفظ کرنا سہل ہوگا ، ارشاد ہے : وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴ [القمر] : ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)؛ (۱۹) کتابت و اشاعت قرآن ، ارشاد ہے : وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۵۲ [الطور]: ۲ تا ۳)، یعنی قسم ہے اس کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے ، کشادہ اوراق میں ؛ یہاں رق کا لفظ استعمال ہوا ہے ، جس کا مفہوم باریک جھلّی ہے ، جو عام طور پر کتابت کے لیے استعمال ہوتی تھی - مفسرین کے مطابق ، یہاں قرآن حکیم کی قسم کھائی گئی ہے ، یہ قسم ایک طرح کی پیشین گوئی ہے اور اس میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ قرآن کی نشر و اشاعت بذریعہ کتابت اور چھپائی ہمیشہ جاری رہے گی ؛ (۲۰) باطل سے حفاظت کا وعدہ : ارشاد ہے : لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (۴۱ [حم السجدۃ] : ۴۲) ، یعنی اس پر باطل کا اثر نہ آگے سے ہو سکتا ہے اور نہ پیچھے سے ؛ بقول قاضی سلیمان سلمان منصور پوری، فلسفہ قدیم (باطل من بین یدیہ) اور فلسفہ جدید (باطل من خلفہ) نے بہت زور مارا، مگر وہ اس پر اثر انداز ہونے سے قاصر رہا (رحمۃ للعالمین ، ۳ : ۲۷۰ تا ۲۸۱) - عام مفسّرین کے مطابق، اس سے مراد ہر قسم کا باطل ہے ، خواہ انسانوں میں سے ہو ، جنات میں سے یا کسی اور جنس سے ، قرآن حکیم ہر قسم کی تحریف اور تلبیس سے محفوظ رہے گا ؛ یہ ایک طرح سے حفاظت معانی قرآن کی پیشین گوئی ہے ؛ یہود کے متعلق پیشین گوئیاں : (۲۱) مسلمانوں کو ان سے در پردہ سازشوں کے علاوہ ، یا سب و شتم کے علاوہ کوئی نمایاں قسم کی ایذا نہ پہنچ سکے گی (۳ [آل عمران] : ۱۱۱)؛ (۲۲) ان پر ذلت و مسکنت طاری رہے گی ، تاوقتیکہ وہ اللہ یا بندوں کی رسی نہ تھام لیں (۳ [آل عمران] ۱۱۲)؛ اگرچہ اب یہودیوں نے اپنی الگ مملکت قائم کر لی ہے، مگر دنیا جانتی ہے کہ یہ حکومت پوری طرح امریکہ اور دیگر یورپین ممالک کے زیر اثر بلکہ ان کی دست نگر اور انہیں کے سہارے پر قائم ہے ؛ (۲۳) موت کی تمنا نہیں کر سکیں گے ، انہیں دو مقامات پر (۲ [البقرۃ] : ۹۴ ؛ ۶۲ [الجمعہ] : ۶) یہ چیلنج کیا گیا کہ اگر وہ سچے ہیں تو سامنے آئیں اور موت کی تمنا کر دکھائیں ، مگر انھوں نے سامنے آنے سے انکار کیا اور دنیا کی زندگی سے محبت کی تالیں بڑھاتے رہے ؛ (۲۴) یہودیوں کی باہمی فرقہ بندیوں کی پیشین گوئی : ارشاد ہے :

marfat.com
Marfat.com

وَ اَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (۵ [المائدہ] : ۶۴)، یعنی ہم نے ان کے درمیان باہمی بغض و عداوت، قیامت تک کے لیے ڈال دیا ہے ؛ چنانچہ اسی کا یہ اثر ہے کہ اس وقت بھی یہودیوں میں دو مختلف کتب (سامریہ ، یونانیہ) موجود ہیں اور ہر کتاب کے پیرو کار دوسرے کو کافر خیال کرتے ہیں ؛ (۲۵) نصاریٰ کے متعلق پیشین گوئیاں ؛ نصاریٰ کی بابت بھی یہ پیشین گوئی فرمائی گئی کہ ان کے آپس میں بھی قیامت تک دشمنی اور عداوت قائم رہے گی (۵ [المائدہ] : ۱۴) ؛ اس کی صداقت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اب تک عیسائیوں میں دو متوازی چرچ چلے آتے ہیں ، ہر ایک میں کئی کئی فرقے ہیں اور ہر ایک دوسرے کی تکفیر کرتا ہے ۔

(۵) احوال آخرت کا بیان : قرآن حکیم میں صرف دنیا کے ماضی اور مستقبل کے حالات ہی بیان نہیں کیے گئے ، بلکہ اس میں اُس زندگی کے احوال بھی زیر بحث لائے گئے ہیں جسے عالم آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔

آخرت کی زندگی کا کم و بیش بنیادی تصور تو ہر مذہب میں موجود ہے ، مگر اس کی مکمل اور صحیح شکل و صورت صرف قرآن مجید ہی میں بیان کی گئی ہے ۔ قرآن حکیم عالم برزخ سے لے کر ، صور پھونکنے ، روز قیامت کے برپا ہونے ، نامۂ اعمال کے ہاتھوں میں تھمائے جانے ، خداوند ذوالجلال کے فرشتوں کے جلو میں نزول اجلال فرمانے ، پھر ہر شخص سے حساب و کتاب لیے جانے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا و سزا دیے جانے ، جنت کے انعامات اور دوزخ میں دوزخیوں پر گزرنے والے احوال تک ہر ایک کیفیت اور حالت کی تفصیلی خبر دیتا ہے ؛ اس بنا پر بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے عالم آخرت کا پہلی مرتبہ ایک مکمل نقشہ پیش کیا اور اس کی کیفیات سے پہلی دفعہ بنی نوع انسان کو آگاہ کیا ۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ سب احوال اس انداز اور لب و لہجے میں ارشاد ہوئے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کیفیات اس کتاب کے نازل کرنے والے کے سامنے ہیں اور وہ ان احوال کی جزئیات تک سے آگاہ ہے ۔ کوئی پہلو اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے ، مثلا ایک جگہ ارشاد ہے : وَ لَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ (۶ [الانعام] : ۹۳) ، یعنی اور کاش تم ان ظالم ، یعنی مشرک ، لوگوں کو اس وقت دیکھو جب یہ موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں اور فرشتے ان کی طرف (عذاب کے لیے) ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں؛ ایک اور مقام پر ارشاد ہے : ولو تری اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط (۳۲ [السجدۃ]: ۱۲)، یعنی اور (تم تعجب کرو) جب دیکھو کہ گنہکار اپنے پروردگار کے سامنے سر جھکائے ہوں گے ۔ اس قسم کے دو چار نہیں سینکڑوں مقامات ہیں ، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سنی سنائی باتیں نہیں ، بلکہ ٹھوس حقائق ہیں ، جو کھلی ہوئی کتاب کی طرح قرآن مجید کے نازل کرنے والے کے سامنے ہیں ۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ عرب کے ایک امی[۳] ، جس نے نہ کبھی کسی سے پڑھنا سیکھا اور نہ پرانے مذہب کی کتابوں اور تاریخ سے کوئی واقفیت بہم پہنچائی ، وہ ان تمام احوال اور کیفیات کی اس جامع پیرائے میں خبر دے کہ یہ محسوس ہو کہ یہ کانوں کا سماع نہیں آنکھوں دیکھا بیان ہے ۔ یہ تبھی ممکن ہے جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آپ[۳] پر یہ کتاب اللہ رب العزت نے نازل فرمائی ہے ، اور آپ[۳] مہبط وحی اور مرکز فیوضات الٰہیہ

marfat.com
Marfat.com

ہیں اور قرآن کے نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جو عالم الغیب اور خالق کائنات ہے۔ الغرض احوال آخرت کے بیان سے بھی قرآن حکیم کے من جانب اللہ ہونے کی توثیق و تصدیق ہوتی ہے۔

(۶) احکام اسلام: اعجاز قرآنی کا سب سے بڑا ثبوت اس میں بیان شدہ احکام و قوانین ہیں۔ یہ احکام جس طرح تشکیل دیے گئے ہیں اور جس طرح انہیں ایک باہمی مربوط و منظم شکل میں پیش کیا گیا ہے اور جس طرح ایک فرد کی انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی سطح پر قیام مملکت تک کی تمام ضرورتوں اور تقاضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اور جس طرح ان احکامات کے سلسلے میں تدریجی پیش رفت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، یہ سب کچھ انسانی طاقت و قوت سے باہر ہے اور یہ اعجاز قرآنی کا ایک روشن پہلو ہے۔ کسی ایک فرد کے لیے، جو امی بھی ہو، ہرگز یہ ممکن نہیں کہ وہ اس طرح کے احکام و قوانین وضع کرکے پیش کر سکے، جن میں آفاقیت اور ابدیت کے تمام تقاضے ملحوظ رکھے گئے ہوں، جو ہمیشہ اقوام کی عادتوں اور طبائع سے یکساں مناسبت رکھتے ہوں۔ پھر ان میں طبع سلیم کی جو رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اور جو ہر جگہ یکساں طور پر دکھائی دیتی ہے وہ اس بات کا قوی ترین ثبوت ہے کہ اس کتاب کو کسی انسان نے مرتب نہیں کیا۔ اسلام کے ان احکام کا اگر دوسری ملتوں اور قوموں کے احکام و قوانین سے موازلہ کیا جائے تو یقیناً ترجیح کا پہلو قرآن کے لیے ہی نکلتا ہے (دیکھیے: رحمت اللہ کیرانوی: بائبل سے قرآن تک، مطبوعۂ کراچی؛ فرانسس موکالیے: بائبل قرآن اور سائنس (اردو ترجمہ)، مطبوعہ کراچی)۔ اسلام نے ہر مسئلے میں ایسے احکامات دیے ہیں جو کسی جغرافیائی یا علاقائی سطح تک محدود نہیں، بلکہ ان کی وسعت پورے کرۂ ارضی کو محیط ہے، مثلاً اسلام کا تصور توحید، رسالت، معاد، عبادات، معاملات اور جزا و سزا وغیرہ۔ اسی لیے قرآن حکیم میں یہ دعوٰی کیا گیا: قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۸ [القصص]: ۴۹)، یعنی کہ دو کہ اگر تم خدا کے پاس سے کوئی کتاب لے آؤ جو ان دونوں کتابوں سے بڑھ کر ہدایت کرنے والی ہو، تا کہ میں بھی اس کی پیروی کروں، تو تم سچے ہوگے۔

قرآن حکیم کو یہ غیر معمولی شرف حاصل ہے کہ ایک طرف اس کے احکام واوامر آفاقی اور ابدی نوعیت کے ہیں اور دوسری طرف اس میں ہر قسم کی طبائع انسانی کے جذبوں، امنگوں اور تصورات کا بڑے ہی جامع انداز میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس میں ان پڑھ دیہاتی سے لے کر ترقی یافتہ دنیا کے ایک مہذب ترین فرد تک کے لیے احکام اور قوانین موجود ہیں۔

پھر اس کتاب میں بعض ایسے احکام بھی ہیں جو آج سے چودہ سو سال پہلے اس وقت نازل ہوئے جب دنیا اس کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھی، مگر آج ان کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے، مثلاً حقوق و مراعات میں تمام انسانوں اور تمام قوموں کی برابری (۴۹ [الحجرات] : ۱۳)، استحقاق و اہلیت کا معیار کسب ہے نہ کہ حسب و نسب (۴ [النساء] : ۷)، حرمت و حریت انسانی (۱۷ [بنی اسرائیل] : ۷۰)؛ عورتوں کی وراثت میں شرکت (۴ [النساء] : ۱۱)، آزادی غلامان کا عالم گیر تصور (۹۰ [البلد] ۱۳)، غربا و مساکین کو ان کو حق دینا (۵۱ [الذاریات] : ۱۹)؛ یہ اصطلاح صدقہ و خیرات دینے سے وسیع

marfat.com
Marfat.com

مفہوم رکھتی ہے) اور نوع بنی انسان کے حقوق وغیرہ۔ یہ وہ چند نکات ہیں جن کو وسعت دینے سے موجودہ زمانے میں بین الاقوامی سطح پر حقوق انسانی کا ایک منظم و مربوط نظام تشکیل دیا گیا۔

قرآن حکیم کا ایک نمایاں اعجاز واقعات، احکام اور مسائل میں اس کی گہری حقیقت پسندی بھی ہے۔ اس کتاب مبین میں ہر جگہ اور ہر مقام پر انسانوں کو فطرت اور حقیقت سے روشناس کرایا گیا ہے اور یوں تخیل پرستی کے بجائے حقیقت پسندی کے جذبے کو تقویت دی ہے اور کائنات کی وسعتوں میں موجود حقائق جاننے کی طرف رغبت دلائی گئی ہے (مثلاً دیکھیے ۲ [البقرۃ] : ۱۶۴ ؛ ۳ [آل عمران] : ۱۸۹ تا ۱۹۵)؛ انسانوں کو غیر حقیقی تصورات سے ہٹا کر موجودہ وقت یعنی حال پر توجہ دینے کی طرف راغب کیا گیا (اسلام کے مختلف احکام پر عقلی و نقلی بحث کے لیے دیکھیے : قاضی سلیمان سلمان منصور پوری : رحمۃ للعالمین، ۳ : ۳۲۷ تا ۴۲۰)۔

(۷) قرآن حکیم کے اثرات و برکات : کسی کتاب کو جانچنے اور اس کے معیار کو پرکھنے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کتاب کا پڑھنے اور سننے والوں پر اثر کس قسم کا ہوتا ہے۔ قرآن مجید خود اپنی نسبت خبر دیتے ہوئے بیان کرتا ہے : اللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ ط (۳۹ [الزمر] : ۲۳)، یعنی خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں، (یعنی) کتاب جس کی آیتیں (باہم) ملتی جلتی (ہیں) اور دہرائی جاتی (ہیں) جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے بدن کے (اس سے) رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر ان کے بدن اور دل نرم (ہو کر) خدا کی ذات کی طرف (متوجہ) ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا : اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا (۸ [الانفال] : ۲)، یعنی مؤمن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔

اس لحاظ سے قرآن حکیم واحد آسمانی کتاب ہے جس نے تاریخ انسانیت پر گہرے، انمٹ اور لازوال اثرات چھوڑے ہیں۔ قرآن حکیم کے ذریعے نہ صرف اشاعت اسلام ہوئی، بلکہ اسلام قبول کرنے والوں میں اخلاق و معاشرتی، سماجی اور مذہبی اقدار کو استوار رکھنا، آزادی و غلامی، ترقی و تنزل، الغرض ہر دور میں ان کے ذہنی جذبے (Morale) کو نہ صرف بلند رکھنا بلکہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے پر آمادہ کرنا، قرآن حکیم کا ایک نمایاں اعجاز ہے۔ اگر مسلمانوں کے پاس یہ کتاب نہ ہوتی، تو شاید دنیا میں ان کی آج وہ علمی اہمیت نہ ہوتی جو دیکھنے میں آ رہی ہے۔

نہ صرف مسلمانوں، بلکہ اکثر اوقات غیر مسلموں پر اس کے سننے سے واضح اثرات دیکھنے میں آئے (مثلاً دیکھیے، ابن سعد : الطبقات، جلد اول ؛ ابن ہشام : السیرۃ النبویہ ؛ البلاذری انساب الاشراف، ج ۱ ؛ الطبری : تاریخ، وغیرہ)۔ کسی انسانی کتاب کے اتنے مثبت نتائج کبھی نہیں نکلے اور نہ ہی نکل سکتے ہیں، اس لیے اثرات و برکات کی اس آفاقیت سے بھی اعجاز قرآن کا ایک نمایاں پہلو سامنے آتا ہے۔

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

(۵) سیرت طیبہ: آپؐ کی سیرت طیبہ بھی دیکھنے والوں کے لیے ایک بہت بڑے معجزے کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ آپؐ جن جن مراحل سے گزرے: عقل باور نہیں کرتی کہ کوئی شخص تائید ایزدی کے بغیر، ان مراحل سے کامیابی سے گزر سکتا ہے: آپؐ ابھی شکم مادر میں تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے؛ چھے سال عمر ہوئی تو والدہ اللہ کو پیاری ہوگئیں؛ آٹھ سال کے ہوئے تو پیارے دادا آپؐ کو داغ مفارقت دے گئے۔ پھر آپؐ نے اپنے چچا ابوطالب کے زیر کفالت پرورش پائی۔ ان حوادث نے آپؐ میں ناداری کا احساس پیدا کردیا؛ چنانچہ آپؐ کو روزی کمانے کے لیے کھلے کھلے آسمانوں تلے بکریاں چرانا پڑیں اور پھر تجارت کا پیشہ اپنانا پڑا، تا آنکہ حضرت خدیجہؓ سے رشتۂ مناکحت استوار ہوگیا۔ چونکہ یتیم کی دیکھ بھال میں عام طور پر کوتاہی ہو جاتی ہے اور پھر اگر یتیم مال و دولت سے بھی محروم ہو تو اس کی حالت اور بھی کسمپرسی کی ہوتی ہے اسی بنا پر یتیم بچوں کے بننے کی نسبت بگڑنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس پر معاشرتی اور سماجی برائیاں اور گمراہیاں اور اخلاق بے راہ روی مستزاد تھی۔ پورے جزیرۃ العرب میں بد عملی اور بدکرداری کا دور دورہ تھا۔ لوگ علانیہ جرم کرتے اور پھر ان جرائم پر فخر کا اظہار کرتے (دیکھیے مثلاً امرؤالقیس کا معلقہ)۔ خود آپؐ کے دوست ساتھی اکثر گانے بجانے کی مجلسوں میں شرکت کے لیے مکہ مکرمہ آتے جاتے رہتے تھے، مگر ان سب کے باوجود آپؐ ہر اخلاقی عیب، ہر انسانی و بشری کمزوری سے مبرا و منزہ رہے۔ اس دور میں بھی کوئی بڑے سے بڑا دشمن آپؐ کی سیرت و کردار پر انگشت نمائی نہ کر سکا۔ خود قرآن مجید میں آپؐ کی حیات طیبہ کے ان ادوار کو دلیل نبوت کے طور پر پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ○ وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی ○ وَ وَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی (۹۳ [الضحی]: ۶ تا ۸)، یعنی بھلا اس (خدا) نے تمھیں یتیم پاکر جگہ نہیں دی اور رستے سے ناواقف دیکھا تو سیدھا رستہ دکھایا، اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔ نبوت و رسالت سے سرفرازی کے بعد آپؐ نے کوہ صفا سے قریش مکہ کو جو پہلا خطاب کیا اس میں بھی اپنی گزشتہ زندگی کے حوالے سے ہی بات شروع کی اور فرمایا: اگر میں تمھیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر تم پر عنقریب حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم مان لو گے، انھوں نے کہا ہاں (ابن الجوزی: الوفا، ۱: ۱۸۱ ببعد)۔ اور قرآن میں آپؐ کی طرف سے یہ اعلان دھرایا گیا: فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰ [یونس]: ۱۶)، یعنی میں اس سے پہلے تمھارے درمیان میں رہا ہوں۔ اگر آپؐ کے سر پر سایۂ ایزدی نہ ہوتا تو آپؐ کا ان مراحل سے کامیابی و کامرانی سے گزرنا محال تھا؛ بار نبوت سنبھالنے کے بعد بھی آپ کو جن کٹھن حالات سے گزرنا پڑا اور جس طرح آپؐ نے راہ حق و صداقت میں پامردی دکھائی، اور پھر مختصر مدت میں اتنا عظیم الشان کارنامہ سر انجام دیا، جس کی مثال تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے، اس اعتبار سے زندگی مبارک کا یہ دور بھی تائید ایزی کا مظہر ہے۔ مسئلہ صرف فتوحات اور جنگوں کا ہی نہیں تھا، بلکہ آپؐ کا اصل مشن قلوب و اذہان کو اخلاق اور معنوی گندگیوں سے صاف کرکے ان کو نیکی اور پاکیزگی کی راہ پر ڈالنے کا تھا، جو آپؐ نے اپنی دیگر تمام مصروفیات کے ساتھ انجام دیا۔ اس کے علاوہ آپؐ کی سیرت مبارکہ ایک کامل ترین انسان کی زندگی کا بہترین نمونہ پیش کرتی

marfat.com
Marfat.com

ہے ، یعنی ایک ایسے انسان کا جو ہر اعتبار سے کامل و مکمل ہے ، یعنی اپنے قواے نفس ، قواے جسم ، قواے ظاہری و باطنی ، اپنے احساسات و ادراکات ، اپنی قوت بدنی ، اپنے خلق عظیم ، زندگی کی طرف اپنے رویے ، انسانوں کے ساتھ اپنے معاملات، خود عمل کرنے ، دوسروں کو عمل پر آمادہ کرنے، دوسروں کے سامنے خود کو نمونۂ عمل بنانے اور جملۂ بشری محاسن و کمالات مثلاً جود و کرم، عفو و در گزر ، بلند حوصلگی ، شجاعت ، عزت نفس ، نظافت طبع، جودت ذہن، فطانت قلب، معاملہ فہمی، قوت خطابت ، فصاحت و بلاغت ، ہر قسم کی مشکلات کا تحمل ، دنیا کو اپنے رنگ میں رنگنے کا حوصلہ ، دشمنوں کی دشمنی اور ایذا رسانی سے مرعوب نہ ہونے الغرض جو اپنی ہر وصف اور ہر صفت میں مرتبہ کمال پر فائز ہے۔ اسی بنا پر تمام بنی نوع بشر کے لیے آپؐ کی زندگی کو نمونۂ قرار دیا گیا (۳۳ [الاحزاب] : ۲۱) - کسی انسان کو یہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی جو آپؐ کو نصیب ہوئی ؛ اور پھر آپؐ کی سیرت طیبہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود بھی جس طرح اپنے تمام تر جزئیات میر اس وقت دنیا کے سامنے ہے ، کہ ایک ادنی سے ادنی معاملے سے لے کر اعلی سے اعلی معاملے (ہر ایک کے سامنے ہیں ، یہ حیثیت بھی آج تک کسی انسانی زندگی کو حاصل نہ ہو سکی (سید سلیمان ندوی : خطبات مدراس).

(۶) غیب کی خبریں دینا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ایک اہم علمی و عقلی معجزہ آپؐ کا غیبی خبریں دینا بھی ہے (نیز دیکھیے بالا معجزۂ قرآنی) - قرآن کریم میں مذکورہ غیبی خبروں کے علاوہ احادیث سے بھی ہمیں تین طرح کی غیبی خبریں ملتی ہیں: (الف) زمانہ ماضی کی خبریں: آپؐ نے متعدد مواقع پر اُمی محض ہونے کے باوجود لوگوں کو گزشتہ قوموں ، بالخصوص یہود و نصاریٰ کے واقعات اور ان کے حالات سے آگاہ کیا - اکثر یہودی آپؐ کی مجلس میں دروغ گوئی کرتے تھے ، مگر آپؐ ان کی غلطیاں پکڑ لیتے تھے، مثلاً ایک دفعہ ایک یہودی جوڑے کو بدکاری کے جرم میں ماخوذ کیا گیا ، آپؐ نے یہودی علما سے بدکاری کی سزا کے متعلق استفسار کیا - انھوں نے کہا کہ ہماری کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ امیر آدمی کا منہ کالا کر دیا جائے اور غریب پر رجم کیا جائے - آپؐ نے فرمایا: تم جھوٹ بولتے ہو، اپنی کتاب لے کر آؤ- کتاب لائی گئی تو واقعی آپؐ کا فرمانا صحیح نکلا (البخاری، کتاب الحدود؛ ابو داؤد، ۴ : ۵۹۳ تا ۵۹۵، حدیث ۴۴۴۶ تا ۴۴۵۰؛ مسلم، ۳: ۱۳۲۶ حدیث ۱۶۹۹، مطبوعۂ قاہرہ) - اس کے علاوہ آپؐ ان کو بتلاتے تھے کہ میری بعثت کی خبر تمہاری تمام کتابوں میں لکھی ہوئی ہے- ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا : میں دعاے ابراہیم اور نوید مسیحؑ ہوں (ابن الجوزی: الوفا، ص ۳۶)؛ (ب) زمانۂ حال کی خبریں: غیب کی دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی موجودہ زمانے کے حوادث و وقائع سے مطلع ہو جائے- آپؐ کے متعلق متعدد صحابہؓ سے منقول ہے کہ آپؐ کو دور دراز کی خبریں وحی الٰہی سے پہنچ جایا کرتی تھیں ، چنانچہ غزوہ مؤتہ کے موقع پر آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور فرمایا (میں تمھیں معرکے کے حالات بتاتا ہوں) : اب جھنڈا زیدؓ بن حارثہ کے ہاتھ میں ہے اور اب وہ شہید ہو گئے ہیں - پھر فرمایا: اب علم لشکر حضرت جعفرؓ نے لے لیا ہے ، اب وہ بھی شہید ہو گئے ہیں ، اب عبداللہؓ بن رواحہ نے جھنڈا پکڑ لیا ہے ، اب وہ بھی شہید ہو

marfat.com
Marfat.com

گئے ہیں؛ جب آپؐ یہ خبر دے رہے تھے، اس وقت آپؐ کی آنکھیں نمناک تھیں، پھر فرمایا: اب یہ علم اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (خالدؓ بن ولید) کے ہاتھ میں ہے (البخاری، ۶۴ / ۴۴، ۳ : ۱۳۵)۔ اس میں یہ صراحت بھی ہے کہ آپؐ نے یہ اطلاع قاصد کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے دی تھی (حوالۂ مذکور)۔ اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر ایک صحابی حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے قریش مکہ کو آپؐ کی جنگی تیاریوں سے خبردار کرنے کے لیے ایک عورت کے ہاتھ ایک خط روانہ کیا۔ جیسے ہی یہ عورت مدینہ منورہ سے باہر نکلی، آپؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو بلایا اور فرمایا کہ تم سیدھے مقام روضہ خاخ پر پہنچو، وہاں تمہیں ایک عورت ملے گی، اس کے پاس ایک جاسوسی خط ہے، اسے برآمد کرکے لاؤ؛ چنانچہ یہ صحابہؓ جب وہاں پہنچے تو انھیں ایک مسافر عورت سے مذکورہ خط مل گیا (البخاری، ۶۴ / ۴۶، ۳ : ۱۳۷)۔ کتب حدیث و سیرۃ میں اس نوع کے اور بھی بہت سے واقعات مروی ہیں؛

(ج) حالات مستقبلہ کی پیشین گوئیاں: آپؐ کے عظیم معجزات میں سے یہ معجزہ بھی ہے کہ آپؐ نے مختلف مواقع پر آئندہ زمانے سے متعلق، جو پیشین گوئیاں کیں، وہ اپنے اپنے وقت پر حرف بحرف پوری ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ان پیشین گوئیوں کا ظہور مختلف حالتوں میں ہوا۔ مثلاً کبھی وحی قرآنی کی صورت میں، کبھی رؤیاے صالحہ اور کبھی زبان مبارک سے فوری اطلاع کی صورت میں (قرآنی پیشین گوئیوں کے لیے دیکھیے بالا اعجاز قرآن)؛ ذخیرۂ احادیث میں آپؐ کی بے شمار پیشین گوئیاں مذکور ہیں، چند ایک کا تذکرہ حسب ذیل ہے:

(۱) کثرت ساز و سامان اور مال و دولت کی پیشین گوئی: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مجھ سے پوچھا اے جابرؓ؛ کیا تمھارے پاس قالین ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: عنقریب تم قالینوں پر بیٹھوگے؛ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ بالآخر وہ دن آیا کہ ہم قالینوں پر بیٹھے (البخاری، ۲ : ۱۱۴)۔ ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا: بخدا! مجھے تم پر فقر و فاقہ یا مشرک ہو جانے کا ڈر نہیں، البتہ یہ خطرہ ہے کہ تم پر پہلی امتوں کی طرح دولت کی بہتات کر دی جائے، پھر تم اس میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے سے حسد و رقابت کرنے لگو اور یوں پہلی قوموں کی طرح غفلت میں جا پڑو (البخاری، ۵۸ / ۱، ۲ : ۲۹۲؛ ۸۱ / ۷، ۴ : ۲۱۳)۔ ایک دفعہ فرمایا: قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تمھاری یہ حالت نہ ہو جائے کہ صدقات کا مال لینے والا کوئی نہ رہے (البخاری، ۴ : ۳۸۰)۔ ایک اور موقع پر خبر دی: تم پر عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ تمھارے سامنے رات کو ایک پیالہ اور صبح کو دوسرا پیالہ ہوگا اور کعبہ کے پردوں کی طرح تمھارا لباس بیش قیمت ہوگا (احمد بن حنبل: مسند، حدیث طلحۃ النضر)۔

(۲) فتوحات عظیمہ کی پیشین گوئی: نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مختلف مواقع پر فتوحات کی خبریں دیں، جو ان حالات میں بظاہر ناممکن نظر آتی تھیں۔ غزوۂ خندق کے موقع پر خندق کھودنے کے دوران میں ایک سخت پتھر نکلا، جسے صحابہؓ توڑنے سے قاصر رہے تو آپؐ نے چادر اتار کر خندق کے کنارے رکھی اور کدال (معول) سے تین ضربیں لگائیں۔ ہر ضرب کے بعد چنگاری اڑتی اور آپؐ بلند آواز سے فرماتے: و تمّت کلمۃُ ربک صدقا و عدلا ط لا مبدل لکلمتہ۔

marfat.com
Marfat.com

صحابہؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا: میری پہلی ضرب سے جو روشنی پھیلی اس میں مجھے کسری کے محلات اور اس کے آس پاس کی تمام اشیا دکھائی دیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ان کی فتح کے لیے دعا کیجیے۔ آپؐ نے دعا فرمائی؛ پھر فرمایا: دوسری ضرب میں قیصر کے شہر اور آس پاس کے علاقے نظر آئے، حاضرین نے ان کی فتح کے لیے بھی دعا کی درخواست کی جو قبول ہوئی؛ پھر فرمایا: تیسری ضرب میں حبشہ کے شہر اور گاؤں نگاہوں کے سامنے آئے۔ پھر فرمایا: حبشہ والوں سے تعرض نہ کرنا تاوقتیکہ وہ تم سے تعرض کریں (النسائی، کتاب الجهاد، ۲: ۶۴ تا ۶۵؛ مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۰۶ھ)۔ دوسرے موقع پر صراحۃً ان کی فتح کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: تم لوگ جزیرۂ عرب میں لڑوگے؛ تمھیں فتح ہوگی۔ پھر فارس سے لڑوگے، کامیاب ہوگے۔ پھر روم سے معرکہ ہوگا، تم شادکام رہوگے اور آخر میں دجال سے معرکہ آرائی میں بھی کامیاب رہوگے (مسلم، ۴: ۲۲۲۵، حدیث ۲۹۰۱)؛ اس کے علاوہ نام بنام مختلف علاقوں کی فتح کی بشارتیں بھی منقول ہیں۔ شام کی فتح کی خبر دیتے ہوئے فرمایا: شام مفتوح ہوگا تو لوگ اپنی سواریوں کو ہانکتے ہوئے مع اہل و عیال وہاں رہائش پذیر ہونے کے لیے جائیں گے اور اگر وہ جانیں تو مدینہ ان کے لیے بہتر ہے (مسلم، ۲: ۱۰۰۸، حدیث ۱۳۸۸)۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: تم لوگ عنقریب شام کو ہجرت کروگے اور وہ تمھارے لیے فتح کر دیا جائے گا (ابن حنبل مسند، ۵: ۲۴۱)۔ یمن کی فتح کی بشارت بھی دی اور فرمایا: یمن مفتوح ہوگا اور لوگ اپنی سواریوں اور اہل و عیال کو لیے ہوئے وہاں جائیں گے (مسلم، ۲: ۱۰۰۸، حدیث ۱۳۸۸ و ۱۳۸۹)۔ یہی الفاظ عراق کی فتح سے متعلق بھی ملتے ہیں (حوالۂ مذکور)۔ اسی طرح فتح مصر کی بشارت دی اور فرمایا: تمھارے لیے عنقریب مصر فتح ہوگا اور یہ قیراط کی سر زمین ہے۔ جب تم اس کو فتح کرو تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا، کیونکہ تمھارے اور ان کے درمیان رشتہ ہے (حضرت ہاجرہ ام اسماعیلؑ مصر کی تھیں؛ مسلم، ۴: ۱۹۷۰، حدیث ۲۵۴۳)۔ اسی طرح بیت المقدس (البخاری، کتاب الجزیہ، ۵۸ / ۱۵، ۲: ۲۹۸) قسطنطینیہ و روما (النسائی، کتاب الجهاد، ۲: ۶۳ تا ۶۴؛ احمد بن حنبل: مسند، بروایت ابو عبداللہ بن ابی سیر الخثعمی، ایضا عن ابی قنبل التابعی) وغیرہ کی پیشین گوئیاں بھی آپؐ نے امت کو سنائیں۔ یہ تمام علاقے مسلمانوں نے فتح کیے اور ان پر اپنی حکومت و سیادت قائم کی؛ (۳) قیام خلافت اور مدت خلافت کی پیشین گوئی: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مختلف مواقع پر یہ بھی خبر دی کہ میرے بعد خلفا ہوں گے اور بہت ہوں گے (مسلم، ۳: ۱۵۵۲ ببعد)۔ ان میں سے بارہ ایسے ہوں گے کہ جن سے اسلام کی حمایت و نصرت کا کام لیا جائے گا (حوالۂ مذکور)، مگر خلافت راشدہ کا زمانہ تیس برس ہوگا؛ (۴) خلفائے راشدین کی نام بنام پیشین گوئی: آپؐ نے صرف مدت خلافت ہی کی تصریح نہیں فرمائی تھی، بلکہ اپنے بعد آنے والے خلفا کے ناموں سے لوگوں کو آگاہ کر دیا تھا۔ خلافت راشدہ کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ ان کی خلافت کا آپؐ نے متعدد ارشادات میں اشارہ فرمایا تھا: امام بخاری (۲: ۴۱۹، کتاب فضائل اصحاب النبیؐ) کے مطابق آپؐ نے ایک سے زیادہ افراد کو کچھ دینے کا وعدہ فرمایا تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا

marfat.com

Marfat.com

تھا کہ اگر تمھاری مجھ سے ملاقات نہ ہو تو ابوبکرؓ کے پاس آنا، وہ میرے وعدے کو پورا کر دیں گے؛ وصال اقدس سے پانچ روز قبل دیے ہوے خطبے میں بطور خاص حضرت ابوبکرؓ کے مناقب بیان فرمائے اور یہاں تک فرما دیا کہ میں ہر شخص کے حقوق ادا کر چکا ہوں سوائے ابوبکرؓ کے؛ مزید فرمایا کہ ابوبکرؓ کے سوا ہر شخص اپنا مسجد میں کھلنے والا عقبی دروازہ (خوخہ) بند کر لے؛ نیز اپنی حیات طیبہ ھی میں انھیں اپنے مصلے پر کھڑا کیا! ابن الجوزی (۲ : ۹۷۷) کے مطابق آپؐ نے وصال سے کچھ عرصہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کو فرمایا تھا کہ میرے پاس ھڈی کا شانہ یا لکڑی (لوح) لے آؤ تاکہ میں خلافت صدیقی کی تحریر لکھ دوں، مگر جب عبدالرحمٰنؓ مذکورہ چیز لینے کے لیے تشریف لے جانے لگے، تو فرمایا: خدا اور اس کے اھل ایمان بندے ابوبکرؓ کے سوا کسی پر راضی نہ ہوں گے (نیز دیکھیے مسلم، ۴ : ۱۸۵۷ حدیث ۲۳۸۷، جہاں عبدالرحمنؓ کی جگہ حضرت عائشہؓ کا نام ھے).

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت کی خبر ایک خواب کے ذریعے بھی آپؐ نے اُمت کو سنائی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ میں ایک کنویں پر کھڑا ھوا پانی کے ڈول نکال رھا ہوں۔ پھر میرے ھاتھ سے رسی اور ڈول ابوبکرؓ نے لے لیے۔ انھوں نے ایک یا دو ڈول نکالے (خلافت صدیقی کی مدت دو سال چار ماہ ھے) اور ان کے ڈول نکالنے میں کمزوری تھی؛ اللہ انھیں معاف فرمائے ان کے ھاتھ سے پھر یہ ڈول عمر فاروقؓ نے لے لیا اور متعدد ڈول نکالے۔ آپؐ نے فرمایا: میں نے کسی طاقتور کو عمر فاروقؓ کی طرح ڈول نکالتے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ حوض لبالب پانی سے بھر گیا (البخاری، ۹۱ / ۲۸ تا ۳۰، ۴ : ۳۵۶ تا ۳۵۷).

خلفاے راشدین میں سے تین خلفا شہید ہوے ھیں، ان میں سے ھر ایک کی شہادت کی خبر بھی آپؐ نے سنائی۔ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کی خبر دیتے ہوے فرمایا: عمر فاروقؓ فتنوں کے درمیان ایک بند دروازے کی طرح حائل ھیں۔ حضرت عمرؓ نے اس روایت کے راوی (حضرت حذیفہؓ) سے پوچھا کہ یہ دروازہ کھلے گا یا ٹوٹے گا؟ انھوں نے فرمایا کہ نہیں بلکہ ٹوٹے گا؛ چنانچہ ایسا ھی ھوا (البخاری، ۲ : ۴۰۲)۔ ایک مرتبہ وہ پہاڑ پر آپؐ کے ساتھ تشریف رکھتے تھے؛ پہاڑ پر زلزلے کی سی کیفیت طاری ھوئی۔ آپؐ نے پہاڑ پر پاؤں مارا اور فرمایا: ٹھہر جا: کیونکہ تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور ایک شہید ھے (کتاب مذکور، ۲ : ۴۲۷)؛ دوسری روایت میں دو شہیدوں کا ذکر ھے (کتاب مذکور، ص ۴۲۴).

خلفاے راشدین میں سے دو خلیفے بڑے مصائب و آلام سے دو چار ہوے اور پھر وہ دونوں شہید کر دیے گئے۔ ان پر وارد ہونے والے ان حالات کی بھی آپؐ نے پیشین گوئی کر دی تھی۔ حضرت عثمانؓ سے فرمایا: تمھیں ایک مصیبت پڑنے پر جنت کی بشارت ھے (البخاری، ۲ : ۴۲۴؛ مسلم، ۴ : ۱۸۶۷، حدیث ۲۴۰۳) اور صحابہؓ سے فرمایا: کہ عنقریب ایک فتنہ اٹھے گا۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ اس کے متعلق آپؐ کا کیا حکم ھے؟ فرمایا: میں تمھیں امیر اور اس کے جان نثاروں کی حمایت کرنے کی تلقین کرتا ہوں (الحاکم: مستدرک، ۳ : ۹۹، مطبوعہ حیدر آباد دکن، ۱۳۴۱ھ)۔ ایک دوسری روایت میں آپؐ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا: اے عثمانؓ! خدا

marfat.com
Marfat.com

تعالی تمھیں ایک قمیص پہنائے گا۔ کچھ لوگ اسے اتارنا چاھیں گے، مگر تم ہرگز نہ اتارنا (کتاب مذکور، ص ۱۰۰) - اسی طرح حضرت علیؓ کو بھی آپؐ نے متعدد ارشادات میں پیش آنے والے مصائب سے آگاہ فرما دیا تھا - ایک موقع پر فرمایا : اے علیؓ ! تمھیں میرے بعد بڑی مشکلات در پیش ھوں گی - حضرت علیؓ نے پوچھا : کیا میرا دین سلامت رہے گا؟ فرمایا : ھاں (مستدرک، ۳ : ۱۴۰) اور پھر یہ بھی فرما دیا تھا کہ تمھیں تلوار کی دھار سے شہید کیا جائے گا (حوالۂ مذکور).

حضرت علیؓ کے بڑے فرزند حضرت حسنؓ بن علیؓ دو اسلامی لشکروں کے درمیان مصالحت کراتے ھیں۔ آپؐ نے اس کی بھی پیشین گوئی فرما دی تھی۔ ابوبکرہؓ ایک صحابی رسولؐ روایت کرتے ھیں کہ آپؐ ایک مرتبہ منبر پر چڑھے، آپؐ کی گود میں حضرت حسنؓ تھے۔ آپؐ نے فرمایا : یہ میرا بیٹا سردار ھے؛ شاید اس کے ذریعے اللہ تعالی مسلمانوں کی دو جماعتوں میں مصالحت کے اسباب پیدا کر دے (البخاری، ۶۱/۲۵، ۲ : ۴۱۱)؛

(۵) امن و امان قائم ھونے کی اطلاع : ان سب سے بڑھ کر پورے جزیرۂ عرب میں امن و امان قائم ھونے کی اطلاع دی اور فرمایا : اے عدیؓ کیا تم نے شہر حیرہ دیکھا ھے؟ عدیؓ نے عرض کیا کہ نہیں یا رسول اللہ، البتہ مجھے اس کے حالات معلوم ھیں : آپؐ نے فرمایا : اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ حیرہ سے ایک ھودج نشین عورت چل کر خانۂ کعبہ کا طواف کرے گی اور اس کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ھوگا۔ حضرت عدیؓ فرماتے ھیں میں نے اس پیشین گوئی کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ھے (البخاری، باب علامات النبوة)؛

(۶) فتنوں اور باھمی اختلاف و انتشار کی اطلاع : امن و امان قائم ھونے کی خوشگوار اور مسرت انگیز خبر کے علاوہ آپؐ نے مسلمانوں کے باھمی اختلافات اور مناقشات کی بھی اطلاع دی۔ ایک موقع پر صحابہ کرامؓ کے ساتھ مدینہ منورہ سے باھر نکلے اور مدینہ منورہ کی طرف دیکھا اور فرمایا : میں دیکھ رھا ھوں تمھارے گھروں پر فتنے بارش کی طرح برس رہے ھیں (البخاری، ۶۱/۲۵، ۲ : ۴۰۳) - اور یہ بھی فرمایا کہ یہ فتنے شہادت فاروق کے بعد وارد ھوں گے (البخاری، ۹۲/۱۷، ۴ : ۳۷۵)۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی نسبت اطلاع دی کہ وہ فتنوں اور آزمائشوں میں فریق حق ھوں گے (دیکھیے بالا) اور یہ بھی فرمایا کہ فتنوں کا زیادہ تر ظہور مشرقی جانب سے ھوگا، جدھر سے سورج نمودار ھوتا ھے (البخاری، ۹۲/۱۶، ۴ : ۳۷۴) ! چنانچہ حضرت عمرؓ کا قاتل بھی ادھر سے تعلق رکھتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا مسکن بھی یہی علاقہ رھا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین کی معرکہ آرائی بھی انھی میدانوں میں اور مشرقی علاقوں کے لوگوں کی شرانگیزیوں سے ھوئی۔ خوارج سے لے کر معتزلہ، جبریہ، قدریہ تک بہت سے نت نئے گروہ بھی اسی علاقے میں پیدا ھوے۔ الغرض کئی صدیوں تک یہ مشرقی علاقے فتنوں اور شورشوں کا منبع اور مرکز رہے؛

(۷) مختلف لوگوں کی وفات کی خبریں : نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے من جانب اللہ اطلاع پا کر مختلف لوگوں کی ھلاکت یا وفات کی بھی قبل از وقت خبریں دیں، مثلاً صفوان کے قتل کی اطلاع دی (البخاری، ۶۴/۴، ۳ : ۵۳)؛ غزوہ بدر میں دشمنان اسلام کے قتل اور موضع قتل کی پیشین گوئی فرمائی۔ صحابہؓ فرماتے ھیں کہ وہ سب لوگ اسی جگہ قتل ھوے جس کی آپؐ نے اطلاع دی تھی (مسلم، ۳ : ۱۴۰۳،

marfat.com
Marfat.com

حدیث ۱۷۷۹)۔ جنگ مؤتہ میں تین صحابہؓ حضرت زیدؓ بن حارثہ، عبداللہؓ بن رواحہ اور جعفرؓ بن ابی طالب کو یکے بعد دیگرے امیر مقرر کیا اور فرمایا کہ اگر جعفرؓ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان جس کو چاہیں امیر چن لیں (ابن ہشام : السیرۃ، ۳: ۱۵ ببعد)۔ اس موقع پر بعض یہودی موجود تھے، انھوں نے کہا کہ اگر آپؐ سچے نبی ہیں تو یہ تینوں بزرگوار شہید کر دیے جائیں گے؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا، یہ تینوں یکے بعد دیگرے شہید کر دیے گئے (الواقدی : المغازی، ذکر غزوۂ مؤتہ)۔

(۸) متعدد مواقع پر اپنے وصال کی خبر دینا : وصال سے چند روز پیشتر خطبہ دیا، جس میں آپؐ نے فرمایا کہ خدا تعالی نے اپنے ایک بندے کو دنیا میں رہنے یا اس کے پاس آنے میں مختار کیا ہے اور اس بندے نے خدا کے پاس جانے کو ترجیح دی (البخاری، ۶۲ / ۳، ۲ : ۴۱۸)۔ حجۃ الوداع کے خطبے میں ارشاد فرمایا : لوگو! میری باتیں توجہ سے سنو، ہو سکتا ہے کہ تم اس سال کے بعد مجھے اپنے اندر نہ پاؤ (الوثائق السیاسیہ، عدد ۲۸۷/الف- حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن رخصت کرتے وقت فرمایا : معاذؓ! اب اس کے بعد تم مجھ سے نہ مل سکو گے، واپس آؤ گے تو میری مسجد اور میری قبر کے پاس سے تمھارا گزر ہوگا (احمد بن حنبل: مسند، ۵ : ۲۳۵)۔ وصال سے چند روز پیشتر حضرت فاطمہؓ کے کان میں سرگوشی کی، جس سے وہ رو پڑیں۔ دوبارہ کچھ فرمایا تو وہ مسکرا دیں۔ بعد از وصال، حضرت عائشہؓ کے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ پہلے آپؐ نے مجھے یہ بتایا تھا کہ آپؐ اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکیں گے اس پر وہ رو پڑی تھیں؛ دوسری مرتبہ جب آپؐ نے خبر دی کہ وہ (حضرت فاطمہؓ) اہل بیت نبوی میں سب سے پہلے آپؐ سے ملاقات کریں گی۔ اس خبر کے سنتے ہی وہ خوش ہو گئیں (مسلم، ۴: ۱۹۰۴، حدیث ۲۴۵۰)۔ ازواج مطہرات میں سب سے پہلے انتقال پانے والی زوجۂ مطہرہ کی خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہ خاتون ہوں گی جن کا ہاتھ لمبا (فیاض) ہوگا؛ چنانچہ ام المساکین حضرت زینبؓ سب سے پہلے انتقال فرما گئیں (البخاری : الجامع الصحیح)۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ کے شہادت پانے کی پیشین گوئیاں فرمائیں (دیکھیے بالا)۔ ایک صحابیہ ام ورقہ کو گھر میں شہادت کی خبر سنائی، چنانچہ ان کی باندی اور غلام نے انھیں گلا گھونٹ کر شہید کر دیا (ابو داؤد، باب الامامۃ)۔ حضرت عمارؓ بن یاسر کی نسبت فرمایا : انھیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا (مسلم، ۲۲۳۶، حدیث ۲۹۱۶)۔ اس کے علاوہ بہت سے صحابہؓ و صحابیات کے متعلق اس نوع کی پیشین گوئیاں مروی ہیں۔

(۹) فتنۂ ارتداد کی اطلاع : آپؐ نے مختلف ارشادات میں فتنۂ ارتداد کی خبر دی اور فرمایا : کچھ لوگ حوض کوثر پر میرے سامنے آئیں گے، میں انھیں پہچان کر ان کی طرف بڑھوں گا، مگر مجھے یہ کہہ کر روک دیا جائے گا کہ یہ آپؐ کے بعد دنیا میں اپنی ایڑیوں پر پھر گئے تھے، (مسلم، ۴ : ۱۷۹۴، حدیث ۲۲۹۴)، نیز فرمایا : مجھے دو کنگن پہنائے گئے؛ میں نے پھونک ماری تو وہ گر گئے، فرمایا یہ دو جھوٹے نبی (مسیلمہ اور اسود عنسی) ہیں (البخاری، ۹۱/ ۴۰، ۴ : ۳۶۱)؛ چنانچہ اسود عہد نبوی میں اور مسیلمہ عہد ابی بکرؓ میں مارا گیا۔ نیز فرمایا : قیامت سے پہلے تیس کاذب دجال پیدا ہوں گے، جن میں سے ہر ایک یہی کہے گا کہ وہ اللہ کا نبی

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہے، آگاہ ہو جاؤ! میں خدا کا آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا (الزرقانی : شرح المواهب، ۷ : ۲۳۱)۔

(۱۰) منکرین حدیث کے بارے میں اطلاع: آپؐ نے متعدد ارشادات میں یہ خبر بھی دی تھی کہ میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو اور اس کے پاس میرے کاموں میں سے کوئی کام، جس کے کرنے کا میں نے حکم دیا یا منع کیا، بیان کیا جائے، تو وہ کہے ہم نہیں جانتے، ہم جو قرآن میں ہے اسی کو مانتے ہیں (ابو داؤد، ۵ : ۱۰ تا ۱۲، حدیث ۴۶۰۴، ۴۶۰۵؛ الترمذی، العلم، حدیث ۲۶۶۵، ۲۶۶۶؛ ابن ماجه، حدیث ۲۱)۔

(۱۱) فتنۂ خوارج کی اطلاع : فتنۂ خوارج کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا : کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو تمہاری طرح نماز پڑھیں گے اور تمہاری طرح قرآن پڑھیں گے، مگر قرآنی اثرات ان کے گلے سے نیچے نہیں اتریں گے، وہ مسلمانوں کو قتل کریں گے؛ یہ لوگ اسلام سے چھو کر اس طرح باہر جا نکلیں گے جس طرح تیر اپنے نشانے کو لگ کر باہر جا نکلتا ہے (مسلم، ۲ : ۷۴۱ تا ۷۴۲، حدیث ۱۰۶۴)۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ان کا خروج مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے موقع پر ہوگا (مسلم، ۲ : ۷۴۵)؛ چنانچہ عین جنگ صفین کے موقع پر یہ جماعت مسلمانوں سے الگ ہو گئی اور ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا

(۱۲) قدریہ کے بارے میں کی اطلاع: قدریہ کی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: قدریہ اس امت کے مجوس ہوں گے (الزرقانی : شرح المواهب، ۷ : ۲۳۰)؛

(۱۳) سازشوں کی اطلاع: آپؐ کو آپؐ کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا بھی اللہ کی طرف سے قبل از وقت علم ہو جاتا تھا ۔ قریش مکہ میں سے صفوان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو قتل کرنے کے لیے عمیر کو مدینہ منورہ بھیجا اور اس کے اہل و عیال کی کفالت اور قرض کی ادائی کی ذمہ داری خود اٹھائی ۔ وہ آپؐ کی خدمت میں پہنچا تو آپؐ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ اس نے اور صفوان نے قتل سازش کی تھی یہ سن کر عمیر مسلمان ہو گیا (الوفا، ۱ : ۳۱۹؛ قاضی عیاض: الشفا، ص ۱۷۱)۔ یہود مدینہ بنو نضیر نے ایک مرتبہ آپؐ کو قتل کرنے کی سازش تیار کی۔ جب آپؐ ان کے محلے میں ایک کام کی غرض سے تشریف لے گئے تو انھوں نے مکان کے اوپر سے چکی کا پاٹ گرا کر (معاذ اللہ) آپؐ کا کام تمام کر دینا چاہا؛ اس مقصد کے لیے ایک یہودی عمرو بن جحاش بن کعب مکان کے اوپر چڑھ گیا ۔ آپؐ کو اطلاع ہو گئی ۔ آپؐ کسی کام کا بہانہ کرکے وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بعد میں فرمایا کہ یہود نے یہ سازش تیار کی تھی (ابن سعد : الطبقات، ۲ : ۵۷، غزوۂ بنو النضیر)۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپؐ اس عظیم الشان فتح کی تیاریوں میں مصروف تھے، ایک صحابی حاطب بن ابی بلتعہ نے ایک عورت کے ذریعے اہل مکہ کے نام خط پہنچانے کی کوشش کی۔ آپؐ نے من جانب اللہ مطلع ہو کر حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو اس عورت سے خط برآمد کرنے کے لیے بھیجا۔ تلاشی لی گئی تو اس کے بالوں میں گندھا ہوا خط برآمد ہوا (البخاری، ۳ : ۳۴۹)۔ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ جس وقت گرفتار ہو کر مدینہ منورہ لائے گئے تو ان سے فدیے کا مطالبہ کیا گیا۔ انھوں نے ناداری کا عذر کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم نے اپنی بیوی ام الفضل (لبابہ بنت الحارث، حضرت خدیجہؓ اور فاطمہؓ بنت عباس کے بعد پہلی مسلم خاتون) کے پاس جو مال رکھوایا تھا اسے کیا ہوا۔ حضرت

marfat.com
Marfat.com

عباس رض نے تعجب کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اس کا علم صرف ان کو تھا یا ام الفضل کو ، اور فرمایا کہ آپ سچے رسول ہیں (الوفا، ۱ : ۳۱۷؛ قاضی عیاض : الشفا، ص ۱۷۱)۔ انہیں وجوہات کی بنا پر آپ کے زمانے میں لوگ خلوت میں بھی کوئی ایسی بات کرنا پسند نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ چپ ہوجاؤ؛ بخدا! آپ کو کسی شخص نے نہ بھی بتایا تو بطحاء کے یہ پیغمبر پھر بھی بتا دیں گے (کتاب مذکور، ص ۲۷۱)۔ غزوۂ خیبر کے دوران میں کِنانہ بن ابی الحُقَیق یہودی نے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ کوئی چیز آپ سے نہیں چھپائے گا، مگر پھر اس نے خود ہی خلاف ورزی کی اور کچھ زیورات چھپا لیے۔ آپ نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ اس نے کوئی چیز آپ سے نہیں چھپائی۔ آپ نے صحابہ رض کو حکم دیا کہ فلاں جگہ جاؤ اور وہاں سے چھپا ہوا مال نکال لاؤ؛ چنانچہ وہاں سے وہ مال برآمد ہو گیا (الوفا، ۱ : ۳۱۳)۔ ابو سفیان کے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ جب فتح مکہ کے موقع پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ آپ نے طواف کے دوران میں ان سے فرمایا کہ تم نے اور تمہاری بیوی ہندہ نے یہ یہ باتیں کی ہیں۔ ابو سفیان نے دل میں خیال کیا کہ شاید ہندہ نے یہ راز فاش کیا ہے۔ میں ذرا اس سے ملوں تو پھر پوچھوں گا۔ آپ جب طواف سے فارغ ہو گئے تو ابو سفیان کے قریب آئے اور فرمایا : ہندہ پر زیادتی نہ کرنا؛ کیونکہ اس نے تمہارا کوئی راز فاش نہیں کیا۔ یہ سنتے ہی ابو سفیان پکار اٹھے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں ، ورنہ میرے دل کا بھید آپ کو کون بتا سکتا ہے (ابن الجوزی : الوفا، ۱ : ۳۱۴)۔ اسی طرح ایک موقع پر ایک صحابیہ رض نے آپ کو اور صحابہ رض کو کھانے پر بلایا۔ آپ کے سامنے جونہی کھانا رکھا گیا، آپ نے صحابہ رض کو ہاتھ اٹھا لینے کا حکم دے دیا۔ صحابہ رض کے تعجب پر آپ نے فرمایا : یہ ایسی بکری کا گوشت ہے جو بلا اجازت ذبح کی گئی ہے؛ تحقیق کرنے پر یہ بات سچ ثابت ہوئی (کتاب مذکور، ص ۳۱۴)۔

(۱۲) زمانۂ مستقبل کی پیشین گوئیاں : (الف) جہاد بحری کی اطلاع : آپ کے پُر صعوبت زمانے میں کبھی یہ وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلمان کبھی جہاد بحری کرنے کے اہل بھی ہو جائیں گے، مگر آپ نے حضرت ام حَرام رض بنت مِلحان (ایک صحابیہ) کو جہاد بحری کی خبر دیتے ہوئے فرمایا : میں نے امت کے ان مجاهدوں کو دیکھا جو سمندر میں جہاد کے لیے سفر کریں گے اور جہازوں پر اس طرح بیٹھے ہوں گے جس طرح بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھتے ہیں اور فرمایا کہ وہ سب جنتی ہیں؛ حضرت ام حرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ! دعا کیجیے کہ میں بھی انہیں خوش نصیبوں میں سے ہو جاؤں۔ آپ نے دعا فرمادی۔ آپ کا یہ فرمان عہد امیر معاویہ رض میں پورا ہوا، جب مسلمانوں نے قسطنطینیہ پر بحری راستے سے پہلا حملہ کیا (البخاری، ۵۶/۶۳، ۲ : ۲۱۸)؛ (ب) عرب ممالک کی حجاز سے قطع تعلق کی پیشین گوئی : حضرت ابو ہریرہ رض سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا : عراق نے اپنے درہم و قفیز، شام نے اپنے درہم و دینار، اور مصر نے بھی اپنے دینار روک لیے اور پھر آپ نے تین مرتبہ فرمایا : تم ویسے کے ویسے رہ گئے، جس طرح کے شروع میں تھے (مسلم، ۴ : ۲۲۲۰ تا ۲۲۲۱، حدیث ۲۸۹۶)؛ چنانچہ عہد بنی امیہ میں یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی جب دمشق میں سلطنت اموی کا قیام عمل میں آ گیا اور حجاز کو ان علاقوں سے نہ غلہ پہنچتا تھا نہ نقدی؛

marfat.com
Marfat.com

(ج) ایک اعرابی سُراقه بن مالک بن جُعشم کو کسرٰی کے کنگن پہنائے جانے کی اطلاع : آپؐ نے سراقه بن مالک بن جعشم کو فرمایا: تمھارا اس وقت کیا حال ہوگا جب تمھارے ہاتھوں میں کسرٰی کے کنگن پہنائے جائیں گے (البیهقی ؛ الزرقانی : شرح المواهب ، ۷ : ۲۰۸)؛ چنانچه حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں مدائن فتح ہوا اور کسرٰی کے کنگن حاضر کیے گئے تو انھوں نے سراقه کو بلا کر ان کے ہاتھ میں اپنے ہاتھوں سے پہنائے (کتاب مذکور)؛ (د) مدینه منورہ میں ایک بڑی آگ کی پیشین گوئی : بخاری (۲۴/۹۲ ، ۴ : ۳۸۰) اور مسلم (۴ : ۲۲۲۷ ، حدیث ۲۹۰۲) دونوں کی روایت ہے که آپؐ نے ارشاد فرمایا : اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک حجاز میں ایسی آگ نه بھڑکے، جو بُصری کے اونٹوں پر روشنی ڈالے گی۔ آپؐ کی یه پیشین گوئی ۶۵۴ھ / ۱۲۶۵ء میں ، یعنی آپؐ کے وصال سے ۶۴۴ سال بعد پوری ہوئی اور مدینه منورہ میں پہاڑ کی آتش فشانی سے بہت بڑی آگ لگی۔ عینی شاهدوں کے مطابق یه آگ اتنی بڑی تھی که اس کی روشنی میں بُصری کے بدووں نے اپنے اونٹوں کو دیکھا اور شناخت کیا (قاضی سلیمان سلمان منصور پوری : رحمة للعالمین ، ۳ : ۱۶۱ تا ۱۷۰)۔ یه آگ یکم جمادی الآخرة کو لگی اور کئی روز تک شعله زن رہی؛ (ه) غزوۂ ہند کی خبر : ہندوستان میں محمد بن قاسم ، سلطان محمود غزنویؒ اور دیگر مسلمان حکمرانوں نے متعدد بار جهاد کیا : اس کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیه و آله وسلم کا ارشاد مبارک امام نسائی نے یه نقل کیا ہے که نبی کریم صلی اللہ علیه و آله وسلم نے یه وعده فرمایا که مسلمان ہندوستان میں جهاد کریں گے (نسائی : سنن ، ۲ : ۶۳ ، کتاب الجهاد ، باب غزوة الهند)؛ (و) ترکوں کے حملے اور مملکت اسلامیه پر قبضے کی پیشین گوئی : ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں تاتاریوں نے ہلاکو خان کی سرکردگی میں بغداد پر حمله کرکے اسلامی سلطنت کے مرکز پر قبضه کر لیا اور لاکھوں آدمیوں کو ته تیغ کر دیا۔ اس اہم واقعے کی خبر دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: اس وقت تک قیامت برپا نه ہوگی جب تک تم ان ترکوں سے جنگ نه کرو گے جن کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی، چہرے سرخ، ناک چپٹے ، اور چہرے ڈھال کی طرح چوڑے ہوں گے (البخاری ، مسلم ، ۴ : ۲۲۳۴ ، حدیث ۲۹۱۲)؛ مزید فرمایا : ترکوں کو اس وقت نه چھیڑنا جب تک وه تمھیں نه چھیڑیں - یہی وه قوم ہے جو میری امت سے ملک چھین لے گی (الطبرانی و ابو نعیم)؛ (ز) خاندان بنو شیبه میں کلید کعبه رہنے کی پیشین گوئی : فتح مکه (۸ھ/ ۶۳۰ء) کو آپؐ نے کعبه کے پرانے کلید بردار خاندان کے شیبه بن عثمان اور عثمان بن طلحه کو کعبه کی کنجیاں حوالے کرتے ہوئے ارشاد فرمایا : یه کنجی سنبھال لو ، ہمیشه ہمیشه کے لیے: تم سے یه کنجی ظالم کے سوا کوئی چھین نہیں سکے گا : چنانچه آج تک یه کلید بنو شیبه کے پاس ہے اور یزید بن معاویه کے سوا کسی نے نہیں چھینی (رحمة للعالمین، ۳ : ص ۱۷۱)؛ (ح) فتح قسطنطنیه کی خبر : سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیه کو ۸۵۵ھ/۱۳۵۲ء میں فتح کیا ، مگر نبی اکرم صلی اللہ علیه و آله وسلم نے اس کی اطلاع بہت پہلے دے دی تھی ، اور فرمایا تھا که ایک بہترین امیر اور بہترین سپاه قسطنطنیه کو فتح کریں گے (ابو داؤد : سنن، ۴ : ۴۸۲ حدیث ۴۲۹۴؛ احمد بن حنبل : مسند (عن ابی ہریرهؓ)؛ مسلم، ۴:۲۲۲۱ ، حدیث ۲۸۹۷ ؛ الزرقانی : شرح المواهب، ۷:۲۰۵ -

marfat.com
Marfat.com

۴۴) : (ط) ہلاکت کسریٰ کی خبر : آپؐ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا : جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی اور کسریٰ نہیں ہو سکے گا (مسلم، ۴ : ۲۲۳۷، حدیث ۲۹۱۹) ؛ چنانچہ جب کسریٰ یزدگرد عہد عثمانؓ (۲۵ تا ۵۳۶ھ) میں ہلاک ہو گیا تو آج تک کوئی اور کسریٰ نہیں پیدا ہو سکا ؛ اسی طرح فرمایا : جب قیصر ہلاک ہوگا تو اس کے بعد کوئی اور قیصر نہ ہو سکے گا (حوالۂ مذکور) ؛ (ی) مسلمانوں کے درمیان باہمی قتل و غارت گری کی خبر : صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا : ایسا وقت مسلمانوں پر ضرور آئے گا جب مسلمان ایک دوسرے کا تلوار سے مقابلہ کریں گے اور ان دونوں کا دعوٰی ایک ہی ہوگا (مسلم، ۴ : ۲۲۱۳، حدیث ۲۸۸۸ ؛ ۲۲۱۴، حدیث ۱۵۷) - ایک دوسرے موقع پر فرمایا : میری امت کی ہلاکت آپس میں قتل و خون ریزی کی وجہ سے ہوگی (کتاب مذکور، ص ۲۲۱۵، حدیث، ۲۸۸۹) - ایک دوسری روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا : میری امت تبھی ہلاک ہوگی حب اس کے گناہ بڑھ جائیں گے یا وہ خود ایک دوسرے سے عذر کریں گے، یعنی کام سے جی چرائیں گے (ابو داؤد، ۴ : ۵۱۵، ۴۳۴۷) .

(ے) آپؐ کا مستجاب الدعوات ہونا : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عقلی معجزات میں آپؐ کا مستجاب الدعوات ہونا بھی شامل ہے - آپؐ نے مختلف مواقع پر جو دعائیں مانگیں، خداوند قدوس کی طرف سے جلد یا بدیر ان کی قبولیت کے آثار نمایاں ہوئے - یہ خصوصیت کسی متنبی کو ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی - مختلف مواقع پر آپؐ نے جو دعائیں مانگیں اور جس طرح وہ مقبول بارگاہ خداوندی ہوئیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :

(الف) قریش مکہ پر عذاب کا آنا اور دور ہونا : قریش مکہ نے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی ؛ اس لیے ان کی ہدایت کے لیے اب ایک ہی راستہ تھا کہ ان پر کوئی ہلکا پھلکا عذاب آئے، جو انہیں خواب غفلت سے جگا سکے ؛ چنانچہ آپؐ نے قریش مکہ کے بارے میں قحط اور غلے کی کمی کی دعا مانگی ؛ یہ دعا مقبول ہوئی اور اہل مکہ سخت ترین قحط سالی میں مبتلا کر دیے گئے حتی کہ انہوں نے اس عرصے میں سوکھے چمڑے تک کھائے - (جس طرح قریش مکہ کے تین سالہ معاشی مقاطعہ کے زیر اثر خاندان بنی ہاشم پر یہی دور ابتلا آیا تھا) - جب وہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے تو انہیں دھواں سا نظر آتا - جب یہ مصیبت حد سے متجاوز ہوئی تو انہوں نے خدمت نبویؐ میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی - آپؐ نے ان کی آہ و زاری سے متأثر ہو کر دعا مانگی، جس سے پورے علاقے پر فوری طور خوب بارش برسی (البخاری، ۳ : ۱ : ۳۲۸۲۵۹، کتاب التفسیر، سورۃ الدخان) ؛ اسی طرح رؤساے قریش نے عین صحن حرم میں آپؐ کی شان اقدس میں گستاخی کی، چونکہ یہ کعبۂ معلی اور نماز جیسے اسلام کے بنیادی رکن اور خدا کے حضور میں کھڑے ہوے خدا کے پیارے نبیؐ کی توہین تھی، اس لیے آپؐ نے شر پسندوں کے نام لے کر دعا مانگی ؛ چنانچہ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ان کو غزوۂ بدر میں ذلت کی موت مرتے دیکھا (البخاری، ۸/۱۰۸، ۴ : ۱۴۰ تا ۱۴۱) ؛

(ب) ثقیف کے حق میں دعاے خیر : آپؐ اس امید پر کہ چونکہ قریش مکہ انکار پر مصر ہیں، شاید بنو ثقیف ہی دعوت اسلام قبول کر لیں، طائف تشریف لے گئے - اس موقع پر بنو ثقیف نے آپؐ سے جو سلوک روا رکھا وہ دنیا کی تاریخ میں ایک

marfat.com
Marfat.com

الدوہناک اور افسوسناک واقعہ ہے۔ آپؐ کو اتنے پتھر مارے گئے کہ جسم اطہر لہو لہان ہو گیا۔ بنو ثقیف کے اس ناروا سلوک سے رحمت حق کو جوش آیا اور ملک الجبال، حضرت جبرائیلؑ کی معیت میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوے اور بنو ثقیف کو تباہ کرنے کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے فرمایا: کہ اگر بنو ثقیف ایمان نہیں لائے، تو عین ممکن ہے کہ ان کی اولاد کو یہ شرف حاصل ہو جائے (ابن الجوزی: الوفا، ۱: ۲۱۱ تا ۲۱۴)۔ آپؐ کا یہ ارشاد گویا اس قوم کے لیے دعاے خیر تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سنہ ۹ھ/ ۶۳۱ء میں پوری قوم بنو ثقیف رضا و رغبت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئی، اور یوں آپؐ کی دعا کی قبولیت کے آثار نمایاں ہو گئے؛ (ج) بنو دوس کے لیے دعا: سردار قبیلۂ بنو دوس، طفیلؓ بن عمرو دوسی مشرف با اسلام ہوکر اپنی قوم میں دعوت اسلام کی اجازت کے ساتھ اپنے مستقر کو لوٹ گئے۔ انھوں نے تبلیغ دین کا سلسلہ جاری رکھا، مگر ان کی قوم ذرا بھی متأثر نہ ہوئی۔ اس پر وہ خدمت نبویؐ میں حاضر ہوے اور درخواست کی کہ قوم دوس کے حق میں بد دعا مانگی جائے۔ آپؐ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور فرمایا: اے اللہ! قوم دوس کو ہدایت عطا فرما اور مسلمان کرکے لا۔ آپؐ کی یہ دعا قبول ہوئی اور تمام بنو دوس مشرف باسلام ہوگئے (البخاری، ۵۶/ ۱۰۰، ۲: ۲۳۲)؛ (د) قریش مکہ کے حق میں دعاے خیر: غزوۂ احد میں مسلمانوں کو اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آپؐ ایک خندق میں گر پڑے اور خود آپؐ کے دانتوں میں پیوست ہو گئی، سارا چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ آپؐ کی یہ شدید تکلیف دیکھ کر صحابہؓ نے درخواست کی کہ آپؐ ان کے حق میں بد دعا فرمایے، آپؐ نے فرمایا: اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرما، کیونکہ وہ (میرا مرتبہ) نہیں جانتے (مسلم، ۳: ۱۴۱۷، حدیث ۱۴۹۲)؛ (ہ) غزوۂ بدر اور غزوۂ احزاب میں دشمن کی ہزیمت کی دعا: غزوۂ بدر میں قریش مکہ اور غزوۂ احزاب [رک بہ خندق؛ غزوات] میں پورے جزیرۂ عرب کے عرب قبائل اتحاد کرکے مدینہ منورہ کے خلاف جارحانہ عزائم لے کر حملہ آور ہوے تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر آپؐ نے دعا مانگی: اے اللہ! یہ قریش طاقت و غرور کے نشے میں سرمست چلے آتے ہیں، ان کے مقابلے پر ہماری مدد فرما (ابن ہشام، ۲: ۲۷۳) اور غزوۂ احزاب کے موقع پر آپؐ یہ دعا مانگتے رہے: اے اللہ! لشکروں کو شکست دے اور ان کے قدم ڈگمگا دے (البخاری، ۵۶/ ۹۸، ۲: ۲۳۱)؛ چنانچہ دونوں معرکوں میں مسلمان سرخرو رہے؛ (و) بارش کے لیے دعا: ایک دفعہ عہد نبویؐ میں قحط پڑا۔ انھی دنوں آپؐ ایک خطبہ جمعہ دے رہے تھے کہ ایک اعرابی خدمت اقدسؐ میں حاضر ہوا اور کہا: اے اللہ کے رسولؐ! مال تباہ ہو گیا اور عیال بھوک سے نڈھال ہو گئے، ہمارے لیے دعا فرمائیے۔ آپؐ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت آسمان بالکل صاف تھا۔ بخدا آپؐ نے ہاتھ ابھی نیچے بھی نہیں کیے تھے کہ ایک گوشے سے بادل نمودار ہوے اور آپؐ ابھی منبر پر تھے کہ آپؐ کی ریش مبارک پر بارش کے قطرے نظر آنے لگے۔ بارش کا یہ سلسلہ دراز ہو گیا، پورا ہفتہ بارش ہوتی رہی۔ اگلے جمعے کو پھر آپؐ خطبۂ جمعہ دے رہے تھے کہ پھر وہی اعرابی کھڑا ہوا اور کہنے لگا: حضورؐ! مکانات بھی گرنے لگے؛ اللہ دعا کیجیے کہ بارش ختم ہو جائے۔ آپؐ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور فرمایا: الٰہی! گرد و نواح پر برسے، ہم پر نہ

marfat.com
Marfat.com

برسے ۔ صحابہؓ فرماتے ھیں کہ اسی وقت بادل چھٹ گئے اور نماز ختم ہونے سے پہلے صاف دھوپ نکل آئی (البخاری، ۱۵/۱۲، ۱ : ۲۵۹)؛ (ز) مدینہ منورہ کی آب و ہوا کے لیے دعا : جب آپؐ ہجرت کرکے مدینہ منورہ آئے تو یہاں کا موسم اتنا خوشگوار نہیں تھا ؛ اکثر صحابہؓ بیمار پڑ گئے اور انھیں بار بار اپنا وطن یاد آنے لگا ۔ آپؐ نے صحابہؓ کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا : الٰہی ! مدینہ منورہ کو بھی ہمارے لیے ویسا ھی محبوب بنا دے جیسا کہ مکہ تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ؛ الٰہی ! ہمارے صاع اور مد میں برکت دے، اور اس کو ہمارے لیے صحت بخش اور خوشگوار بنا دے (مسلم) ۔ یہ دعا حرف بحرف پوری ہوئی ۔ اس علاقے کا موسم اور ماحول اتنا خوشگوار ہو گیا کہ مہاجرین اس سے پوری طرح مانوس ہوگئے اور اپنے سابقہ وطن کو بھول گئے ۔ موسم کی خوشگواری کا یہ عالم تھا کہ ۶۵۴ھ میں جب یہاں آتش فشاں کے پھٹنے سے بہت بڑی آگ لگی تو راویوں کا کہنا ہے کہ اس آگ کے باوجود مدینہ میں ہوا ٹھنڈی آتی رہی (رحمۃ للعالمین، ۳ : ۱۷۰)؛ (ح) امت کے لیے دعاے خیر و برکت : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اکثر فوج کو صبح کے تڑکے روانہ فرماتے ۔ صبح خیزی آپؐ کو ہمیشہ پسند تھی اور ہمیشہ کا معمول بھی رہی ۔ ایک موقع پر آپؐ نے صبح سویرے اٹھنے والوں کے حق میں دعاے خیر و برکت کرتے ہوئے فرمایا : اے اللہ ! میری امت کو صبح کے اٹھنے میں برکت دے ۔ ایک تجارت پیشہ صحابیؓ فرماتے ھیں کہ اس فرمان نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے میں ہمیشہ اپنا سامان تجارت صبح سویرے روانہ کرتا ہوں اور اس کی برکت سے مال کی اتنی کثرت ہے کہ رکھنے کو جگہ نہیں ملتی (ابو داؤد)؛ (ط) سلطنت کسرٰی کی تباہی کی بد دعا : کسرٰی ایران نے نہ صرف مکتوب نبویؐ کی توہین کی تھی ، بلکہ اس نے گورنر یمن باذان کو حکم دیا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو گرفتار کرکے اس کے سامنے پیش کرے ۔ اس کی اطلاع ملنے پر آپؐ نے بد دعا کی اور فرمایا : اے اللہ جس طرح کسرٰی نے میرے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ھیں ، تو اسی طرح کسرٰی کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دے (البخاری، ۵۶/۱۰۱، ۲ : ۲۳۲؛ ابن الاثیر: الکامل، ۲ : ۸۱)؛ چنانچہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں یہ بد دعا پوری ہوئی اور سلطنت کسرٰی اسلامی قلم رو میں شامل کرلی گئی اور آخری حکمران کسرٰی یزد گرد خلافت عثمانی میں ایک کسان کے ہاتھوں مارا گیا ؛ (ی) امت کے حق میں تین دعائیں : آپؐ کا ارشاد مبارک ہے کہ میں نے امت کے بارے میں خدا تعالٰی سے تین دعائیں مانگی تھیں ، دو قبول ہو گئیں اور ایک قبول نہیں ہوئی ۔ قبول ہونے والی دو دعائیں یہ ھیں کہ اے خدا ! میری امت پر کوئی اس طرح کا قحط (عذاب) نہ بھیجنا ، جو ان کو مکمل طور پر ہلاک کر دے اور کسی باہر کے ایسے دشمن کو ان پر مسلط نہ کرنا جو ان کو پوری طرح ہلاک کر دے ؛ قبول نہ ہونے والی دعا یہ تھی کہ خدا تعالٰی امت کو آپس کے اختلاف اور انتشار سے محفوظ رکھے (مسلم، ۴ : ۲۲۱۵ تا ۲۲۱۶، حدیث ۲۹۸۹ تا ۲۹۹۰).

(ک) مختلف صحابہ کرامؓ کے لیے انفرادی دعائیں : ان اجتماعی دعاؤں کے علاوہ آپؐ نے مختلف صحابہ کرامؓ کے لیے بھی خیر و برکت اور دیگر مقاصد میں کامیابی کے لیے دعائیں کیں ، جو پوری طرح مستجاب ہوئیں ؛ ایک صحابی ضمرہؓ بن ثعلبہ کے لیے آپؐ نے دعا فرمائی : اے اللہ مشرکین

marfat.com
Marfat.com

پر ان کا خون حرام کر دے؛ چنانچہ یہ صحابی بے دھڑک دشمنوں کی صفوں میں گھس جاتے اور پھر صحیح سلامت لوٹ آتے تھے (الطبرانی: معجم الاوسط)؛ حضرت عمر فاروقؓ کے اسلام لانے کے لیے دعا کرتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! ابو جہل بن ہشام اور عمر فاروقؓ میں سے جو تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہو، اس سے اسلام کو عزت بخش۔ خود آپؐ کے نزدیک عمر فاروقؓ زیادہ محبوب تھے (الترمذی، ۵: ۶۱۷، حدیث ۳۶۸۱)؛ یہ دعا حضرت عمرؓ کے بارے میں قبول ہوئی۔

ایک صحابی نے آپؐ سے عفت و عصمت کے لیے دعا کی درخواست کی۔ آپؐ نے دعا فرمائی تو اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انھیں دوبارہ کبھی اس قسم کا خیال بھی نہ آتا تھا (احمد بن حنبل: مسند؛ البیہقی: شعب الایمان)۔ سراقہ بن مالک بن جعشم نے سفر ہجرت [رکّ بآن] کے دوران میں آپؐ کا اور حضرت ابوبکرؓ کا تعاقب کیا، وہ جب نزدیک آیا تو آپؐ نے اس کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا مانگی، اس کے اثر سے اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ معافی مانگنے پر آپؐ نے مکرر دعاے خیر کی تو اس کی جان بخشی ہوئی (البخاری، الہجرۃ، ۳: ۳۹ تا ۴۰)۔ بجیر بن بجرہ، جو قبیلۂ بنی طے میں سے تھا، اس کے لیے آپؐ نے دعا مانگی کہ خدا تعالٰی تمھارے دانت سلامت رکھے؛ چنانچہ نوے سال کی عمر تک ان کے دانت سلامت تھے (البیہقی؛ السیوطی: خصائص الکبرٰی، ۱: ۲۷۸)۔ حضرت انسؓ بن مالک چھوٹے سے تھے۔ ان کی والدہ ان کو آپؐ کی خدمت میں لائیں اور بطور خادم کے پیش کیا اور دعا کی درخواست کی۔ آپؐ نے حضرت انسؓ کے مال اور اولاد میں ترقی کی دعا کی (مسلم، ۴: ۱۹۲۸ تا ۱۹۲۹، حدیث ۲۴۸۰ تا ۲۴۸۱)۔ اس کا یہ اثر تھا کہ حضرت انسؓ فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس مال و دولت کی بھی کثرت ہے اور اولاد کی بھی؛ چنانچہ لڑکوں، پوتوں وغیرہ کی تعداد ۱۰۰ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ان کا باغ سال میں دو مرتبہ پھل دیا کرتا تھا (الترمذی، ۵: ۶۸۳)۔ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بارک اللہ لک (اللہ تجھے برکت دے) فرمایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر میں پتھر بھی اٹھا لاتا ہوں تو اس سے بھی مجھے توقع ہوتی ہے کہ یہ سونا اور چاندی ہو جائے گا (البخاری)۔ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کو دعاے علم دیتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! ان کو دین کی سمجھ عطا فرما اور انھیں تاویل (تفسیر) کا علم سکھا (مسلم، ۴: ۱۹۲۷، حدیث ۲۴۷۷)۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مہمات مسائل بھی ان پر آسان ہو گئے تھے اور انھوں نے حبر الامۃ کا لقب پایا۔ ایک مرتبہ مالکؓ بن ربیعہ السلولی کو کثرت اولاد کی دعا دی۔ حضرت مالکؓ فرماتے ہیں کہ میرے لڑکوں کی تعداد اسّی کے قریب ہے (ابن عساکر: مستدرک)۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے لیے صحت یابی کی دعا مانگی تو ان کی شدید بیماری دور ہو گئی (النسائی، ۲: ۱۲۶، کتاب الوصیۃ)۔ انھی کے بارے میں منقول ہے کہ آپؐ نے ان کے مستجاب الدعوات ہونے کی دعا مانگی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر دعا قبول ہو جاتی تھی (البخاری، الصلوۃ)۔ ایک مرتبہ حضرت ابو طلحہؓ کا ایک بیٹا رحلت کر گیا۔ اسی رات ابو طلحہؓ سفر سے واپس لوٹے تھے۔ ان کی بیوی نے اس خیال سے کہ ان کے خاوند کو پریشانی ہوگی بتانا مناسب نہ سمجھا اور خود تنہا جاگ کر رات گزار دی؛ آپؐ کو پتا چلا تو آپؐ نے اس جوڑے کے لیے خیر و

marfat.com
Marfat.com

برکت کی دعا کی۔ ایک انصاری کہتے ہیں کہ میں نے ابو طلحہؓ کی نو اولادیں دیکھی ہیں اور سب کی سب قرآن کی حافظ (البخاری، کتاب الجنائز ۱ : ۳۲۸) ۔ اسی طرح حضرت عروہؓ کے حق میں دعاے خیر و برکت کی۔ حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ اگر میں مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا ہوں تو وہ سونا ہو جاتی ہے (البخاری)۔ ایک مغرور شخص الٹے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ سیدھے ہاتھ سے کھانا کھاؤ۔ اس نے کہا میں نہیں کھا سکتا، آپؐ نے فرمایا: خدا کرے ایسا ہی ہو؛ چنانچہ اس کے بعد وہ فی الواقع اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر منہ تک نہیں لے جا سکتا تھا (مسلم)۔ حضرت ابو ہریرہؓ اپنی والدہ کے بارے میں اکثر پریشان رہتے تھے ۔ ایک دفعہ خدمت اقدسؐ میں حاضر ہوے تو ماں کے شرک اور کفر کی وجہ سے سخت کبیدہ خاطر تھے اور تقریبا روتے ہوے عرض کیا : یا رسول اللہؐ! میری والدہ کی ہدایت کے لیے دعا کیجیے۔ آپؐ نے اسی وقت دعا مانگی۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں گھر لوٹا تو ماں کو غسل کرتے پایا ۔ غسل فرما چکیں تو کنڈی کھولی اور کلمۂ طیبہ پڑھ کر مسلمان ہو گئیں (مسلم، ۴: ۱۹۳۸ تا ۱۹۳۹، حدیث ۲۴۹۱) ۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی قوت حافظہ کے لیے دعا مانگی تو ان کا حافظہ اتنا قوی ہو گیا کہ جو بات ایک دفعہ سن لیتے تھے کبھی بھولتے نہیں تھے (مسلم، ۴ : ۱۹۳۸، حدیث ۲۴۹۲ تا ۲۴۹۳) ۔ عوام الناس میں ان کی محبت و مقبولیت کے لیے دعا مانگی تو اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر دیکھنے والا ان سے محبت کرتا تھا (مسلم، ۴ : ۱۹۳۹، حدیث ۲۴۹۱)۔ حضرت جریرؓ بن عبداللہ گھوڑے پر ٹھیک طرح بیٹھ نہیں سکتے تھے ۔ آپؐ نے ان کے گھوڑے پر ثابت قدم رہنے کے لیے دعا مانگی ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ تیز سے تیز دوڑ میں گھوڑے پر ثابت قدم رہتے تھے (کتاب مذکور، ۴ : ۱۹۲۶، حدیث ۲۴۷۶) ۔ اس قسم کی بے شمار دعائیں منقول ہیں، جن سے آپؐ کی عند اللہ مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

(۲) حسی معجزات : حسی معجزات سے مراد وہ معجزات ہیں جن کو حواس خمسہ کے ذریعے محسوس کیا جا سکتا ہے اور جن کی خبر عینی شاهدوں اور پھر محسوس کرنے والوں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے ۔ حسی معجزات کو پھر دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

(الف) قرآن مجید میں بیان شدہ معجزات؛

(ب) احادیث میں مندرج معجزات .

(الف) قرآن مجید میں بیان شدہ معجزات : قرآن مجید بذات خود بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عظیم اور لافانی معجزات میں سے ہے (دیکھیے بالا)۔ اس کے علاوہ اس میں آپؐ کے متعدد معجزات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، چند حسب ذیل ہیں :

(۱) شق قمر : روایت ہے کہ بعض مشرکین نے یہ مطالبہ کیا کہ انہیں چاند کو دو ٹکڑے کرکے دکھایا جائے ۔ آپؐ نے اشارہ فرمایا تو چاند دو نیم ہو گیا ۔ اس واقعہ کے متعلق ارشاد ہے : اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ ○ وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۵۴ [قمر] : ۱ تا ۲)، یعنی قیامت قریب آ گئی اور چاند دو شق ہو گیا ۔ اور اگر (کافر) کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک ہمیشہ کا جادو ہے ۔ انشاق قمر کا یہ معجزہ امام بخاری (۵۲/۶۵، ۳ : ۳۴۱)، مسلم، الترمذی (۳ : ۲۹۷، حدیث ۲۲۸۵ دو مرتبہ کی تصریح سے)، ابو داؤد

marfat.com
Marfat.com

الطیالسی، الحاکم، البیہقی، ابو نعیم وغیرہ نے بالتصریح نقل کیا ہے، اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، انسؓ بن مالک، جبیرؓ بن مطعم لوفلی، علیؓ ابن ابی طالب اور حذیفہؓ بن یمان وغیرہ کی روایت سے منقول ہے، ان کی یہ روایت ذاتی شہادت پر مبنی ہے، یعنی ان صحابہ کرامؓ نے اپنی آنکھوں سے چاند کو دو ٹکڑے دیکھا؛ اس وقت کہ ایک ٹکڑا پہاڑ کے ایک طرف تھا اور دوسرا دوسری طرف (تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبی، ۳: ۵٦۰ تا ۵٦۷؛ قاضی سلیمان سلمان منصور پوری: رحمۃ للعالمین، ۳: ۱۵۸ تا ۱٦۲ بمع معجزہ شق القمر کے وقت اور مختلف ممالک کے اوقات کا ٹائم ٹیبل)؛ (۲) جنات کی حاضری اور قبول اسلام: جنات [رک بہ جن] ایک لطیف اور غیر مرئی مخلوق ہیں، مگر اللہ تعالٰی کے حکم سے بعض افراد انسانی پر ان کو آشکارا کر دیا جاتا ہے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت اقدس میں متعدد مرتبہ جنات کی جماعتیں حاضر ہوئیں اور انھوں نے اسلام قبول کیا؛ قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَ اِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْکَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا (۴٦ [الاحقاف]: ۲۹)، یعنی اور جب ہم نے جنوں میں سے کئی شخص تمھاری طرف متوجہ کیے کہ قرآن سنیں تو جب وہ پاس آئے تو کہنے لگے کہ خاموش رہو۔ نیز فرمایا: قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۷۲ [الجن]: ۱)، یعنی اے پیغمبرؐ (لوگوں سے) کہ دو کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے اس کتاب کو سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا۔ حضورؐ کے سامنے جنات کا ظاہر ہونا اور آپؐ کی نبوت و رسالت پر ایمان کا اظہار کرنا، خوارق عادت میں سے ہے، جو تائید ایزدی کے بغیر ناممکن ہے؛ (۳) شہب ثاقب کی کثرت: آپؐ کے زمانۂ اقدس میں ایک غیر معمولی امر جس نے جنات جیسی سرکش اور متمرد قوتوں کو جستجوے حق پر آمادہ کیا، شہب ثاقب کی کثرت بھی تھا۔ ارشاد باری ہے: وَ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّ شُهُبًا ۙ (۷۲ [الجن]: ۸)، یعنی (اور جنات کہنے لگے) ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اس کو مضبوط چوکیداروں اور انگاروں سے بھرا پایا۔ شہب ثاقب کا اگرچہ عام دنوں میں بھی نزول ہوتا رہتا ہے، مگر آپؐ کے زمانۂ اقدس میں اس کا خصوصی اور بکثرت نزول، غیر معمولی باتوں میں سے ایک ہے؛ (۴) قریش پر قحط سالی کا عذاب: سورۃ الدخان میں ارشاد ہے: فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ ۝ یَّغْشَی النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۴۴ [الدخان]: ۱۰ تا ۱۱)، یعنی تو اس دن کا انتظار کر کہ آسمان سے صریح دھواں نکلے گا جو لوگوں کو چھپا لے گا، یہ درد دینے والا عذاب ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ قریش پر ان کے انکار اور معاندانہ رویے کی بنا پر سخت قسم کی خشک سالی اور قحط کی حالت مسلط کر دی گئی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے بھوک کی وجہ سے مردار کے چمڑے تک کھائے۔ جب وہ آسمان کی طرف دیکھتے تو انھیں دھواں نظر آتا، بالآخر آپؐ کی دعا سے یہ عذاب ان سے موقوف ہوا (البخاری، ۶۵/۴۴، ۳: ۳۲۸)؛ (۵) سفر معراج: آپؐ کی زندگی مبارک کا جو سب سے انوکھا اور منفرد واقعہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے وہ آپؐ کا سفر معراج ہے؛ یہ عجیب و غریب، اور کسی انسانی طاقت سے ماورا سفر ایک ہی رات بلکہ ایک ہی لمحے میں مکمل ہوا۔ یہ سفر خواب میں

marfat.com
Marfat.com

نہیں تھا، کیونکہ خواب میں کسی شخص کا سفر، سفر نہیں کہلاتا اور نہ ہی خواب میں دیکھی ہوئی چیز کو سیر کرنا کہتے ہیں۔ سفر معراج دو مرحلوں (مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک اور بیت المقدس سے عرش معلٰی تک) میں مکمل ہوا۔ ان میں سے پہلے مرحلے کا قرآن مجید میں صراحۃً ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (١٧ [بنی اسراءیل]: ١)، یعنی وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصی (یعنی بیت المقدس) تک، جس کے گردا گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، لے گیا تاکہ ہم اسے اپنی (قدرت کی) کچھ نشانیاں دکھائیں۔ دوسرے مرحلے کا ذکر قرآن مجید (٥٣ [النجم]: ٨ تا ١٢) میں کنایۃً اور متفقہ روایات میں صراحۃً و تفصیلاً کیا گیا ہے۔ الزرقانی (شرح المواہب اللدنیہ) کے بقول اس واقعے کے ناقلین کی مجموعی تعداد ٤٥ کے قریب ہے، اور حدیث و سیر اور تاریخ کی تقریباً سبھی کتابوں میں منقول و مشہور ہے۔ راویوں میں حضرت ابو ذر رض، مالک بن صعصعہ رض، انس رض بن مالک، عبداللہ رض بن عباس رض، ابو ہریرہ رض، جابر رض بن عبداللہ اور حضرت عبداللہ رض بن مسعود وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر راوی ایسے ہیں جنھوں نے یہ واقعہ خود حضور ص کی زبان اقدس سے سنا (تفصیلات کے لیے دیکھیے الزرقانی: شرح المواہب، ١: ٣٥٥ تا ٣٥٨؛ قاضی عیاض: الشفاء، مطبوعہ بریلی، ص ٨٠ - ٩٦؛ ابن القیم: زاد المعاد، ٣: ٣٣ تا ٤٣، مطبوعہ بیروت ١٣٩٩ھ/١٩٧٩ء؛ شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، کراچی، ص ٢٠٠ تا ٢٠٢؛ سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبی، ٣: ٣٩٣ تا ٤٨٤ [نیز رک بہ اسراء؛ معراج])؛ (٦) ہجرت کے موقع پر دشمنوں نے آپ ص کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ (معاذ اللہ) آپ ص کا قضیہ ہی ختم کر دیا جائے، مگر آپ ص دشمنوں سے بچتے ہوئے نکل آئے۔ دوران سفر بھی کئی مواقع ایسے آئے کہ جب دشمن آپ ص کے سر پر پہنچ گئے تھے، مگر تائید ایزدی نے آپ ص کو دشمنوں کی دسترس سے محفوظ رکھا، ارشاد ہے: وَ اِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ ؕ وَ یَمْكُرُوْنَ وَ یَمْكُرُ اللّٰهُ (٨ [انفال]: ٣٠)، یعنی اور (اے محمد ص) اس وقت کو یاد کرو جب کافر لوگ تمھارے بارے میں چال چل رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں، یا جان سے مار دیں یا وطن سے نکال دیں تو ادھر تو وہ چال چل رہے تھے اور ادھر خدا چال چل رہا تھا اور خدا سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔ سورۃ التوبہ میں ارشاد فرمایا: اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلَیْهِ وَ اَیَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا (٩ [التوبہ]: ٤٠)، یعنی اگر تم پیغمبر ص کی مدد نہ کروگے تو خدا ان کا مددگار ہے، (وہ وقت تم کو یاد ہوگا) جب ان کو کافروں نے گھر سے نکال دیا (اس وقت) دو (ہی شخص تھے جن) میں (ایک ابوبکر رض) دوسرے (خود رسول اللہ ص) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے اس وقت پیغمبر ص اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے، تو خدا نے ان پر تسکین نازل فرمائی اور ان کو ایسے لشکروں سے مدد دی جو تم کو نظر نہیں آتے۔ ان دونوں آیات میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اگرچہ دشمنوں کی تدبیریں بڑی سخت تھیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تائید ایزدی حاصل تھی؛ اسی بنا پر آپ ص ان جملہ مشکلات سے

marfat.com
Marfat.com

گزر گئے۔ (سفر ہجرت کی تفصیلات کے لیے [رک بہ ہجرت])؛ اس موقع کے معجزات کی تفصیل کے لیے دیکھیے البخاری، ۶۳/۴۵، ۳: ۳۴ تا ۴۳؛ السیوطی: الخصائص الکبری، ۱: ۱۲۱ تا ۱۲۲)؛

(۷) غزوۂ بدر کے موقع پر نزول ملائکۃ: ارشاد باری ہے: إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِينَ (۸ [الانفال]: ۹)، یعنی جب تم اپنے پروردگار سے دعا کرتے تھے اس نے تمھاری دعا قبول کر لی اور فرمایا کہ (تسلی رکھو) ہم ہزار فرشتوں سے، جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے جائیں گے تمھاری مدد کریں گے۔ ملائکہ ایک لطیف و غیر مرئی مخلوق ہیں۔ ان کا نزول تائید ایزدی کا مظہر ہے، جو جنگ کے نتیجے سے بخوبی ظاہر ہو رہا ہے؛ (۸) آپؐ کا دشمن پر کنکریاں پھینکنا: غزوۂ بدر کے دوران میں آپؐ نے اپنے ہاتھ میں کنکریاں لیں اور انھیں دشمن پر پھینک دیا۔ چونکہ دشمن کا رخ مسلمانوں کی طرف تھا، اور ہوا ان کے سامنے سے پیچھے کو چل رہی تھی، اس لیے یہ تدبیر کارگر ہوئی اور اس طرح دشمنوں کے سامنے میدان جنگ کا منظر اوجھل ہو گیا، دوسری طرف مسلمانوں کی تلواریں اپنا کام دکھا رہی تھیں، اس موقع کے لیے ارشاد ہے: وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸ [انفال]: ۱۷)، یعنی اور (اے محمدؐ) جس وقت تم نے وہ ریت یا کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ کنکریاں پھینک دینا تو بلا شبہہ آپؐ کا فعل تھا، مگر ان کو دشمن کی آنکھوں میں پہنچا دینا اور پھر اس معمولی سے فعل کو جنگ کی قسمت کا فیصلہ کر دینے والا بنا دینا خدا کی تائید اور مشیت کے بغیر ممکن نہیں؛ (۹) غزوۂ احد میں نیند کا طاری ہونا: غزوۂ احد میں مسلمانوں کو بظاہر خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا اور رہے سہے مسلمان بھی حواس باختہ ہو کر جوہر شجاعت کھو بیٹھے تھے، چنانچہ مشیت ایزدی نے ان میں یہ وصف دوبارہ پیدا کرنے کے لیے اور ان میں غزوۂ بدر والی ہمّت و چستی بیدار کرنے کے لیے ان پر نیند کا خمار طاری کر دیا، جس کے بعد وہ دوبارہ چاک و چوبند دستوں میں بدل گئے تھے اور مافات کا غم ان کے دلوں سے دور ہو گیا تھا، ارشاد ہے: ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ (۳ [آل عمران]: ۱۵۴)، یعنی پھر خدا نے رنج و غم کے بعد تم پر تسلی نازل فرمائی یعنی نیند کہ تم میں سے ایک جماعت پر طاری ہو گئی (ابو طلحہؓ کی عینی شہادت کے لیے دیکھیے البخاری ۶۵/۳، ۳: ۲۱۸)؛ (۱۰) غزوۂ احزاب کا وقوع اور اس میں فتح کا وعدہ: غزوۂ احزاب میں عرب کے شمالی اور جنوبی علاقوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے قبیلوں نے مسلمانوں کے خلاف باہمی اتحاد کر لیا تھا۔ دشمن کی اہل اسلام کے خلاف یہ سب سے بڑی جارحیت تھی۔ اس طرح کی جارحانہ کارروائی کی عرب کی گزشتہ تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس متحدہ عرب قوت کے حملے کی پیشگی اطلاع دے دی تھی، اس لیے جب مسلمانوں نے عرب کے متحدہ لشکر کو آتا دیکھا تو انھیں اللہ پر اور اللہ کے رسول پر [illegible] یقین اور مستحکم ہو گیا، ارشاد ہے: وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (۳۳ [الاحزاب]: ۲۲)، یعنی جب مومنوں نے (کافروں کے) لشکر کو دیکھا تو کہنے لگے یہ وہی ہے جس کا خدا اور اس کے پیغمبرؐ نے ہم سے

marfat.com
Marfat.com

 حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وعدہ کیا تھا اور خدا اور اس کے پیغمبرؐ نے سچ ہی کہا تھا اور اس سے ان کا ایمان اور اطاعت اور زیادہ ہو گئی! (۱۱) ہواؤں سے نصرت: غزوۂ احزاب میں اللہ تعالٰی نے مسلمانوں کی تند و تیز آندھی سے مدد فرمائی، جس نے تمام دشمنوں کو منتشر ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ آندھی اتفاقیہ واقعہ نہ تھا، بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تائید غیبی کا مظہر تھا۔ ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (۳۳ [الاحزاب]: ۹)، یعنی اے اہل ایمان خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جو (اس نے) تم پر (اس وقت) کی، جب فوجیں تم پر (حملہ کرنے) آئیں تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر (نازل کیے) جن کو تم دیکھ نہیں سکتے۔ اسی بنا پر آپؐ اکثر فرمایا کرتے تھے: صدق اللہ وعدہٗ و نصر عبدہٗ و ھزم الاحزاب وحدہٗ (البخاری) اللہ تعالٰی نے اپنا وعدہ پورا کیا، دشمن کو تنہا ہزیمت دی اور اپنے بندے کو کامیاب کیا؛ (۱۲) مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخلے کی اطلاع: ۶ھ میں آپؐ نے اپنے ایک خواب سے اطلاع پا کر فتح مکہ کی خبر دی۔ صحابہ کرامؓ یہ خبر سن کر بڑے خوش ہوئے، مگر جب لشکر اسلام مقام حدیبیہ میں پہنچا تو دشمن نے روک لیا اور بالآخر صلح ہو گئی اور اسی صلح کے نتیجے میں دو سال بعد مکہ فتح ہو گیا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِیْنَ لَا تَخَافُوْنَ (۴۸ [الفتح]: ۲۷)، یعنی بے شک خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو سچا (اور) صحیح خواب دکھایا کہ خدا نے چاہا تو تم مسجد حرام میں اپنے سر منڈوا کر اور اپنے بال کتروا کر امن و امان سے داخل ہوگے اور کسی طرح کا خوف نہ کروگے؛ (۱۳) صلح حدیبیہ میں بیعت رضوان دو عظیم فتوحات کا پیش خیمہ تھی: صلح حدیبیہ میں آپؐ کو جب دشمنوں نے مقام حدیبیہ پر روک لیا اور واپس لوٹ جانے پر اصرار کیا اور ادھر قاصد نبوی حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر لشکر اسلام میں پہنچی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر بیعت لی، جسے اصطلاح قرآن میں بیعت رضوان کہا جاتا ہے۔ یہ بیعت رضائے خداوندی کے عین مطابق تھی۔ ارشاد باری ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (۴۸ [الفتح]: ۱۰)، یعنی جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں، وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں، خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ بالآخر یہی بیعت دو عظیم فتوحات، یعنی فتح خیبر اور فتح مکہ کا باعث ہوئی؛ (۱۴) غزوۂ حنین میں فتح و نصرت: غزوۂ حنین آپؐ کی زندگی کا واحد غزوہ ہے کہ جس میں مسلمانوں کی تعداد دشمن سے زیادہ تھی (تقریبًا ایک اور تین کی نسبت تھی) اور اسی بنا پر بعض صحابہ کرامؓ کو اپنی ظاہری طاقت و قوت پر بھروسا ہو گیا تھا، لیکن جس وقت لشکر اسلام ہوازنی تیر اندازوں کی زد میں آیا تو ہراول کے قدم اکھڑ گئے۔ اس کے ساتھ ہی قلب لشکر میں موجود مجاہدین نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور میدان جنگ میں صرف آپؐ اور چند جاں نثار باقی رہ گئے تھے؛ ایک لحاظ سے مسلمان تقریبًا یہ جنگ ہارنے کو تھے کہ اسی وقت آسمان سے فتح و نصرت نازل ہوئی اور آپؐ کے بلانے پر بھاگنے والوں کے قدم واپس مڑنے لگے۔ آپؐ نے صفوں کو دوبارہ منظم کیا اور یک بارگی حملے سے دشمن کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور

marfat.com
Marfat.com

کر دیا۔ اس جنگ میں فتح و نصرت یقیناً امداد غیبی کی رہین منت تھی، اسی لیے ارشاد فرمایا: لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (۹ [التوبہ]: ۲۵ تا ۲۶)، یعنی خدا نے بہت سے موقعوں پر تم کو مدد دی ہے، اور (جنگ) حنین کے دن بھی جب کہ تم کو اپنی (جماعت کی) کثرت پر غرہ تھا، تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی، اور زمین باوجود (اتنی بڑی) فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر پھر گئے، پھر خدا نے اپنے پیغمبرؐ پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی (اور تمہاری مدد کو فرشتوں کے) لشکر جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے (آسمان) سے اتارے؛ (۱۵) علوم غیب پر اطلاع: نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا سب سے حیرت انگیز وصف آپؐ کا علوم غیب پر اطلاع پانا ہے (دیکھیے بالا)؛ خود قرآن حکیم اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، لیکن آپؐ کی وحی صرف قرآن تک ہی محدود نہیں ہوتی تھی بلکہ بول چال اور ہر قسم کی گفتگو بھی اسی کے زیر سایہ پروان چڑھتی تھی، اسی لیے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۵۳ [النجم]: ۳ تا ۴)، یعنی اور نہ آپؐ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں، یہ تو حکم خدا ہے جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے، اسی وحی کے ذریعے آپؐ ہر قسم کی مخفی باتوں پر اطلاع پاتے تھے حتی کہ دشمن کی خفیہ باتوں پر سے پردے اٹھاتے تھے، اسی لیے ارشاد فرمایا: يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ (۹ [التوبۃ]: ۶۵)، یعنی منافق ڈرتے رہتے ہیں کہ ان (پیغمبرؐ) پر کوئی ایسی سورت نہ اتر آئے کہ ان کے دل کی باتوں کو مسلمانوں پر ظاہر کر دے، کہہ دو ہنسی کیے جاؤ، جس بات سے تم ڈرتے ہو خدا اس کو ضرور ظاہر کرے گا (نیز دیکھیے بالا).

(ب) کتب احادیث میں مذکور معجزات: معجزات نبویؐ کی دوسری قسم وہ ہے، جن کا ذکر کتب احادیث میں ملتا ہے، تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) معجزات یمن و برکت: قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ وہ احادیث جن میں آپؐ سے یمن و برکت کے ظاہر ہونے کا ذکر ہے، کثیر تعداد میں مروی ہیں (الشفا، ص ۱۴۱) اور اس نوع کی روایات کو ہر امام حدیث نے اپنے احادیث کے مجموعے میں جگہ دی ہے؛ (الف) امام بخاریؒ (۲: ۳۹۸)، حضرت انسؓ کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں کہ حضرت ابو طلحہؓ (زید بن سہل انصاری) نے ایک مرتبہ آپؐ کی آواز سے یہ محسوس کیا کہ آپؐ کئی روز سے بھوکے ہیں: انھوں نے اپنی اہلیہ (ام سلیمؓ) کے مشورے سے آپؐ کی ضیافت کا اہتمام کیا؛ کھانا اتنا کم تھا کہ بمشکل ایک دو آدمیوں کو کفایت کر سکتا تھا، مگر آپؐ اپنے ساتھ ستر یا اسی آدمی لے آئے، اور کھانا منگوا کر اس پر کچھ پھونکا، پھر دس دس آدمیوں کی ٹولیوں نے (سات یا آٹھ مرتبہ) اسے پیٹ بھر کر کھایا۔ ابن حجر کے مطابق افراد ۸۰ سے بھی زائد تھے، ان کے شکم سیر ہونے کے بعد آپؐ نے بھی کھایا، پھر اسی سے گھر والوں نے کھایا، مگر پھر بھی وہ کھانا بچا رہا (فتح الباری، ۶: ۵۹۱)؛ (ب) اسی طرح کی ایک روایت حضرت جابرؓ سے بھی مروی ہے: وہ فرماتے ہیں کہ مجھ پر میرے والد کا لیا ہوا بہت سا قرض تھا۔ ادائی کا واحد ذریعہ

marfat.com
Marfat.com

کھجوریں تھیں۔ جب وہ پک گئیں، تو میں اس خیال سے کہ مبادا قرض خواہ مجھ سے بد سلوکی کریں، آپؐ کو بلا کر لے گیا۔ کھجوروں کے ڈھیر سے بظاہر یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان سے قرض اتارا جا سکے گا۔ آپؐ نے کھجوروں کے ڈھیر کا ایک چکر لگایا اور دعا فرمائی اور پھر فرمایا: ماپنا شروع کر دو۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ کے قدوم میمنت کی برکت سے میں نے اسی ڈھیر سے تمام قرض چکا دیا اور پھر تقریباً اتنی ہی تعداد میں کھجوریں بچ بھی رہیں (البخاری، ۲: ۲۱۹)؛ (ج) اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے آئے ہوئے کھانے کو جو بمشکل دو آدمیوں کو کفایت کر سکتا تھا، بارہ سے زائد آدمیوں نے کھایا (کتاب مذکور، ص ۴۰۰؛ فتح الباری، ۶: ۵۹۶ تا ۵۹۸)؛ (د) ایک صحابیہ ایک برتن میں سے حضورؐ کو گھی دیا کرتی تھیں۔ گھی ختم ہو گیا، مگر اس کے باوجود جب بھی وہ اس میں ہاتھ ڈالتیں گھی نکل آتا، یہاں تک کہ اس نے اس کو نچوڑ لیا، آپؐ نے فرمایا اگر تم اسے نہ نچوڑتیں تو ہمیشہ اس میں گھی باقی رہتا (مسلم، ۴: ۱۷۸۴، حدیث ۲۲۸۰)؛ (ہ) حضرت جابرؓ نے غزوۂ خندق کے موقع پر آپؐ کی قناعت دیکھ کر آپؐ کی دعوت کا اہتمام کیا۔ گھر میں موجود ایک بکری کا بچہ ذبح کیا اور تھوڑا سا آٹا گوندھ کر آپؐ کو اطلاع دی: کھانا اتنا کم تھا کہ بمشکل پانچ آدمیوں کا گزارا ہو سکتا تھا، مگر آپؐ نے آواز دے کر اپنے ساتھ پورے لشکر کو بلا لیا اور حضرت جابرؓ سے فرمایا کہ جب تک میں نہ آ جاؤں ہنڈیا کو چولہے سے نہ اتارا جائے اور نہ روٹیاں پکانی شروع کی جائیں: ایسا ہی کیا گیا۔ آپؐ تشریف لائے تو دونوں میں لعاب دہن ڈال کر دعا دی اور پھر حضرت جابرؓ کی اہلیہؓ سے فرمایا کہ روٹیاں پکا پکا کر دیتی رہو، چنانچہ ایک ہزار کے قریب صحابہؓ نے شکم سیر ہو کر یہ کھانا کھایا اور پھر بھی گوشت اور آٹا جوں کا توں رہا، آخر میں گھر والوں نے اور پھر آپؐ نے تناول فرمایا (البخاری، ۲۹/۶۴، ۳: ۹۴ تا ۹۵، باب غزوۂ خندق)؛ (و) ایک دفعہ ایک شخص نے آپؐ سے کچھ مانگا، آپؐ نے اسے جو کی تھوڑی سی مقدار مرحمت فرما دی۔ وہ شخص روزانہ اس میں سے اپنے اہل و عیال اور مہمان کے لیے خرچ کرتا، مگر وہ غلہ جوں کا توں موجود رہا، آخر میں اس نے اس میں موجود تمام جو نکالے اور انہیں تول لیا۔ آپؐ کو علم ہوا تو فرمایا، اگر تم نہ تولتے تو ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتا (مسلم، ۴: ۱۷۸۴)؛ (ز) اسی طرح غزوۂ خیبر کے دوران سفر میں زاد راہ کی کمی ہو گئی۔ آپؐ نے ہر شخص سے اپنا اپنا سامان پیش کرنے کو کہا - جب سب نے ایسا کر دیا، تو آپؐ نے دعائے خیر فرمائی۔ اس کی برکت سے وہ سامان اتنا بڑھا کہ ہر شخص نے اپنے برتن اس سے بھر لیے اور پیٹ بھر کر کھانے کے باوجود بھی بچ رہا (مسلم، ۱: ۵۷، حدیث ۲۷)؛ (ح) ایک دوسرے سفر میں ایک صاع آٹے اور ایک بکری کے گوشت سے ۱۳۰ کے قریب صحابہؓ کے شکم سیر ہونے کا ذکر ملتا ہے (البخاری، ۷۰/۶، ۳: ۴۹۴، کتاب الاطعمۃ)؛ (ط) حضرت زینبؓ کے نکاح کے ولیمے کے موقعہ پر ایک تھال (طشت) میں معمولی سے حیس (ایک قسم کا میٹھے کھانے) میں اتنی برکت ہوئی کہ دس دس کی ٹولیوں میں تقریبا تین سو آدمیوں نے شکم سیر ہو کر کھایا، مگر پھر بھی اتنا کھانا بچ رہا کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جان سکا کہ جب کھانا رکھا گیا تھا

marfat.com
Marfat.com

اس وقت زیادہ تھا، یا جب اٹھایا گیا، اس وقت اس کی مقدار زیادہ تھی (مسلم، ۲ : ۱۰۶۸ تا ۱۰۵۲، حدیث ۱۲۲۸)؛ (ی) دودھ کے ایک پیالے سے اصحاب صُفّہؓ میں سے ستر افراد نے پیٹ بھر کر دودھ پیا، مگر پھر بھی اس کی مقدار کم نہ ہوئی (البخاری، ۸۱ / ۱۷، م : ۲۲۰ تا ۲۲۱ کتاب، الرقاق)؛ (ک) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب آپؐ کا وصال ہوا تو گھر میں کھانے کو جو کے ایک وسق (ایک مقدار) کے سوا کچھ نہ تھا ۔ ہم اسی میں سے کھاتے رہے اور وہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا، یہاں تک کہ ہم نے اس میں موجود جو نکال کر تول لیے، جس سے اس کی برکت جاتی رہی (البخاری)؛ (ل) ایک موقع پر آپؐ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو تھوڑی سی کھجوریں برکت کی دعا کے ساتھ عنایت فرمائیں۔ وہ اتنی بڑھیں کہ وہ مدتوں اس توشہ دان میں سے نکال نکال کر کھاتے رہے اور ۵۰ وسق تو راہ خدا میں خیرات کر ڈالیں، مگر اس کے باوجود اس میں کھجوریں کم نہ ہوئیں (مسند احمد، مسند ہریرہؓ).

(۲) پانی جاری ہونا : برکت ہی کی ایک قسم آپؐ کی انگلیوں میں سے پانی کا رواں ہونا بھی ہے، مگر فرق یہ ہے کہ کھانے وغیرہ میں برکت محض مخفی طریقے سے ہوتی تھی، جب کہ پانی کا رواں ہونا ظاہر و باہر تھا ۔ قدیم انبیا میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام واحد نبی ہیں جن کے عصا مارنے سے پتھر میں سے پانی کے چشمے رواں ہوئے، مگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے متعدد مواقع پر یہ معجزات ظاہر ہوئے: (الف) امام بخاریؒ حضرت انسؓ سے نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپؐ مقام الزوراء میں تھے کہ آپؐ کے سامنے ایک پانی کا برتن لایا گیا، آپؐ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو پانی آپؐ کی انگلیوں کے درمیان سے جوش مارنے لگا۔ پھر اس چھوٹے سے برتن سے تقریباً تین سو افراد نے وضو کیا (البخاری، ۲ : ۳۹۷)؛ (ب) ایک دوسرے موقع پر نماز عصر کے وقت وضو کے ایک برتن سے پانی کے چشمے رواں ہو گئے اور تمام لشکر نے وضو کیا (حوالۂ مذکور)؛ (ج) ایک چھوٹے سے پیالے میں معمولی سا پانی تھا ۔ آپؐ کی انگلیاں جیسے ہی اس پانی سے مس ہوئیں اس میں سے پانی جوش مارنے لگا، یہاں تک کہ ستر کے قریب صحابہؓ نے اس میں سے وضو کیا (حوالہ مذکور)؛ (د) یوم حدیبیہ میں صحابہ کرامؓ کو سخت پیاس لگی۔ پانی کا صرف ایک ہی برتن (رکوۃ) تھا، آپؐ نے اس میں اپنا ہاتھ مبارک ڈال دیا ۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس برتن میں سے پانی کے کئی فوارے پھوٹ پڑے ہوں۔ اس پانی سے وہاں پر موجود تقریباً ۱۴ سو صحابہ کرامؓ نے وضو بھی کیا اور شکم سیر ہو کر پیا بھی، مگر اس کے باوجود وفور آب کا یہ عالم تھا کہ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ اگر ایک لاکھ آدمی بھی ہوتے تو ان سب کو کافی ہوتا (البخاری، ۲ : ۵۹۸)؛ (ہ) حضرت براءؓ بن عازب صلح حدیبیہ ہی کے موقعہ کی ایک دوسری روایت نقل فرماتے ہیں کہ مقام حدیبیہ میں پانی کا صرف ایک ہی کنواں تھا۔ ہم لوگ اس میں سے پانی پیتے رہے، یہاں تک کہ اس کا آخری گھونٹ نکال لیا۔ اور پھر پانی کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ آپؐ کو اطلاع دی گئی تو آپؐ کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئے اور کچھ پانی منگوایا؛ پہلے کلی کی اور پھر بقیہ پانی بھی کنویں میں ڈال دیا؛ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ وہ کنواں پانی سے لبا لب بھر گیا، جس سے تمام صحابہ کرامؓ، جن کی مجموعی تعداد ۱۴ سو تھی،

marfat.com
Marfat.com

اور ان کی تمام سواریوں نے پیٹ بھر کر پانی پیا (البخاری، ۲ : ۳۹۸)؛ (و) اسی طرح ایک غزوہ کے دوران میں پانی کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ اس وقت عسکر اسلام ایک چٹیل میدان میں خیمہ زن تھا۔ تلاش بسیار کے بعد ایک عورت ملی جو پانی کا مشکیزہ اٹھائے ہوئے گھر جا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہاں آس پاس کہیں پانی موجود نہیں ہے اور یہ کہ اس کے گھر کا فاصلہ ایک دن اور رات کا ہے۔ آپؐ نے اس مشکیزے پر ہاتھ پھیرا اور اس کے منہ کو کھولنے کا حکم دیا۔ اس وقت لشکر میں تقریباً ۴۰ آدمی تھے، انھوں نے شکم سیر ہو کر پانی پیا پھر مشکیزے کا منہ بند کر دیا، مگر پھر بھی مشکیزہ جوں کا توں رہا۔ یہ دیکھ کر وہ عورت مسلمان ہو گئی (البخاری، ۲ : ۳۶۹)؛ (ز) غزوۂ تبوک کے موقع پر ایک چشمے سے لشکر اسلام کا گزر ہوا، مگر اس چشمے میں پانی بہت ہی کم تھا۔ آپؐ تشریف لائے اور اس میں اپنے ہاتھ اور منہ دھو کر پانی ڈال دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ چشمہ پانی سے پوری طرح بھر گیا، یہاں تک کہ تمام لوگوں نے شکم سیر ہو کر پانی پیا (مسلم، ۴ : ۱۷۸۴، حدیث ۷۰۶)؛ (ح) حِبان بن بُحّ الصدائی کے بقول آپؐ نے انھیں سفر کے دوران میں پانی کا ایک برتن دیا، جس میں اس نے وضو کیا، پھر آپؐ نے اس برتن میں ہاتھ ڈالا تو پانی جوش مار کر ابلنے لگا (احمد بن حنبل : مسند، ۴ : ۱۶۸ تا ۱۶۹)۔ اس موضوع پر اور بھی بہت سی روایات ملتی ہیں۔

(۳) شفاے امراض : آپؐ کی ذات منبع خیر و برکت تھی۔ اس کا اظہار اس سے بھی بکثرت ہوا کہ آپؐ کے ہاتھ سے مریضوں کو فوری شفایابی ہوئی۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں : (ا) ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا ٹھیک ہونا : حضرت عبداللہؓ بن عتیک کی ٹانگ پر، جو ایک مہم کے دوران میں بلندی سے چھلانگ لگانے کی وجہ سے ٹوٹ گئی تھی، آپؐ نے اپنا دست مبارک پھیرا تو وہ بالکل ٹھیک ہو گئی (البخاری، ۶۴/۱۶، ۳ : ۶۷ تا ۷)؛ (ب) آشوب زدہ آنکھوں کا صحت یاب ہونا : غزوۂ خیبر کے دوران میں حضرت علیؓ کی آنکھیں آشوب زدہ تھیں۔ آپؐ کے لعاب دہن کی برکت سے فوری طور پر ٹھیک ہو گئیں (مسلم، ۴ : ۱۸۷۱، حدیث ۲۴۰۴)؛ (ج) نابینے کا بینا ہونا : ایک صحابیؓ نابینا تھے۔ انھوں نے آ کر خدمت نبویؐ میں اپنی تکالیف بیان کیں۔ آپؐ نے انھیں فرمایا کہ وضو کرکے میرے وسیلے سے دعا مانگو، انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اور قدرت خداوندی سے شفا پائی (حاکم : مستدرک، ۱ : ۵۱۹، ۵۲۶ تا ۵۲۷، علی شرط البخاری)؛ (د) ابن الجوزی (الوفا، ۲ : ۳۳۳) نے ابو قتادہؓ بن النعمان کے متعلق نقل کیا ہے کہ غزوۂ احد میں ان کی آنکھ حلقے سے باہر گر پڑی، انھوں نے آپؐ کی خدمت میں اپنی تکلیف بیان فرمائی، آپؐ نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر آنکھ کو حلقے میں لگا دیا اس پر ان کی بینائی بحال ہو گئی؛ (ہ) تلوار کے زخم سے صحت یابی : غزوۂ خیبر میں ایک صحابی حضرت سلمہؓ بن اکوع کی ٹانگ پر تلوار کا زخم آ گیا تھا، جس میں اکثر تکلیف رہتی تھی۔ آپؐ نے اس پر تین مرتبہ دم کیا، اس کے بعد انھیں پھر کبھی تکلیف محسوس نہ ہوئی (البخاری، ۶۴/۳۸، ۳ : ۱۲۴)؛ (و) آسیب کے اثر سے محفوظ ہونا : ایک مرتبہ آپؐ ایک سفر میں تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک عورت اپنے بچے کو اٹھائے ہوئے لائی اور کہا کہ اس میں کسی بلا کا دورہ ہوتا ہے، آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا : اے دشمن خدا اس میں سے نکل جا، آپؐ کے یہ

marfat.com
Marfat.com

فرمانے سے وہ بچہ بالکل تندرست ہو گیا اور پھر اس کے بعد وہ بلا کبھی واپس نہ آئی (احمد بن حنبل : مسند، ۴ : ۱۷۰، ۱۷۱)؛ (ز) عارضۂ جنون سے اِفاقہ : ایک صحابی کے بھائی پر جنون کا اثر تھا۔ وہ اسے لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ کے دم کرنے سے اس کا ہر قسم کے جنون کا عارضہ جاتا رہا؛ (ح) گونگے کا قوت گویائی پانا : ایک عورت کا بچہ گونگا تھا۔ وہ اسے آپؐ کی خدمت میں لائی۔ آپؐ نے پانی منگوا کر ہاتھ دھوئے اور کلی کی؛ پھر وہ پانی اس بچے کو پلانے اور اس پر چھڑکنے کے لیے دیا۔ صرف پلانے سے وہ بچہ بالکل ٹھیک ہوگیا اور بولنے لگا (ابن ماجہ : السنن، باب النشرہ؛ ابو نعیم، ص ۱۶۷)؛ (ط) مرض نسیان سے شفا : حضرت ابو ہریرہؓ نے قلت حافظہ کی شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا : دامن پھیلاؤ۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ آپؐ نے دامن میں ہاتھ ڈالا اور فرمایا: اس کو سمیٹ لو۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں اس دن کے بعد کوئی بات نہیں بھولا (البخاری، ۲ : ۱۵۴؛ مسلم، ۴ : ۱۹۴۰، حدیث ۲۴۹۲)۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ بن ابی العاص (عامل طائف) اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت مذکور ہے کہ ان دونوں صاحبان کو نسیان کی بیماری لاحق تھی اور آپؐ کی دعا یا دم کی برکت سے وہ بیماری زائل ہوگئی (ابن ماجہ : السنن، باب الفزع والارق؛ الترمذی عن علی، ۴ : ۵۶۳ تا ۵۶۵، حدیث ۳۵۷۰؛ حاکم : مستدرک، ۱ : ۳۱۶)؛ (ی) آگ میں جلے ہوئے بچے کی صحت یابی : ایک صحابیؓ محمد بن حاطب، بچپن میں آگ میں گرنے کی بنا پر بری طرح جھلس گئے۔ آپؐ نے ان پر لعاب دھن لگایا اور دعا کی؛ روایت کے مطابق ان کی والدہ ابھی انھیں اس مجلس میں سے لے کر اٹھنے بھی نہ پائی تھیں کہ وہ بالکل صحت یاب ہو گئے (ابو داؤد الطیالسی : مسند، ص ۱۶۵؛ احمد بن حنبل : مسند، ۴ : ۲۰۹)۔

(۴) جمادات میں اثر : جمادات اگرچہ شعور و ادراک سے محروم وجود ہیں، مگر قرآن حکیم ان میں ایک خاص قسم کے شعور و ادراک پر زور دیتا ہے اور وہ ہے اپنے خالق و مالک کی پہچان اور اس کے تکوینی احکام بجا لانے کا شعور (دیکھیے ۱۷ [بنی اسرائیل] : ۴۴)۔ موجودہ سائنس بھی جمادات میں ایک معمولی درجے کے احساس کی قائل ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جمادات اپنے رب کی مرضی کو پہچانتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت و رسالت کی تصدیق کرنے میں جمادات بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے، چند مثالیں حسب ذیل ہیں :

(ا) اسطوانۂ حنانہ کا ہلنا اور رونا : مسجد نبوی میں ایک کھجور کا تنا تھا، جس کے ساتھ ٹیک لگا کر آپؐ خطبہ دیا کرتے تھے، منبر تیار ہوا تو آپؐ نے اس پر بیٹھ کر خطبہ دینا شروع کر دیا۔ عین اسی وقت اس اسطوانہ سے بچے کے رونے کی آواز پیدا ہوئی (بعض روایات میں اونٹنیوں کی طرح بلبلانے کا ذکر ہے)۔ یہ دیکھ کر آپؐ نیچے اترے اور اسطوانہ کو سینے سے لگا لیا تو وہ آواز ختم ہوگئی۔ یہ رونا بالکل ایسا تھا، جس طرح کوئی شخص کسی سے بچھڑ کر اس کے فراق میں روتا ہے (البخاری، ۶۱/۲۵، ۲ : ۴۰۰)۔ یہ روایت ۱۱ مختلف صحابہ کرامؓ سے منقول ہے (دیکھیے سید سلیمان ندوی : سیرۃ النبی، ۳ : ۶۱۵، حاشیہ ۲)۔ مولانا قاسم نانوتوی کے مطابق آپؐ کا یہ معجزہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے احیاے موتی کے معجزات سے بڑھ کر ہے، کیونکہ بہرحال حضرت موسیٰؑ کا عصا اژدھے کی شکل میں آ کر زندہ ہوا، اور اس نے اژدھوں جیسی حرکات

marfat.com
Marfat.com

کیں؛ اسی طرح حضرت عیسیٰ کی بنائی ہوئی اشیاء پرندوں کی اصلی شکل و صورت میں آ کر حیات ہوئیں، مگر آپ کی برکت سے اسطوانہ، لکڑی ہوتے ہوئے زندہ ہوا اور زندوں جیسی حرکات اس سے صادر ہوئیں۔ لہذا آپ کا یہ معجزہ اپنے پیشرووں کے معجزات سے بڑھ کر ہے۔ دیکھیے حبیب الرحمن: دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا، مطبوعۂ دیوبند ۱۳۶۵، ص ۱۰۳)۔

(ب) ہلتے ہوئے پہاڑ کا ساکن ہو جانا: ایک مرتبہ آپ ایک پہاڑ پر کھڑے تھے کہ وہ پہاڑ ہلنے لگا۔ آپ نے اس پر پاؤں کی ایک ضرب لگائی اور فرمایا: ٹھیر جا، تیری پشت پر ایک پیغمبر، ایک صدیق، ایک شہید ہے (البخاری، المناقب؛ الترمذی، ۳ : ۶۲۴، حدیث ۳۶۹۷) چنانچہ وہ پہاڑ ٹھیر گیا؛ (ج) پہاڑوں اور درختوں میں سے آواز کا آنا: حضرت علی فرماتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ حضور کے ہمراہ تھے۔ راستے میں انھوں نے سنا کہ آپ جس درخت یا پتھر کے پاس سے گزرتے ہیں، اس میں سے آواز آتی ہے: السلام علیک یا رسول اللہ (الترمذی، ۵ : ۵۹۳، حدیث ۳۲۲۶)۔ اسی طرح کی ایک روایت کے راوی حضرت جابر بن سمرہ ہیں۔ وہ حضور سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: میں مکے کے ایک پتھر کو اچھی طرح جانتا ہوں، جو مجھے مبعوث کیے جانے کے بعد سلام کیا کرتا تھا (کتاب مذکور، حدیث ۳۶۲۴)؛ (د) کھانوں سے تسبیح کی آواز: حضرت جابر فرماتے ہیں کہ عہد نبوی میں ہمیں کھانوں سے تسبیح کی آواز سنائی دیا کرتی تھی (البخاری، ۶۱/۲۵، ۲ : ۳۹۹)؛ (ہ) زمین کا ایک مرتد کو قبول نہ کرنا: عہد نبوی میں ایک نصرانی مسلمان ہوا اور کچھ دنوں تک کتابت وحی کی خدمت انجام دیتا رہا، بعد ازاں مرتد ہو گیا اور یہ دعوی کرنے لگا کہ (معاذ اللہ) جو کچھ اس نے کتابت کیا ہے (سورۃ البقر و آل عمران) آپ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے لوگوں کے لیے عبرت بنانا چاہا تو اسے موت دے دی، جس کے بعد اس کے ساتھیوں نے اسے دفن کر دیا، مگر اگلی صبح انھوں نے قبر کو کھلا اور اس کے مردہ جسم کو اوپر پڑے ہوئے دیکھا تو خیال کیا ضرور یہ کسی صحابی کی کارروائی ہوگی؛ چنانچہ اب کی مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ گہری قبر کھودی اور اسے دفنا دیا، مگر میت اگلی صبح پھر باہر تھی؛ اس روز مزید قبر کو گہرا کیا گیا اور میت کو دفنا دیا گیا، مگر تیسری صبح پھر میت کا یہی حال تھا۔ اس پر لوگوں نے باور کر لیا کہ یہ کارروائی کسی انسان کی نہیں ہو سکتی، اور اسے یونہی پڑا رہنے دیا گیا (البخاری، ۶۱/۲۵، ۲ : ۴۰۹؛ الترمذی، ۵ : ۵۹۷، حدیث ۳۶۶۳)؛ (و) کنکریوں سے تسبیح کی آواز: ایک مرتبہ ایک مجلس میں آپ نے سات کنکریاں اٹھائیں تو ان میں تسبیح کی آواز پیدا ہوئی۔ آپ نے انھیں رکھ دیا تو وہ آواز رک گئی (ابن الجوزی: الوفا، ۱ : ۳۲۴)۔

(۵) نباتات میں اثر: نباتات میں گو ایک ابتدائی درجے کا شعور و ادراک موجود ہوتا ہے، مگر پھر بھی ان میں اتنا شعور و ادراک نہیں ہوتا کہ وہ آدمی میں تمیز کر سکیں یا کسی پاس سے گزرنے والے کو سلام کر سکیں، جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات اقدس کو نباتات نہ صرف جانتے تھے، بلکہ حیرت انگیز طریقے پر آپ کے احکام کی تعمیل بھی کرتے تھے، سطور بالا میں حضرت علی کے حوالے سے یہ گزر چکا ہے آپ کو راستے کا ہر درخت اور ہر پتھر سلام کرتا تھا، اس کے علاوہ

marfat.com
Marfat.com

چند واقعات حسب ذیل ہیں : (الف) درختوں کا چل کر آنا : ایک مرتبہ آپؐ رفع حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت جابرؓ پانی لیے ہوئے ہمراہ تھے۔ میدان ہموار ہونے کی بنا پر کوئی آڑ نہ ملی تو آپؐ نے دور کھڑے ہوئے دو درختوں کو اشارہ کیا۔ وہ وہاں سے چل کر آئے اور باہم مل گئے۔ آپؐ نے ان کی اوٹ میں حاجت سے فراغت حاصل کی؛ پھر انھیں اپنی جگہ پر چلے جانے کا حکم دیا، انھوں نے ایسا ہی کیا (مسلم، حدیث جابرؓ؛ مشکوٰۃ، ۳ : ۱۷۱، حدیث ۵۸۸۵)۔ اسی طرح کے ایک موقع پر جب آپؐ کچھ مغموم تھے، حضرت جبرائیل علیہ السلام کے فرمانے پر آپؐ نے ایک درخت کو قریب بلایا۔ وہ درخت قریب آ گیا؛ پھر اسے حکم دیا تو واپس چلا گیا (ابن ماجہ : السنن، الدارمی؛ مشکوٰۃ، ۳ : ۱۸۸، حدیث ۵۹۲۴)؛ (ب) درختوں کا صداقت اسلام کی گواہی دینا : ایک دوسرے موقع پر ایک بدو نے آپؐ کی نبوت کی دلیل طلب کی۔ آپؐ درخت کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے پوچھا: کیا تو گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ درخت کی تمام شاخیں زمین سے پیوست ہوگئیں۔ پھر آپؐ نے درخت کو اپنی اصلی حالت پر لوٹ آنے کا حکم دیا؛ چنانچہ وہ درخت اپنی سابقہ کیفیت پر لوٹ آیا۔ یہ دیکھ کر وہ اعرابی مسلمان ہوگیا (الترمذی، ۵ : ۵۹۴، حدیث ۳۹۲۹)؛ (۶) حیوانات کا آپؐ کے منصب اعلیٰ کو جاننا: حیوانات نباتات سے شعور و ادراک سے اونچا درجہ رکھتے ہیں، مگر ان میں کبھی اچھے اور برے، نیک اور بد کا شعور نہیں دیکھا گیا، البتہ آپؐ کے خوارق عادت میں سے ایک یہ امر بھی بے مثال اہمیت رکھتا ہے کہ جانوروں نے نہ صرف آپؐ کے مرتبے کو جانا، بلکہ آپؐ کو اپنے مالکوں کی شکایات بھی کیں۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں : (الف) سواری کا تیز ہونا : مختلف روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ حلیمہ سعدیہ جب آپؐ کو گود لے کر واپس ہوئیں تو ان کی سواری، جو پہلے ان کی ہمجولیوں کی سواریوں سے پیچھے رہ جاتی تھی، سب سے آگے آگے تھی۔ ان کی ہمجولیاں بار بار تعجب کا اظہار کرتی تھیں کہ کیا یہ وہی سواری نہیں ہے جو آتی مرتبہ تمہارے پاس تھی؟ حلیمہ کہتیں کہ ہے تو وہی، مگر اب اس کی شان ہی نرالی ہے (ابن ہشام : السیرۃ النبویہ، ۱ : ۱۷۲ تا ۱۷۳، مطبوعۂ قاہرہ)؛ (ب) اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت ابوطلحہؓ کے سست رفتار گھوڑے کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ نے ایک مرتبہ اس کی سواری فرمائی اور واپسی پر فرمایا: یہ تو دریا ہے، آپؐ کے اس فرمانے کا نتیجہ تھا کہ اب کوئی گھوڑا رفتار میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا (البخاری، کتاب الجهاد، باب امر رکوب علی الدابہ؛ ابن الجوزی، ۱ : ۳۰۳ تا ۳۰۴)؛ (ب) بے دودھ کی بکری کا دودھ دینا : حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ بکریاں چرا رہا تھا کہ آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور پینے کے لیے کچھ دودھ مانگا، مگر میں نے معذرت کر دی۔ آپؐ نے پوچھا کہ اچھا بکری کا کوئی بچہ ہے؟ میں نے کہا : ہاں ہے۔ آپؐ نے اسے حاضر کرنے کا حکم دیا؛ چنانچہ آپؐ کے ہاتھ کی برکت سے اس بکری کے بچے نے دودھ دیا، جسے پہلے آپؐ نے پھر حضرت ابوبکرؓ اور پھر میں نے پیا (ابن سعدؒ، ۱ : ۱۲۲)؛ سفر ہجرت کے دوران میں بھی ام معبد کی بکری کے دودھ دینے اور اس پر اس کے ایمان لانے کا ذکر آتا ہے (مشکوٰۃ، ۲ : ۱۹۵)؛ (د) جانور کا آپؐ کے مرتبے کو پہچاننا : ایک مرتبہ ایک انصاری کا اونٹ باؤلا

marfat.com
Marfat.com

ہو گیا۔ آپ کو اطلاع دی گئی۔ تو آپ اس کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے۔ صحابہؓ نے روکا کہ مبادا آپ کو کاٹ لے، مگر آپ نے فرمایا: مجھے اس کا کوئی ڈر نہیں۔ یہ کہ کر آپ آگے بڑھے تو اس اونٹ نے اپنا سر آپ کے آگے ڈال دیا۔ آپ نے اسے پکڑ کر اس کے مالک کے حوالے کر دیا اور فرمایا: ہر مخلوق جانتی ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں، مگر گنہگار انسان اور نافرمان جن (احمد بن حنبل: مسند، عن انس؛ ابن الجوزی، ۱: ۳۰۲)۔ اسی طرح آپ ایک مرتبہ ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے، جہاں ایک اونٹ کھڑا گھرا رہا تھا، آپ کو دیکھ کر بلبلانے لگا اور اس کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ آپ نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تو وہ خاموش ہو گیا۔ پھر آپ نے اس کے مالک کو بلایا اور فرمایا یہ اونٹ مجھ سے شکایت کر رہا ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو (ابو داؤد، باب الشفقۃ علی البھائم)۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ ایک اونٹ نے آ کر آپ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ آپ نے فرمایا: یہ اونٹ کس کا ہے؟ یہ مجھ سے اپنے مالک کی شکایت کر رہا ہے۔ تحقیق پر یہ بات درست ثابت ہوئی تو آپ نے اس اونٹ کو اس کے مالک سے لے کر صدقہ کے اونٹوں میں بھیج دیا (ابن الجوزی، ۱: ۳۰۱ تا ۳۰۲) ابن الجوزی (۱: ۳۰۲ تا ۳۰۳) اور دیگر سیرت نگاروں نے اس نوع کے متعدد واقعات نقل کیے ہیں۔

سیرت نگاروں نے ارشاد خداوندی: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (۲۱ [الانبیاء]: ۱۰۷) یعنی اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کے بھیجا ہے، سے استشہاد کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ جس طرح آپ کی نبوت کل عالم کے لیے تھی، اسی طرح حضور کو تمام عوالم میں معجزات سے تائید فرمائی گئی ہے۔ اقسام عالم حسب ذیل ہیں: (۱) عالم معانی (غیر قائم بالذات ذوات، یعنی خواص اور عوارض وغیرہ)؛ (۲) عالم ملائکہ؛ (۳) عالم انسان؛ (۴) عالم جنات؛ (۵) عالم علوی، افلاک، کواکب؛ (۶) عالم بسائط، یعنی عناصر؛ (۷) عالم جمادات؛ (۸) عالم نباتات؛ (۹) عالم حیوانات اور (۱۰) عالم کائنات الجو۔ ان میں سے ہر ایک عالم میں آپ کو معجزات سے مشرف فرمایا گیا ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے: (۱) عالم معانی، مثلاً معجزہ قرآنی اور حضور کا غیب کی خبریں دینا؛ (۲) عالم ملائکہ: ملائکہ ایک نورانی اور لطیف مخلوق ہیں جو ہماری ظاہری آنکھوں اور دیگر آلات کی مدد سے نہیں دیکھی جا سکتی اور نہ ان سے کسی قسم کا رابطہ پیدا کرنا ممکن ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپ کے پاس ملائکہ اکثر وحی لے کر اور جنگوں میں فتح و نصرت لے کر نازل ہوتے تھے؛ (۳) عالم انسان: عالم انسان میں حضور کے سب سے زیادہ معجزات منکشف ہوئے، جن میں آپ کی دعا سے بعض قوموں اور بعض افراد کے قبول ہدایت سے لے کر مریضوں کی صحت یابی تک اور ہر قسم کی غیر معمولی باتوں کے اظہار تک امور شامل ہیں؛ (۴) متعدد قرآنی آیات اور احادیث سے جنات کا آپ پر ایمان لانا ثابت ہوتا ہے؛ (۵) عالم علوی و کواکب میں چاند کا دو نیم ہونا، شب معراج میں آپ کا افلاک سے گزر کر عرش و کرسی تک پہنچنا سبھی خوارق شامل ہیں؛ (۶) عالم عناصر میں، مثلاً آپ کی بد دعا سے سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں کا زمین میں دھنسنا: زمین کا ایک مرتد کو قبول نہ کرنا

marfat.com
Marfat.com

اور اسی طرح تھوڑے پانی سے زیادہ آدمیوں کا سیراب ہو جانا؛ حضرت جابرؓ کے گھر میں دعوت کے موقع پر آگ جلنے کے باوجود اس کا سالن کو ختم اور خشک نہ کرنا؛ غزوۂ احزاب میں دشمنوں پر یخ اور تند و تیز ہوا کا چلنا وغیرہ امور شامل ہیں؛ (۷) عالم جمادات میں ہلتے ہوئے پہاڑوں کا تھم جانا یا کسی پتھر سے سلام کی آواز کا آنا وغیرہ آپؐ کے معجزات ہیں؛ (۸) عالم نباتات میں درختوں کا آپؐ کے سامنے تعظیماً جھک جانا، یا آپؐ کے بلانے سے ان کا چلا آنا وغیرہ آپؐ کے خوارق عادت امور ہیں؛ (۹) عالم حیوانات میں مختلف جانوروں کا آپؐ کو پہچان لینا اور آپؐ کے آگے گردن جھکا دینا اسی نوع کے واقعات ہیں؛ (۱۰) کائنات الجو میں آپؐ کی دعا سے بادلوں کا چھا جانا، برسنا اور پھر ان کا چھٹ جانا وغیرہ آپؐ کے معجزات ہیں (تفصیل کے لیے اشرف علی تھانوی : نشرالطیب، ص ۱۹۲ تا ۳۰۲؛ الکلام المبین؛ السیوطی : خصائص کبرٰی وغیرہ).

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں، [محمودالحسن عارف، رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

مآخذ : سیرت (الف) بنیادی مآخذ (Primary Sources)، (صرف عربی): (۱) قرآن حکیم بمواقع کثیرہ بمدد اشاریہ : محمد فؤاد عبدالباقی : معجم المفہرس لالفاظ القران الکریم : سیرت نبوی کا سب سے مُستند، مفصل اور متداول ذریعہ معلومات کتب حدیث ہیں : (۲) محمد بن اسماعیل البخاری (م ۲۵۶ھ/۸۶۹ء) : الجامع الصحیح، (مطبوعۂ لائیڈن، قاہرہ اور دہلی) : (۳) مسلم النیشاپوری : (م ۲۶۱ھ/۸۷۱ء) الجامع الصحیح، (مطبوعۂ قاہرہ، دہلی اور استانبول) : (۴) ابو داوٗد (م ۲۷۵ھ / ۸۸۸ء) : الجامع السنن، (مطبوعۂ دہلی، لکھنؤ اور قاہرہ، بالخصوص حمص (شام) طبع عزت عبیداللہ عاش بمع اعداد و تعلیق ۱۳۸۸ھ / ۱۹۶۹ء) : (۵) ابو عیسٰی الترمذی (۲۰۹ - ۲۹۷) : الجامع السنن، (مطبوعۂ دہلی و قاہرہ) و شمائل : (۶) النسائی (م ۳۰۳ھ / ۹۱۵ء) : السنن، مطبوعۂ لکھنو، و دہلی؛ (۷) ابن ماجہ القزوینی (م ۲۷۳ھ/ ۲۶۰) : السنن، (مطبوعۂ دہلی و قاہرہ) : (۸) امام مالک: الموطأ، (مطبوعۂ دہلی) : (۹) البیہقی : سنن، و شعب الایمان : (۱۰) امام احمد بن حنبل : مسند، (مطبوعۂ حیدرآباد دکن و قاہرہ) : (۱۱) عبدالرزاق (م ۲۱۱ھ / ۸۲۶) : مصنف، بیروت ۱۹۷۲ء : (۱۲) ابن ابی شیبہ (م ۲۳۵ / ۸۴۹ء) : مصنف، مطبوعۂ حیدرآباد دکن؛ (۱۳) علی متقی : (م ۹۷۵ھ / ۱۵۶۷ء) کنزالعمال فی السنن والاقوال (مطبوعۂ حیدر آباد دکن و حلب) ; (۱۴) الحاکم (م ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء) : المستدرک علی الصحیحین، مطبوعۂ حیدرآباد دکن وغیرہ (۱۳۳۴ھ)؛ (۱۵) خطیب تبریزی : مشکوٰۃ المصابیح (مطبوعۂ قاہرہ وغیرہ) ; کتب شروح حدیث : (۱۶) ابن حجر العسقلانی (۷۷۳ - ۸۵۴ھ) : فتح الباری شرح صحیح البخاری، مطبوعۂ قاہرہ و لاہور ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء : (۱۷) بدر الدین عینی (۸۴۴۷۶۲) : عمدہ القاری فی شرح البخاری، مطبوعۂ استانہ ۱۳۰۸ - ۱۳۱۱ : (۱۸) القسطلانی : ارشاد الساری شرح صحیح البخاری، مطبوعۂ قاہرہ : (۱۹) النووی : (۶۳۱ - ۶۷۷) المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج، (مطبوعۂ قاہرہ) : (۲۰) ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) : مرقاہ المفاتیح لمشکاۃ المصابیح، مطبوعۂ قاہرہ : کتب سیر و مغازی : (۲۱) محمد بن اسحاق (م ۱۵۰ھ / ۷۶۷ء) المغازی، طبع محمد حمید اللہ، مراکش؛ (۲۲) الواقدی (م ۲۰۷ھ/۸۰۲ء): کتاب المغازی، طبع مارسڈن جونز (Marsdon Jones) اکسفرڈ ۱۹۶۶ء : (۲۳) ابن ہشام : (م ۲۱۸ھ/۸۳۳ء): کتاب سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ و آلہ وسلم و المغازی، المعروف بہ سیرہ ابن ہشام، مطبوعۂ قاہرہ (اس کے متعدد زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں) : (۲۴) البلاذری (م ۲۷۹ھ/۸۹۲ء): انساب الاشراف، جلد اول، (مطبوعۂ

marfat.com

Marfat.com

قاهره ۱۹۵۹ء) ؛ (۲۵) عبدالرحمن السهیلی : شرح الروض الانف (مطبوعهٔ قاهره ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء، ۲ جلدیں)؛ (۲۶) ابن عبدالبر (م ۴۶۳ھ/۱۰۶۹ء) : تلخیص سیرت ابن هشام بعنوان الدرر فی اختصار المغازی و السیر ، (طبع شوق ضیف ، قاهره ۱۹۶۶ء) ؛ (۲۷) محمد بن سعد الکاتب (م ۲۳۰ھ / ۸۴۴ء) : کتاب الطبقات الکبیر ، (مطبوعه لائیڈن ، نیز بیروت ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء) ؛ (۲۸) سلیمان بن موسیٰ الکلاعی الاندلسی (م ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء) : الاکتفاء فی مغازی رسول الله و الثلاثة الخلفاء ، مطبوعهٔ قاهره ، ۳ مجلدات : (۲۹) ابن سید الناس (م ۷۳۴ھ / ۱۳۳۳ء) : عیون الاثر فی فنون المغازی و السیر، مطبوعهٔ قاهره نیزشرح ابراهیم بن محمد : نور النبراس ؛ (۳۰) ابن کثیر (۷۷۴ھ/ ۱۳۷۲ء) : السیرة النبویه، مطبوعه، قاهره ۱۹۶۴-۱۹۶۶ء، ۴ جلدیں) - جو دراصل البدایه و النهایه کی ابتدائی دو جلدوں کا مجموعه هے ؛ (۳۱) المغلطائی (م ۷۶۱ھ / ۱۳۵۹ء) : الاشارة الی سیرة النبویه ؛ (۳۲) المقریزی : امتاع الاسماع ، فیما الرسول من الاسماع و المتاع، مطبوعهٔ قاهره ؛ (۳۳) یحیی بن ابی بکر العامری : (م ۸۹۳ھ / ۱۴۸۷ء) : بهجة المحافل فی السیر و المعجزات و الشمائل، (مطبوعهٔ قاهره ۱۳۳۰ء) ؛ (۳۴) القسطلانی : مواهب اللدنیه فی منح المحمدیه ، مع شرح الزرقانی (م ۱۱۲۳ھ / ۱۷۱۱ء) مطبوعهٔ قاهره ۱۳۲۵-۱۳۲۸ھ، ۸ جلدیں ؛ (۳۵) شمس الدین الصالحی شامی (م ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء) : سبل الهدی و الرشاد فی سیره خیر العباد ، المعروف به سیرة شامی، مطبوعهٔ قاهره ؛ (۳۶) ابن الجوزی (م ۵۷۹ھ / ۱۱۸۳ء) : الوفا باحوال المصطفی، مطبوعهٔ قاهره ۱۹۷۷ء؛ (۳۷) ابن حزم (م ۴۵۶ھ / ۱۰۶۴ء) : جوامع السیرة، (مطبوعهٔ قاهره و گهکهڑ منڈی، ضلع گوجرانواله ؛ (۳۸) علی بن برهان الدین الحلبی (م ۹۷۰ھ / ۱۰۴۴ء) : انسان العیون فی سیرة الامین المامون الشهیر بالسیرة الحلبیه ، مطبوعهٔ قاهره ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء ؛ کتب تاریخ: (۳۹) الطبری (م ۳۱۰ھ/۹۲۳ء) : تاریخ الرسل و الملوک، (مطبوعهٔ لائیڈن) بالخصوص جلد اول ؛ (۴۰) ابن الاثیر : (م ۶۳۰ھ/۱۲۳۲ء) : الکامل فی التاریخ ، (مطبوعهٔ لائیڈن ۱۸۷۶ء)، بالخصوص جلد اول؛ (۴۱) المقریزی (م ۸۴۵ھ/ ۱۴۴۱ء) الخطط ، مطبوعهٔ قاهره ؛ (۴۲) حسین بن محمد الدیار بکری : (م ۹۶۶ھ / ۱۵۵۸ء) : تاریخ الخمیس فی احوال أنفس نفیس ، مطبوعهٔ بیروت ؛ (۴۳) ابوحنیفه الدینوری (م ۳۸۲ھ / ۸۹۰ء) : الاخبار الطوال ؛ (۴۴) الیعقوبی (م ۲۸۴ھ / ۸۹۷ء) : تاریخ ؛ (۴۵) ابن قتیبه (۲۷۶ھ / ۸۸۹) : المعارف، (مطبوعهٔ) ؛ (۴۶) المسعودی (م نواح ۳۴۵ھ/۹۵۶ء): تاریخ ؛ (۴۷) الازرقی : (م ۲۲۳ھ/ ۸۳۷ء) : اخبار مکه ، مطبوعهٔ لائپزگ ؛ (۴۸) ابو المحاسن ابن‌تغری بردی (م ۸۷۴ھ/۱۴۶۹ء): النجوم الزاهره فی ملوک مصر و القاهره ، ابتدائی جلد؛ (۴۹) عمر بن شبه (م ۲۶۲ھ/ ۸۷۵ء) : اخبار مدینه ؛ کتب شمائل و اخلاق ومعجزات؛ (۵۰) ابوالفضل قاضی عیاض: الشفا بتعریف حقوق المصطفی، (مطبوعهٔ قاهره، خاص دمشق و بریلی) نیز شرح الخفاجی : نسیم الریاض ؛ (۵۱) البیهقی : (م ۴۳۰ھ / ۱۰۳۸ء) : دلائل النبوة ، مطبوعهٔ قاهره ؛ (۵۲) ابو نعیم الاصبهانی (م ۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء) : دلائل النبوة ، (مطبوعهٔ حیدر آباد دکن ؛ (۵۳) السیوطی : خصائص کبریٰ ، مطبوعه حیدر آباد دکن (تین جلدیں) ؛ (۵۴) ابن کثیر (م ۷۷۴ھ/ ۱۳۷۲ء) : شمائل الرسول ، طبع مصطفیٰ عبدالاحد قاهره ۱۹۶۷ء)؛ (۵۵) ابن القیم : زاد المعاد فی هدی خیر العباد، (مطبوعهٔ کانپور و قاهره) ، کتب معارف ؛ (۵۶) ابن قتیبه الدینوری : عیون الاخبار ، مطبوعهٔ قاهره ۱۹۰۷ء ؛ (۵۷) المسعودی : التنبیه و الاشراف ، طبع ڈخویه لائیڈن ، ۱۸۹۳ء ؛ (۵۸) السرخسی : شرح السیر الکبیر ، مطبوعهٔ حیدرآباد دکن ، چار جلدیں ؛ (۵۹) ابن العماد الحنبلی : شذرات الذهب فی اخبار من ذهب ، مطبوعه قاهره ۱۳۵۰ء جلد اول ؛ (۶۰) السمهودی : خلاصة الوفا فی اخبار دارالمصطفی ، مطبوعهٔ بولاق ۱۲۸۵ء ؛ (۶۱) ابو عبید قاسم بن سلام : کتاب الاموال ؛ (۶۲) ابو یوسف: کتاب

marfat.com
Marfat.com

الخراج .

مآخذ : (۱) C. A. Brockelmann : *G.A.L.* ، مع تکملہ مطبوعۂ لائیڈن ؛ (۲) F. Rosenthal : *A History of Muslim Historiography* ، مطبوعۂ لائیڈن ؛ (۳) ابن الندیم : الفہرست ، مطبوعۂ لائپزگ ، طبع Flugal ؛ (۴) حاجی خلیفہ : کشف الظنون، بار دوم، استانبول ؛ (۵) جرجی زیدان : تاریخ الآداب اللغۃ العربیہ، طبع شوق ضیف ، بیروت ؛ (۶) السخاوی : الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اھل التواریخ ، مطبوعۂ دمشق ۱۳۴۹ھ ؛ (۷) الزرکلی : الاعلام ، قاہرہ ۱۹۵۴-۱۹۵۶ء ؛ (۸) احمد امین : ضحی الاسلام ، ۲ : ۳۱۹-۳۳۸ ، بار چہارم ، مطبوعۂ بیروت ؛ (۹) شبلی : سیرت النبی، مقدمہ ، ۲۲ - ۳۷ ، بار ششم ، مطبوعۂ اعظم گڑھ ؛ (نیز رک بہ سیرت نگاری).

(۱) جدید عربی کتب سیرت: دور جدید میں سیرت نبوی پر بہت سی کتب شائع ہوئی ہیں جن میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں : (۱) محمد الخضری : نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین ، (قاہرہ کی متعدد طباعتیں) ؛ (۲) محمد حسین ہیکل : حیاۃ محمد ، (بار چہارم) ، قاہرہ ۱۹۴۷ء؛ اس کا اردو (حیاۃ محمد) اور فارسی (زندگانی محمد) زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے - یونیسکو کی طرف سے انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے)؛ (۳) محمد عزہ دروزہ : سیرہ الرسول صور مقتبسۃ من القرآن الکریم، (دو جلدیں، قاہرہ ۱۹۴۸ء)؛ (۴) محمد جاد المولی : محمد المثل الکامل ، بار چہارم ، قاہرہ ۱۹۵۱ھ ؛ (۵) عز الدین خراج : نبی الاسلام فی مرأۃ الفکر المغربی، قاہرہ، ۱۹۵۳ء؛ (۶) محمد لطفی جمعہ: ثورۃ اسلام و بطل الانبیاء، قاہرہ، ۱۹۵۸ء؛ (۷) جواد علی: تاریخ العرب قبل الاسلام ، (السیرۃ النبویہ) ، بغداد ، ۱۹۶۱ء ؛ (۸) محمد فرج : العبقریہ العسکریہ فی غزوات الرسول ، تقدیم انوار السادات ، تعارف محمد ابو زہرہ ، قاہرہ ، ۱۹۶۳ء ؛ (۹) محمد احمد باشمیل : غزوۃ احد، ریاض ، ۱۹۶۴ء؛ (۱۰) وہی مصنف : غزوۃ الاحزاب، بار اول ، بیروت ۱۹۶۵ء؛ (۱۱) ابراہیم خلیل احمد : محمد فی التوراۃ والانجیل، ۱۹۶۴ء ؛ (۱۲) سید محمود ابو الفیض المنوفی : سیرۃ سید المرسلین صاحب الشریعۃ الاسلامیۃ و القرآن ، بار ثانی ، قاہرہ ۱۹۶۴ء ؛ (۱۳) محمد ابراہیم الشریف : مکہ و المدینۃ فی الجاھلیۃ و عصر الرسول ، بار ثانی ، قاہرہ ۱۹۶۵ء ؛ (۱۴) عبدالرحمن عزام : بطل الابطال ، (قاہرہ) ؛ (۱۵) محمد الغزالی : فقہ السیرہ ، بار ششم ، قاہرہ ۱۹۶۵ء ؛ (۱۶) محمد شبلی: شخصیۃ محمد ، بار اول ، قاہرہ ۱۹۶۷ء ؛ (۱۷) محمد جمال الدین سرور : قیام الدولۃ العربیہ فی حیاہ محمد ، بار پنجم ، قاہرہ ۱۹۶۶ء ؛ (۱۸) محمد عطیہ الابراشی : عظمۃ الرسول ، بار ثانی ، قاہرہ ، ۱۹۶۶ء ؛ (۱۹) عمر ابو النصر : اعظم قصۃ فی التاریخ سیرۃ محمد بن عبداللہ ، بیروت ۱۹۶۷ء ؛ (۲۰) محمود شیت خطاب : الرسول القائد ، (بغداد ، بیروت اور قاہرہ کی متعدد طباعتیں (اردو ترجمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت سپہ سالار، بھی شائع ہو چکا ہے)؛ (۲۱) عباس محمود العقاد : مطلع النور او طوالع البعثۃ المحمدیہ ، بار اول ، قاہرہ ، ۱۹۶۵ء نیز بیروت ۱۹۶۹ء ؛ (۲۲) وہی مصنف : عبقریہ محمد، (قاہرہ اور بیروت کی متعدد طباعتیں) ؛ (۲۳) محمد حسن کامل المطاوی : رسول اللہ فی القرآن الکریم ، قاہرہ ، ۱۹۷۲ء ؛ (۲۴) عماد الدین خلیل : دراسۃ فی السیرہ ، قاہرہ ۱۹۷۴ء ؛ (۲۵) عبدالعزیز خیر الدین : السیرہ الفطرہ محمد خاتم الرسل ، قاہرہ ؛ (۲۶) عبدالحمید جورۃ السحار : محمد رسول اللہ و الذین معہ، مطبوعہ قاہرہ؛ (۲۷) ابو الحسن علی ندوی : السیرہ النبویہ ، بیروت ، ۱۹۷۹ء ؛ (۲۸) محمد ابو زہرۃ: خاتم النبین ، (۳ جلدیں) قاہرہ .

مآخذ : جرجی زیدان : تاریخ الآداب اللغۃ العربیہ، طبع شوق ضیف ، بیروت ؛ (۲) الزرکلی : الاعلام ، قاہرہ ، ۱۹۵۴ء ؛ (۳) محمد امین : ضحی الاسلام ، ۲ : ۳۱۹ تا ۳۳۸، بار چہارم مطبوعہ بیروت؛ (۴) شبلی : سیرت النبی، مقدمہ، ص ۲۲ تا ۳۷ ، بار ششم ، مطبوعۂ اعظم گڑھ ؛

marfat.com
Marfat.com

(۵) Library of Congress Catalogue ، ۱۷ ، ۲۷ بذیل مادہ محمد) [نذیر حسین ادارہ وکن نے لکھا] .

(ادارہ)

۲- کتب سیرت فارسی : فارسی زبان میں بھی اس موضوع پر بہت سی تصنیفات مرتب ہوئیں ، چند ایک حسب ذیل ہیں: (۱) عباس شوستری (مہرین): خاتم النبین و آموزش اسلام ، مطبوعۂ برق کوثر پریس ۱۹۳۰ء ، ایک جلد؛ (۲) شاہ عبدالحق محدث دہلوی : مدارج النبوۃ، مطبوعۂ نولکشور؛ (۳) جعفر سبحانی : فروغ ابدیت، ج ۱، ۲ ، تہران ، تیر ماہ ۱۳۴۹ھ ! (۴) وہی مصنف : در مکتب وحی، تہران ۱۳۸۸ھ ؛ (۵) خواجہ کمال الدین : کردار و گفتار محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ، ترجمہ از ابو القاسم طاہری، تہران ، تاریخ ندارد : (۶) محمد باقر مجلسی : حیات القلوب، ج ۳، (زندگانی محمد پیامبر اسلام)، تہران ، ۱۳۷۸ھ: (۷) معین الدین کاشفی الرومی : معارج النبوہ، سکھر(پاکستان) ۱۹۷۸ء؛ (۸) آقای زین العابدین: پیامبر ، جلد ۱ (زندگانی حضرت رسول اکرم) ، تہران: آذر ۱۳۳۰ھ : (۹) شیر محمد : حیات فخر کائنات ، ۲ جلدیں ؛ [(۱۰) قاضی محمد ثناء اللہ محدث پانی پتی : شرح شمائل ترمذی ، (مخطوطہ) مملوکہ مولینا الیف اللہ عثمانی ، سرگودھا] (مقبول بیگ بدخشانی نے لکھا) .

(ادارہ)

۳- کتب سیرت اردو : (۱) ولی ویلوری : روضۃ الانوار (تصنیف ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء)؛ (۲) محمد صدیق لاہوری (م ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء) : سلک الدرر ، (غیر منقولہ سیرت) : (۳) محمد اجمل : سیرت قرآنیہ ، (تصنیف ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء) : (۴) مفتی محمد عنایت احمد : تاریخ حبیب اللہ ، (۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء) : (۵) عنایت احمد کاکوروی : السید الاخبار ، (۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء) : (۶) سر سید احمد خان : خطبات احمدیہ ، (سرولیم میور کے جواب میں) ، مطبوعۂ ۱۳۰۹ھ/۱۸۸۷ء ؛ (۷) سرور علی : سوانح عمری حضرت محمد[۳] : (۸) مرزا حیرت دہلوی : سیرت الرسول[۳] ، ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء : (۹) ابو خالد : ہادی اعظم ، ۱۳۳۸ھ / ۱۹۰۹ء) : (۱۰) قاضی سلیمان منصور پوری : رحمۃ للعالمین ، ۳ جلدیں ، مطبوعۂ لاہور وغیرہ؛ (۱۱) شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی: سیرت النبی، مطبوعۂ اعظم گڑھ ، کراچی وغیرہ : (۱۲) سید سلیمان ندوی : خطبات مدراس ، سیرت پر آٹھ جامع خطبات کا مجموعۂ ؛ (۱۳) حافظ محمد عبدالتواب : سیرہ الحبیب ؛ (۱۴) حکیم ابو البرکات دانا پوری : اصح السیر، (۱۹۳۲ء)؛ (۱۵) مناظر احسن گیلانی : النبی الخاتم ، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۶) چوہدری افضل حق رئیس احرار : محبوب خدا ؛ (۱۷) مولانا اشرف علی تھانوی : حبیب خدا ؛ (۱۸) وہی مصنف : نشرالطیب فی ذکر النبی الحبیب ، مطبوعۂ کراچی؛ (۱۹) محمد ابراہیم میر سیالکوٹی: سیرت المصطفی ۲ جلدیں : (۲۰) محمد طاہر فاروق : سرور دو عالم ، (۱۹۳۳ء) : (۲۱) ابراہیم العمادی : خاتم النبین ، (۱۹۳۶ء) : (۲۲) معین الدین ندوی : تاریخ اسلام ، جلد اول ، مطبوعۂ اعظم گڑھ ؛ (۲۳) غلام رسول مہر : سرور دو عالم : (۲۴) مفتی یار محمد : سلطنت مصطفی ، (۱۹۴۳ء)؛ (۲۵) محمد خالد : سرور دو عالم، (۱۹۴۵ء)؛ (۲۶) مفتی محمد شفیع : آداب النبی ، (۱۹۴۸ء) : (۲۷) سیماب اکبر آبادی : سیرۃ النبی ، (۱۹۴۹ء) : (۲۸) ماہر القادری : در یتیم ، (۱۹۴۹ء) ؛ (۲۹) رئیس احمد جعفری : رسالت مآب ، (۱۹۴۹ء) : (۳۰) عبدالعلی : حیات النبی ، (۱۹۴۹ء) : (۳۱) محمد حمید اللہ : رسول اکرم کی سیاسی زندگی ، (۱۹۵۰ء) : (۳۲) ابو القاسم دلاوری : سیرت الکبری ، (۱۹۵۱ء) : (۳۳) ملا واحدی: حیات سرور کائنات ، ۱۹۵۳ء ؛ (۳۴) عبدالماجد دریا بادی : خطبات ، (۱۹۵۸ء) ؛ (۳۵) امداد صابری : رسول خدا کا دشمنوں سے سلوک، ۱۹۵۹ء؛ (۳۶) قاری محمد طیب : در یتیم ، (۱۹۵۹) : (۳۷) قاضی محمد زاہد : رحمت کائنات ، (۱۹۵۹ء) ؛ (۳۸) نعیم صدیقی : محسن انسانیت ، (بار دوم ، لاہور ۱۹۶۳ء) : (۳۹)

marfat.com
Marfat.com

محمد آصف قدوائی : مقالات سیرت ، (مطبوعہ ۱۹۵۹ء) ؛ (۳۰) انتخار الحسن کاندھلوی : حالات مبارک خیر البشر ، (مطبوعۂ دھلی) ؛ (۳۱) محمد عاشق الٰہی میرٹھی : اسلام اور حضرت محمدؐ، مطبوعۂ دیوبند؛ (۳۲) ابوالقاسم دلاوری : شمائل کبریٰ ؛ (۳۳) محمد جعفر پھلواری : پیغمبر انسانیت ؛ (۳۴) محمد ادریس کاندھلوی : سیرت مصطفیٰؐ ، ۳ جلدیں ، مطبوعۂ لاھور ، ۱۹۷۷ء ؛ (۳۵) محمد حنیف یزدانی : محمد رسول اللہ غیر مسلموں کی نظر میں ، ۱۹۶۹ء ؛ (۳۶) ابوالکلام آزاد : رسول رحمت، مرتبہ غلام رسول مہر ؛ (۳۷) تذکار محمدؐ، شائع کردہ ہمدرد دواخانہ ، (مختلف علما کی تحریرات کا مجموعہ) ؛ (۳۸) عبدالحی : اسوہ رسول اکرمؐ ، ۱۹۷۵ء ؛ (۳۹) نصیر احمد ناصر : سیرت خیر البشر ، (سعودی عرب سے تیسری انعام یافتہ کتاب) ؛

خصوصی اشاعتیں : (۱) انتخاب سیرت پاک ماہ نو کی خصوصی اشاعتوں کا انتخاب، ۱۹۶۶ء؛ (۲) سیارہ ڈائجسٹ رسول نمبر (۱۹۷۳ء) .

مآخذ : غلام مصطفی خان : اردو کا دینی ادب ، در تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ، لاھور ، ۱۹۷۵ء ؛ (۲) عبدالحق : قاموس الکتب اردو ، جلد اول، کراچی ، ۱۹۶۱ء ؛ (۳) عبدالجبار خان : مقالہ اردو میں سیرت نبوی کا سرمایہ ، (مخطوطہ سندھ یونیورسٹی ، حیدرآباد).

(عبدالجبار خان)

۴- بنگلہ کتب سیرت : بنگلہ زبان میں بھی سیرت طیبہ پر خاصا کام ہوا ہے ، چند تصنیفات حسب ذیل ھیں :

(۱) مولوی سراج الدین : سیرت النبی ، (۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء) ؛ (۲) شیخ عبدالرحیم (۱۸۵۹ - ۱۹۳۱ء) : جیون چرت ، (سیرت پیغمبر) ، ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء ؛ (۳) وھی مصنف : تاریخ الاسلام ، ۲ جلدیں ، ۱۹۱۰ء ؛ (۴) ران پران گپتا (ہندو ادیب) : حضرت محمدؐ (۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) (۵) ابوالحسن ... حضرت محمد مصطفیٰ (۱۹۰۸ء)؛ (۶) بہادر تسلیم الدین احمد : سامراٹ پیغمبر، (متعدد مرتبہ شائع ہوئی) ؛ (۷) یعقوب علی چودھری (۱۸۸۷-۱۹۳۸ء) : منات مکت ، (تاج انسانیت) ۱۹۲۱ء؛ (۸) محمد اکرم ، مولانا : مصطفی چرت ، ۱۹۲۱ء ؛ (۹) کوئی غلام مصطفی (۱۸۹۷ - ۱۹۶۳ء) : شبو نبی ، (پیغمبر اعظم، نثر مرصع) ، ۱۹۲۱ ؛ (۱۰) عبدالخالق : سید المرسلین ؛ (۱۱) محمد واجد علی : مرو بھاسکر ، (پیغمبر صحرا) ، ۱۹۳۱ء ؛ (۱۲) قاضی نذر الاسلام : مرو بھاسکر، (پیغمبر صحرا)، (نظم) ؛ (۱۳) روشن یزدانی: خاتم النبیین ، ۱۹۶۰ء ؛ (۱۴) احمد ممتاز الدین : نبی پاریسایر (Nabi Paricayer) ، ۱۹۶۲ء؛ (۱۵) علی میر رحمت : نبی دو جہان ، ۲ جلدیں ، ۱۹۶۲ء ؛ (۱۶) معصوم قاضی : سارا جہانارا نبی ، ۱۹۶۲ء ؛ (۱۷) اے - ی - ایم عبدالخالق : بشرا نبی ولے کاری دو لار ، ۱۹۶۲ء ؛ (۱۸) قاضی عبد الودود : جاراتا محمد اسلاما ، ۱۹۶۶ء .

مآخذ : (۱) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، بنگالی ادب ؛ (۲) *Library of Congress Catalogue*، ۱۷ ، بذیل مادہ محمد .

۵- ترکی کتب سیرت : دوسرے بلاد اسلامیہ کی طرح ترکی میں بھی سیرت طیبہ پر بہت کام ہوا ہے ، چند کتابیں حسب ذیل ھیں :

(۱) علی اکنکی (Ali Akinki) : عاھر زمان پیغمبر حضرت محمد ، استانبول ۱۹۴۹ء ؛ (۲) برکت علی ھست: خاتم الانبیاء حضرت محمد وحیاۃ ، ۱۹۶۰ء ؛ (۳) اکسیک احمد حمدی (۱۸۸۷ - ۱۹۵۱ء) : پیغمبر حضرت محمد علیہ السلام و موسلو مانک ، ۱۹۶۳ء ؛ (۴) مصطفی عاصم کوکسال : حضرت محمد علیہ السلام ، انقرہ ۱۹۶۶ء.

۶- چینی زبان میں کتب سیرت : چین میں مسلمانوں کی خاصی آبادی ھے - انھیں اسلام اور پیغمبرؐ اسلام سے گہری محبت ہے - سیرت طیبہ کے موضوع پر تصنیف کی ... کتب حسب ذیل ھیں :

marfat.com
Marfat.com

(۱) Liw chih (اٹھارھویں صدی): *The true Annals of the prophet of Arabia*، بمدد الحلبی (۹۷۵-۱۰۴۴ھ): انسان العیون فی سیرہ الامین و المامون، روسی ترجمہ از Archmandrite pall idius؛ انگریزی ترجمہ، Isaacma-son: *Life of Mohammad the Arabian Prophet*، (مطبوعۂ شنگھائی ۱۹۲۱ء)؛ (۲) Hasing chen tsung: *Ma-ham-mo-techuam*۔

مآخذ: *Library of congress catalogue*، تکملہ ۱۹۶۵ - ۱۹۶۹ء، ۱۶: ۳۶۰ ببعد؛ (۲) Isaacmason: مقدمہ، *The Arabian Prophet*، مطبوعہ شنگھائی۔

[محمود الحسن عارف رکن ادارہ نے مرتب کیا]۔

(ادارہ)

۷- سندھی کتب سیرت: سندھی زبان میں سیرت طیبہ پر خاصا کام ہوا ہے، چند کتب حسب ذیل ہیں: (۱) مخدوم میاں موریو (پ ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۵ء): کنزالعبرت، (تصنیف ۱۱۷۵ھ)، واقعات سیرت کا اجمالی تذکرہ، قدیم اور جدید سندھی میں طبع ہو چکی ہے؛ (۲) وہی مصنف: مجموعہ، (پانچ رسائل کا مجموعہ، جن میں سے ایک رسالہ غزوات اور دوسرا شجاعت خیر انام پر ہے)؛ (۳) حکیم فتح محمد سیوھانی: حیات النبی، بار اول ۱۹۱۴ء؛ (۴) وہی مصنف: اخلاق النبی؛ (۵) فضل احمد غزنوی: سیرۃ النبی، (۲ جلدیں)؛ (۶) محمد بخش واصف: اسانجو پیارو رسول، ۱۹۳۵ء؛ (۷) وہی مصنف: دریتیم، ۱۹۳۸ء؛ (۸) وہی مصنف: رسول پاک، ۱۹۴۰ء؛ (۹) مخدوم محمد صالح بھٹی: کامل رهنما؛ (۱۰) خیر محمد نظاماتی: اسانجو نبی؛ (۱۱) غلام محمد مهوانی و عبد الواحد سندھی: رسول پاک؛ (۱۲) علی خان ابڑو: حالات نبی؛ (۱۳) مرزا قلیچ بیگ: سیرت پاک؛ (۱۴) حسین عالی شاہ: معجزات محمدی؛ (۱۵) عبدالرحیم مگسی: سیرہ النبی؛ (۱۶) قاضی عبدالرزاق: اسانجو پیارو نبی؛ (۱۷) محمد یعقوب ابڑو: شاہ عرب؛ (۱۸) رشید احمد لاشاری: محمد مصطفی؛ (۱۹) محمد عنایت اللہ: سرکار مدینہ۔

مآخذ: (۱) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ۱۳: ۴۳۵ - ۶۵۵ (سندھی ادب)؛ (۲) *Library of congress catalogue*، بذیل محمد؛ (۳) میمن محمد صدیق: تاریخ سندھی ادب، جلد اول و دوم؛ (۴) ماہنامہ المعارف، اگست ۱۹۸۰ء، ص ۳ تا ۱۱) [محمود الحسن عارف رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

۸- پشتو کتب سیرت: (۱) اخون درویزہ (م ۱۰۴۸ھ / ۱۶۳۸ء): مخزن الاسلام؛ (۲) ملا عبدالرشید: رشید البیان، (تصنیف ۱۱۲۹ھ/۱۷۱۶ء)؛ (۳) میاں مجدی بن محمد عمر چمکنی: شمائل نامہ؛ (۴) ملا احمد جان: جواہر الاولیاء، (تصنیف ۱۳۳۰-۱۳۴۰ھ)؛ (۵) ملا نعمت اللہ: قصص الانبیاء؛ (۶) پیر بخش: زموخت محمد نبی صلی اللہ علیہ و سلم؛ (۷) خان میر ہلالی: دنیانو امام؛ (۸) وہی مصنف: بنکلے رسول؛ (۹) امیر ترخوی: دوست د خدائے؛ (۱۰) عبدالحمید قریشی: زما رسول؛ (۱۱) عبدالوہاب: زینۃ الاسلام؛ (۱۲) سید روح اللہ: تاریخ سردار عالم؛ (۱۳) امین گل: سیرت الرسول؛ (۱۴) غلام نبی: سیرت خیر البشر، (دو جلدیں)؛ (۱۵) مرزا عبدالرحیم: سردار عالم؛ (۱۶) فقیر محمد عباس قادریہ: کتاب سیرہ النبی؛ (۱۷) سید اکبر صابر: سیرت النبی؛ (۱۸) محمد تقدیم الحق کاکا خیل: تاریخ است، (پہلا حصہ)۔

(پریشان خٹک)

۹- یورپی زبانوں میں کتب سیرت: یورپ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ بڑی حد تک بے خبری سے کیا گیا ہے اور بعض تصانیف سے تو تنگدلی کا تأثر ملتا ہے۔ بہر حال اس موضوع پر فضلائے مغرب کی چند تصانیف و تحریرات قابل ذکر ہیں، مگر انھیں بھی بڑی احتیاط سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض تصانیف حسب ذیل ہیں:

marfat.com
Marfat.com

موجودہ صدی کے مجلات میں سیرۃ پر جو مقالے شائع ہوئے ہیں ان کے لیے دیکھیے Pearson : *Index Islamicus* ، عام یورپین علمی کتب جن میں سیرۃ پر مواد ہے ان میں : (۱) Pfanmüller : *Handbuch der Is'am Literatur* : (۲) Chauvin : *Bibliographie des ourages arabesou relatifs aux arabes* : (۳) Sauvaget : *Introduction al histoire del' orient musulman* ، متعلقہ فصلیں :

(الف) سیرۃ پر انگریزی میں عام کتابیں : (۵) Sir William Muir : *The life of Mahammed* : لندن ۲ جلدیں ۱۸۵۶ء تا ۱۸۶۱ء ، ایک غیر محتاط تصنیف ، جس کے اعتراضات کے مختلف علما نے تفصیلی جوابات دیئے ہیں: (۶) Stanley Lane Poole (۱۸۲۲-۱۸۹۵ء): *The Prophet of Islam* ، ۱۸۷۹ء : (۷) وہی مصنف : *The Speeches and table talk of the Prophet Mohammad* : (۸) Sir Thomas Arnold ، (۱۸۶۳ - ۱۹۳۰ء) : *The Preaching of Islam* ، ۱۸۹۶ء ، (ابتدائی حصہ متعلق بہ سیرت) : (۹) Sir Thomas Carlyle ، (۱۷۹۵ - ۱۸۸۱ء) : *Sartus Resartus on Heroes and Hero Worship* ، مقالہ دوم بعنوان: The hero as Prophet ، مطبوعۂ لندن ، ص ۲۷۷ تا ۳۱۱ ، یہ مقالہ ۱۸۴۰ء میں بطور لیکچر پڑھا گیا: (۱۰) Irving Washington : *The life of Mohammed* ، (نیو یارک ۱۸۴۹ء)، عربی ترجمہ از حسنی الخربوطلی بعنوان حیاۃ محمد ، قاہرہ بار ثانی ۱۹۶۶ء : (۱۱) Bosworth Smith : *Mohammed and Mohammedanism* ، مطبوعہ ۱۸۷۵ء : (۱۲) S.W. Koell : *Mohammed and Mohammedanism critically considered* ، (۱۸۸۸ء) : (۱۳) John Stone : *Mohammed and his Power* ، ۱۹۰۱ء، بسلسلہ World Epoch Maker : (۱۴) Morgoliouth (Davids) ، (۱۸۵۸-۱۹۴۰ء): *Mohammed and the Rise of Islam* ، نیو یارک ۱۹۰۵ء : (۱۵) Townsend (Meredith W.) : *The Great Arabian* ، ۱۹۱۲ء ، بسلسلۂ Modern biographies : (۱۶) Dreycott (G. M.) : *Mohammed Founder of Islam* ، ۱۹۱۶ء : (۱۷) A. J. Wensinck : *A Handbook of Mohammedan Tradition* ، ۱۹۲۷ء [عربی ترجمہ از محمد فؤاد عبدالباقی : مفتاح کنوز السنۃ ، قاہرہ و لاہور] : (۱۸) Bodley, Renald (V. C.) : *The Messenger The life of Mohammad* : لاہور ۱۹۳۰ء : (۱۹) W. Montgomery Watt : *Muhammad at Mecca* ، آکسفرڈ ۱۹۵۳ء : (۲۰) وہی مصنف : *Muhammad at Medina* ، آکسفرڈ ۱۹۵۱ء : (۲۱) وہی مصنف : *Muhammad : Prophet and Statesman* ، آکسفرڈ، ۱۹۶۱ء : (۲۲) R. A. Nicholson : *A literary History of the Arabs* ، کیمبرج ۱۹۳۰ء ۔

(ب) دیگر زبانوں کی تصنیفات : (۲۳) J. Gagnier : *La Vie de Mahomet* ، ۳ مجلدات ۱۷۴۸ء : (۲۴) Dujarric و Lamaitress : *Vie de Mahomet 'd' apris Latradition* ، ۱۸۹۷ - ۱۸۹۸ء : (۲۵) Th. Nöldeke : *Das Leben Muhammed'e nach den Ouellen popular dargestellt* ، ۱۸۶۳ء: (۲۶) A. Krehl : *Das leben des Muhammed* ، ۱۸۸۴ء : (۲۷) R. Dozy : *Essai Sur l' histoire de l' Islamism* ، ۱۸۷۹ء: (۲۸) H. Grimme : *Mohammed* ، ۲ جلدیں، ۱۸۹۲-۱۸۹۵ء : (۲۹) Leone Caetani ، (۱۸۶۹ - ۱۹۲۶ء) : *Annali dell' Islam* ، میلان ۱۹۰۵ء ، جلد ۱ و ۲/۱ : (۳۰) E. Dermenghem : *La Via de Mohamet* ، بار اول پیرس ۱۹۲۹ء ، بار دوم ۱۹۵۰ء : (۳۱) A. Sprenger : *Das Leben und die Lehre des Mohammad* ، ۳ جلدیں، ۱۸۶۱-۱۸۹۵ء : (۳۲) G. Weil : *Muhammed der Prophet, Sein Leben und Sein Lehre* ، ۱۸۴۳ء: (۳۳) Franz Buhl : *Muhammeds liv* ، ۱۹۰۳ء : (۳۴) *Das Leben Muhammeds* ، لائپزگ ۱۹۳۰ء: (۳۵) J. Wellhausen : *Skizzen Und Vorabeiten* ، جلد ۴: (۳۶) M. Gaudefroy : *Mahomet* ، پیرس ۱۹۵۷ء ۔

marfat.com
Marfat.com

۱۰- یورپی زبانوں میں مسلم مصنفین کی تصانیف : (۱) سید امیر علی (۱۸۴۹-۱۹۲۸ء) : A critical examination of the life and Teachings of Muhammad ، لنڈن ۱۸۷۳ء : (۲) وہی مصنف : The Spirit of Islam, A history of the evolution and ideas of Islam with a life of the Prophet ، (متعدد اشاعتیں) : (۳) عبداللہ یوسف علی : The Personal life of Muhammad، در سلسلہ Progressive Islamic Prophet، شمارہ ۲، لنڈن ۱۹۲۶ء : (۴) سردار اقبال : Mohammad the Prophet ، ۱۹۳۲ء : (۵) خالد لطیف گابا : The Prophet of the Desert ، ۱۹۳۳ء : (۶) محمد حمید اللہ : Muhammad Rasulullah ، حیدرآباد دکن ۱۹۷۳ء ، کراچی ۱۹۷۹ء : (۷) وہی مصنف : Le Prophete de l' Islam ، دو جلدیں ، پیرس ۱۹۵۹ء : (۸) وہی مصنف : Corpus de Documents ، پیرس ۱۹۳۵ء : (۹) قاسم علی جیراجپوری : Muhammad, a Mercy to all the Nations ، ۱۹۳۷ء : (۱۰) سلیمان بن ابراہیم ، (Dinet' Et.) : La vie Mohammed ، (مستشرق Dinet)، کے اسلام کے متعلق دیکھیے نجیب العقیقی: المستشرقون، ۱ : ۲۳۵) : (۱۱) مارما ڈیوک پکتھال (Marmaduke Pickthal) و اللہ بخش یوسفی : Life of the Holy Prophet Mohammad: Al-Amin، مطبوعۂ کراچی ۱۹۵۹ء: (۱۲) عبدالسمیع مصری : Muhammad the Prophet of Islam، قاہرہ ۱۹۶۸ء : (۱۳) عبدالحمید صدیقی : Life of Muhammad ، لاہور ۱۹۶۹ء : (۱۴) ثروت صولت : The life of Mohammad ، ۱۹۷۶ء .

۱۱- کتب سیرت سے متعلق جدید فہرستیں اور کتابیات : (۱) General Catalogue of Printed books to 1955 in the British Museum, London ، فوٹو لیتھو گرافک ایڈیشن ، ج ۱۶۶ ، مطبوعہ ۱۹۶۳ء ، ک ۶۰۰ - ۷۴۳ : (۲) Five yearly Supplement of British Museum General catalogue ، ۱۹۵۶ - ۱۹۶۰ء ، ۳۲ : ۳۰۸ بعد : (۳) Catalogue of Printed books in the British Museum, London ، مطبوعہ ۱۹۷۰ء ، ج ۱ ، ک ۶۹۹ بعد : (۴) کتاب مذکور، دہ سالہ تکملہ ۱۹۵۶-۱۹۶۵ء، ج ۳۲ ، ک ۳۰۸ بعد : (۵) Library of Congress Catalogue، ۱۹۵۰ تا ۱۹۶۰ء، ۲۷ : ۳۱۰ - ۳۲۰ : (۶) کتاب مذکور : تکملہ ، ۱۹۶۰ - ۱۹۶۳ء ، ۱۳۰ ج ۱۶، ص ۱۳۶ - ۱۳۷ : (۷) کتاب مذکور : تکملہ ، ۱۹۶۵-۱۹۶۹ء ، ج ۱۳ ، بذیل محمد : (۸) نجیب العقیقی : المستشرقون ، ۳ جلدیں ، بمواضع کثیرہ بمدد اشاریہ : (۹) Encyclopaedia of Islam، لائیڈن ، بذیل ماخذ مقالہ حضرت محمدؐ ; (۱۰) Encyclopaedia Britannica، بذیل ماخذ مقالہ حضرت محمدؐ : (۱۱) Carl Brockelmann : Geschichte der Arabischen Litteratur ، جلد ۱ ، بذیل ماخذ مقالہ محمد و قرآن: (۱۲) Humphrey Prideaux : Life of Mahomet ، مطبوعہ ۱۶۹۶ء، ص ۲۵۰ تا ۲۶۳: (۱۳) پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور کی کارڈ کیٹالاگ: [محمود الحسن عارف رکن ادارہ نے لکھا] .

(ادارہ)

۱۲- جدید عربی کتب : (۱) بنت الشاطی : ام الرسول محمدؐ : (۲) محمد خالد : خاتم النبیین : (۳) عبدالمتعال الصعیدی : شباب قریش : (۴) محمد عزت دروزہ : عصر النبیؐ و بیئتہ قبل البعثۃ : (۵) طٰہٰ حسین : علی ہامش السیرۃ : (۶) محمد الغزالی : فقہ السیرۃ : (۷) محمد حسین ہیکل : فی منزل الوحی : (۸) توفیق الحکیم : محمد صلی اللہ علیہ وسلم : (۹) محمد عبدالفتاح ابراہیم : محمدؐ القائد: (۱۰) محمد احمد جاد المولی : محمدؐ المثل الکامل: (۱۱) محمد رضا : محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم: (۱۲) عبدالرحمن بن عزام : بطل الابطال (او ابرز صفات النبی محمدؐ) (۱۳) محمد جمال الدین سرور : قیام الدولۃ العربیۃ الاسلامیہ فی حیاۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم: (۱۴) محمد الطیب النجار : القول المبین فی سیرۃ سید المرسلین، قاہرہ (۱۹۸۳ھ) : (۱۵) عماد الدین خلیل : دراسۃ فی السیرۃ

marfat.com
Marfat.com

(بیروت ۱۹۷۵ء) ؛ (۱۶) عبدالحلیم محمود : الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ؛ (۱۷) ابن ابراهیم شموط و محمود زیادہ : الحقیقۃ المثالیہ : (۱۸) عبدالفتاح شحاتہ : تاریخ العرب و مصر الرسولؐ ؛ (۱۹) محمود زیادہ : دراسات اسلامیہ ؛ (۲۰) محمد مصطفٰی النجار : سیرۃ الرسولؐ ؛ (۲۱) حسن ابراهیم حسن : تاریخ الاسلام السیاسی و الدینی و الثقافی ، جلد اول ؛ (۲۲) امین دویدار : صور من حیاۃ الرسولؐ (۱۹۵۸ء) ؛ (۲۳) محمد بن عبدالوهاب : مختصر سیرۃ الرسولؐ ؛ (۲۴) عبداللہ بن محمد بن عبدالوهاب : مختصر سیرۃ الرسولؐ ؛ (۲۵) مخدوم محمد هاشم الهندی التتوی : بذل القوۃ فی حوادث سنی النبوۃ : حیدرآباد (پاکستان) ۱۹۶۶ء ؛ (۲۶) عروۃ بن الزبیر (۲۳ھ تا ۹۴ھ) : مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم (بروایت ابی الاسود) : استخراج و طبع محمد مصطفی الاعظمی ، الریاض ۱۹۸۱ء (صفحات ۲۶۴) بالخصوص مقدمہ کتاب ؛ (۲۷) محمد فرج : العبقریۃ العسکریۃ فی غزوات النبی صلی اللہ علیہ و سلم ؛ (۲۸) مصطفی فہمی : محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ؛ (۲۹) ابن قیم الجوزیۃ : الطب النبویۃ ، بیروت ؛ (۳۰) ابو الحسن علی علاء الدین الحموی الکحال : الاحکام النبویۃ فی الصناعۃ الطبیۃ .

۱۳- جدید اردو کتب سیرت : (۱) محمد ولی رازی : هادی عالم (پوری کتاب کی عبارت غیر منقوطہ ہے) ؛ (۲) محمد عبدالحی : اسوہ رسول اکرمؐ ؛ (۳) وحید الدین خاں : پیغمبرؐ انقلاب ؛ (۴) سید اسعد گیلانی : رسول اکرمؐ کی حکمت انقلاب ؛ (۵) عبدالعزیز عرفی : جمال مصطفٰیؐ (۴ جلدیں) ؛ (۶) شیر علی خاں راؤ : سیرت محسن کائناتؐ ؛ (۷) محمد شریف قاضی : اسوہ حسنہ ؛ (۸) محمد صدیق قریشی : رسول اکرمؐ کی سیاست خارجہ ؛ (۹) خواجہ محمد اسلام : محبوبؐ کے حسن و جمال کا منظر ؛ (۱۰) امیر افضل خان : جلال مصطفٰیؐ (حضور پاک کی جنگی حکمت عملی اور تدبیرات کا فوجی تجزیہ) ؛ (۱۱) گلزار احمد : غزوات رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ؛ (۱۲) قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی : سیرت طیبہ ؛ (۱۳) سید ابوالحسن علی ندوی : نبی رحمت صلی اللہ علیہ و سلم (۲ جلدیں) ؛ (۱۴) عبد الرزاق ملیح آبادی (ترجمہ) : اسوہ حسنہ ؛ (۱۵) اسد القادری : سیرت الرسول صلی اللہ علیہ و سلم ؛ (۱۶) ابن خلدون : تاریخ ، جلد اول ، عہد رسالت (اردو ترجمہ از شیخ عنایت اللہ) ؛ (۱۷) غلام عزیز ربانی : سیرت طیبہؐ (۲ جلدیں) .

۱۳- جدید فہرستیں: (۱) Horowitz : *The Earliest Biographies of the Prophet and their Authors* در *Islamie culture* ، ۱ (۱۹۲۷ء) : ۵۳۵ تا ۵۵۹ ، ۲ (۱۹۲۸ء) : ۲۲ تا ۵۰ ، ۱۶۴ تا ۱۸۲ ، ۴۹۵ تا ۵۲۶ ؛ (۲) فؤاد سزگین : تاریخ التراث العربی ، المجلد الاول، قاهرہ ۱۹۷۷ء ، ص ۳۰۹ تا ۳۱۲ ، ۳۴۳ تا ۳۸۵ ؛ (۳) W. M, Watt : *The Materials used by Ibn Ishaq* ، در *Historians of the Middle East* ؛ (۴) محمد حمید اللہ : (*Le Prephete de l, Islam*) ؛ اور (۵) عبدالحمید صدیقی : (*The life of Muhammad*) دونوں نے مصادر و مآخذ کے تحت کتب سیرت کی مفصل فہرستیں درج کر دی ہیں ؛ (۶) حافظ احمد یار خاں : فہرست کتب سیرت (اردو و پنجابی) ؛ (۷) نویں قومی سیرت کانفرنس (۱۹۸۴ء) کے موقع پر اسلام آباد میں کتب سیرت کی ایک شاندار نمائش کا اهتمام کیا گیا تھا ۔ امید ہے کہ عنقریب اس کی فہرست بھی طبع ہو جائے گی ۔ [عبدالقیوم رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

۱۴- عربی ، فارسی ، اردو اور دیگر باثروت زبانوں کی طرح ترکی زبان بھی اسلامی ادب سے مالا مال ہے ۔ آج بھی ترکیہ میں اسلامی مخطوطات کے قابل رشک وافر ذخائر موجود ہیں ؛ البتہ دیگر اسلامی موضوعات کے مقابلے میں سیرت النبیؐ کے موضوع پر اهل علم نے بدیر توجہ دی ۔ بڑے بڑے علما و شعرا نے اس صنف ادب میں بھر پور حصہ لیا ۔ ابتدا میں زیادہ تر اعتماد و انحصار عربی و فارسی کتب سیرت النبی کے تراجم پر رہا ۔ پھر

marfat.com
Marfat.com

قدیم کتب سیرت کے اختصار اور تبویب و تشریح پر بھی خاصا کام ہوا ۔ اس سلسلے میں سیرت ابن ہشام ، شمائل ترمذی اور قاضی عیاض کی شفا کے تراجم و اختصارات خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ نظم و نثر میں سیرت پر مستقل تالیفات کا بھی خاصا ذخیرہ موجود ہے ۔ چند اہم کتابوں کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

(۱) مصطفی بن یوسف بن عمر الاوزن الرومی الضریر : ترجمہ سیرت النبیؐ (ترجمة الضریر و تقدمة الظهیر) ۔ مترجم نے سیرت ابن ہشام کا ترکی زبان میں ترجمہ ۷۹۰ھ میں مکمل کیا ۔ پھر مملوک سلطان مصر سیف الدین برقوق کی خدمت میں پیش کیا ۔ بعد کے آنے والے مصنفین سیرت نے اس ترجمے سے بڑا استفادہ کیا : (۲) محمد نُبی (م ۱۱۶۶ھ) : ترجمة الشفا فی شمائل صاحب الاصطفاء ، قاضی عیاض کی الشفا کا ترکی ترجمہ ۱۱۶۱ھ میں مکمل ہوا : (۳) ابراہیم حنیف (م ۱۱۸۹ھ) : خلاصة الوفا فی شرح الشفا ، مصنف نے قاضی عیاض کی کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفی کی شرح ترکی زبان میں چار جلدوں میں رقم کی ہے ، استانبول ۱۳۱۳ھ تا ۱۳۱۷ھ ؛ (۴) عبدالباقی بن محمد المعروف بباقی (م ۱۰۰۸ھ) : معالم الیقین فی سیرة سید المرسلین ، یہ کتاب القسطلانی کی المواہب اللدنیة کا ترکی ترجمہ ہے جو مترجم نے ۹۸۶ھ میں مکمل کیا ۔ جلد اول ، استانبول ۱۳۲۲ھ ، جلد دوم ۱۳۲۶ھ ؛ (۵) محمود المغنیساوی نے بھی المواہب اللدنیة کا ترکی ترجمہ کیا ؛ (۶) احمد بن خیرالدین اسحاق خواجہ سی البرسوی (م ۱۱۲۰ھ) اقوم الوسائل فی ترجمة الشمائل ، امام ترمذی کی کتاب الشمائل النبویہ کا ترکی ترجمہ جو ۱۱۱۱ھ میں مکمل ہوا ۔ استانبول ۱۲۸۷ھ ، ۱۳۲۲ھ ، پھر ۱۳۲۶ھ ؛ (۷) محمد الآق کرمانی : ترجمہ الشمائل النبویہ ، شمائل ترمذی کا ترکی ترجمہ ؛ (۸) حسین بن محمد بن حسن الشہیر بحسام الدین نقشبندی (م ۱۲۴۸ھ) : شرح الشمائل الشریفة ، بولاق ۱۲۵۴ھ ؛ (۹) احمد عاصم عینتابی (م ۱۲۳۵ھ) : السیرة الحلبیة ، بولاق ۱۲۴۸ھ در حقیقت یہ کتاب ابراہیم بن مصطفی الحلبی (م ۱۱۹۱ھ) کی شرح منظومة السیرة الحلبیہ کا ترکی ترجمہ ہے جو ۵۰۴ صفحات پر مشتمل ہے ؛ (۱۰) حافظ بن سلیمان : کفایة الانوار ، قاضی عیاض کی کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفی کا ترکی ترجمہ ؛ (۱۱) لامعی چلبی بن محمد بن عثمان (م ۹۳۸ھ) : ترجمہ شواہد النبوة لتقویة یقین اہل الفتوة ، اس ترکی شاعر نے عبدالرحمن جامی (م ۸۹۸ھ) کی کتاب کو ترکی زبان میں منتقل کیا ؛ (۱۲) عبدالحلیم بن محمد بن نور اللہ الشہیربہ حلیمی آخی زادہ (م ۱۰۱۳ھ) نے ۱۰۰۹ھ میں جامی کی مذکورہ بالا کتاب کا ترکی ترجمہ مکمل کیا ؛ (۱۳) جلال زادہ مصطفی چلبی (م ۹۷۵ھ) : (ترجمہ معارج النبوة فی مدارج الفتوة ، معین الدین محمد الفراہی المعروف بملا مسکین (م ۹۱۰ھ) نے کتاب معارج النبوة فارسی میں لکھی اور مترجم جلال زادہ نے اس کا یہ ترکی ترجمہ ۹۵۹ھ میں مکمل کیا ؛ (۱۴) محمد بن محمد الاسکوبی المعروف بابن الجقرقجی (م ۱۰۳۳ھ) : دلائل نبوت محمدی و شمائل فتوت احمدی ۔ یہ بھی معارج النبوة فی مدارج الفتوة کا ترکی ترجمہ ہے اور پہلے ترجمے سے زیادہ مقبول و مروج ہے ؛ (۱۵) محمود المغنیساوی المعروف بیکلی زادہ (م ۱۱۳۰ھ) : ترجمہ روضة الاحباب فی سیرت النبی والآل والاصحاب ، ۱۱۰۴ھ میں فارسی سے ترکی میں ترجمہ کیا ؛ پہلی جلد میں سیرة النبی ، دوسری میں حیات خلفاے راشدین اور تیسری میں حضرت حسن و حسین اور اموی و عباسی خلفا کے حالات ، استانبول ۱۲۶۸ھ ؛ (۱۶) احمد وحی زادہ الازنیقی (م ۱۰۱۸ھ) : صحائف العبیر و لطائف السیر (ترجمہ سیر گازرونی) ، فارسی زبان سے ترکی میں یہ ترجمہ ۱۰۰۳ھ میں مکمل ہوا ؛ (۱۷) عبدالعزیز قرہ چلبی زادہ (م ۱۰۶۸ھ) : ترجمہ سیر گازرونی (فارسی سے ترکی میں ترجمہ) ؛ (۱۸) لطف اللہ احمد : حیات حضرت محمد (تین جلدیں) ، استانبول ۱۳۳۲ھ ؛ (۱۹) محمد سعد الدین افندی بن حسن : الرسالة الشمائلیة ؛ (۲۰) یوسف شکری بن

marfat.com
Marfat.com

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

عثمان الخربوطلبی : سلسلۃالصفا لمحمد المصطفیٰ ؛ بولاق ۱۲۸۷ھ ؛ (۲۱) ازمیرلی اسماعیل حقی : سیر جلیلۃ نبویۃ، استانبول ۱۳۳۲ھ ؛ (۲۲) محمد ضیا : سیر نبیؐ ، استانبول ۱۹۲۶ء ؛ (۲۳) عاطف : سیرۃ النبیؐ ، استانبول ۱۳۳۸ھ؛ (۲۴) عبدالباقی عارف افندی (م ۱۱۲۵ھ) : سیرۃ النبیؐ (منظوم) : (۲۵) ابراہیم حنیف افندی (م ۱۲۱۷ھ) : سیرالنبیؐ (منظوم) ، اس ترکی ادیب نے یہ کتاب ۱۲۰۴ھ میں مکمل کی ؛ (۲۶) محمد حاکم الرومی (م۱۱۸۴ھ) : سیر النبیؐ (عجائب الاخبارفی اخبار سید الاخیار) ؛ (۲۷) احمد رفیق : غزوات جلیلہ پیغمبری ، صرف غزوات النبیؐ پر مشتمل ہے (صفحات ۲۲۴) ، استانبول ۱۳۲۴ھ ؛ (۲۸) عبدالعزیز قرہ چلبی زادہ (م ۱۰۶۸ھ) : الفوائح النبویہ فی السیرۃ المصطفویۃ ؛ (۲۹) یحییٰ بک دوقاکین زادہ (م ۹۹۰ھ) : گل صدرنگ (منظوم) ، مشتمل بر معجزات نبوی ؛ (۳۰) محمد بن ابراہیم بن احمد العمادی (م ۱۱۲۰ھ): کواکب الانوار الاحمدیۃ فی اسرار المعجزات المحمدیۃ ؛ (۳۱) اویس بن محمد آلاشہرلی الاسکوبی الشہیر بویسی (م ۱۰۳۷ھ) : درۃ التاج فی سیرۃ صاحب المعراج (۲ جلدیں) ، مشہور ترکی ادیب ویسی نے مغلق اسلوب میں صنعت لفظی کا اہتمام کرتے ہوئے عربی و فارسی الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں - کتاب کا ایک حصہ مکی زندگی پر مشتمل ہے اور دوسرا مدنی پر - دوسرا حصہ غزوہ بدر پر ختم ہو گیا ، استانبول ۱۲۸۶ھ ؛ (۳۲) یوسف الرہاوی المشہور نابی (م ۱۱۲۴ھ) : ذیل سیر ویسی ، درۃ التاج کا تکملۃ ، غزوہ بنی قینقاع تا فتح مکہ ، بولاق ۱۲۴۸ھ ؛ (۳۳) وہی مصنف : ذیل ذیل نابی (وہ تک)؛ (۳۴) نظمی زادہ مرتضی البغدادی (م۱۱۳۴ھ) نے درۃ التاج فی سیرۃ صاحب المعراج کو مکمل کیا ؛ (۳۵) محمد توفیق پاشاہ : لوامع النور ، استانبول ۱۳۰۸ھ ؛ (۳۶) ایوب صبری : محمود السیر ، استانبول ۱۲۸۷ھ ؛ (۳۷) یوسف سعاد : مرآت محمدیہ و مناقب احمدیہ ، استانبول ۱۳۱۳ھ ؛ (۳۸) جوابی : معجزات البنویۃ ؛ (۳۹) حافظ محمد زہدی : نظم السیر ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوات کو مثنوی کے انداز میں نظم کیا گیا ہے ، طرابزون ۱۳۲۴ھ ؛ (۴۰) احمد بن ابراہیم طوپ خانہ وی: موہبۃ سنیۃ من السیرۃ الزکیۃ؛ (۴۱) محمد رائف افندی: مختصر شمائل شریفیۃ ترجمہ سی ، استانبول ۱۳۰۴ھ؛ (۴۲) یوسف سعاد : اقوم السیر ، الجزء الاول ، استانبول ۱۳۲۷ھ (۴۳) عبیدی : اوصاف و معجزات النبیؐ ، استانبول ۱۳۱۳ھ ، (۴۴) میرزا زادہ احمد نیلی (م۱۱۶۱ھ) الاوفی فی ترجمۃ الوفاء (۴۵) محمد خاقانی (م۱۰۱۵ھ): حلیہ خاقانی - مثنوی کی طرز پر شاعر نے نظم کیا ہے ، استانبول ۱۲۶۴ھ ، ۱۳۰۷ھ وغیرہ ؛ (۴۶) وزیر محمد راغب پاشا (م ۱۱۷۶ھ) : حنینیہ ؛ غزوہ حنین کے واقعات کو نظم کیا گیا ہے - اس موضوع پر نیز دیکھیے سہ ماہی مجلہ عالم الکتب ، جلد ۱ ، عدد ۴ (۱۹۸۰) و جلد ۲ ، عدد ۴ (۱۹۸۱ء)، الریاض؛ [عبدالقیوم رکن ادارہ نے مرتب کیا؛ نیز متن مقالہ میں اضافے کیے]۔

(ادارہ)

اللّٰہم صلِّ علیٰ محمدٍ و آلہٖ و بارِک و سلِّم

marfat.com
Marfat.com

marfat.com